سلسلہ اعمال القلوب مکمل

دِل کی اِصلاح

اللہ تعالیٰ کے قریب کرنے والے اعمالِ دِل

تالیف: فضیلۃ الشیخ محمد صالح المنجد

ترجمہ: فضل الرحمن رحمانی ندوی رحمہ اللہ

نام کتاب

دل کی اصلاح

اللہ تعالیٰ سے قریب کرنے والے اعمال

تالیف: فضیلۃ الشیخ محمد صالح المنجد ترجمہ: فضل الرحمن رحمانی ندوی حفظہ اللہ

سعودی عرب

دارالعلوم النحیہ للنشر والتوزیع

س ت: ١٠١٠٢٠٤٨٧٦

فرع: مرکز الجامع التجاری شارع باخشب جدہ

معرض: ٠٢٦٣٣٦٦٤٠ فاکس: ٠٢٦٨٧٤٥٥٧

المكتب الرئيسي الرياض، حي الفيصلة

هاتف: ٠١٢٤٢٣١٢٦

مكتبه دار الفرقان، الرياض

هاتف: ٠١-٤٣٥٨٦٤٦، ٠٥٦٣٠٦٤٧٣٦، ٠٥٠٧٤١٩٩٢١

مكتبه بيت السلام، الرياض

هاتف: ٠١-٤٤٦٠١٢٩، ٠٥٠٥٤٤٠١٤٧، ٠٥٠٢٠٣٣٢٦٠

پاکستان

مکتبہ الکتاب: حق سٹریٹ، اردو بازار لاہور فون: 0321-4210145

ڈیلرز

اسلامی اکیڈمی: الفضل مارکیٹ، اردو بازار لاہور فون: 042-37357587

کتاب سرائے: الحمد مارکیٹ، اردو بازار لاہور فون: 042-37320318

نعمانی کتب خانہ: حق سٹریٹ، اردو بازار لاہور فون: 042-37321865

مکتبہ اسلامیہ: غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور فون: 042-37244973

دار الکتب السلفیہ: اقرا سینٹر، غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور۔ فون: 042-37361505

مکتبہ قدوسیہ غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون: 0321-4460487

مکتبہ آل ابراھیم غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون: 0322-4005775

ملنے کے پتے

- دارالنور: 0321-5336844
- المسعود اسلامک بکس: 051-32261356
- تجلیات طیبہ: 051-35536168
- الحرم (اسلامک بکس): 0300-322-4814274
- فضلی بکس: 021-32212991
- کتاب گھر: 021-32628939
- مکتبہ رحمانیہ: 052-3458911
- مکتبہ اسلامیہ: 041-32631204
- مکتبہ اہل حدیث: 041-32629292

۹۹

فہرست مضامین

عرضِ ناشر

اللہ تعالیٰ کے نزدیک فضل و شرف کا معیار ظاہری افعال و اعمال نہیں بلکہ ایمان کے حقائق ہیں۔ اعمال کی فضیلت و برتری صاحب عمل کے دل کے اندر قائم دلیل و برہان کے تابع ہوتی ہے یہاں تک کہ دو عمل کرنے والے بظاہر ایک رتبہ میں دکھائی دیتے ہیں لیکن فضیلت و برتری اور وزن میں ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ قلب کی اصلاح وتزکیہ اور اسے آفات سے خالی (پاک وصاف) رکھنے اور فضائل وخوبیوں سے آراستہ کرنے کی ضرورت پر زور دینے والی چیزوں میں سے یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے اپنی نگاہ کا مرکز ان کے دلوں کو قرار دیا ہے۔ سیّدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نہیں دیکھتا تمہارے جسموں کو اور نہ ہی تمہاری شکلوں کو بلکہ وہ دیکھتا ہے تمہارے دلوں کو'' اور آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں سے اپنے سینہ مبارک کی طرف اشارہ کیا۔ لہٰذا ایمان وکفر، ہدایت وضلالت اور نیکی و بدی کے درمیان اصل واساس وہ چیز ہے جو بندے کے دل میں قائم وموجود ہے۔ اسی بنا پر عام علمائے اُمت اس بات کی طرف گئے ہیں کہ جس شخص کو کفریہ کلمہ کہنے پر مجبور کیا گیا ہو اس کا اس پر مواخذہ نہیں ہوگا بشرطیکہ اس کا سینہ اسلام کے لیے کھلا ہوا ہو اور دل ایمان سے لبریز اور مطمئن ہو۔ قلب کے ساتھ عنایت خاص کی ضرورت پر زور دینے والی چیزوں میں سے یہ بھی ہے کہ انسان کا دل ہی وہ تاج پوش بادشاہ ہے اور وہی وہ سردار ہے جس کی تابعداری کی جاتی ہے۔

اللہ کے نبی ﷺ یہ دُعا فرمایا کرتے تھے:

((اَللّٰهُمَّ يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْب ثَبِّتْ قُلْبِيْ عَلٰى دِيْنِك .))

''اے اللہ! اے دلوں کے اُلٹنے پلٹنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت قدم رکھ۔''

میرے بھائی! بغیر کسی سستی و اکتاہٹ اور کمزوری طبع کا مظاہرہ کیے ہوئے اپنے دل کی حفاظت اور اس کی اصلاح اور اس پر گہری نظر رکھو کیونکہ تمہارا دل تمہارے اعضائے جسم میں سب سے زیادہ خطرناک عضو ہے۔ اس کا معاملہ مشکل اور اصلاح دشوار ہے۔خوب اچھی طرح جان لو کہ اس کی اصلاح اور استقامت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اسے ان خطرات سے محفوظ نہ کیا جائے جو اسے فاسد کر دیتے ہیں۔ ان میں اہم امراض شرک،غفلت، بدعت کا ارتکاب اور سنت سے انکاری،شہوات کی پیروی اور گناہوں میں لذت محسوس کرنا اور دین میں شبہات کا شکار ہونا ہیں۔

یہ عربی کتاب ''سلسلہ اعمال القلوب'' کا اُردو ترجمہ ''دل کی اصلاح'' ہے۔اس کتاب میں اللہ تعالیٰ کے قریب کرنے والے اعمال کا بالتفصیل ذکر کیا گیا ہے۔اس کا مطالعہ دل کی اصلاح میں انتہائی معاون ہوگا۔ ان شاء اللہ

اس کتاب کی پاکستان میں اشاعت اور ترجمہ کے حقوق بفضل اللہ تعالیٰ الفرقان ٹرسٹ کو دیے گئے ہیں۔ ہم نے خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کو سامنے رکھتے ہوئے اسے عوام الناس کے لیے ترتیب دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ جملہ معاونین کو جزائے خیر عطا فرمائے۔خاص طور پر اپنی بڑی بیٹی کا مشکور ہوں کہ جس نے آخری پروف کو پڑھا اور غلطیوں کی نشان دہی کی۔ہم قارئین کے بھی مشکور ہیں جو ہماری کتابوں کو محبت اور توجہ سے پڑھتے اور ان کے منتظر رہتے ہیں۔ آخر میں الفرقان ٹرسٹ کے رفیق عبدالرؤف بھائی کا بھی شکر گزار ہوں جو ہر کتاب کو دقیق نظری سے گزار کر شائع کرتے ہیں اور ادارے کی ترقی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جزاہ اللہ احسن الجزاء

اللہ تعالیٰ سے دُعا گو ہوں کہ وہ ہم سب معاونین خیر کو آخرت میں بھی جنت الفردوس میں اسی طرح جمع فرما دے۔ آمین

ابو ساریہ عبدالجلیل

سعودی عرب

أعمال
القلوب
www.KitaboSunnat.com
اخلاص وللٰہیت
خوف
محاسبہ
شکر
غور و فکر
رضا
ورع
تقویٰ

مقدمہ

اخلاص کے معانی ومفاہیم:

اخلاص دراصل دین کا لب لباب اور نچوڑ ہے بلکہ دین کی اساس وبنیاد اور انبیاء ورسل علیہم السلام کی دعوت وتبلیغ کی جڑ اخلاص ہی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَاۗءَ﴾ (البینة: ٥)

''اور انھیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں، اس حال میں کہ اس کے لیے دین کو خالص کرنے والے۔''

اور ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ۭ﴾ (الزمر: ٣)

''خبردار! خالص دین صرف اللہ ہی کا حق ہے۔''

مراد یہ ہے کہ عبادت واطاعت خالص اللہ ہی کے لیے ہے، یہ اسی ذات باری تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔

اخلاص عبادت کی روح اور اس کا مغز ہے، بلکہ اگر کہا جائے کہ اخلاص ہی عبادت کا ماحصل لب لباب اور نچوڑ ہے تو بجا ہے، امام ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نیت عبودیت کا نقطہ ہے، اعمال کی انجام دہی کے سلسلہ میں اس کی حیثیت ٹھیک ایسے ہی ہے جیسے جسم میں روح کی ہوتی ہے اور یہ بات محال ہے کہ اللہ کی عبودیت و بندگی بغیر روح کے انجام دی جائے اگر ایسا کیا گیا تو گویا کہ اس کا وجود بے جان جسم کے مانند ہوگا مراد یہ ہے ایسی عبودیت میں جان ہی نہیں ہے یعنی بغیر کسی فائدہ کے مردہ باڈی موجود ہے جو بے فیض ہے۔

اعمال کی قبولیت اور عدم قبولیت کی اساس وبنیاد اخلاص ہی ہے، اخلاص ہی کامیابی و

ناکامی سے ہم کنار کرنے کا ذریعہ ہے، اخلاص ہی جنت ودوزخ کے درمیان امتیازی شان ہے اگر اخلاص میں نقص ہے تو وہ جہنم کی طرف لے جانے کا پیش خیمہ ہے اور اگر عمل میں اخلاص کی جلوہ نمائی بدرجہ اتم موجود ہے تو یہی جنت میں داخلہ کا پروانہ ہے۔

لغوی تعریف:......عربی زبان میں کہا جاتا ہے (خلص یخلص خلاصا) خلص کے معنی ہیں (صفا یازال) اس سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز کو ملاوٹ یا شوائب سے پاک وصاف کرنا اور کہا جاتا ہے (خَلَصَ الشَّيْءُ) مراد یہ کہ یہ خالص اور پیور چیز تیار ہوگئی ہے اور جب کہا جاتا ہے کہ خَلَصْتُ اِلَی الشَّیْءُ تو معنی ہوتے ہیں میں اس کے پاس تک رسائی پانے میں کامیاب ہوگیا۔ اسی لیے عربی زبان میں خَلَاصَةُ السَّمَنِ کہہ کر خالص گھی مراد لیا جاتا ہے۔

تو پتا یہ چلا کہ کلمہ اخلاص کے اندر (صفاء، نقاء، اورزال نیز تنزہ من الاخلاط والاوشاب) کے معنی پائے جاتے ہیں۔

مراد یہ ہے کہ کلمہ اخلاص میں صفائی ستھرائی، صاف وشفاف اور شوائب وملاوٹ سے پاک وصاف کرنے یا میل کچیل زائل کرنے جیسے معانی ومفاہم پائے جاتے ہیں۔ اسی لیے خالص اور پیور چیز کہہ کر ایسی صاف اور ستھری چیز مراد ہوتی ہے جس میں مادی یا معنوی ملاوٹوں میں سے کوئی ملاوٹ موجود نہ ہو۔

لہٰذا جب کہا جائے اَخْلَصَ الدِّیْنِ لِلّٰہِ تو اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ اس نے اپنی نیت درست کرلی ہے اور ریاکاری ترک کردی ہے یعنی دین کو خالص محض اللہ کے لیے اختیار کیا ہے اور اسے ملاوٹ وشوائب پاک وصاف کرکے اللہ کے لیے اپنایا ہے اسی لیے فیروز آبادی رحمہ اللہ اس کی توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اَخْلَصَ لِلّٰہِ اَیْ تَرَكَ الرِّیَاءَ اگر کسی شخص کے لیے کہا جائے اخلص للہ تو اس سے مراد یہ ہوگا کہ اس نے ریاکاری ترک کردی ہے اور صدق ووفا اور اخلاص واستقامت کا پیکر بن گیا ہے۔

لہٰذا کلمہ اخلاص کلمہ توحید کو کہا جاتا ہے اور مخلصین کہہ کر موحدین مراد لیے جاتے ہیں

کیوں کہ وہی چنیدہ اور برگزیدہ لوگ ہیں۔

اصطلاحی معنی: ...... جہاں تک عرف عام میں اخلاص کی تعریف کا معاملہ ہے تو اس سلسلہ میں امام ابن قیم رحمہ اللہ مختلف زاویہ سے اس کی متنوع تعریف کی ہے مگر ان کی ہوئی بعض تعریفوں میں منتخب تعریف یہ ہے (هو افراد الله سبحانه بالقصد فی الطاعة) مراد یہ ہے کہ اطاعت وفرمانبرداری عبادت وریاضت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات کو منفرد ماننا۔ مطلب یہ ہے کہ تم اللہ کی ہی کی ذات عالی شان کو خالص کرتے ہوئے مانو اور اس کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔

اس بارے میں سلف صالحین رحمہم اللہ سے مختلف اقوال وعبارات منقول ہیں ان میں چند قارئین کی خدمت میں پیش ہیں:

۱۔ عمل خالص اللہ کے لیے ہو، اس میں غیر اللہ کا کوئی حصہ نہ ہو اور نہ اللہ کے علاوہ کسی اور کا قصد کیا جائے۔

۲۔ اطاعت وبندگی میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات کو اپناتے ہوئے اس کو منفرد سمجھا جائے۔

۳۔ مخلوق کے دکھاوے یا ریا کاری سے عمل کے تصفیہ کو اخلاص کہتے ہیں۔

۴۔ ہر قسم کی ملاوٹ وشوائب سے عمل کو پاک وصاف کرنے کا نام اخلاص ہے۔ [1]

مخلص شخص کی پہچان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنی اصلاح قلب کے لیے اگر اس کو لوگوں کی طرف سے خفت اور بے وقعتی کا سامنا کرنا پڑے اور لوگوں کے نزدیک اس کی قدر وقیمت ختم ہو جائے تو وہ محض اخلاص کے مدنظر اس کی بھی پرواہ نہیں کرتا اور اسے یہ ناگوار ہوتا ہے کہ لوگ اس کے اعمال خالص میں سے کسی عمل کے بارے میں ذرہ برابر مطلع ہوں۔

اخلاص کا حکم:

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ﴾ (البینه: ۵)

---

[1] ملاحظہ ہو: القاموس المحیط/۷۹۷۔

''اور انھیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں، اس حال میں کہ اس کے لیے دین کو خالص کرنے والے۔''

ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ﴾ (الزمر : ۳)

''خبردار! خالص دین صرف اللہ ہی کا حق ہے۔''

اور ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٦٢﴾ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿١٦٣﴾ ﴾

(الانعام : ۱۶۲۔۱۶۳)

''کہہ دے بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے، جو جہانوں کا رب ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں حکم ماننے والوں میں سب سے پہلا ہوں۔''

اور اللہ تعالیٰ اپنی کتاب کریم میں ایک جگہ یوں ارشاد فرماتا ہے:

﴿ الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ﴿٢﴾ ﴾ (الملك : ۲)

''وہ جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا، تاکہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ اچھا ہے اور وہی سب پر غالب، بے حد بخشنے والا ہے۔''

تابعی جلیل جناب فضیل بن عیاض رحمہ اللہ اس آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے بتلاتے ہیں کہ "اَحْسَنُ عَمَلًا" سے مراد خالص ترین عمل ہے جس میں صواب واخلاص دونوں بدرجہ اتم موجود ہوں، تو جناب فضیل عیاض رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا کہ اخلص اور اصوب سے کیا مراد ہے؟ تو انہوں نے جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ عمل اگر خالص ہو، ملاوٹ اور شوائب سے پاک وصاف ہو، مراد یہ ہے کہ اس میں اخلاص کا پہلو نمایاں ہو، اگر سنت کے خلاف ہو تو

وہ قابل قبول نہیں ہے اور اگر (صــواب) یعنی سنت کے مطابق تو ہو مگر اخلاص کے ساتھ نہ کیا گیا ہو تب بھی مردود ہے۔ یہاں تک کہ بیک وقت خالص بھی ہو اور اسی کے ساتھ سنت کی پیروی کرتے ہوئے کیا گیا ہو تو مقبول بارگاہ الٰہی ہوگا ورنہ نہیں، اور خالص سے مراد یہ ہے کہ ''خالص اللہ تعالیٰ کے لیے کیا گیا ہو'' اسی طرح ''صــواب'' سے مراد یہ ہے کہ سنت نبوی کا اتباع اور پیروی کرتے ہوئے انجام دیا گیا ہو [1] پھر انہوں نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿١١٠﴾﴾ (الکھف: ۱۱۰)

''پس جو شخص اپنے رب کی ملاقات کی امید رکھتا ہو تو لازم ہے کہ وہ عمل کرے نیک عمل اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔''

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ﴾ (النساء: ۱۲۵)

''اور دین کے لحاظ سے اس سے بہتر کون ہے جس نے اپنا چہرہ اللہ کے لیے تابع کر دیا، جب کہ وہ نیکی کرنے والا ہو۔''

مراد یہ ہے اس نے نیت اور عمل دونوں اعتبار سے اخلاص پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اللہ کی ذات کا قصد کیا اور دوسرا مرتبہ احسان کا ہے جس سے مراد سنت نبوی کی پیروی اور متابعت ہے۔ [2]

لہٰذا جو لوگ اپنے عمل کے ذریعہ اللہ کی خوشنودی اور اس کی رضامندی کے خواہاں ہیں تو آپ ان کو عظیم الشان اجر و ثواب کی خوشخبری سنا دیں اور اے نبی کریم! اللہ تعالیٰ نے آپ کو وصیت کی ہے کہ آپ ان کی معیت اختیار کریں انھیں اکیلا نہ چھوڑیں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾ (الکھف: ۲۸)

''اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رکھ جو اپنے رب کو پہلے اور

---

[1] مدارج السالکین(۲/۹۱)۔ [2] مدارج السالکین(۲/۹۱-۹۲)۔

پچھلے پہر پکارتے ہیں، اس کا چہرہ چاہتے ہیں۔“

اور ایک جگہ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۫ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۳۸ ﴾ (الروم: ۳۸)

”پس قرابت والے کو اس کا حق دے اور مسکین کو اور مسافر کو۔ یہ ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو اللہ کا چہرہ چاہتے ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔“

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۝۱۷ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝۱۸ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۝۱۹ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝۲۰ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ۝۲۱ ﴾ (اللیل: ۱۷ تا ۲۱)

”اور عنقریب اس سے وہ بڑا پرہیز گار دور رکھا جائے گا۔ جو اپنا مال (اس لیے) دیتا ہے کہ پاک ہو جائے۔ حالانکہ اس کے ہاں کسی کا کوئی احسان نہیں ہے کہ اس کا بدلہ دیا جائے۔ مگر (وہ تو صرف) اپنے اس رب کا چہرہ طلب کرنے کے لیے (دیتا ہے) جو سب سے بلند ہے۔ اور یقیناً عنقریب وہ راضی ہو جائے گا۔“ [1]

ریا کاری اور ریا کار کی مذمت

جہاں ریا کاروں کا معاملہ ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت کی ہے اور ریا کاری کے انجام کار سے ان کو آ گاہ بھی کر دیا ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝۱۵ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ

---

[1] حلیه الاولیاء (۸/۹۵)

﴿إِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٦﴾﴾

(ھود: ۱۵، ۱۶)

''جوکوئی دنیا کی زندگی اور اس کی زینت کا ارادہ رکھتا ہو ہم انھیں ان کے اعمال کا بدلہ اسی (دنیا) میں پورا دے دیں گے اور اس (دنیا) میں ان سے کمی نہ کی جائے گی۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں اور برباد ہوگیا جو کچھ انھوں نے اس میں کیا اور بے کار ہے جو کچھ وہ کرتے رہے تھے۔''

اور ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَّن كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَن نُّرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَّدْحُورًا ﴿١٨﴾﴾ (الاسراء: ۱۸)

''جو شخص اس جلدی والی (دنیا) کا ارادہ رکھتا ہو ہم اس کو اس میں جلدی دے دیں گے جو چاہیں گے، جس کے لیے چاہیں گے، پھر ہم نے اس کے لیے جہنم بنا رکھی ہے، اس میں داخل ہوگا، مذمت کیا ہوا، دھتکارا ہوا۔''

اور ایک جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَن كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ ۖ وَمَن كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِن نَّصِيبٍ ﴿٢٠﴾﴾

(الشوریٰ: ۲۰)

''جوکوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے ہم اس کے لیے اس کی کھیتی میں اضافہ کریں گے اور جوکوئی دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اسے ہم اس میں سے کچھ دے دیں گے اور آخرت میں اس کے لیے کوئی حصہ نہیں۔''

اور ایک ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ

وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿٤٧﴾

(الانفال : ٤٧)

''اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اپنے گھروں سے اکڑتے ہوئے اور لوگوں کو دکھاوا کرتے ہوئے نکلے اور وہ اللہ کے راستے سے روکتے تھے اور اللہ اس کا جو وہ کر رہے تھے، احاطہ کرنے والا تھا۔''

مخلصین کاملین اور ان کے عمل خالص کی مدح سرائی

اللہ تعالیٰ نے مخلص بندوں کی اپنی کتاب عزیز میں مدح سرائی کی ہے جیسا کہ گزر چکا اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کی وصف بیانی کرتے ہوئے یہ بات ذکر کی ہے کہ اہل جنت دنیا میں بھوکوں محتاجوں، فقیروں مسکینوں کو لوجہ اللہ کھانا کھلایا کرتے تھے۔ باری تعالیٰ جنتیوں کی زبانی اس بات کی توثیق کرتے ہوئے انھی کی زبان میں بیان فرما رہا ہے:

﴿اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ﴿٩﴾﴾

(الدھر : ٩)

''(اور کہتے ہیں) ہم تو صرف اللہ کے چہرے کی خاطر تمھیں کھلاتے ہیں، نہ تم سے کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ۔''

اور ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿١١٤﴾﴾ (النساء : ١١٤)

''ان کی بہت سی سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں، سوائے اس شخص کے جو کسی صدقے یا نیک کام یا لوگوں کے درمیان صلح کرانے کا حکم دے اور جو بھی یہ کام اللہ کی رضا کی طلب کے لیے کرے گا تو ہم جلد ہی اسے بہت بڑا اجر دیں گے۔''

اور سورۂ شوریٰ میں اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ۝۲۰﴾

(الشوریٰ : ۲۰)

''جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے ہم اس کے لیے اس کی کھیتی میں اضافہ کریں گے اور جو کوئی دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اسے ہم اس میں سے کچھ دے دیں گے اور آخرت میں اس کے لیے کوئی حصہ نہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے غزوۂ احد میں مؤمنین کاملین کو ابتلاء وآزمائش میں ڈال کر اوران کی تطہیر وگلو خلاصی کر کے نکھارنا اور پاک وصاف کرنا چاہتا تھا اور انھیں علمی دروس سے آگاہ کرنے کا ارادہ کیا تھا، مؤمنین کاملین کو جس کی پاداش میں اپنی جانوں کے نذرانے پیش کرنا پڑے، زخمی اور گھائل ہونا پڑا، اپنا خون پسینہ بہانا پڑا۔ مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کو مہنگی قیمت ادا کرنی پڑی اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں فرمایا ہے:

﴿اَمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ﴾ (آل عمران : ۱۵۲)

''تم میں سے کچھ وہ تھے جو دنیا چاہتے تھے اور تم میں سے کچھ وہ تھے جو آخرت چاہتے تھے۔''

اور ایک ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ﴾ (الانفال : ٦٧)

''تم دنیا کا سامان چاہتے ہو اور اللہ آخرت کو چاہتا ہے۔''

اس سلسلہ میں اہم ترین حدیث وہ ہے جو نیت کے بارے میں وارد ہوئی ہے، نبی کریم ﷺ سے وارد ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کے لیے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی ہے'' [1]

---

[1] رواہ البخاری، کتاب بدء الوحی، اور امام مسلم نے (۱۹۰۷) کتاب الامارہ میں نقل کیا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے ہمیں بتلا دیا ہے کہ ہر معاملہ میں یہی حکم لگایا جائے گا چاہے وہ نماز وروزہ کا مسئلہ ہو، جہاد ولشکر کشی کا معاملہ ہو یا صدقہ وخیرات سے اس کا تعلق ہو، اس کے علاوہ اور جو بھی معاملات ہیں ان سب میں بھی نیت پر ہی دارومدار ہے، اسی لیے نبی کریم ﷺ نے دوٹوک الفاظ میں صاف صاف فرمادیا ہے کہ ''جو شخص اللہ کے راستہ میں جہاد کی غرض سے نکلے اس حال میں کہ اس کی نیت مال غنیمت میں ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کے حصول کی ہی کیوں نہ ہو (چاہے وہ رسّی کے حصول کی نیت ہی کیوں نہ رکھتا ہو) تو اس کے لیے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی ہے۔''❶

اسی لیے محشر کے دن لوگ اپنی نیتوں کے بقدر اجر وثواب لے کر اٹھیں گے کیونکہ ارشاد نبوی ہے: ''لوگوں کو ان کی نیتوں کے بقدر دے کر اٹھایا جائے گا۔''❷

۱۔ آخرت میں بندے کے نجات کے اسباب میں سے ایک سبب اخلاص بھی ہے۔

۲۔ دنیا میں دل جمعی، ثبات قلب اور ہموم وغموم کا مداوا اخلاص ہی ہے، بغیر اخلاص کے دنیا میں بھی انسان بے چین ومضطرب رہتا ہے لہٰذا اخلاص ہی دل ودماغ کو تقویت پہنچانے اور ہوش وحواس کی جمع خاطر کا ذریعہ ہے، اسی لیے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''جس شخص کا ہدف حصول آخرت ہے اللہ تعالیٰ اس دل کو غنا یا لذت آشنائی سے بھر دیتا ہے اور اس کا شیرازہ جمع کر کے یکسوئی عطاء فرمادیتا ہے اور اس کے پاس دنیا ناک رگڑتی ہوئی (یعنی ذلیل) آتی ہے اور جس شخص کا ہدف صرف دنیا ہی دنیا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے اوپر فقر وفاقہ، تنگ دستی ومحتاجی مسلط کر دیتا ہے اور اس کا شیرازہ منتشر کر دیتا ہے اور دنیا اس کو اتنی ہی ملتی ہے جتنی اس کے لیے مقدر کر دی گئی ہے۔''❸

---

❶ اخرجه أحمد (۲۲۱۸٤) اور دارمی نے (۲۴۱۷) کتاب الجهاد میں اور نسائی نے (۳۱۳۸) کتاب الجهاد میں نقل کیا ہے اور شیخ البانی رحمہ اللہ نے صحیح الجامع الصغیر میں (٦٢٠١) کے تحت نقل کیا ہے۔

❷ ابن ماجة، کتاب الزهد، باب النية: ٤٢٢٩ اور شیخ البانی رحمہ اللہ نے صحیح الجامع الصغیر میں (۳۳۷۹) اس کو صحیح کہا ہے۔

❸ ترمذی، کتاب صفة القيامة، باب احاديث ابتلينا بالضراء: ٢٤٦٥ اور ابن ماجہ نے کتاب الزهد، باب

الهم بالدنيا: ٤١٠٥ کے تحت نقل کیا ہے اور شیخ البانی نے اس حدیث کو جامع الصحیح الصغیر میں (٢٥١٠، ٢٥١٦) کے تحت صحیح قرار دیا ہے۔

۳۔ اخلاص رزق کی کشادگی کا سرچشمہ اور اس میں وسعت وفراخی کا عظیم الشان ذریعہ اور اجر وثواب کے حصول کی کنجی ہے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشادگرامی قدر ہے کہ ''تم اللہ کی رضاوخوشنودی کی نیت رکھتے ہوئے جو کچھ اپنی جیب سے خرچ کرتے ہو اس پر تمہارے لیے اجر وثواب مرتب ہوتا ہے اور تم ماجور ہوتے ہو، حتی کہ تم اپنی بیوی کے منہ میں جو لقمہ ڈالتے ہو اس پر بھی تم کو اجر ملتا ہے۔'' [1]

۴۔ اخلاص قیامت کے دن دردناک عذاب سے نجات کا ذریعہ ہے یہ اخلاص ہی کی اثر پذیری ہے کہ مخلص شخص قیامت کے دن خوفناک عذاب سے محفوظ و مامون رہے گا کیوں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''قیامت کے دن سب سے پہلے جو لوگ جہنم کا ایندھن بنیں گے وہ تین لوگ ہوں گے، بظاہر ان کے اعمال صوری طور پر لائق ستائش ہوں گے (صدقہ، جہاد، قراءت قرآن) جیسے اعمال حسنہ ہوں گے مگر حقیقت میں اللہ کے نزدیک ان کے ان اعمال حسنہ کی کوئی حیثیت نہ ہوگی کیوں کہ صدقہ وخیرات کرنے والے نے صدقہ وخیرات اس لیے کیا ہوگا تا کہ وہ سخی کہلائے اور قاری قرآن اس لیے قرآن کا علم اس لیے حاصل کیا ہوگا تا کہ وہ عالم وحافظ مولانا کہلائے اور مجاہد نے اس لیے جہاد کیا ہوگا تا کہ اسے جری اور بہادر کہہ کر بلایا جائے۔ اس بارے میں سیّدنا ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، بیان کرتے ہیں میں نے نبی کریم ﷺ کو کہتے ہوئے سنا ہے آپ ﷺ فرمارہے تھے کہ ''حساب وکتاب کی غرض سے قیامت کے دن جس شخص کے اعمال کا میزان پر فیصلہ کیا جائے گا وہ شہید ہوگا اسے لایا جائے گا اور اس کو اس پر عطاء کی گئی نعمتوں کے بارے میں پہچان کروائی جائے گی وہ انھیں پہچان جائے گا، تو اس سے سوال کیا جائے گا کہ تم نے ان نعمتوں کی

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب ما جاء: أن الاعمال بالنية: ٥٦ ـ صحیح مسلم، کتاب الوصية، باب الوصية بالثلث: ١٦٢٨.

حق شناسی کی یا نہیں، تو وہ کہے گا کہ میں نے تیری راہ میں جہاد کیا حتی کہ اپنی جان اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر قربان کردی، تو اس سے کہا جائے گا کہ تو جھوٹ بول رہا ہے تو نے تو اس لیے جہاد وقتال کیا تا کہ تجھے شجاع یا بہادر کے لقب سے یاد کیا جائے وہ کہا جا چکا، اس کے بارے میں حکم دیا جائے کہ اسے گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے چنانچہ اس کو اوندھے منہ گھسیٹ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا اور اس کے بعد اس شخص کی باری آئے گی جس نے علم قرآن حاصل کیا ہوگا اور درس وتدریس کا فریضہ انجام دیا ہوگا اس سے پوچھا جائے گا تو نے کیا عمل کیا، وہ کہے گا میں نے محض تیری رضا کی خاطر قرآن کریم حفظ کیا اور علوم قرآن میں کمال حاصل کیا، اس کو جواب ملے گا کہ تو جھوٹ بول رہا ہے، تو نے تو علم اس لیے حاصل کیا تا کہ تجھے عالم کہا جائے اور قرآن اس لیے حفظ کیا تا کہ تجھے قاری کہا جائے اس کے بعد اس کے لیے حکم ہوگا کہ اسے گھسیٹ کر جہنم میں پھینک دیا جائے اور اسے گھسیٹ کر جہنم رسید کر دیا جائے گا اس کے بعد اس شخص کی باری آئے گی، اللہ تعالیٰ نے مال ودولت کی فراوانی اس پر کی ہوگی اور اس کو ہر طرح کے مال واسباب سے نوازا ہوگا اس کو لایا جائے گا اور اس کو دی گئی نعمتوں سے آشنا کرایا جائے گا جب وہ شخص نعمتوں کی شناخت کر لے گا تو اس سے کہا جائے گا تم نے ان نعمتوں کی حق شناسی میں بطور شکرانہ کیا کام کیا؟ تو وہ مال دار شخص جواب دے گا میں نے ہر اس کار خیر میں اپنی دولت صرف کی جس میں صرف کرنا تجھے مرغوب اور پسند ہے، تیرے پسندیدہ کاموں میں سے کوئی ایسا کام نہیں ہے جس میں نے مال صرف نہ کیا ہو، تو اس سے کہا جائے گا تو جھوٹ بولتا ہے تو نے تو یہ اس لیے کیا کہ تجھ کو سخی کہا جائے وہ کہا جا چکا پھر حکم دیا جائے گا اسے منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم رسید کر دیا جائے گا چنانچہ اسے اوندھے منہ گھسیٹ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔''

اس حدیث کو سیّدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے جب بیان کیا تو اس کی ہولناکی اور دردناکی کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو کر گر پڑے اور روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں اور بے ہوشی طاری

ہوگئی، پھر تھوڑی دیر میں افاقہ ہوا اور اپنے چہرے کو پانی سے دھویا یہی کیفیت آپ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہر مرتبہ پیش آتی تھی اس کے بعد ہی یہ حدیث آپ بیان کر پاتے تھے اور فرماتے تھے نبی کریم ﷺ نے ان کو ان تینوں اشخاص کے بارے میں بتلایا اور فرمایا: اے ابو ہریرہ! اللہ کی مخلوق میں سے یہی وہ تین لوگ ہوں گے یوم محشر جنہیں سب سے پہلے جہنم کا ایندھن بنایا جائے گا۔

قاتل، زانی، چور، اچکے، بدمعاش، ڈاکو، اغلام باز، شراب نوش کو نہیں بلکہ قاری قرآن، صدقہ وخیرات کرنے والے مال دار اور اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والے مجاہد کو ریا کاری جیسے خطرناک قضیہ میں ملوث ہونے کے پیش نظر سب سے پہلے جہنم کا ایندھن بنایا جائے گا اور وہ خطرناک قضیہ قضیہ اخلاص کا معدوم ہونا ہے۔

اسی طرح طلب علم کے معاملہ میں اخلاص کا فقدان یعنی ریا کاری کا انجام بڑا بھیانک اور خوفناک ہے، نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ ''کسی شخص نے ایسا علم حاصل کیا جس سے اللہ کی خوشنودی مطمع نظر ہونا چاہیے مگر اس شخص نے اس کو دنیا کے معمولی منافع کے حصول کے پیش نظر حاصل کیا تو ایسے شخص کو قیامت کے دن جنت کی خوشبو بھی ملنا محال ہے۔''

اس کے علاوہ ایک جگہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: ''جس کسی شخص نے بھی اس لیے علم حاصل کیا کہ وہ اس کے ذریعہ کج فہموں سے مناظرہ کرے اور علمائے کرام کا بطور فخر ومباہات سامنا کرے یا لوگوں کی اپنی طرف توجہ مرکوز کرے تو ایسا شخص جہنم کا ایندھن ہے وہ جہنم میں جائے گا۔''

لہٰذا اخلاص ہی قیامت کے دن انسان کو قیامت کے دن کے موقف کی ہولناکی اور حد سے زیادہ پریشانی سے نجات کا ذریعہ ثابت ہوگا اور مخلص لوگ اخلاص کے سایہ عاطفت میں چین وسکون اور اطمینان وراحت کے ساتھ ہوں گے جس دن کہ اللہ تعالیٰ ریا کاروں کو مخاطب کر کے کہے گا، جاؤ ان لوگوں کے پاس جا کر دیکھو جن کو دکھانے کے لیے دنیا میں تم لوگ اعمال کیا کرتے تھے، ارے جاؤ، تو ذرا ان کے پاس جا کر تو دیکھو آیا وہ تمھیں تمہارے

اعمال کی جزا یا ثواب دے سکتے ہیں یا ان کے پاس تم کو بطور اجر دینے کچھ ہے بھی یا نہیں۔

(یہ حدیث سلسلة الصحيحة میں موجود ہے۔)

اسی طرح اخلاص کا کمال یہ ہے کہ وہ انسان کو اجر وثواب سے محرومیت کا شکار ہونے نہیں دیتا یا اجر میں نقص کے لیے مانع بن جاتا ہے، اسی لیے نبی کریم ﷺ نے کے پاس ایک شخص آیا اس نے پوچھا کہ آپ کا اس شخص کے بارے میں کیا خیال ہے، جو کسی غزوہ میں اجر وثواب اور نیک نامی وشہرت کی غرض سے شریک ہو؟ اس کے لیے اس کے صلہ میں کیا ہے؟ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''اس کے لیے کچھ بھی نہیں ہے اور تین مرتبہ اس جملہ کو دوہرایا، پھر فرمایا کہ ''اللہ اسی عمل کو قبول کرتا ہے جو خالص اسی کے لیے کیا گیا ہو اور اس سے اللہ ہی رضا وخوشنودی مقصود ہو۔'' [نسائی]

راوی حدیث سیّدنا مکرز رضی اللہ عنہ شام سے تعلق رکھتے ہیں، انہوں نے سیّدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول! کوئی شخص اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا چاہتا ہے اور حصول دنیا کی بھی دل میں تمنا لیے ہوئے ہے؟ تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''اس کے لیے کوئی اجر وثواب نہیں'' یہ بات لوگوں پر گراں بار ہوئی (اس لیے لوگوں نے اس شخص سے کہا) تم دوبارہ نبی کریم ﷺ کے پاس جا کر رجوع کرو شاید تم کو مغالطہ ہو گیا ہو اور بات تمہارے سمجھ میں نہ آئی ہو۔ وہ شخص دوبارہ آیا اور آ کر عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ایک شخص جہاد فی سبیل اللہ کا ارادہ رکھتا ہے مگر اس کے دل میں حصول دنیا کا بھی داعیہ پایا جاتا ہے تو نبی کریم ﷺ نے اس مرتبہ بھی یہی جواب دیا کہ ''اس کا کوئی اجر وثواب نہیں ہے۔'' تو لوگوں نے اس شخص سے کہا جاؤ ایک مرتبہ پھر جاؤ اور جا کر استفسار کرو۔ لہٰذا وہ شخص حاضر ہوا اور وہی بات دہرائی تو نبی کریم ﷺ نے پھر فرمایا: ''اس کے لیے کوئی اجر وثواب نہیں ہے۔'' (رواہ ابو داؤد وحسنه الالبانی)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے صاف صاف دوٹوک الفاظ میں ارشاد فرما دیا ہے:

''میں شرک کرنے والوں کے شرک سے پورے طور پر مستغنی ہونے کا اعلان کرتا ہوں جس شخص نے میرے ساتھ میرے علاوہ کسی اور کو شریک کیا میں نے اس سے اور اس کے شرک سے دست برداری کا اعلان کر دیا وہ جانے اور اس کا کام جانے میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔''

۵۔ اعمال قلوب میں اخلاص کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ اعمال قلوب میں اخلاص بنیادی حیثیت کا حامل ہے اور اعضا و جوارح سے سرزد ہونے والے اعمال کا تتمہ اور تکملہ گردانا جائے گا ان کی حیثیت جزوی گردانی جاتی ہے اعضائے انسانی سے انجام پذیر ہونے والے اعمال اعمال قلوب کے تابع شمار ہوا کرتے ہیں۔

اخلاص کے ثمرات

بے شک اخلاص کے بے شمار فوائد و ثمرات ہیں۔ یہ نیک انسان کے دل کا جزو خاص ہے، اور یہی اس کا ثمرہ ہے۔

۱۔ اخلاص کے اہم ترین فوائد میں سے یہ بھی ہے کہ اخلاص معمولی سے معمولی کام کو بڑھاتا چلا جاتا ہے حتی کہ وہ پہاڑ کے مانند دیوہیکل بن کر مخلصین کے لیے نمودار ہوگا اور ریا کاری عظیم الشان عمل کو بیکار اور ناکارہ بنا دیتی ہے حتی کہ عنداللہ اس کار خیر کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی، بلکہ اللہ تعالیٰ اس کو خس و خاشاک کی طرح ضائع کر دیتا ہے

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ قَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ۝۲۳﴾

(الفرقان: ۲۳)

''جو انھوں نے کوئی بھی عمل کیا ہوگا تو اسے بکھرا ہوا غبار بنا دیں گے۔''

امام ابن مبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اعمال میں کتنے ہی اعمال ایسے ہوتے ہیں جو بظاہر بڑے معمولی قدر و قیمت کے ہوتے ہیں ان کو نیت خالص عظیم الشان بنا دیتی ہے اور بہتیرے اعمال ایسے ہوتے ہیں جو بظاہر عظیم ہوتے ہیں مگر نیت ان کو حقیر بنا کر کہیں کا نہیں چھوڑتی اور ان کی کوئی وقعت وحیثیت باقی نہیں رہتی۔''

پھر اخلاص تو وہ نسخہ کیمیا ہے جو شیطان مردود سے انسان کی حفاظت کرتا ہے بلکہ وہ تو انسان کی حمایت کے لیے مضبوط قلعہ ہے اسی شیطان نے خود بخود اس موقع سے جب اس نے رب کریم کے روبرو اپنے لیے بطور عہد و پیمان کہا تھا کہ وہ اس کے بندوں کو ورغلائے گا اور انھیں جادۂ حق سے بھٹکانے کا کام کرے گا تو اس وقت شیطان اللہ تعالیٰ کے روبرو اس حقیقت کا اعتراف کیا تھا:

﴿اِلَّا عِبَادَكَ مِنۡهُمُ الۡمُخۡلَصِيۡنَ ۝﴾ (الحجر : ٤٠)

''مگر ان میں سے تیرے وہ بندے جو خالص کیے ہوئے ہیں۔''

جناب معروف کرخی رحمہ اللہ اپنے نفس کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اے میرے نفس اخلاص کا دامن تھام لے کامیابی وکامرانی،نجات وفلاح سے ہم کنار ہو جائے گا۔''

۲۔ سلف صالحین کا شعار تھا کہ وہ اخلاص سے متعلق وارد حدیث ہی سے اپنے کام کی ابتداء کرتے تھے۔

اس موضوع سے متعلق حدیث بڑی اہمیت کی حامل ہے کیوں کہ یہی حدیث سلف صالحین رحمہم اللہ کا شعار رہی ہے ہمارے اسلاف کرام رحمہم اللہ جب بھی اپنی مؤلفات کی ابتدا کرتے تھے تو وہ اسی حدیث سے کرتے تھے مثال کے طور پر امام بخاری رحمہ اللہ نے (اَصَحُّ الْكِتَابِ بَعْدَ كِتَابِ اللّٰهِ) صحیح بخاری کی شروعات اسی حدیث سے کی ہے:

((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ......))

امام عبدالرحمٰن بن مہدی رحمہ اللہ نے تو یہاں تک فرما دیا ہے:''جو شخص بھی کوئی کتاب تصنیف

کرے تو اس کی ابتداء حدیث مذکور ((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّات)) سے ہی کرے۔"

۳۔ دور حاضر میں جن ناگفتہ بہ حالات اور جس دردناک صورتحال سے امت مسلمہ گزر رہی ہے اس کی اصلاح کے لیے اخلاص بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

اخلاص اہم ترین فریضہ ہے، کیوں کہ اکثر و بیشتر لوگ داخلی طور پر طرح طرح کی کشمکش سے دوچار ہیں چاہے وہ دعاۃ اسلام کا طبقہ ہو یا طلاب علم کا، ان میں سے ہر ایک داخلی رسہ کشی میں مبتلا ہے اور انھیں ایسے چیلنجوں کا سامنا ہے جن کی وجہ سے خیر و برکت سے محرومی اور توفیق الٰہی سے دوری ان کا مقدر بن گئی ہے (الا من رحمه الله تعالیٰ) اور دین کی اساس و بنیاد مخلص دعاۃ کے کاندھوں پر قائم ہے اور علم دین کا فروغ ایسے طلاب علم سے جاری وساری ہے جو اخلاص کا پیکر ہیں اگر اخلاص معدوم ہو جائے تو باقی کیا بچا؟ عصر حاضر کے مادی دور میں ہمیں اگر کوئی نجات سے ہم کنار کرسکتی ہے تو وہ اخلاص ہے۔ آج ہم انحطاط اور انحلال جیسی ابتر صورتحال سے دوچار ہیں اس سے چھٹکارہ دلانے میں اخلاص کا کلیدی کردار ہے اور دین کی نصرت وحمایت مخلص داعیوں کے ذریعے ہی ہوسکتی ہے، اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ عروج و زوال سے متاثر بے اتاہ سمندر میں ہچکولے کھاتی ہوئی نیا کو اس وقت اخلاص ہی ساحل سے ہم کنار کرسکتا ہے، اگر آپ اپنے اردگرد نگاہ دوڑائیں تو آپ پتہ چل جائے گا کہ امت مسلمہ پر اس وقت عجب وقت آن پڑا ہے، انحطاط و زوال اور ہزیمت و رسوائی کا دوردورہ ہے۔ صبح و شام اسی کے قصے زبان زد خاص و عام ہیں عجیب افراتفری کے عالم سستی بلکتی آخری سانسیں گن رہی ہے، شرق و غرب دونوں اس کے سر پر مسلط ہیں (آخر اس کا سبب کیا ہے؟) اس کے اسباب تو بہت سے ہیں لیکن اہم ترین سبب یہ ہے کہ اس نے اپنی پہچان اور تشخص کھو دیا ہے کیوں کہ مسلمان کی زندگی کا اہم ترین عنصر اخلاص ہے، وہ مفقود ہے، چراغ لے کر ڈھونڈھ ڈالیے کوئی مخلص بندہ نظر نہیں آئے گا، گویا کہ عصر حاضر مخلص بندہ عدیم الوجود نہیں تو نادرالوجود تو ضرور ہے، شائد کہیں کوئی مخلص نظر آجائے اگر آج اخلاص کا دوردورہ ہوتا تو مسلمانوں کا یہ حال نہ ہوتا جس سے وہ دوچار ہیں اس دور میں بہت سی تنظیمیں، ادارے،

کمیٹیاں، پروجکٹس، رفاہی کام کے ادارے قائم ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ناکام اور بے فیض ہوکر رہ گئے اور کتنے دعوتی ادراے بنائے گئے اور کھوکھلے نعرے لگائے گئے، مگر ریاکاری نے انھیں دیمک کی طرح چاٹ کر کھوکھلا کرڈالا، اس کائنات میں عالمی پیمانہ کی بہت سی تحریکوں کا وجود عمل میں آیا جس کی اثر پذیری کا عالم یہ ہوا کہ ہزاروں لوگ اس کے سایہ تلے جمع ہوگئے مگر نتیجہ کیا نکلا وہ کہ بالآخر وہ اس تحریک کا نام ونشان تک باقی نہ رہا، ثریا سے زمیں پر آسماں نے اخلاص نہ ہونے کی وجہ سے دے مارااور اس کی فلک بوس عمارت اوندھے منہ گرکر زمیں دوز ہوگئی، کیوں کہ وہ دنیاوی مقاصد (ریاست وکرسی، مال ودولت، جاہ ومنصب) کے نظر ہو گئی اخلاص کو پس پشت ڈال دیا تو اللہ تعالیٰ کے عتاب کا شکار ہوگئی اور اس کا نام ونشان تک باقی نہ رہا۔

۴۔ اعمال کی صحت ودرستگی کی شروط میں سے ایک شرط اخلاص بھی ہے۔

کوئی بھی عمل اس وقت انجام پذیر نہیں ہوسکتا جب تک اخلاص اور دل جمعی کے ساتھ صحیح اصولوں کی بنیاد پر نہ کیا جائے، بڑی عجیب وغریب بات جو میری سمجھ سے بالا تر ہے کہ جو شخص نیت کی حقیقت سے ناآشنا ہو اس کی نیت کیسے درست ہوسکتی ہے؟ اور بالفرض کسی شخص نیت درست بھی کرلی ہو مگر اخلاص کی حقیقت ناآشنا رہتے ہوئے ایسا شخص مخلص کیسے ہوسکتا ہے؟ اور مخلص اپنے نفس سے صدق نیت کا مطالبہ کیسے کرسکتا جب تک اس کی صدق نیت کے معنی مراد اور کنہ تک رسائی نہ ہو جائے؟

۵۔ لوگوں اخلاص کی تعلیم دینے کے بارے علمائے کرام کے اہتمام وتوجہات کا بیان۔

علمائے کرام اخلاص کی تعلیم وتعلم کی طرف لوگوں کو راغب اور متوجہ کیا کرتے تھے نیز اس مسئلہ کو بڑی اہمیت کی نظر دیکھا کرتے تھے چنانچہ (ابن ابوجمرہ جن کا کبار علماء میں شمار ہوتا ہے فرمایا کرتے تھے) میری تمنا ہے کہ فقہائے امت میں سے چند لوگ ایسے بھی ہوں جن کا م لوگوں کو ان کے اعمال واشغال کے بارے میں نیت اور مقاصد کی درستگی کی طرف توجہ دلانا ہواور وہ لوگوں کو ان کی تصحیح نیت کے درس وتدریس کا فریضہ انجام دیں اور اس کے علاوہ

کچھ بھی نہ کریں کیوں کہ لوگ نیتوں کے فتور کی وجہ سے ہی مصائب وآلام کا شکار ہیں۔

دراصل یہ زندگی کے ہر موڑ پر اتار چڑھاؤ، ناکامی ونامرادی، محرومی وحرمان نصیبی، پست ہمتی وحوصلگی نیت کے اندر فتور اور عدم اخلاص کی وجہ سے رونما ہوا، یہی وجہ ہے کہ بندے کے سارے اعمال میں بے برکتی کا عنصر نمایاں نظر آنے لگا ہے، تو ہماری تمنا ہے کہ کاش علماء کی ایک ایسی ٹیم تیار ہوتی جو لوگوں کو عبادات اور اعمال میں اس قضیہ کو ملحوظ رکھنے کے طور و طریقوں سے آگاہ کرتی اور انھیں اخلاص نیت کے درس وتدریس کا فریضہ انجام دیتی۔

٦۔ اخلاص کے متعدد فوائد میں سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اخلاص مباحات کو عبادات میں تبدیل کردیتا ہے۔

اخلاص کے متعدد فوائد میں سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اخلاص مباحات کو عبادات میں تبدیل کردیتا ہے اور اخلاص نیت کے بقدر مراتب کا حصول ہوتا ہے، اخلاص کی جتنی آمیزش ہوگی اتنے بلند مرتبہ تک خود بخود رسائی ہوتی چلی جائے گی، مثال کے طور پر اگر کوئی شخص خوشبو یا عطر استعمال کرتا ہے اور اس سے اس کا مقصد نبی کریم ﷺ کا اتباع اور آپ ﷺ کی سنت کی پیروی ہے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا جمعہ کے دن یا مسجد جاتے وقت بیت اللہ کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے عطر وغیرہ استعمال کرنے کا معمول تھا یا اس سے اس کا مقصد بندوں یا ملائکہ کو ایذا رسانی گریز کرنے کا قصد ہو تو وہ شخص اپنی اس نیت کی وجہ سے عنداللہ ماجور قرار پائے گا (سلف صالحین رحمہم اللہ) میں سے کسی کا قول ہے کہ مجھے یہ بات مرغوب ہے کہ میں ہر کام کرنے میں اخلاص نیت سے کام لوں حتّٰی کہ کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، یہاں تک کہ قضائے حاجت کے لیے حمام جاتے وقت بھی نیت درست کرلوں۔

یہ سارے اُمور اس وقت ممکن ہیں جب ان سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی مقصود ہو کیوں کہ ہر وہ چیز جو جسم کی تقویت کا ذریعہ ہو اور اس کی بقا کی ضامن ہو اور دل کو شرعی مہمات ادا کرنے کے لیے فارغ کرنے کا وسیلہ ہے شرعاً مطلوب ومقصود ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی کھاتا پیتا ہے اور اپنی صحت وعافیت کا خیال رکھتا ہے اور اس سے اس کی نیت

عبادت میں یکسوئی اور حصول تقویٰ وخشیت ہے تو ایسا شخص اجر وثواب کا مستحق ہے جس کا شادی اور بیاہ سے اپنے نفس پر کنٹرول کرنا مقصد ہے اور دل کو مزکی و مصفی بنانا ہے وہ عنداللہ ماجور ہے اوراس شادی سے ایسی اولاد کا حصول مقصود ہو جو اس کے بعد عبادت و بندگی کے فریضہ کو قائم ودائم رکھے اس کو اس کا اجروثواب ملے گا وہ اس کام میں عنداللہ ثواب کا مستحق قرار پائے گا۔ مذکورہ مباحات اوراس قسم کے اور دوسرے مباحات میں اجرواحتساب کی نیت کرنے کو معمولی گردانتے ہوئے حقیر نہ سمجھو، ہوسکتا ہے تمہاری یہی ادا قیامت کے دن تمہاری کامیابی وکامرانی کا ذریعہ بن جائے اورتم کامیاب و بامراد ہو جاؤ۔ فقہاء کے نزدیک نیت وہ ہے جس سے عبادات کو عادات سے الگ تھلگ کر کے امتیازی شکل دی جا سکے اور عبادات میں سے بعض عبادات کو ایک دوسرے سے بحیثیت عادت جانا پہچانا جا سکے یہاں نیت سے مقصود اللہ کی رضا وخوشنودی کے حصول کا دل سے ارادہ کرنا ہے۔

ہم جب نیت کے بارے میں اخلاص کے پیرہن میں بات کرتے ہیں تو ہماری مراد اس سے (غسل جنابت اور غسل نظافت) یا نماز ظہر اور نماز عصر میں فرق بیان کرنا نہیں ہے، کیوں کہ صوری طور پر یہ ساری چیزیں ایک ہیئت کی ہیں، اب جو چیز نماز ظہر کو نماز عصر سے نمایاں کرتی ہے وہ نیت ہے اس لیے ہم یہاں اس مبحث میں عبادت کے مابین فرق بیان کرنے یا عادت کو عبادت سے ممیّز کرنے کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے بلکہ ہمارا ارادہ اخلاص کے متعلق نیت کے اہم رول اور مرکزی کردار کی نشاندہی ہے اور وہ اللہ کی رضا و خوشنودی کے حصول کی نیت وقصد ہے۔

۷۔ اخلاص قلب کو مزکی و مصفی بنانے اور اعمال کی قبولیت کے متعدد اسباب میں سے اہم ترین سبب ہے۔

جب ہم اخلاص نیت کی بات کرتے ہیں تو ہمیں یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ اخلاص قلب انسانی کو (کینہ وکدورت، بغض وعداوت، جلن وحسد جیسی بیماریوں سے پاک وصاف کرنے کا ذریعہ ہے اور قبول عمل کی کنجی ہے، کیوں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمادیا ہے کہ ”اللہ تعالیٰ اعمال

میں سے اسی عمل کو شرف قبولیت سے نوازتا ہے جو خالص ہو اور سچے دل کے ساتھ کیا گیا ہو اور اس سے اللہ کی خوشنودی ورضامندی چاہی گئی ہو۔'' ❶

۸۔ اخلاص نیت گناہوں اور معصیتوں کی بخشش اور مغفرت کے اسباب میں ایک سبب ہے۔

اخلاص نیت ہی وہ عمل ہے جو کبیرہ گناہوں کی بخشش کا سبب ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''مختلف اور انواع واقسام کے اعمال میں سے ایک عمل ایسا بھی ہے اگر انسان اسے بھرپور اخلاص اور مکمل صدق نیت کے ساتھ انجام دیتا ہے تو وہ کبائر ذنوب کے لیے کفارہ ثابت ہوتا ہے، جیسے کہ بطاقہ والی حدیث سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ ورنہ اہل کبائر میں سے ہر ایک کلمہ لا الہ الا اللہ کا ورد کرتا ہے لیکن یہ اخلاص اور صدق دل سے لا الہ الا اللہ کہنے والے کے کلمہ کی اثر پذیری ہوگی کہ یہ کلمہ توحید چونکہ اس کی زبان سے صدق دل اور اخلاص کے جذبہ سے نکلا ہے، اس لیے وہ اس کے اقرار کرنے والے کے تمام گناہوں کو جلا کر راکھ کر دے گا اور اس شخص کا پلڑا اس کلمۂ شہادت کی وجہ بھاری ہو جائے گا جیسا کہ زانیہ عورت کے ساتھ معاملہ پیش آیا، اس نے پیاسے کتے کو پانی پلا دیا اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کی ادا کے عوض بخش دیا یا اس آدمی کی طرح جس نے راستہ سے تکلیف دہ چیز ہٹا دی تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے اس شخص کو بخشش کا پروانہ عطا فرما دیا۔''

کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ راستہ پر پڑی ہوئی درخت کی ٹہنی ہٹا دینا ہی کیوں کر بخشش کا ذریعہ بن سکتا ہے؟

ہاں ہاں کیوں نہیں بن سکتا؟ اخلاص وفا کی اثر پذیری اسے اس مرتبہ تک پہنچا دیتی ہے، اسی طرح زانیہ عورت کو صرف ایک پیاسے کتے کو پانی پلا دینے کی وجہ سے بخشش کا پروانہ مل گیا

❶ نسائی، کتاب الجهاد، باب من غزا في سبيل الله: ٣١٤٠ و صححه الحاكم.

ایسا کیوں کر ہوا؟ ایسا اس لیے ہوا کہ اس کے دل میں اخلاص وصدق نیت کی جو کیفت پیدا ہوئی اسے اللہ کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا جس کی بنیاد پر اس کو بخشش کا گارنٹی مل گئی۔ یہ وہ کیفیت ہے جو شاذ ونادر ہی کسی کے دل میں کروٹ لیتی اور جاگتی ہے، چونکہ اس زانیہ کے دل میں اخلاص کی یہ کیفیت پیدا ہوئی اور کبائر کے ارتکاب کرنے والے اور اس شخص کے دل میں جس نے راستہ سے تکلیف دہ چیز ہٹائی جب یہ کیفیت اور یہ جذبہ پیدا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو معاف فرما دیا اور بخشش سے نواز دیا۔

اگر چہ ہم لوگ مباحات کی قبیل سے تعلق رکھنے والے بہت سے کام اپنی روزمرہ کی زندگی میں انجام دیتے ہیں مگر اخلاص کہاں؟ میرے بھائی اخلاص بڑی اہمیت کا حامل ہے، اگر ہم اخلاص نیت کے ساتھ روزمرہ میں پیش آنے والے کاموں کو انجام دیں تو یہ مباحات عبادات میں تبدیل ہو جائیں، کیوں کہ ہم نے یہ کام تو کرنے ہی ہیں اور روزانہ کرنے ہیں مثال کے طور پر کون ہے جو کھانا نہ کھاتا ہو اور کون ہے جو قضائے حاجت کے لیے حمام نہ جاتا ہو؟ کون ہے جو شادی بیاہ نہ کرتا ہو؟ (شاذ ونادر ہی کوئی ایسا ہو جو شادی نہ کرے) کون ہے جو کپڑے زیب تن نہ کرتا ہو؟ کون ہے جو خوشبو استعمال نہ کرتا ہو؟ یہ سارے کے سارے کام روزمرہ کے ہی تو ہیں، کون ہے جو اپنے گھر کے کھانے پکانے کے سامان نہ خرید کر لاتا ہو یہ تو ضروریات زندگی میں سے ہے اس کو انجام دینا ہی دینا ہے، کون ہے جو اسکول یا یونیورسٹی میں تعلیم حاصل نہ کرتا ہو کوئی نہیں، کیوں کہ یہ کرنا ہی پڑے گا تو جب روزمرہ کے کام انجام دینے ہی ہیں اور بہر صورت ان کو بجا لانا ہے تو کیا ہی بہتر اور موزوں ہوتا کہ تم ان کاموں کی انجام دہی کے لیے وہ طریقہ استعمال کرتے جو تمہارے لیے باعث اجر وثواب ہوتا۔ سوال کرنے والا سوال کر سکتا ہے کہ آخر وہ کون سا طریقہ ہے جو ان کاموں کو باعث اجر بنا دیتا ہے؟ تو ہمارا جواب ہے کہ یہ سارے کے سارے روزمرہ انجام دینے والے کام صدق نیت جس کو اخلاص کہتے ہیں سے کام لینے کی وجہ سے باعث اجر وثواب بن جاتے ہیں۔

۹۔ اخلاص مصائب وآلام سے نجات دلانے کے اسباب میں سے اہم ترین سبب ہے۔

اضطراب و بے چینی، حیرانی و پریشانی دور کرنے کا حقیقی علاج اخلاص نیت ہے، اس بات کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں ان تین اشخاص کا تذکرہ ہے جو غار میں پناہ گزیں تھے اور پتھر کی چٹان گرنے کی وجہ سے غار کا منہ بند ہوگیا تھا، اس اضطرابی کیفیت سے نجات کا ذریعہ اخلاص ہی بنا تھا، کیوں کہ ان تینوں میں سے ایک شخص نے اللہ کی رضا اور خوشنودی کی نیت سے خلوص دل سے اپنے والدین کی خدمت کی غرض سے انتظار کرتے ہوئے پوری رات کھڑے ہو کر گزار دی اور ان میں سے دوسرے شخص نے محض اللہ کی رضا کے لیے اخلاص نیت کے ساتھ عورت کے قابو میں آ جانے بعد بدکاری سے انکار کر دیا اور ان میں سے تیسرے شخص نے اپنے مزدور کو اس کی پوری دہاڑی ادا کر دی، مگر وہ مزدور اپنی دہاڑی چھوڑ کر چلا گیا تو مالک نے اس کی اجرت والے پیسہ کو تجارت میں لگا دیا اور اس کو بڑھاتا رہا حتی کہ سالہا سال یہ معاملہ چلتا رہا اور اس کی اجرت کا مال بڑھتے بڑھتے دولت کا انبار لگ گیا، یہ سب اس نے اخلاص نیت کے ساتھ اللہ کی رضا کے لیے کیا۔ اس شخص نے اپنے ساتھیوں میں عظیم الشان کارنامہ انجام دیا اور ان تینوں میں سے ہر ایک اللہ کے سامنے اپنے نیک عمل کے وسیلے سے دعا کرتا جاتا اور یہ کہتا جاتا کہ اے اللہ! اگر تیرے علم میں یہ بات ہے کہ میں نے یہ کام تیری رضا اور خوشنودی کے لیے کیا ہے تو، تو ہم لوگوں سے اس مصیبت کو ٹال دے جس میں ہم گرفتار ہیں۔ چنانچہ وہ تینوں کے تینوں اپنے اخلاص کی وجہ سے نجات پا گئے اور ان کے اوپر غیبی مدد آئی اور مصیبت و آزمائش کی گھڑی ان تینوں کے اوپر سے ٹل گئی مگر یہ سب کچھ خلوص نیت کی بنا پر تھا۔

اخلاص ہی سفینۂ نجات ہے، اسی سے کرب والم کے گہرے بادل خود بخود چھٹتے چلے جاتے ہیں اور یہ اسی اخلاص کی دین ہے کہ اس سے وساوس واوہام رفع ہو جاتے ہیں اور انسان پر حکمت و دانائی کا راز کھلتا چلا جاتا ہے، بشرطیکہ بندہ اللہ کے لیے خالص نیت کر کے متوجہ ہو جائے پھر ایسا شخص اس مقام تک رسائی پا جاتا ہے کہ اسے حق وصواب کی توفیق کا حق دار قرار دے دیا جاتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۞ ﴾

(الانفال : ۲۹)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم اللہ سے ڈرو گے تو وہ تمھارے لیے (حق و باطل میں) فرق کرنے کی بڑی قوت بنا دے گا اور تم سے تمھاری برائیاں دور کر دے گا اور تمھیں بخش دے گا اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے۔''

اور نبی کریم ﷺ کی دعاؤں میں سے ایک دعا یہ بھی ہے آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے:

''اے اللہ محض اپنے فضل و کرم سے حق کے بارے جن چیزوں میں التباس ہے اس کی کنہ تک مجھے رسائی عطاء فرما دے۔''[1]

۱۰۔ اخلاص بلندیٔ درجات کا سبب ہے۔

اخلاص کی بدولت عمل کا اجر مرتب ہوتا چلا جاتا ہے، چاہے وہ شخص اس عمل کو کرنے کی طاقت وقدرت نہ رکھتا ہو مگر صدق نیت اور خلوص دل کی وجہ سے اس مرتبہ تک رسائی پا جاتا ہے، بلکہ کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ اسے شہداء اور مجاہدین کا مرتبہ نصیب ہو جاتا ہے اگرچہ اس کو بستر مرگ پر ہی کیوں موت نہ آئے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۠ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ۞ ﴾ (التوبۃ : ۹۲)

''اور نہ ان لوگوں پر کہ جب بھی وہ تیرے پاس آئے ہیں، تا کہ تو انھیں سواری دے تو تو نے کہا میں وہ چیز نہیں پاتا جس پر تمھیں سوار کروں، تو وہ اس حال میں واپس ہوئے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، اس غم سے کہ وہ نہیں پاتے جو خرچ کریں۔''

---

[1] صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب صلاۃ النبی و دعائہ باللیل : ۷۷۰.

اور نبی کریم ﷺ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا:

''مدینہ منورہ میں کچھ لوگ ہمارے پیچھے رہ گئے ہیں مگر ہم نے کوئی ایسی وادی یا کوئی ایسی گھاٹی طے نہیں کی جہاں وہ ہمارے ساتھ نہ ہوں اگر چہ ان کو عذر نے ہمارے ساتھ نکلنے نہیں دیا مگر وہ ہمارے ہم رکاب ہیں۔'' ❶

۱۱۔ اخلاص حصول اجر کا سبب ہے۔

اخلاص کی وجہ سے انسان اجر وثواب کا مستحق قرار پاتا ہے چاہے اس سے لغزش اور خطا ہی سرزد کیوں نہ ہو جائے، مثال کے طور پر مجتہد یا عالم یا فقیہ کا کسی مسئلہ میں اجتہاد کرنا اگر ان میں سے کسی نے اجتہاد کیا اور اجتہاد سے ان کا ارادہ اپنی وسعت کے مطابق کوشش صرف کر کے محض اللہ تعالیٰ کے لیے حق تک رسائی حاصل کرنے کی غرض سے اجتہاد کرنا ہے چاہے وہ اپنے اس اجتہاد میں حق تک رسائی میں کامیاب نہ ہو پائیں پھر بھی وہ ماجور سمجھے جائیں گے چاہے اجتہاد میں کامیابی سے ہم کنار نہ ہو سکے ہوں۔

۱۲۔ اخلاص فتنوں اور اندیشوں سے نجات کا ذریعہ ہے۔ انسان اخلاص کا لبادہ اوڑھ کر فتنوں اور آزمائشوں سے نجات پا جاتا ہے اور اخلاص بدکاری وبدفعلی کے آڑ بن جاتا ہے اور فسق وفجور کے دلدل میں جا گرنے سے انسان کے لیے حاجز بن جاتا ہے۔ یہ اخلاص کی اثر پذیری تھی جس نے سیّدنا یوسف علیہ السلام کو عزیز مصر کی بیوی کے فتنہ میں مبتلا ہونے سے بچایا اور فسق وفجور کی گہری کھائی میں گرنے سے ان کی حفاظت وحراست کی۔ ذرا آیات قرآنیہ پر غور فرمائیے:

﴿ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ ۖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ أَن رَّأَىٰ بُرْهَانَ رَبِّهِ ۚ كَذَٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ۚ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ ﴿٢٤﴾ ﴾

(یوسف : ۲٤)

❶ صحیح بخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب من حبسه العذر عن الغزو: ۲۸۳۹۔ صحیح مسلم کی روایت میں ہے: ''مگر وہ اجر میں تمہارے ساتھ ہیں۔'' صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب ثواب من حبسه عن الغزو: ۱۹۱۱۔

”اور بلاشبہ یقیناً وہ اس کے ساتھ ارادہ کر چکی تھی اور وہ بھی اس عورت کے ساتھ ارادہ کر لیتا اگر یہ نہ ہوتا کہ اس نے اپنے رب کی دلیل دیکھ لی۔ اسی طرح ہوا، تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو ہٹا دیں۔ بے شک وہ ہمارے خالص کیے ہوئے بندوں سے تھا۔“

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ أُولَٰئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُومٌ ﴿٤١﴾ فَوَاكِهُ ۖ وَهُم مُّكْرَمُونَ ﴿٤٢﴾ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿٤٣﴾ ﴾ (الصافات: ٤١ تا ٤٣)

”یہی لوگ ہیں جن کے لیے مقرر رزق ہے۔ کئی قسم کے پھل اور وہ عزت بخشے گئے ہیں۔ نعمت کے باغوں میں۔“

اخلاص کے بقدر اجر وثواب مرتب ہوتا ہے، نیکیوں کا اجر سات سو گنا تک پہنچنے کے بعد بھی اس سے کئی گنا زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے، اخلاص میں جتنی چاشنی ہوگی اسی قدر نیکیوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مخلصین کے پائے استقامت میں ثبات فرمائے۔ آمین

جب اخلاص کے اتنے بیش بہا فوائد وثمرات ہیں تو ہمیں اہل اخلاص کے زمرے میں شامل ہو جانا چاہیے تاکہ ہم بھی ان کی طرح اجر وثواب کے مستحق بن سکیں اور ہمارا بھی مخلصین کے زمرے میں حشر ونشر ہو (آمین یارب العالمین)

اخلاص کی اہمیت سے متعلق نصوص شرعیہ کا بیان

بندوں کو اخلاص کی اہمیت وافادیت سے روشناس کرانے کے لیے مختلف زاویوں سے نصوص شرعیہ کا وارد ہوئے ہیں جن کا محور نقاش اخلاص نیت ہے جو کہ درج ذیل ہیں:

☆ عقیدہ توحید اور اخلاص دونوں لازم ملزوم ہیں۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے: ”جب بھی کوئی بندہ (بشرطیکہ وہ بندہ کبائر کے ارتکاب سے اجتناب کرنے والا ہو) خلوص دل کے ساتھ (لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) کہتا ہے اس کے لیے ساتوں آسمان کے دروازے کھول دیے

جاتے ہیں حتی کہ اس دل سے نکلے ہوئے کلمۂ توحید کی عرش الٰہی تک رسائی ہو جاتی ہے۔''❶

☆ سجدہ کی حالت میں اخلاص کے استحضار کا بیان

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: ''اگر کوئی بندہ اللہ کے لیے خلوص نیت کے ساتھ سجدہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے اس کے لیے ایک درجہ بلند فرما دیتا ہے اور ایک گناہ معاف فرما دیتا ہے۔''❷

☆ روزوں کے سیاق میں اخلاص کا بیان۔

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: ''جس شخص نے رمضان کریم کے روزے ایمان اور اجر وثواب کی نیت خالص کے ساتھ رکھے اس کے پہلے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔''❸

اور ایک دوسری روایت میں ہے:

''جس شخص نے فی سبیل اللہ ایک دن کا روزہ رکھا اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کو جہنم کی آگ کی تپش سے ستر سال کی مسافت کے برابر دور ہٹا دے گا۔''❹

☆ قیام اللیل کے سیاق وسباق میں اخلاص کا بیان نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

''جس شخص نے ایمان واحتساب کی نیت سے رمضان میں قیام کیا اس کے سرزدشدہ گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔''❺

❶ ترمذی، کتاب الدعوات، باب دعاء ام سلمة : ۳۵۹۰ وحسنه الالبانی فی صحیح الجامع الضعیر : ۵۶۴۸.

❷ أحمد: ۲۱۸۶۵۔ صحیح مسلم، کتاب الصلاة، باب فضل السجود والحث علیه: ۴۸۸۔ نسائی، کتاب التطبیق، باب فضل السجود : ۱۱۳۹۔ ابن ماجه، کتاب إقامة الصلوٰت، باب ما جاء فی کثرة السجود : ۱۴۲۳.

❸ بخاری، کتاب الایمان، باب صوم رمضان احتسابا من الإیمان: ۳۸۔ مسلم: ۷۶۰.

❹ بخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب فضل الصوم فی سبیل الله: ۲۸۴۰۔ مسلم: ۱۱۵۳۔

❺ بخاری، کتاب الایمان، باب تطوع قیام رمضان من الایمان: ۳۷۔ مسلم: ۷۵۹.

☆ اللہ کے لیے محبت کرنے اور صدقہ وخیرات کرنے نیز حرام کام کے ارتکاب سے کنارہ کشی اختیار کرنے کے سیاق وسباق میں اخلاص کا بیان۔

سیّدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''سات اشخاص ایسے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ اپنے عرش کے سایہ میں جگہ دے گا اس دن جس دن اس کے عرش کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا۔ ایک تو عادل ومنصف حکمراں، اور ایسا نوجوان جو اللہ کی عبادت میں پروان چڑھا ہو، اور وہ شخص جس کا دل مساجد سے معلق رہتا ہو اور وہ دو آدمی جنہوں نے اللہ کی رضا کے لیے آپس میں محبت کی ہو صرف اللہ کے لیے اکٹھے ہوتے ہوں اور اللہ ہی کے لیے جدا ہوتے ہوں، اور وہ شخص جس کو عہدہ اور مرتبہ والی حسین وخوبصورت نے حرام کاری کی دعوت دی ہو تو اس نے اس کی دعوت یہ کہہ کر ٹھکرا دی ہو کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور وہ شخص جس نے خفیہ طور پر صدقہ کیا ہو حتی کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہ چل پایا ہو کہ اس کے داہنے ہاتھ نے کیا خرچ کیا ہے اور ایک وہ شخص جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا ہو اور آنکھوں سے آنسو ڈبڈبا پڑے ہوں۔'' [1]

☆ مساجد کی طرف چلنے میں اخلاص نیت کا بیان۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

''آدمی کی جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کا ثواب گھر میں یا بازار میں تنہا نماز پڑھنے سے ۲۵ گنا زیادہ ہے وہ اس ایسے کہ انسان وضو کرے اور وضو بحسن وخوبی اس کا حق ادا کر کے کرے پھر مسجد میں صرف نماز ادا کرنے کی غرض سے چلا جائے تو اس سلسلہ میں وہ جو قدم بھی رکھتا ہے اس پر ہر قدم کے بدلے اس کا ایک درجہ بلند کر دیا جاتا ہے اور اس کا ایک گناہ بخش دیا جاتا ہے اور جب نماز ادا

[1] بخاری، كتاب الزكاة، باب بالصدقة باليمين: ۱٤۲۳ـ مسلم: ۱۰۳۱.

کرتا ہے اس دوران ملائکہ اس پر درود وسلام بھیجتے ہیں جب تک کہ وہ اپنی نماز کی جگہ موجود رہتا ہے فرشتے کہتے ہیں (اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَیْهِ اَللّٰھُمَّ ارْحَمْهُ) ''اے اللہ! تو اس پر رحمت بھیج اور اس پر رحم وکرم کا معاملہ فرما۔''
اور تم میں ہر وہ شخص نماز کی حالت میں شمار کیا جاتا ہے جو نماز کے انتظار میں رہتا ہو۔'' (صحیح بخاری)

☆ شہادت کی تمنا کرنے والے کے اخلاص کا بیان۔

نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص نے صدق نیت کے ساتھ اللہ کے راستے میں شہید ہونے کی تمنا کی اللہ تعالیٰ اس کو شہادت کے مرتبہ پر فائز فرما دیتا ہے اگرچہ اس کو اس کے بستر مرگ پر ہی موت کیوں نہ آئی ہو؟''

☆ جنازے کی مشایعت کرنے میں اخلاص نیت کا بیان۔

ارشاد نبوی ﷺ ہے: ''جس کسی نے کسی مسلمان شخص کے جنازہ کی مشایعت محض ایمان اور اجر وثواب کی نیت سے کی اور میت کے ساتھ رہا حتی کہ اس کی نماز جنازہ ادا کر دی جائے اور اسے دفن کر دیا جائے تو ایسا شخص اپنے اس عمل کی بنا پر دو قیراط ثواب لے کر واپس آتا ہے اور ہر قیراط احد پہاڑ کے برابر ہے اور جس شخص نے صرف نماز جنازہ ادا کی اور چلا آیا اس کے لیے ایک قیراط کا ثواب ہے۔''[1]

☆ توبہ کے بارے میں اخلاص کا بیان۔

یہ وہ شخص ہے اللہ تعالیٰ نے جس کی توبہ قبول کر لی تھی، باوجود اس کے کہ اس نے سو لوگوں کو قتل کیا تھا، مگر پھر بھی اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ملائکہ کے حق میں فیصلہ صادر فرمایا تھا کہ وہ اس شخص کی روح قبض کریں۔ سیّدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ کا قول ہے کہ عہد قدیم کا قصہ ہے کہ ایک شخص نے ۹۹ قتل کیے، اس کے دل میں جستجو پیدا ہوئی کہ اس زمانہ کے کسی دین دار شخص کی خدمت میں حاضری دے تو اسے ایک

---

[1] بخاری، کتاب الایمان، باب اتباع الجنائز من الایمان: ٤٧.

راہب کے بارے میں بتلایا گیا کہ اس کے پاس جاؤ وہ اس وقت دنیا میں سب سے بڑا عالم اور دین دار شخص ہے چنانچہ وہ شخص اس راہب کے پاس آیا اور اس کے سامنے اس نے بطور اعتراف عرض کیا کہ اس نے ۹۹ قتل کیے ہیں کیا اس کے لیے توبہ کی کوئی صورت ہے؟ تو اس راہب نے جواب دیا کہ تیرے لیے توبہ کا کوئی راستہ نہیں۔ یہ سننا تھا اس شخص نے اس راہب کو بھی قتل کرڈالا اور سو کا ہندسہ پورا کرلیا، اس نے پھر سرزمین پر اس دور میں پائے جانے والے سب سے بڑے عالم کی تلاش شروع کردی تو اس کسی نے بتلایا کہ فلاں شخص عالم ہے اس نے اس عالم کے پاس آکر عرض کیا کہ: اس نے ۱۰۰ آدمیوں کا قتل کیا ہے کیا اس کے لیے توبہ کی گنجائش ہے؟ تو اس عالم نے جواب دیا کیوں نہیں، کون ہے جو توبہ اور تمہارے درمیان حائل ہوسکتا ہے؟ مگر فلاں فلاں جگہ چلے جاؤ وہاں کچھ لوگ موجود ہیں جن کا مشغلہ اللہ کی عبادت وریاضت ہے تم بھی ان کے زمرے میں شامل ہوکر عبادت وریاضت میں مشغول ہوجاؤ اور اپنے گاؤں واپس نہ آنا کیوں کہ جہاں تمہارا گھر ہے وہ سرزمین بدترین سرزمین ہے وہاں کے لگ اچھے نہیں ہیں چنانچہ وہ شخص وہاں سے چل دیا ابھی وہ آدھی مسافت ہی طے کرپایا تھا کہ موت نے اسے آلیا اور وہ مرگیا، اب ملائکہ رحمت اور ملائکہ عذاب میں بحث وتکرار ہونے لگی رحمت کے فرشتے کہنے لگے: یہ شخص توبہ کرکے آرہا تھا اور اپنے قلب وقالب کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ تھا لہٰذا یہ تائب سمجھا جائے گا اور ملائکہ عذاب نے کہا کہ: اس شخص نے زندگی بھر کوئی نیکی کا کام کیا ہی نہیں اس کو تائب کیسے سمجھا جائے، چنانچہ ان دونوں کے درمیان فیصلہ کے لیے ایک فرشتہ آدمی کی شکل میں نمودار ہوا، ان لوگوں نے اس کو اپنا ثالث بنا لیا اس فرشتہ نے کہا کہ ذرا دونوں طرف کی زمین کی پیمائش کرو اور دیکھو کہ یہ شخص کس سرزمین کے قریب ہے یہ جس سرزمین کے قریب ہوگا اسی کے حق میں فیصلہ ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے زمین کی پیمائش کی تو یہ شخص اس سرزمین کے قریب نکلا جس کی طرف صدق نیت کے ساتھ توبہ کی غرض سے جارہا تھا۔ بایں طور رحمت کے فرشتہ نے اس کی روح قبض کی اور اسے بخشش کا پروانہ مل گیا۔'' [متفق علیه]

☆ کبھی انسان دل ہی دل میں خیال کرتا ہے اور اپنے دل کو سمجھاتا ہے کہ کاش کہ ایسا ہوتا تو میں بھی ایسا کرتا تو خلوص نیت کی وجہ سے اس کے اجر میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔
مثال کے طور پر کوئی شخص ایسا ہے کہ اس کے پاس مال و دولت نہیں ہے مگر وہ کہتا ہے کہ کاش کہ میرے پاس فلاں شخص کی طرح پاس مال و دولت ہوتی تو میں بھی اسی طرح خرچ کرتا جس طرح وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے تو گویا کہ وہ دل ہی دل میں ہم کلام ہو کر اسے اپنی نیت کے بارے میں باخبر کر رہا ہے جس کی وجہ سے اس کے اجر وثواب میں اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''دنیا تو چار قسم کے لوگوں کے لیے ہے، ایک وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ مال و دولت اور علم سے نوازا ہو تو وہ اس مال کو تقویٰ و پرہیز گاری، صلہ رحمی وغیرہ پر خرچ کرتا ہو اور اس میں اللہ کے حق کا بھی خیال رکھتا ہو ایسا شخص افضل ترین مرتبہ کا حامل ہے اور دوسرا شخص وہ ہے اللہ تعالیٰ نے جس کو علم تو دیا ہو مگر مالی اعتبار سے وہ مجبور ہو لیکن اس کی نیت خالص ہو وہ یہ کہتا ہو کہ اگر میرے پاس مال و دولت ہوتی تو میں فلاں کی طرح اسے خیر کے کام میں صرف کرتا تو اس کو اس کی نیت کے بقدر اجر وثواب ملے گا اور یہ اور اول الذکر شخص دونوں کے دونوں اجر وثواب میں برابر ہیں اور ایک شخص ایسا ہے اللہ تعالیٰ نے جس کو مال و دولت سے سرشار کیا ہے مگر علم سے کورا ہے وہ اپنے مال میں بغیر علم کے اٹکل لگاتا پھرتا ہے اور نہ ہی اس کو تقویٰ وخشیت کی کوئی پرواہ ہے اور نہ ہی صلہ رحمی کرتا ہے اور نہ ہی اس مال میں اس کے کو اللہ کا حق ادا کرنے کا خیال ہے تو یہ خبیث ترین مرتبہ ہے جس پر یہ شخص فائز ہے اور ایک شخص ہے اللہ تعالیٰ نے نہ تو اسے مال ہی دیا ہے اور نہ ہی اس کے پاس علم وعرفان کی دولت ہے، وہ کہتا ہے کہ اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں ایسے ہی خرچ کرتا جیسے کہ مؤخر الذکر شخص خرچ کرتا ہے اور وہی برائیاں کرتا اور رنگ رلیاں مچاتا جو وہ مچاتا رہتا ہے تو یہ دونوں مؤخر الذکر اشخاص گناہ میں برابر کے شریک ہیں۔''[1]

---

[1] اخرجه أحمد والترمذی وابن ماجه وصححه الالبانی فی صحیح الجامع الصغیر: ۳۰۲٤.

صدق ووفا کے پیکر مخلص لوگ
اپنی سیرت وواقعات کے آئینہ میں

امت مسلمہ کی تاریخ الحمدللہ ایسے لوگوں کے واقعات سے لبریز ہے جو صدق ووفا سے لبریز خالص اخلاص میں ڈوبی ہوئی سیرت سے مزین ہے ایسے اللہ والے لوگ بکثرت گزرے ہیں جن کی سیرتیں بعد میں والے لوگوں کے لیے نمونہ اور آئیڈیل کی حیثیت رکھتی ہیں ان کی زندگیاں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں یہی وجہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی سیرتوں کو زباں زد خاص وعام بنادیا ہے اوران کے نام کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ وتابندہ کردیا تا کہ ان کے بعد آنے والے لوگ ان کے اخلاص اور صدق ووفا کے قصے سن کران کی اقتدا اور پیروی کریں ان میں سرفہرست انبیاء علیہم السلام کی ذات بابرکات ہیں اوران میں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہماری لیے خاص طور سے آئیڈیل اور نمونہ ہے اس کے بعد انبیاء علیہم السلام کے حواریوں کا نمبرآتا ہے ان میں بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو سرفہرست گردانا جاتا ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی جماعت ان نفوس قدسیہ پر مشتمل ہے جنھوں نے اپنے اخلاص اور صدق ووفا کے زور سے پوری دنیا فتح کی اوران کے اخلاق ان کے عادات واطوار کو دیکھ کر لوگوں نے دین اسلام کو گلے لگایا اس کے تابعین رحمہم اللہ اور تبع تابعین رحمہم اللہ نے اسی نہج دعوت کواپنایا اور دیکھتے دیکھتے چہار دانگ عالم اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔

عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ اوران کا اخلاص:

تاریخ بغداد میں عبدہ بن سلیمان رحمہ اللہ سے یہ قصہ منقول ہے،وہ کہتے ہیں کہ'' میں عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کے ساتھ ایک سریہ میں رومیوں سے برسرپیکار ہونے کی غرض سے نکلا اور میں ان کے ساتھ رومیوں کے درمیان روم میں موجود تھا اتنی دشمنوں نے یلغار کردی، چنانچہ جب فریقین نے صفیں درست کرلیں اوردونوں فریق برسرپیکار ہونے لگے تو دشمنوں کی صف سے ایک شخص دعوت مبارزت دینے کی غرض سے آگے بڑھا جس کے مقابلہ کے لیے

مسلمانوں کی صف سے ایک شخص آگے بڑھا اور دشمن پر شیر کی طرح جھپٹ پڑا اور وار کر کے اس کا کام تمام کر دیا۔ اس کا بدلہ لینے کی غرض سے دشمنوں کی طرف سے ایک اور شخص نکل کر سامنے آیا اور دعوت مبارزت دینے لگا، چنانچہ وہ مسلم پھر نمودار ہوا اور پہلے ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا اس کے بعد پھر تیسرا شخص آیا اس پر بھی وہ مسلم مرد جانباز جھپٹا اور اس کو بھی قتل کر دیا، اب کیا تھا لوگ اس مسلمان جانباز کو دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے تاکہ یہ تو پتہ چلے کہ آخر یہ کون مرد مجاہد ہے، تو دیکھتے کیا ہیں وہ شخص منہ پر ڈھاٹا باندھے ہوئے ہے۔

اس قصہ کے راوی کا بیان ہے کہ میں بھی ان لوگوں میں شامل تھا جو اس شخص کی شناخت کرنے کی غرض سے دیوانہ وار جمع ہو رہے تھے چنانچہ میں نے اس جواں مرد کی آستین کا کنارہ پکڑ لیا جس کی وجہ سے مجھے پتہ چل گیا کہ یہ عبداللہ بن مبارک ہیں چنانچہ انہوں نے نقاب پوشی کی حالت میں فرمایا کہ تم نے مجھے بے نقاب کرنے کے لیے جو میرا چہرہ کھولا ہے اس کی وجہ سے تم نے (اے ابو عمر) مجھے شرمندہ کر دیا [ملاحظہ ہو تاریخ بغداد]

حسن بصری رحمہ اللہ کا دکھاوے اور نمود و نمائش سے اجتناب:

حسن بصری رحمہ اللہ کا قول ہے: کیا ہی موزوں ہوتا کہ انسان حافظ قرآن ہو اور لوگوں کو پتہ نہ چل سکے کہ اس نے قرآن کریم حفظ کیا ہے۔ کیا مناسب بات ہوتی کہ انسان کو علوم شرعیہ میں تفقہ حاصل ہو اور لوگوں کو یہ محسوس نہ ہو سکے کہ یہ مفتی ہے! کیا ہی اچھا ہوتا کہ انسان گھر کے اندر طویل سے طویل ترین قیام کرے اور ملنے والوں کی آمد و رفت لگی ہوئی ہو مگر لوگ محسوس نہ کر سکیں کہ یہ شخص طویل قیام کرنے والوں میں سے ہے، میں نے اس دنیائے رنگ و بو میں بہت سے لوگ ایسے بھی دیکھے ہیں جو اگر کوئی کام پردہ خفا میں رہ کر کرنے پر قادر ہوتے تو اسے وہ پردۂ خفا ہی میں انجام دیتے علانیہ طور پر اسے انجام دینے سے بھرپور گریز کرتے۔

ہمارے اسلاف دعا و مناجات کیا کرتے تھے مگر ان کی آواز گھر کی چار دیواری باہر سنائی نہیں دیتی تھی سوائے ان کے اور رب کریم کے درمیان سرگوشی کے اور ان کا کوئی مشغلہ نہ تھا وہ

اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمادیا ہے:

''تم اپنے پروردگار سے دعا ومناجات کیا کرو گڑگڑا کر، آہ وزاری کے ساتھ بھی اور چپکے چپکے خفیہ طور پر بھی۔'' [الاعراف: ٥٥]

علی بن بکار رحمہ اللہ کا چاپلوسی وتملق یا مجاملہ بازی سے ان کا خوف واحتیاط:

علی بن بکار بصری رحمہ اللہ (بصرہ کے مشہور زاہد وعابد) کا کہنا ہے:

''میرے نزدیک شیطان سے ملنا اس بات سے کہیں زیادہ موزوں ہے کہ میں فلاں فلاں سے ملوں اوران کے سامنے تملق وچاپلوسی کا مظاہرہ کروں جس کی وجہ سے میں اللہ کی نظروں میں بے وقعت بن جاؤں۔''❶

واقعی سلف صالحین مجاملہ یا چمچہ گیری سے احتیاط برتتے تھے مراد یہ ہے بظاہر آدمی اپنے دوستوں اورمصاحبین سے بڑے بلند اخلاق اورحسن معاملہ کے ساتھ پیش آتا ہوا ملے گا مگر گھر کے اندر کا معاملہ اس کے برعکس ہوگا جب وہ اپنی بیوی اوربچوں میں جا کر بیٹھتا ہوتو معاملہ اس کے برعکس ہو، ان کے ساتھ برے سلوک اور برتاؤ کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا ہو کہ یہ انسان ہی نہیں بلکہ حیوان مفترس ہے، اس لیے اسلاف کرام چاپلوسی سے دور بھاگا کرتے تھے کیوں کہ ہوسکتا ایک شخص اپنے دوستوں اور یاروں کے سامنے مجاملہ بڑا اچھا نظر آئے اور جب دوستوں سے ملے تو خندہ پیشانی اورخوش کلامی وشیریں زبانی سے پیش آئے اور حسن تصرف کا مظاہرہ کرتے ہوئے دکھائی دے لیکن اندر سے کچھ اور ہو ایسا دکھاوے اور نام ونمود کے لیے کرتا ہو۔

ابوالحسن قطان رحمہ اللہ کا علوم ومعرفت کے مظاہر سے احتیاط اور اجتناب:

ابن فارس رحمہ اللہ نے جناب ابوالحسن قطان رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہوئے کہا ہے: ''جناب ابوالحسن قطان رحمہ اللہ فرماتے ہیں ایک مرتبہ میری بینائی کم ہوتی ہوئی محسوس ہوئی معلوم ہوا کہ میری بینائی متاثر ہورہی ہے تو میرے ذہن ودماغ میں یہ سوال گردش کرنے لگا ہو نہ ہو سفر

❶ اخرجه ابونعيم في حلية الاولياء: ٨/ ٢٦٠.

کے درمیان حد سے زیادہ باتونی پنے کا اثر ہے، امام ذھبی رحمہ اللہ اس مقولہ پر تعلیق چڑھاتے ہوئے فرماتے ہیں (اللہ کی قسم ابوالحسن قطان رحمہ اللہ نے سچ کہا ہے کیوں کہ وہ لوگ صدق وفا کے پکے ہونے اور خلوص نیت میں سچے ہونے کی وجہ سے زیادہ منطق وکلام یا علوم ومعرفت کا برملا اظہار کرنے سے ڈرتے تھے۔"❶

اسی بنیاد پر ابوالحسن قطان رحمہ اللہ نے فرمایا: "میری بینائی کے متاثر ہونے کا راز یہی ہے کہ میں نے علوم ومعرفت کی گتھیاں سلجھانے کی خاطر علم وحکمت کا مظاہرہ کیا میرے خیال میں یہ اسی کی سزا ہے جس کی وجہ سے میری بینائی متاثر ہوئی ہے۔"

ہشام دستوائی رحمہ اللہ کی حدیث اور علوم حدیث کی تشنگی بجھانے کا بیان:

ہشام دستوائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اللہ کی قسم میں یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ میں کسی دن علم حدیث کی طلب اور جستجو میں نکلا ہوں اور میری نیت اللہ کی رضامندی اور خوشنودی نہ ہو۔"❷

یہ ان لوگوں کے خوف اور تقویٰ کی بات ہے جن کو امام وقدوہ سمجھا گیا اور لوگوں نے انھیں قابل اقتداء نمونہ گردانا اس کے باوجود یہ لوگ اپنے نفس کشی کے بارے میں کتنے حساس تھے اور ان کو اس بارے کتنا اہتمام تھا۔ سیّدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"جس شخص کی نیت خالص ہو اللہ تعالیٰ اس نے اور مخلوق کے درمیان آڑ بن کر اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔"❸

سرنگ والے شخص کا عجیب وغریب قصہ:

مخلصین صادقین کے عجیب وغریب واقعات میں سے سرنگ والے شخص کا وہ واقعہ ہے جو اخلاص وللّٰہیت کے بارے میں اپنی مثال آپ ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ مسلمانوں نے ایک جنگ کے دوران قلعہ کا محاصرہ کر لیا مگر قلعہ بند دشمنوں نے مسلمانوں پر تیروں اور نیزوں کی

❶ سیر اعلام النبلاء ۱۵/۴٦٤.
❷ سیر اعلام النبلاء: ۷/۱۵۲.
❸ أخرجه هناد بن السري في الزهد.

بوچھاڑ کر دی۔ اسی دوران مسلم فوج میں سے ایک اللہ کا مخلص سپاہی اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے سرنگ کھود کر مسلمانوں کو حملہ آور ہونے کے لیے راستہ فراہم کر دیا اور مسلم فوج کو کامیابی نصیب ہوئی کیوں کہ اس طرح مسلمان قلعہ میں گھس کر قلعے کا دروازہ کھول کر دشمنوں سے برسرپیکار ہونے میں کامیاب ہوگئے مگر یہ راز فاش نہ ہوسکا کہ سرنگ کھودنے والا کون خوش نصیب انسان ہے اس لیے سیّدنا مسلمہ رضی اللہ عنہ کو اس بات کی جستجو لاحق ہوئی کہ اس نادر کارنامہ کے موجد کو انعام و اکرام سے نوازا جائے، جب تلاش بسیار کے بعد انھیں پتہ نہ چل سکا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی کہ اے پروردگار! اس شخص کو تو خود اپنی مشیت سے میرے پاس بھیج دے۔ چنانچہ رات کے اندھیرے میں ایک شخص نے سیّدنا مسلمہ رضی اللہ عنہ کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا اور ایک شرط لگادی کہ اگر اس شخص نے ان کو اپنا نام و پتہ بتلا دیا تو وہ اس دن کے بعد تلاش کرنے کی کوشش نہ کریں۔ چنانچہ سیّدنا مسلمہ رضی اللہ عنہ نے جب ان کی شرط مان لی تو انہوں نے سیّدنا مسلمہ رضی اللہ عنہ کو اپنا نام و پتہ بتلایا اور بتلا دیا کہ وہ وہی ہے جس نے سرنگ کھودی تھی اس لیے سیّدنا مسلمہ رضی اللہ عنہ جب دعا مانگتے تھے تو کہا کرتے تھے کہ اے اللہ! اس سرنگ کھودنے والے کے ساتھ میرا حشر ونشر فرما۔'' کیوں کہ انہوں نے اس صاحب نفق کے عمل میں عجیب وغریب اخلاص کا مشاہدہ کیا تھا اسی لیے سلف صالحین کے نزدیک خلوت میں عمل کرنا جلوت میں عمل کرنے سے کئی گنا زیادہ پسندیدہ اور مرغوب تھا۔

خشیت الٰہی میں رونے کے آثار چھپانے کی غرض سے بہانے بازی کرنا:

جناب حماد بن زید فرماتے ہیں: ''جناب ایوب جب حدیث بیان کرنے کے لیے بیٹھتے تھے تو مجلس میں اثنا درس ان پر رقت طاری ہوجاتی تھی جس کی وجہ سے آنسو ڈبڈبا آتے تھے تو وہ آنسو چھپانے کی غرض سے کھنکھارنے لگتے تھے اور کہنا شروع کر دیتے تھے کہ کتنا شدید زکام ہوگیا ہے۔'' [1]

زکام کا بہانہ بنا کر خشیت الٰہی میں رونے کی کیفیت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے تھے!

[1] سیر اعلام النبلاء: ٦/ ٢٠.

امام حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''درس وتدریس یا ذکر واذکار کی مجلس میں اگر کسی شخص پر رقت طاری ہوجاتی اور آنسوڈبڈبا آتے تو وہ اس کیفیت کو چھپانے کے لیے آنسوؤں کی خشک کرڈالتا یا اگراس کوخطرہ لاحق ہوجاتا کہ اب آنسوؤں کا سیل رواں رکنے والانہیں ہے تو کھڑا ہوکر مجلس سے نکل جاتا۔'' ❶

امام محمد بن واسع تابعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اسلاف میں سے بعض لوگ ایسے بھی گزرے ہیں کہ خلوت میں ۲۰ سال تک رورو کر کاٹ ڈالے، دن اور رات ساتھ میں رہنے والی شریک حیات کو پتہ تک نہ چل پایا کہ ان کا شوہر آہ وزاری کا عادی ہے۔'' ❷

دن رات ساتھ رہنے والی بیوی کو اس بات کا سراغ تک نہ لگ پایا کہ اس کا شوہر رات کو رب کریم کے حضور دعا ومناجات کیا کرتا ہے۔

امام ماوردی رحمہ اللہ اوران کی تصنیف وتالیف کا بیان:

اخلاص وللّٰھیت کے سلسلہ میں امام ماوردی رحمہ اللہ کا عجیب وغریب قصہ ہے خصوصاً تصنیف وتالیف کے بارے میں ان کا یہ واقعہ ضرب المثل ہے امام ماوردری رحمہ اللہ نے فن تفسیر وفقہ میں بہت سی مؤلفات بطوریادگار چھوڑی ہیں لیکن ان کی زندگی میں ایک ان کی ایک تصنیف بھی منظرعام پرنہیں آئی، لکھتے گئے اور چھپاچھپا کر ایسی محفوظ جگہ پر رکھتے گئے جہاں تک کسی کی رسائی نہ ہولہٰذاان کے علاوہ کسی کوبھی اس کا علم نہ تھا کہ امام ماوردی رحمہ اللہ نے اپنے مخطوطات کہاں چھپا کر رکھے ہیں جب ان کی وفات کا وقت قریب آگیا تو انہوں نے ایک ایسے شخص کوجس پران کو اعتماد اور بھروسا تھا اپنے پاس بلایا اور یہ راز فاش کرتے ہوئے فرمایا کہ فلاں فلاں جگہ جو کتابیں رکھی ہوئی ہیں وہ ساری کی ساری میری تصانیف ہیں، اب موت کا میں نے مشاہدہ کرلیا ہے اورنزع کے عالم میں ہوں، لہٰذا اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں رکھنا اگر میں نے تمہارا ہاتھ پکڑلیا تو سمجھ لینا کہ میری کتابوں کو شرف قبولیت حاصل نہیں ہوسکا اس لیے اس صورت میں میری کتابوں کو اٹھانا اور رات میں دریائے دجلہ میں جاکر پھینک

❶ اخرجه احمد فی الزهد: ۲٦۲.
❷ اخرجه ابو نعیم فی حلیه الاولیاء: ۲/ ۳٤۷.

دینا اور اگر میں ہاتھ کی مٹھی کھولے رہا اور تمہارے ہاتھ کو نہیں پکڑا تو سمجھ لینا کہ میری کتابوں کو شرف قبولیت سے نواز دیا گیا ہے اور میں نے جو نیت کی تھی اس میں میں کامیاب و بامراد ہو گیا ہوں اس شخص کا کہنا ہے کہ جب امام ماوردی رحمہ اللہ کی موت کی روح قبض ہونے کا وقت قریب آ گیا تو میں نے اپنے ہاتھ امام صاحب رحمہ اللہ کے ہاتھ میں رکھ دیا انہوں نے میرے ہاتھ پر شکنجہ نہیں کسا اور نہ ہی مٹھی باندھ کر اس کو پکڑا ان کی موت کے بعد میں ان کی کتابوں کو منظر عام پر لایا۔ ❶

یہ تھے امام ماوردی رحمہ اللہ کہ دنیا سے اس حال میں رخصت ہوئے نہ مدح سرائی پسند فرمائی اور نہ ہی تعریف کے قصیدے سننا پسند کئے اور نہ بڑائی و ثنا خوانی کے خواہاں ہوئے اور نہ ہی افراط و تفریط کا شکار بنے اور نہ ہی حقوق محفوظ ہونے کی شرط لگائی دنیا سے لاتعلق رہے اور اس حال میں رخصت ہوئے کہ دنیا کو پتہ تک نہ چلا کہ آپ اتنی بیش بہا کتابوں اور نادر تصانیف کے مؤلف و مصنف ہیں۔

علی بن حسین رضی اللہ عنہ کا رات کے اندھیرے میں صدقہ و خیرات:

سیّدنا علی بن حسین رضی اللہ عنہ رات کے اندھیرے میں اپنی پیٹھ پر روٹی اور آٹا لاد کر فقراء و مساکین کی تلاش نکل پڑتے تھے اور فرماتے تھے: ''رات کے اندھیرے میں صدقہ و خیرات رب کریم کے غصہ کی تمازت کو ٹھنڈا کرنے کا ذریعہ ہے۔'' ❷

اہل مدینہ میں سے بہت سے لوگوں کا گزر بسر اسی پر تھا لیکن ان کو یہ تک پتہ نہ تھا کہ ان کا رسد کہاں سے آ رہا ہے؟ چنانچہ جب سیّدنا علی بن حسین رضی اللہ عنہ کی وفات ہو گئی اہل مدینہ کو رات میں جو کھانے پینے کا سامان ملا کرتا تھا وہ ملنا بند ہو گیا اور سیّدنا علی بن حسین رضی اللہ عنہ کی پیٹھ پر اس بوری لادنے کے نشان پائے گئے جو رات کو بیواؤں اور بے کسوں کے گھر ضروری راشن کا سامان لے جایا کرتے تھے اس طرح وہ (۱۰۰) گھروں کا نان نفقہ برداشت کیا کرتے تھے۔ ❸

---

❶ سیر اعلام النبلاء: ۱۸/۶۶۔ ❷ حلیه الاولیاء: ۳/۱۳۵۔۱۳۶۔

❸ حلیه الاولیاء: ۳/۱۳۶۔ سیر اعلام النبلاء: ۴/۳۹۳، ۳۹۴۔

ان تمام قصوں اور حالات کو اللہ تعالیٰ نے اس لیے زباں زد خاص وعام کردیا تا کہ اس طرح کے اصحاب قصص کا نام رہتی دنیا تک روشن رہے اور ان کو ائمہ کے مناصب پر فائز سمجھا جائے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ۝ ﴾ (الفرقان : ٧٤)

''اور ہمیں متقیوں کا امام وپیشوا بنادے۔''

اور ایک جگہ ارشادر بانی ہے:

﴿ وَ جَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا ﴾ (الانبياء : ٧٣)

''اور ہم نے انھیں ایسے پیشوا بنایا جو ہمارے حکم کے ساتھ رہنمائی کرتے تھے۔''

خفیہ عبادت وریاضت کا بیان حتیٰ کہ اہل وعیال تک کو اس کا پتہ نہ چل سکا:

اسلاف میں سے کسی کا قصہ مشہور ہے کہ وہ بیوی کے پاس جاتے اور بیوی کو سُلا کر آہستہ سے کمرے سے باہر نکل آتے۔ٹھیک اس طرح جس طرح بچے کو ماں باپ چکمہ دے کر کمرے سے باہر آجاتے ہیں اور قیام اللیل میں مشغول ہوجاتے،اور بیوی کو احساس تک نہ ہوسکا کہ محترم قیام اللیل میں رات گزارتے ہیں اسی طریقہ سے (ابوہند رحمہ اللہ) نے مسلسل چالیس سال صوم داؤد رکھا حتیٰ کہ ان کے اہل وعیال تک کو اس کا پتہ نہ چل سکا وہ کرتے تھے کہ اپنے کھانے کا سامان گھر سے لے کر چلے جاتے تھے اور راستہ میں مسکینوں غریبوں پر صدقہ کر دیتے تھے اور شام کو واپس آکر گھر والوں کے ساتھ شام کا کھانا کھالیا کرتے تھے۔ [1]

اعرابی (بدو) اور مال غنیمت:

ایک اعرابی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایمان لے آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع وپیروی کرنا شروع کردی پھر اس نے خواہش ظاہر کی کہ میں آپ کے ساتھ ہجرت کروں گا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے حوالے کردیا چنانچہ جب غزوۂ خیبر کا واقعہ پیش آیا اور اس غزوہ میں کچھ قیدی اور مال غنیمت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ

[1] حلية الاولياء: ٩٤/٣.

آیا۔ جب آپ نے جب اسے تقسیم کیا تو اس میں اس اعرابی کا بھی حصہ مقرر کیا اور اس کا حصہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے سپرد کر دیا، وہ بدو بکریاں چرانے گیا ہوا تھا جب وہ جانور چرا کر واپس آیا تو صحابہ کرام نے اس کا حصہ اس کے حوالہ کر دیا تو اس بدو نے کہا: یہ کیا ہے؟ صحابہ نے جواب دیا: یہ تمہارا حصہ ہے نبی کریم ﷺ نے مال غنیمت میں حصہ لگا کر تم کو دیا ہے۔ اس نے اسے قبول کیا اور لے کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ کے روبرو آ کر کہنے لگا: یہ کیا ہے؟ تو نبی کریم ﷺ نے جواب دیا: یہ تمہارا حصہ ہے میں نے تمہیں مال غنیمت میں حصہ دیا ہے۔ وہ بدو کہنے لگا: میں نے اس مال وزر کے لیے آپ ﷺ کا اتباع نہیں کیا ہے بلکہ میں نے تو آپ ﷺ کا اتباع اس لیے کیا ہے کہ مجھے یہاں تیر لگے (اس نے اپنے حلقوم کی طرف اشارہ کیا) اور اس تیر سے میری موت واقع ہو جائے اور مجھے جنت میں داخلے کا پروانہ مل جائے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اگر تم نے صدق دل سے یہ بات کہی ہے تو اللہ تعالیٰ تمہاری نیت پوری کر کے رہے گا۔'' ان باتوں کے بعد ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ لوگ جنگ کے لیے کھڑے ہو کر میدان میں اتر آئے۔ میدان جنگ سے اس بدو کو اٹھا کر نبی کریم ﷺ کی خدمت لایا گیا اس حال میں کہ اس کو ٹھیک اسی جگہ تیر لگا تھا جہاں لگنے کے لیے اس بدو نے اشارہ کیا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے بطور تاکید فرمایا کہ کیا یہ وہی بدو ہے؟ صحابہ کرام نے جواب دیا: ''ہاں یہ وہی بدو ہے۔'' تو نبی کریم ﷺ نے جواباً ارشاد فرمایا: ''اس نے اللہ سے سچا وعدہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس کے ساتھ اپنے وعدے کو پورا کر دکھایا۔ پھر نبی کریم ﷺ نے اس کی تجہیز و تکفین کی اور اس کی نماز ادا کرنے کے لیے اسے پیش کیا اور اس کی نماز جنازہ ادا کی اور اس کی نماز جنازہ میں یہ دعا پڑھی:

((اَللّٰهُمَّ هٰذَا عَبْدُكَ ، خَرَجَ مُهَاجِرًا فِيْ سَبِيْلِكَ ، فَقُتِلَ شَهِيْدًا ، اَنَا شَهِيْدٌ عَلٰى ذٰلِكَ .)) [1]

---

[1] نسائی، کتاب الجنائز، باب الصلاة علی الشهداء: ۱۹۵۳ وصححه الالبانی فی الجامع الصغیر: ۱٤۱۵.

''اے اللہ یہ تیرا بندہ ہے تیرے راستہ میں ہجرت کر کے آیا تھا اور میدان کارزار اس نے جام شہادت نوش کیا ہے اور میں اس کے لیے گواہ ہوں۔''

خلوص نیت کے بارے میں علمائے کرام کے اقوال اوران کی آراء:

جناب ابراہیم ادہم رحمہ اللہ کا قول ہے: ''وہ شخص کبھی بھی مخلص اور صدق ووفا میں پکا نہیں ہوسکتا جو شہرت اور نام ونمود کا خواہاں ہو، وہ اللہ کا مخلص کیوں کر بن سکتا ہے۔''❶

بعض اہل علم کا قول ہے کہ: عالم دین کے لیے ضروری ہے وہ جب بھی وعظ ونصیحت کرے تو نیت درست کر لے اور صحیح ارادہ کر کے حسن نیت کے ساتھ کلام کرے اگر بذات خود اپنے کلام میں خود پسندی وخودنمائی کی بو آنے لگے تو چپ ہوجائے اور وہیں پر اپنی تقریر بند کر دے اور اگر اس کو چپ رہنے میں عجب محسوس ہو رہا ہو تو بولنا شروع کر دے اور اگر مدح سرائی کا خدشہ ہو تو بھی کلام نہ کرے اور اپنے نفس کے محاسبہ میں کاہلی وسستی کا شکار نہ ہو کیوں کہ نفس ہمیشہ خودنمائی اور مدح سرائی کا خواہاں رہتا ہے۔

جناب سہل بن عبداللہ تستری رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ نفس پر کون سی چیز گراں بار ہوتی ہے؟ تو آپ رحمہ اللہ نے جواب دیا: ''نفس پر اخلاص سب سے زیادہ گراں بار ثابت ہوتا ہے، کیوں کہ اخلاص ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے نفس کی حق تلفی ہوتی ہے اور دل میں اخلاص کا داعیہ پیدا ہوتے ہی نفس کے حقوق کا صفایا ہوجاتا ہے۔''❷

جناب سفیان رحمہ اللہ کا قول ہے: ''میں جن چیزوں کے علاج ومعالجہ یا جن چیزوں کی چارہ جوئی میں بڑی پریشانی سے دوچار ہونا پڑا ان میں سخت ترین چیز میری نیت ہے کیوں کہ اگر میں اس کا علاج ومعالجہ کرتا ہوں تو وہ مجھ پر الٹا وار کر دیتی ہے۔''❸

انسان جب اپنے نفس سے مجاہدہ کرنا چاہتا ہے تو اسے نفس کی ہیرا پھیری کا سامنا کرنا پڑتا ہے اسی کیفیت میں وہ ایسا مصروف ہوجاتا ہے کہ اسے پتہ بھی نہیں چل پاتا کہ وہ کس

❶ حلیة الاولیاء: ٨/٣١۔ ❷ صفه الصفوة: ٤/٦٥۔

❸ اخرجه خطیب بغدادی فی الجامع لاخلاق الراوی وآداب السامع: ١/٣١٧۔

کیفیت سے دوچار ہے! آیا اخلاص کی حالت میں ہے یاریاء کاری کے شکنجہ میں جاکر پھنس گیا ہے اور یہ طبعی کیفیت کہلاتی ہے۔ انسانی طبیعت کی شعور میں یہ بات موجود ہے کہ وہ ہمیشہ محسوس کرتا ہے کہ دائمی طور پر شیطان اور نفس امارہ بالسوء کے حملوں کے لیے معرض ہدف ہوا کرتا ہے اس کا نفس اس کے سامنے کبھی سپرانداز نہیں ہوتا اسی لیے اس میں اوراس کے نفس میں ہمیشہ ٹھنی رہتی ہے اور معرکہ آرائی میں بھی خیر کا پہلو پنہاں ہے اوراگر کسی شخص کا نفس ایک حالت پر قرار پکڑ لے تو یہ کیفیت بھی مشکلات کا باعث ہے۔

یحییٰ بن کثیر فرماتے ہیں: ''نیت درست کرنا سیکھو کیوں کہ نیت عمل کے لیے ہراول دستہ کی حیثیت رکھتی ہے۔'' ❶

جناب زبید یامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''مجھے یہ بات پسند ہے کہ دنیا کا کوئی بھی عمل ہو اس کی انجام دہی کے وقت نیت خالص کا جذبہ میرے دل میں موجزن ہو، چاہے وہ کھانے پینے جیسا خود اپنا ذاتی عمل ہی کیوں نہ ہو؟'' ❷

جناب داؤد طائی رحمہ اللہ کا قول ہے: ''میں نے اس بات کا تجربہ کیا ہے اور یہ بات میری نزدیک مشاہد ومعروف ہے کہ حسن نیت ہر قسم کی خیر وبھلائی کا خزانہ ہے، تمہارے لیے نیت کا درست ہونا ہی خیر عظیم ہے اگر چہ تم کو کوئی محنت ومشقت تک محسوس نہ ہو، کیوں کہ تم نے اس کی وجہ سے باری تعالیٰ کی شان میں جودلجمعی محسوس کی اور دل سے ریاکاری کو نکالا دینے اور دھکے دے کر نکال بھگانے کے سلسلہ میں دل ودماغ میں یکسوئی محسوس کی یہی آپ کے لیے خلوص نیت کا سب سے بڑا عظیم الشان کارنامہ ہے۔'' ❸

سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ لوگوں میں افضلیت کے مرتبہ پر اس لیے فائز نہیں کہ وہ لوگوں میں نماز وروزہ کے اعتبار سے زیادہ عابد وزاہد تھے بلکہ انھیں تو مخلوق خدا پر اس لیے سبقت حاصل ہوئی کہ ان کے دل ودماغ میں جو خلوص وللّٰہیت کا جذبہ موجزن تھا اس کی مثال ملنا مشکل ہے

---

❶ حلیہ الاولیاء: ۳/ ۷۰.

❷ جامع العلوم والحکم: ۷۰.

❸ جامع العلوم والحکم: ۷۰.

اس لیے وہ دنیا کے تمام لوگوں میں بلند مرتبہ پر فائز ہوئے۔ ❶

امام داؤد طائی رحمہ اللہ کا مشہور قول ہے کہ ''نیکی یا کار خیر متقی و پرہیز گار شخص، عالی حوصلگی و اولوالعزمی کی اساس و بنیاد ہے اگر اس کے تمام اعضاء و جوارح حب دنیا سے مسحور و مخمور ہو جائیں لیکن ایک نہ ایک دن اس کی نیت وارادہ اسے اپنی اصل کی طرف لوٹا کر دم لیتے ہیں۔'' ❷

جناب یوسف اسباط رحمہ اللہ کا مقولہ ہے: ''نیت کو فساد و بگاڑ کی چنگل سے نکال کر سیدھی راہ لا کر گامزن کر دینا عامل باعمل لوگوں کے لیے کسی مسئلہ میں اجتہاد سے کہیں زیادہ دشوار کن معاملہ ہوا کرتا ہے۔'' ❸

جناب نافع بن جبیر رحمہ اللہ سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپ نماز جنازہ میں شرکت نہیں فرمائیں گے؟ انھوں نے کہا: تم ذرا انتظار کرو یہاں تک کہ میں نیت کرلوں۔ (مراد یہ تھی کہ تم یہیں پر انتظار کرو حتی کہ میں اپنے نفس سے رسہ کشی کرلوں)۔ ❹

جناب فضیل بن عیاض رحمہ اللہ کا فرمان ہے کہ ''اللہ تعالیٰ تمھاری نیتوں اور ارادوں کے علاوہ کچھ بھی مطلوب نہیں ہے۔'' ❺

جس شخص نے اپنے اندرون کی اصلاح کر کے تزکیہ نفس کا کام انجام دے لیا تو اللہ تعالیٰ خود اس کے ظاہر کے اصلاح کر کے اس کو مزکی و مصفی بنا دیتا ہے اور جو شخص اپنے اور اللہ کے درمیان تعلق استوار کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے مخلوق کائنات کے درمیان بذات خود رشتہ استوار کر کے اس کو سرخروئی عطاء فرماتا ہے اور کوئی شخص اپنی اندرونی عادت و خصلت کو خواہ کتنا ہی چھپا لے مگر اللہ تعالیٰ اس کو اس کے چہرے کے خدوخال یا زبان کی تیزی و طراری یا اس کی لغزش سے ظاہر فرما دیتا ہے عادت و خصلت کبھی چھپ نہیں سکتی (جبل گردد جبلت نہ گردد) مثال مشہور ہے پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل سکتا ہے مگر عادت کہاں بدل پائے گی؟

---

❶ کشف الخفاء: ۲/ ۲۴۸.
❷ جامع العلوم والحکم: ۷۰.
❸ جامع العلوم والحکم: ۷۰.
❹ جامع العلوم والحکم: ۷۰.
❺ جامع العلوم والحکم: ۷۱.

مخلص شخص اپنی نیکیوں کی نمود و نمائش نہیں کرتا بلکہ اللہ والے لوگ اپنی نیکیوں کو پردہ خفا میں چھپا کر رکھتے ہیں اور اسی طرح وہ گناہوں کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتے بلکہ اس کی بھی پردہ پوشی کرتے ہیں اور جو شخص ریا کاری کرتے ہوئے اخلاص کی نمائش کرے تو اس کے اخلاص کو اخلاص کی بھٹی میں ڈال کر نکھارنے کی ضرورت ہے۔

اخلاص کے بارے میں اسلاف کی زبان حق سے وارد اقوال:

☆ انسان کے قلب وقالب میں خالق کائنات کی عظمت کا دائمی تصور ایسا موجزن ہو جو مخلوق کائنات کے لیے ریا کاری کو بھلا دے۔

☆ نیت اور ارادہ کے ساتھ حق تعالیٰ سبحانہ کو منفرد قرار دینا۔

☆ ظاہر اور باطن دونوں طرح کے عملوں میں برابری بھی اخلاص کی دین ہے۔

☆ جو شخص لوگوں کے لیے بناوٹی عمل کرے یا تصنع سے کام لے (مراد یہ ہے کہ ظاہر کچھ ہو اور باطن کچھ اور) تو ایسا شخص اللہ تعالیٰ کی نظروں سے گر جاتا ہے اور اللہ کے نزدیک اس کی کوئی وقعت نہیں رہتی۔

☆ اخلاص ایسا عمل جس کو بالفاظ دیگر بندے اور اللہ کے درمیان پوشیدہ راز کہا جا سکتا ہے، نہ تو اس کا کراماً کاتبین ہی کو پتہ ہوتا ہے کہ وہ اسے اس کے کھاتے میں ثبت کر سکیں اور نہ ہی شیطان اس کا سراغ لگا پاتا ہے کہ وہ اس کی نزاہت اور قداست کو گدلا کر سکے اور اللہ تعالیٰ اپنی مشیت سے جو چاہتے ہیں اور جتنا چاہتے ہیں فرشتوں کو بندے کے احوال وکوائف سے مطلع فرما دیتے ہیں۔

☆ اخلاص کا تقاضا یہ ہے کہ تم اپنے عمل پر اللہ کے علاوہ کسی اور کو گواہ بنانے کی خواہش نہ کرو اگر مذکورہ نیت کے ساتھ انسان اخلاص کا فریضہ انجام دیتا رہا تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو حکمت ودانائی کی دولت سے مالا مال کر دیتا ہے۔

☆ جناب مکحول رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ''اگر کوئی شخص چالیس دن تک اخلاص پر مستقل طور پر عمل پیرا ہو جائے تو اس کی برکت کی اثر پذیری سے اس شخص کی قلب ونظر اور کام و

ذہن سے حکمت ودانائی کا سوتہ ابلنے لگتا ہے۔''[1]

☆ ابوسلیمان دارانی رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ ''جب بندہ اخلاص کے ساتھ عمل کرنے کی عادت ڈال لیتا ہے تو اس کے ذہن ودماغ سے شیطانی وساوس اور ریا کاری جیسی چیزیں خود بخود دُور ہو جاتی ہیں۔''[2]

☆ اور بعض سلف صالحین کا کہنا ہے کہ ہمارے اسلاف کی مرغوب عادتوں میں سے یہ بھی تھا کہ ان میں سے ہر ایک اپنے لیے نیک اعمال میں سے چند اعمال صیغہ راز میں رکھ لیا کرتے تھے غیر تو غیر ہیں حتیٰ کہ اس عمل کا ان کی بیوی تک کو پتہ نہیں چل پاتا تھا۔

☆ دنیا میں سب سے اعلیٰ اور معزز ترین چیز اخلاص ہے، چنانچہ یوسف بن حسین رحمہ اللہ کا قول ہے: ''ریا کاری کو اپنی نظروں سے گرانے کے لیے میں نے بڑی کوششیں کر ڈالیں مگر کیا کریں کہ میں جوں جوں اس کو ذلیل وخوار کرنے کی تگ ودو کرتا ہوں وہ دوسرا رنگ وروپ اختیار کر لیتی ہے۔''[3]

☆ جناب مطرف بن عبداللہ رحمہ اللہ کی مشہور دعاؤں میں سے یہ دعا بھی ہے: ''اے اللہ! میں تجھ سے اس توبہ کی نسبت سے مغفرت کا خواہاں ہوں جو میں نے تیرے روبرو کی اور دوبارہ پھر اسی گناہ کا ارتکاب کر بیٹھا جس سے توبہ کی تھی، اور اس عہد و پیمان کی بابت استغفار کرنا چاہتا ہوں جس میں میں نے تجھ کو اپنا ثالث بنایا تھا، مگر میں سے اس عہد و پیمان کو پورا نہ کیا، اور اس عمل سے بخشش کا خواستگار ہوں جس کو میں نے تیری رضامندی کے حصول کا ارادہ کرتے ہوئے انجام دیا تھا پھر میرے دل میں ریا کاری کا چور گھل مل گیا جس سے تو بخوبی واقف ہے۔''[4]

اخلاص کے بارے میں بعض تنبیہات اور اہم مسائل:

☆ **سوال:**......وہ کون سا موقع ہے جب عمل کا اظہار کرنا مشروع ہوتا ہے؟

---

[1] مدارج السالکین: ۹۲/۲۔ [2] مدارج السالکین: ۹۲/۲۔

[3] مدارج السالکین: ۹۲/۲۔ [4] اخرجه ابو نعیم فی حلیه الاولیاء: ۲۰۷/۲۔

امام قدامہ حنبلی رحمہ اللہ اس مسئلہ کے لیے خاص فصل باندھتے ہوئے رقم طراز ہیں: یہ فصل اس مسئلہ کے بارے میں ہے جس میں شرعاً اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ لوگوں کو عبادت و بندگی کی ترغیب دینے کی غرض سے عمل کو کھلم کھلا دکھلا کر کرنے کی اجازت ہے۔ امام صاحب آگے چل کر مزید تحریر فرماتے ہیں: اس صورت میں عمل کے اظہار میں فائدہ ہے وہ یہ کہ عوام اس کی اقتداء اور پیروی کرے گی اور اس سے لوگوں کو خیر کی جانب ترغیب بھی مقصود ہے اور بعض اعمال ایسے بھی ہیں جن کو کسی صورت میں چھپا کر نہیں کیا جاسکتا، جیسے کہ حج وعمرہ، اور اللہ کے راستے میں اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے برسرِ پیکار ہونا لیکن عمل کے سلسلہ میں قابل اظہار بات یہ ہے کہ انسان کو چاہیے اس حالت میں وہ اپنے قلب کا جائزہ لے تاکہ اس کے اندر ریاکاری کا مخفی چور اپنی کارستانی نہ دکھا سکے بلکہ اس کی نیت یہ ہونی چاہیے کہ وہ تو اس لیے اس عمل کا اظہار کر رہا ہے تاکہ لوگ بھی اس عمل پر گامزن ہو جائیں۔

اس لیے ضروری ہے کہ ہم اعمال ظاہرہ میں اپنی نیتوں کو درست کرلیں اور خلوص وللٰہیت کا پیکر بن کر حسن نیت کے ساتھ اعمال کا مظاہرہ کریں تاکہ ریاکاری کا جو داعیہ موجزن ہے اس کا قلع قمع ہو جائے اور اس عمل کے اظہار سے جس کا اظہار کرنا ضروری ہے ہماری نیت یہ ہو کہ ہم تو اسے اس لیے کر رہے ہیں کہ یہ عمل رواج پذیر ہو جائے اور لوگوں کے لیے ترغیب کا باعث ہو اور ہمارے لیے باعث اجر وثواب بن کر ذخیرہ آخرت بنے اور مزید فرمایا کہ ضعیف النفس یا ضعیف العقیدہ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے نفس کو اس چکر میں پڑ کر مخمصہ میں نہ ڈالے کیوں کہ اس معاملہ میں ضعیف النفس شخص کی مثال اس انسان کی طرح ہے جو سوئمنگ یا تیراکی کا تھوڑا بہت فن جانتا ہو مگر اس کو اس میں مہارت تامہ حاصل نہ ہو، چنانچہ اسے کہیں لوگوں کی ایک جماعت پانی میں ڈوبتی ہوئی نظر آجائے اب وہ ازراہ شفقت ان کو بچانے کی غرض سے ان کے پاس پہنچ جائے تو وہ ڈوبنے والے لوگ اس کی گردن سے لٹک جائیں گے اس طرح وہ خود تو ہلاک ہوں گے ہی، اس کے ساتھ وہ بچانے والا بھی خوامخواہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا (ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے)۔ [1]

---

[1] مختصر منهاج القاصدين، ص: ۲۲۳.

مذکورہ بالا مسئلہ سے یہ باتیں سامنے آتی ہیں:

☆ سنت مطہرہ کی رو سے جن اعمال کی ادائیگی مخفی طور پر مطلوب ہے انھیں خفیہ ادا کیا جائے گا۔

☆ سنت مطہرہ سے جن اعمال کو علی الاعلان کرنے کی ترغیب دی گئی ہے انھیں اعلانیہ کیا جائے گا۔

☆ جن اعمال کو سراً و جہراً دونوں صورتوں میں سے کسی بھی صورت پر کرنے کی چھوٹ دی گئی ہے تو ایسے عمل کی انجام دہی کے بارے میں مکلّف اپنے نفس کا محاسبہ کرے اگر اس کے نفس کے اندر اتنی وقت برداشت ہے کہ وہ لوگوں کی مدح سرائی یا مذمت کے سامنے سپر انداز نہیں ہوگا تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے عمل کو جہراً علی الاعلان انجام دے اور اگر اس کے اندر اس کی سکت اور قوت نہیں ہے تو ایسے شخص کے لیے اس عمل کی انجام دہی خفیہ کرنے کا حکم ہے اور جب قلب وقالب میں پختگی آ جائے تو وہ ان کے لیے اعلانیہ عمل کرنے کی گنجائش ہے کیوں کہ خیر کی طرف ترغیب دینے والے عمل کو خیر کے زمرے میں شمار کیا جائے گا اور اسے خیر ہی کے قائم مقام گردانا جائے گا۔

بعض اسلاف کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے منقول ہے کہ وہ اپنے بعض معزز و مکرم قسم کے اعمال کو عوام الناس کو دکھا کر کیا کرتے تھے تا کہ عامۃ الناس ان کی اقتداء میں ان اعمال کو برضا و رغبت کرنا شروع کر دیں جیسا کہ بعض سلف صالحین سے جاں کنی کے عالم میں اپنے اہل وعیال کے روبرو ان کا یہ مقولہ منقول ہے: انہوں نے حالت احتضار میں ان کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ میری حالت زار پر روتے کیوں ہو؟ جس وقت سے میں نے دائرہ اسلام میں قدم رکھا ہے اس وقت سے اب تک میری زبان سے کوئی بری بات نہیں نکلی ہے۔

جناب ابوبکر بن عیاش رحمہ اللہ نے اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ میرے پیارے بیٹے: خبردار خبردار جو میرے اس کمرے میں معصیت و نافرمانی کی تم نے حرکت کی کیوں کہ میں نے اس میں بیٹھ کر کئی مرتبہ قرآن کریم ختم کیا ہے۔ [1]

---

[1] مختصر منهاج القاصدين، ص: ٢٢٤.

انہوں نے اپنے بیٹے کو وعظ ونصیحت کرتے ہوئے اس راز کا افشا کیا تھا اس لیے انسان کو اس بات کی چھوٹ دی گئی ہے کہ وہ بطور ترغیب بعض اعمال کا اخلاص کا دامن مضبوطی سے تھامتے ہوئے اچھے مقاصد کے پیش نظر عوام الناس کے سامنے اظہار کرے جیسا کہ بعض سلف صالحین کا معمول تھا اور ان تنبیہات میں جن کی طرف میں اشارہ کرنا چاہتا ہوں دوسری تنبیہ یہ ہے۔

☆ کیا ریاکاری کے خوف سے عمل کی انجام دہی بند کر دی جائے؟

یہ انتہائی خطرناک قسم کا ہتھکنڈہ ہے چنانچہ آپ بعض لوگوں کو دیکھیں گے کہ اعمال خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں مگر یک دم انھیں ریاکاری کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے اور اس بہانے وہ طاعت وبندگی کے کاموں میں حصہ لینا بند کر دیتے ہیں کہ کہیں اس عارضہ کا شکار ہو کر نہ رہ جائیں، اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ یہ ایک طرح کی لغزش ہے اور جادۂ حق سے کنارہ کشی وانحراف ہے جس کا فضیل بن عیاض رحمہ اللہ کے اس قول سے بھی انکشاف ہوتا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ ''لوگوں کی وجہ سے عمل کو ترک کر دینا ریاءکاری ہے اور لوگوں کی خاطر عمل کی انجام دہی شرک ہے اور اخلاص یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو ان دونوں صورتوں سے عافیت نصیب فرمائے۔'' [1]

امام نووی رحمہ اللہ اس بارے میں یوں فرماتے ہیں: جو شخص کسی عبادت یا اطاعت کی انجام دہی کا عزم لوگوں کو دکھانے کی غرض سے کرے ایسا شخص ریاکار ہے، کیوں کہ عمل کی انجام دہی اس لیے ترک کی ہے کہ لوگ اس پر واہ واکریں لیکن اگر اس شخص نے عمل کرنا اس لیے ترک کیا ہے کہ وہ اسے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر خفیہ کرے تو اس کا یہ عمل اخلاص کے منافی نہیں، اسی طرح اگر کوئی شخص ایسا ہے کہ عوام الناس کی خاطر اس کے عمل کا اظہار سودمند ہے تو وہ اپنے عمل کا لوگوں کے لیے اظہار کرے، مثلاً کوئی شخص علم وتقویٰ کی وجہ سے عوام الناس کے نزدیک مقتدی کی حیثیت رکھتا ہو یا وہ جو عمل کر رہا ہے شرعی طور پر اصلاً اس

---

[1] سیر اعلام النبلاء: ۸/۴۲۷.

کا اظہار مطلوب ہو تو اس کو اعلانیہ (یعنی لوگوں کے سامنے بھی) کرنا چاہیے۔

تمام نیک وصالح اعمال کا لوگوں سے چھپا کر کرنے کا دعویٰ:

جو شخص تمام اعمال صالحہ کو دنیا کے تمام لوگوں سے مخفی رکھنے کی دعوت دیتا ہے ایسا شخص خبیث النفس ہے وہ اپنے اس بے بنیاد پراپیگنڈے سے دین اسلام کا جنازہ نکال کر اسے زندہ درگور کردینے کے درپے ہے، ایسی تو منافقین کی عادت تھی کہ وہ جب دیکھتے تھے کہ کوئی شخص دل کھول کر صدقہ خیرات کررہا ہے تو کہتے تھے یہ ریاکار ومکار ہے اور جب دیکھتے تھے کہ کوئی شخص اپنی بساط کے مطابق معمولی صدقہ خیرات کررہا ہے تو کہتے تھے اللہ تعالیٰ اس سے بے نیاز ہے، ان کا منشا اور ہدف یہ تھا کہ مسلمانوں کی دل شکنی کی جائے اور معاشرے وسوسائٹی میں خیر سگالی، ونیکوکاری کے اعمال کا یکسر دروازہ بند ہوجائے۔ یہ لوگ اہل خیر واستقامت کا سختی سے نوٹس لیتے تھے جب انھیں کسی شرعی یا دینی عمل کا اظہار کرتے ہوئے دیکھتے تھے خاص طور پر جب وہ کسی خیر کے کام کا فروغ ہوتے ہوئے دیکھتے تھے تو وہ اس کے کرنے والے پر ایذا رسانی کے درپے ہوجاتے تھے مگر وہ شخص تو اس کا اظہار اجروثواب کی نیت سے محتسبا عنداللہ کرتا تھا مگر یہ خبیث منافقین اس اہل خیر واستقامت کو ہدف بنا کر اس کی دل شکنی کے درپے ہوجاتے تھے ایسی صورت میں داعی کو اس نوعیت کے کام کے اظہار میں صبر واستقامت کا مظاہرہ کرنا چاہیے کیوں کہ وہ اس نے اس کی انجام کی ذمہ داری محض اللہ کی خوشنودی کی خاطر اپنے ذمہ لی ہے اور اسے چاہیے کہ خیر وبھلائی کو معاشرے اور سوسائٹی میں رواج دینے کے لیے اس طرح کی کاموں کو علی الاعلان عوام الناس کو دکھانے کی خاطر انجام دے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''جو ان مسلمانوں پر طعنہ زنی کرتے ہیں جو دل کھول کر صدقہ وخیرات کرنے کے (عادی) ہیں اور ان لوگوں پر (طعنہ زنی) کرتے ہیں جنہیں اپنی محنت مزدوری کے اور کچھ میسر ہی نہیں پس یہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں تو اللہ بھی ان سے تمسخر کرتا ہے۔'' [التوبة : ٩٧]

عمل میں ریاکاری اور شرک کا حکم لگانے میں فرق:

ہمیں چاہیے کہ ہم ریاکاری اور شرک مطلق کے عمل میں حکم لگانے میں فرق ملحوظ رکھیں۔

سوال:...... عمل کب باطل قرار پاتا ہے؟ اگر عمل میں حصول دنیا کی رغبت کا معمولی سی آمیزش ہو جائے تو شرعی طور پر ایسے عمل کا کیا حکم ہے؟ ایسی صورت میں کب اور کس طرح اس قسم کے شخص کو گناہ گار تصور کیا جائے گا؟ اور وہ کون سی ایسی صورت ہوگی جس میں عامل کو بے گناہ گردانا جائے گا؟

جواب:...... اللہ تعالیٰ آپ کا بھلا کرے اس صورت میں مسئلہ کو چند اقسام اور مختلف درجات ومراحل میں تقسیم کر دیا جائے گا جس کی چند صورتوں کا مفصل تذکرہ مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ عمل کرنے والا خالص اللہ کے لیے عمل (طاعت وبندگی کے کام کرے) اللہ کی خوشنودی کے علاوہ اس کو کسی حال میں کسی کی کوئی قطعاً پرواہ نہ ہو اور نہ ہی کسی کی طرف اس کی نیت کا رجحان جائے تو یہ اخلاص کا اعلیٰ ترین مرتبہ ہے۔

۲۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ عمل تو اللہ کے لیے کرے مگر اس کی نیت کا رجحان اس طرف ہو جس طرف متوجہ ہونے کا اس کے لیے جواز ہے اس جواز کی وجہ سے وہ اپنے فکر وارادے اور نیت وقصد میں اس طرف مائل ہو جائے اور اس کی توجہ اس طرف مرکوز ہو جائے، مثال کے طور پر کوئی شخص محض اللہ کی خاطر روزہ رکھے مگر اس کی نیت یہ بھی ہو کہ اس سے میں اپنی حفظان صحت وتندرستی کا کام بھی لوں گا تو اس قسم کے عمل کی انجام دہی کا کیا حکم ہے؟ اور ایک شخص ایسا ہے جس نے حج وعمرہ کے ساتھ ساتھ تجارت کی بھی نیت کر لی تو اس کا کیا حکم ہے؟ اور ایک شخص نے اللہ کے راستے میں جنگ کرنے کی نیت کی اس کے ساتھ حصولِ غنائم کا بھی داعیہ پایا جاتا ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟ اور ایک شخص ہے جو نماز کے لیے مسجد چل کر جاتا ہے مگر اس سے ورزش بھی مقصود ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟ اور ایک شخص اپنی عدالت وثقاہت کی اثبات کی غرض سے نماز باجماعت ادا کرنے کی غرض سے مسجد میں پانچ وقت حاضری دیتا ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟ کیا اس قسم کے دنیاوی مقاصد عمل کو باطل کر دیں گے؟ تو اس جواب یہ ہے اس قسم کے رجحانات اور مقاصد وارادوں سے اعمال باطل تو نہیں ہوتے لیکن ان کے اجر وثواب میں نقص وکمی

ضرور پیدا ہو جاتی ہے اور عزیمت کا تقاضا یہی ہے کہ اس قسم کے رجحانات وافکار سے عمل کی انجام دہی منزہ ومبرا ہو، اس قسم کے وساوس کا اعمال میں قطعی وجود نہ ہو اور نہ ہی عمل کی انجام دہی میں ان کا کوئی حصہ اور شراکت ہو اور نہ ہی یہ اور اس قسم کے افکار و رجحانات اعمال کی انجام دہی کے وقت دخل اندازی کریں۔

۳۔ تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ عمل کی انجام دہی کے دوران کسی ایسے رجحان کی طرف توجہ مرکوز ہو جائے جس کی طرف التفات کا جواز پیدا نہیں ہوتا مراد یہ ہے کہ عمل صالح کی انجام دہی کے دوران نیت میں خلل واقع ہو جائے ایسا خلل جس کی طرف ملتفت ہونے کا شرعاً جواز نہیں ہے، مثلاً ریاء کاری، خودنمائی، لوگوں کی مدح سرائی کرنا تاکہ شہرت ومقبولیت حاصل ہو جائے تو اس قسم کے رجحانات سے عمل باطل ہو جائے گا یا نہیں؟ اس کا مفصل جواب ملاحظہ ہو:

ا:......اگر اس طرح کی ریاکاری عمل کی انجام دہی میں اساسی حیثیت اختیار کر لے تو اس کی وجہ سے ایسے شخص کا عمل خود بخود باطل ہو جاتا ہے، مثال کے طور پر کوئی شخص نماز لوگوں کو دکھانے کے لیے ادا کرتا ہو تو اس کی نماز باطل و بے سود ہے۔

ب:......دوسرے صورت یہ ہے کہ عمل کی انجام دہی کے دوران ریاکاری کا وسوسہ پیدا ہوا اور وہ شخص اس کو دفع کرنے کی کوشش اور تگ ودو کرے اور اس کے لیے اپنی وسعت کے مطابق طاقت وقوت صرف کر ڈالے تو ایسے شخص کا عمل درست ہے اور اس کو اپنی کوشش اور تگ ودو صرف کرنے کی وجہ سے ماجور گردانا جائے گا۔

ج:......اثناء عمل ریاء کاری کا داعیہ سر اٹھائے اور مکلّف شخص اسی حالت میں عمل کو انجام دیتا رہے مگر اس دوران نہ تو اس کے خلاف دفاعی انداز اختیار کرے اور نہ ہی اس کو ٹالنے کی کوشش کرے بلکہ اسی داعیہ کی موجودگی میں عمل انجام دے ڈالے تو ایسے شخص کا عمل باطل قرار پائے گا اسے اس پر کوئی اجر وثواب نہیں ملے گا۔

۴۔ چوتھی صورت یہ ہے کہ اس شخص کا عمل خالص دنیوی غرض کے لیے ہو، مثلاً اگر روزہ

رکھتا ہے تو اس سے اس کا قصد ڈائٹنگ، یا حفظان صحت ہو یا اس سے اس شخص کا چاق و چوبند رہنا مقصود ہو غرضیکہ اس عمل میں اجر وثواب کا ذرہ برابر داعیہ نہ پایا جاتا ہو یا اسی طرح کوئی شخص حج وعمرہ کرے اور اس کی نیت تجارت و بزنس کی ہو اس کے علاوہ اور کوئی مقصد نہ ہو یا کوئی شخص زکوٰۃ اس غرض سے ادا کرتا ہے تا کہ مال میں برکت اور بڑھوتری ہو یا کوئی شخص اللہ کے راستے میں مال غنیمت کے حصول کی غرض سے جنگ میں نکلتا ہے یا کوئی شخص باجماعت نماز ادا کرنے مسجد کی طرف چہل قدمی کی غرض سے آتا جاتا ہے تو یہ اور اس طرح کے تمام اعمال بے سود و بے کار ہیں اور ان کو انجام دینے والوں کی محنت ومشقت اکارت و بے معنی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿١٨﴾﴾ (الاسراء: ۱۸)

”جو شخص اس جلدی والی (دنیا) کا ارادہ رکھتا ہو ہم اس کو اس میں جلدی دے دیں گے جو چاہیں گے، جس کے لیے چاہیں گے، پھر ہم نے اس کے لیے جہنم بنا رکھی ہے، اس میں داخل ہوگا، مذمت کیا ہوا، دھتکارا ہوا۔“

اور ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٦﴾﴾ (ھود: ۱۶)

”یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں اور برباد ہوگیا جو کچھ انھوں نے اس میں کیا اور بے کار ہے جو کچھ وہ کرتے رہے تھے۔“

۵۔ پانچویں صورت یہ ہے کہ اس شخص کا عمل خالص ریا کاری کی غرض سے ہو۔

سوال:...... کیا ریا کاری عمل کو سرے سے اکارت و بے مصرف بنا دیتی ہے یا ریا کاری انسان کے لیے نافرمانی کے ارتکاب کا ذریعہ ہے اس کی انجام دہی سے ریا کار معصیت الٰہی کا مرتکب قرار دیا جائے گا؟

جــواب :......ریا کاری عمل کو ناکارہ اور بے کار بنا دیتی ہے اس کے ارتکاب سے آدمی گناہ گار بن جاتا ہے کیوں کہ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کے ارتکاب سے عمل تو باطل ہو جاتا ہے مگر اس کے انجام دینے والے کو گناہ گار قرار نہیں دیا جا سکتا، مثال کے طور پر نماز کی ادائیگی کے دوران بے اختیار ریاح خارج ہو جانا یہ اور ان جیسی چیزوں کے رونما ہونے سے انسان گناہ گاروں کے زمرے میں شمار نہیں ہوگا۔

اور لوگوں میں بعض صنف کے لوگ وہ بھی ہیں جو فتویٰ دینے میں ریا کاری سے کام لیتے ہیں، مالداروں اور رئیسوں کو فتوی دینے میں اور انداز اختیار کرتے ہیں اور فقراء و مساکین کو فتویٰ دینے میں ان کے کچھ اور ہی تیور ہوتے ہیں، وہ مالداروں اور ساہوکاروں کی شرما حضوری میں کہتے ہیں کہ ہم اس مسئلہ میں لوگوں کو عموماً فتویٰ دیا کرتے ہیں کہ یہ کام حرام ہے جائز نہیں، مگر آپ کے لیے جواز کی صورت نکالے دیتا ہوں ان زمین داروں، ساہوکاروں کے سامنے عاجزی و انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مفت خور مفتی ایسا کیا کرتے ہیں اسی لیے بعض سلف صالحین کا قول ہے کہ ''اگر تم کسی عالم کو اس حال میں دیکھو کہ وہ حاکم وقت کی خوشہ چینی کرتے ہوئے اس کی ہم نشینی کی خاطر اس کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو سمجھ لو یہ عالم نہیں بلکہ چور اور اُچکا ہے اور کسی عالم دین کو اغنیاء و وجہاء کی حاشیہ برداری کرتے دیکھو تو سمجھ لو کہ یہ شخص ریا کار ہے۔''[1]

جہاں تک ان لوگوں کا مسئلہ ہے جو مذکورہ لوگوں کے پاس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یا خیر خواہی کی غرض سے جاتے ہیں ان کا معاملہ ان کی نیت پر منحصر ہے۔

بعض امور ایسے بھی ہیں جن کی انجام وہی سے ریا کاری کا شبہ پیدا ہوتا ہے حالانکہ ریا کاری ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

☆ بغیر قصد و ارادے کے لوگ تمہارے نیک کاموں کی انجام دہی پر تمہاری مدح سرائی کریں تو گویا کہ مومن کے لیے پیشگی بشارت کی دنیا ہی میں نوید ہے اس کو ریا کاری

[1] حلیة الاولیاء: ٦/٣٨٧ عن سفیان الثوری.

کے زمرے میں نہیں شمار کیا جاسکتا۔

☆ کسی شخص عبادت گزاروں میں عبادت وریاضت کرتے ہوئے دیکھا تو اس کے اندر بھی ان کے دیکھا دیکھی عبادت وریاضت کی طرف توجہ کی رغبت پیدا ہوئی اور وہ ان عابدوں اور زاہدوں سے زیادہ عبادت وبندگی کا گرویدہ ہوگیا تو اسے ریا کاری سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا، بشرطیکہ عبادت وریاضت میں انہماک سے اس شخص کی نیت رضائے الٰہی ہوتو ایسا عنداللہ ماجور شمار ہوگا۔

☆ اسی طرح پوشاک اور ملبوسات میں نفاست وطہارت، اور جوتے وغیرہ کی صفائی وستھرائی کا خیال اور ظاہری رکھ رکھاؤ اور ٹیپ ٹاپ میں رہنا، خوشبوؤں میں بسے رہنا یہ اور اس قسم کے اہتمامات کا ریا کاری سے کوئی تعلق نہیں۔

☆ معاصی وگناہوں کی پردہ پوشی اور راز کے افشا کرنے سے پرہیز برتنا اور بھری مجلس میں بطور تفاخر گناہوں ومعصیتوں کے ذکر سے اجتناب برتنا بلند اور اعلیٰ اخلاق کی دلیل ہے، بعض لوگوں کے ذہن ودماغ میں یہ خناس گھسا ہوتا ہے کہ اخلاص وللّٰہیت کی دلیل یہ ہے کہ ذنوب ومعاصی کا اعتراف کرکے اس کا راز فاش کردینا ہی اخلاص کی دلیل ہے اس کے بغیر بندہ مخلص نہیں ہوسکتا لیکن ایسا نہیں ہے۔ شرعاً ہم سے گناہوں کی پردہ پوشی کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے اس لیے ذنوب ومعاصی کا کتمان ریا کاری نہیں ہے بلکہ کتمان ذنوب اللہ تعالیٰ کو مرغوب ومحبوب ہے، بلکہ اس کے برخلاف عقیدہ رکھنا شیطانی وسوسہ ہے اور برائی وبدکاری کو رواج دینا ہے اور نفس انسانی کی عزت وکرامت کو بھرے بازار میں نیلام کرنا ہے۔

اپنے فہم وادراک کا امتحان لیں!

ذیل میں اس موضوع سے متعلق سوالات کو دو مرحلوں کو مدنظر رکھتے ہوئے وضع کیا گیا ہے:

سوالوں کی ایک قسم تو وہ ہے جن کا جواب فوراً دینا ہے۔ اس قسم کے سوالات کو پہلے مرحلہ میں رکھا گیا ہے۔

سوالوں کی دوسری قسم وہ ہے جو بحث ونظر اور غور وفکر کی متقاضی ہے۔ اس قسم کے سوالات کو دوسرے مرحلہ میں رکھا گیا ہے۔

پہلے مرحلہ کے سوالات جن کا جواب فوراً دینا ہے:

۱۔ نیت اور اخلاص میں کیا فرق ہے؟

۲۔ کسی معاملے میں سچائی اور اخلاص کا فرق بیان کریں؟

۳۔ احادیث نبویہ ﷺ میں سے حدیث ((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّات)) کیوں اہم ہے؟

۴۔ جب کسی کو مسجد میں غیر حاضری پر پوچھا جائے تو وہ کہتا ہے کہ ''میں نماز کے لیے جا رہا ہوں۔'' آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟ کیا وہ واقعی نماز کے لیے جانا چاہتا ہے؟

۵۔ کسی کام میں اخلاص کے فوائد اور نہ ہونے پر نقصانات بیان کریں؟

دوسرے مرحلہ کے سوالات جو استنباطی انداز کے ہیں:

۱۔ دورِ حاضر کے وہ چند اعمال مع علاج بیان کریں جن میں ریا کاری پائی جاتی ہے؟

۲۔ اخلاص سے متعلق چند ایسی مثالیں بیان کریں جو کتاب میں نہیں ہیں۔

۳۔ بعض سلف صالحین کہتے ہیں کہ ((تخليص النية من فسادها أشد على العاملين من طول الاجتهاد)) اس مقولے کا معنی بیان کریں؟

۴۔ اگر کوئی شخص باجماعت نماز اس لیے ادا نہیں کرتا، تاکہ وہ اپنے اس عمل کو لوگوں سے

چھپائے اور اخلاص پیدا کرلے۔ ایسے شخص کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

۵۔ اخلاص کے موضوع پر اس کے علاوہ چند دیگر کتابوں کا ذکر کریں۔

۶۔ اخلاص کا کوئی ایسا واقعہ بیان کریں جس نے آپ کو متاثر کیا ہو اور وہ اس کتاب میں بھی موجود نہ ہو۔

۷۔ وہ کون سے معاملات ہیں جو بندے کے لیے اخلاص پر معاون ہوتے ہیں؟

۸۔ سورۂ اخلاص کو ''سورۂ اخلاص'' کیوں کہا جاتا ہے؟

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ .

أعمال
القلوب
توکل
اخلاص
خوف
محاسبہ
شکر
غور و فکر
رضا
ورع
تقویٰ

مقدمہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ ، نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ . أما بعد !

یہ کتابچہ توکل کے موضوع سے متعلق ہے۔ اعمال القلوب کے سلسلہ میں لکھے جانے والے کتابچوں میں یہ دوسرے نمبر پر ہے۔ دراصل یہ اُس مادہ علمیہ سے مرتب شدہ ہے جس کو لکچرز کی شکل میں دورۂ علمی، تربیتی کیمپ میں محاضروں اور مقالوں کی صورت میں علمی فائدہ کی غرض سے پیش کیا گیا تھا۔ آج اللہ کی توفیق سے آپ کے سامنے فائدہ کی غرض سے پیش کرنے کی مجھے سعادت نصیب ہوئی، اس کے ترجمہ وتیاری میں الفرقان ٹرسٹ نے تعاون کیا اور آج یہی مکتبہ والے اس کتابچہ کو چھاپ کر اس کی نشر واشاعت میں حصہ لے رہے ہیں۔

اللہ کی ذات پر توکل واعتماد کا مرتبہ بڑی عظیم الشان اہمیت کا حامل ہے اور اس کا مقام بڑا جلیل القدر ہے جس کی بڑی گہری تاثیر نمایاں ہوکر سامنے آتی ہے اس کو ایمان کے منجملہ واجبات میں بڑا بلند مقام حاصل ہے اور توکل کو اعمالِ صالحہ اوران عبادات میں جو تقرب الٰہیہ کا ذریعہ ہیں افضل ترین عمل وعبادت تصور کیا جاتا ہے اور اس کو توحید باری تعالیٰ کے سلسلہ میں کلیدی حیثیت حاصل ہے کیونکہ معاملات میں کوئی معاملہ اس وقت تک پایہ تکمیل کو نہیں پہنچتا جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھرپور توکل اور بھروسا نہ ہو اور اس بارے میں اس کی ذات قدسی سے مدد واستعانت طلب نہ کی جائے۔

ہم اس کتابچہ میں توکل کے معانی ومفاہیم، اس کی حقیقت وماہیت، اور حقیقی توکل وبناوٹی توکل کے درمیان فرق کی بحث کریں گے، اس کے بعد مجموعی طور پر توکل کے فوائد وثمرات اور توکل کے منافی امور کا بھی ذکر کریں گے اور اس کتابچہ کو حسب استطاعت میسر

شدہ متوکلین کے قصوں پر ختم کرنے کی کوشش کریں گے۔ (ان شاء اللہ)

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ توفیق و ہدایت سے بہرہ ور فرمائے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ أَجْمَعِيْنَ.

محمد بن صالح المنجد

موضوع کی اہمیت

تابعی جلیل سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا قول ہے:

''اللہ کی ذات پر توکل واعتماد ہی ایمان کی جڑ اور بنیاد ہے۔''[1]

امام ابن قیم رحمہ اللہ کا فرمان ہے:

''توکل نصف دین ہے اور انابت دین کا دوسرا نصف حصہ ہے، کیونکہ باری تعالیٰ سے استعانت اور اس کی عبادت وبندگی کرتے رہنے کا نام دین ہے اور توکل دراصل استعانت ہی ہے اور انابت کو ہی تو عبادت کہا جاتا ہے۔

توکل کی قدر ومنزلت بڑی ہی وسیع وعریض اور جامع ومانع ہے، توکل سے تعلق رکھنے والوں کی آمد ورفت سے اس کا صحن کبھی خالی نہیں ہوتا اور دنیا میں درپیش ضروریات کی وجہ سے توکل کرنے والوں کی خاطر اس کا در ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔''[2]

توکل کا تعلق ہر مسئلہ سے جڑا ہوا ہے، چاہے وہ مسائل واجبات کے قبیل سے ہوں یا مستحبات کی قبیل سے ہو یا ان کا تعلق مباحات ہی سے کیوں نہ ہو بلکہ اللہ کی ذات کے منکرین کا بھی توکل سے کسی نہ کسی صورت میں تعلق ہے، کفار ومشرکین بھی اپنی مراد کے حصول میں رب کائنات پر توکل کیا کرتے ہیں۔

چونکہ لوگوں کی حاجات حد سے زیادہ ہیں اس لیے حاجت روائی کے لیے لوگوں کا اللہ کی ذات پر توکل ضروری ہے۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اگر بندہ اللہ تعالیٰ کے ذات عالی شان پر پہاڑ کو اپنی جگہ سے ٹالنے کے لیے

---

[1] مصنف ابن ابی شیبہ: ۷/۲۰۲۔ [2] مدارج السالکین: ۲/۱۱۳۔

حقیقی توکل کرے اور اللہ کے نام پر پختہ عزم کر لے اور وہ اس کو اس کی جگہ سے ہٹانے پر مامور بھی ہو تو یقیناً وہ اپنے ارادے میں بہر صورت کامیاب ہو کر رہے گا۔'' ❶

اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ مسلمان اللہ پر توکل کے معاملہ کو اپنے تمام اعمال کی انجام دہی کے سلسلہ میں صرف مستحب مسئلہ نہیں سمجھتا بلکہ وہ تو جو کام بھی انجام دیتا ہے اس میں توکل کو دینی فریضہ گردانتا ہے۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ اس بارے میں فرماتے ہیں: ''توکل اس قضیہ مسلمہ کو کہا جاتا ہے جس کے جلو میں تفویض استعانت اور رضا جیسے اہم ترین پہلو جمع ہو گئے ہیں ان تمام قضایا کا وجود بغیر توکل کے ناممکن ہے۔'' ❷

اسی طرح شیخ سلیمان بن عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ کا قول ہے کہ توکل تو وہ جامع اور مانع کلیہ ہے جس سے عبادات متفرع ہوتی ہیں، توکل ہی حقیقت میں پناہ لینے کی جگہ ہے، توکل ہی وہ فریضہ ہے جس پر قلب وقالب کے ساتھ اعتماد وبھروسا کیا جاسکتا ہے، توکل ہی اللہ کی وحدانیت کا خلاصہ ونچوڑ ہے، اور وہی توحید کی ملتجا ہے، اسی سے محبت اور خوف ورجاء جیسے بلند ترین معزز مقامات کے سوتے پھوٹتے ہیں بلکہ یہ توکل ہی کی بدولت ہے کہ انسان رب کریم کی ذات ستودہ صفات سے بحیثیت رب، والہ، اور اس کی قضاوقدر پر رضامندی کا اظہار کرتا ہے اور راضی برضا رہتا ہے بلکہ بعض موقعوں پر توکل کی وجہ سے بندہ مصائب وآلام کی گرداب میں پھنس کر لذت وانس محسوس کرتا ہے اور اسے اپنے لیے زحمت کے بجائے نعمت غیر مترقبہ تصور کرتا ہے، تو پاک ومقدس ہے وہ ذات جو اپنی مرضی سے جس کو چاہتی ہے جتنا چاہتی ہے نوازتی چلی جاتی ہے اور اللہ کی ذات بہت رفعت وعظمت فضل وکرم والی ہے۔'' ❸

---

❶ نفس المصدر: ۸۱/۱.
❷ المصدر السابق: ۱۳٦/۱.
❸ تیسیر العزیز الحمید: ۸٦.

توکل کی تعریف

لغوی تعریف:......عربی زبان میں لغوی اعتبار سے توکل کیا ہے؟

کہا جاتا ہے: ((وَكِلَ بِاللّٰهِ ، وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ، وَاتَّكَلَ: اَیِ اسْتَلَمَ اِلَيْهِ .))

مراد یہ ہے جب مذکورہ الفاظ استعمال کیے جائیں تو اس سے مراد استسلام تام ہوا کرتا ہے یعنی (خودسپردگی)۔

توکل بالامر: ...... اس وقت کہا جاتا ہے جب کسی کام کی انجام دہی کی گارنٹی یا ضمانت لے لی جائے۔

جب کہا جائے ((وَكَّلْتُ اَمْرِیْ اِلٰی فُلَانٍ)) تو مراد یہ ہوتا ہے کہ میں نے اپنے اس معاملہ میں فلاں پر اعتماد اور بھروسا کیا ہے۔

کہا جاتا ہے ((وَكَّلَ فُلَانٌ فُلَانًا)) فلاں نے فلاں کو اپنا وکیل بنالیا ہے مراد یہ ہے کہ فلاں شخص بنفس نفیس اپنا کام کرنے سے عاجز ہے یا اس نے اپنے کام کی انجام دہی کی خاطر فلاں شخص پر اعتماد اور بھروسا کر کے اسے اپنی نیابت میں اس کام کی انجام دہی کا فریضہ سونپ دیا ہے اور وہ وکیل اس کے کام کو انجام دے گا۔

اور کہا جاتا ہے ((وَكَّلَ اِلَيْهِ الْاَمْرَ)) مراد یہ ہے کہ فلاں نے فلاں کو معاملہ سپرد کر دیا یا فلاں کی تحویل میں معاملہ کو دے دیا۔ [1]

چنانچہ خود بنفس نفیس کسی کام سے عاجز ہونے کا اظہار اور دوسرے پر اس کی انجام دہی کے لیے اعتماد اور بھروسا کرنا توکل کہلاتا ہے۔

اصطلاحی تعریف: ......علمائے کرام نے مختلف زاویوں سے توکل کی چند ایک تعریفیں کی ہیں ان میں سے بعض درج ذیل ہیں:

امام ابن رجب رحمہ اللہ توکل کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

---

[1] لسان العرب : ۱۱/ ۷۳٤.

’’دنیوی اور اُخروی امور میں سے ہر ایک کے بارے میں فوائد یا منافع کے حصول اور مضرت ونقصان سے بچاؤ کی غرض سے سچے دل سے اللہ تعالیٰ کی ذات پر پختہ یقین اور اعتماد وبھروسا کرنا توکل کہلاتا ہے۔‘‘ [1]

جناب حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’بندے کا اپنے رب پر توکل اور پختہ یقین یہ ہے کہ اس کے ذہن ودماغ میں یہ بات رچ بس جائے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی اس کے لیے (معتمد علیہ) ہے۔‘‘ [2]

امام زبیدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’اللہ کے نزدیک جو کچھ ہے اس پر اعتماد وبھروسا اور بندوں کے دست رس میں جو کچھ ہے اس سے بے نیازی کا نام توکل ہے۔‘‘ [3]

فضیلۃ الشیخ / علامہ ابن عثیمین رحمہ اللہ توکل کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

’’ان ظاہری اسباب و وسائل کو اختیار کرتے ہوئے جن کے اختیار کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم صادر فرمایا ہے، منافع کے حصول اور مضرتوں اور نقصانات سے بچاؤ کی خاطر اللہ کی ذات پر سچا اور پکا اعتماد کرنا توکل کہلاتا ہے۔‘‘ [4]

مؤخر الذکر تعریف جامع ومانع اور حسن وجمال کا پیکر ہے۔

توکل کی حقیقت اور ماہیت

اسباب و وسیلہ اختیار کرنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد اور بھروسا کرنا مراد یہ ہے کہ کامل یقین اور اعتقاد کے دوش پر سوار ہو کر پورے اعتماد کے ساتھ انسان یہ سمجھے کہ اللہ ہی کی ذات رازق (رزق دینے والی) خالق (عدم سے وجود بخشنے والی) محی (زندگی عطا کرنے والی) اور مُمیت (موت دینے والی) ہے اس کے علاوہ کوئی حقیقی معبود نہیں اور اس کے سوا نہ ہی

---

[1] جامع العلوم والحکم: ٤٣٦.
[2] المصدر السابق نفسه: ٤٣٧.
[3] تاج العروس، (مادة وكل).
[4] مجموع فتاوی و رسائل ابن عثیمین: ١/ ٦٣.

کوئی (رب) پالنہار ہے توکل کی حقیقت ہے۔

لغوی اعتبار سے توکل استعانت سے عام ہے: ''استعانت یہ ہے کہ تم اللہ کی ذات سے طلب کرو کہ اللہ تعالیٰ مختلف اعمال میں سے کسی عمل کی انجام دہی میں تمہاری مدد واعانت کرے۔''

توکل کی تعریف کے تحت استعانت کا خود بخود اندارج ہو جاتا ہے، توکل معنی کے اعتبار سے استعانت کے مقابلہ میں جامع ومانع ہے، اس میں شمولیت کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ مثال کے طور پر تم کہتے ہو کہ اپنے معاملات کی انجام دہی کے وقت اعانت کے بارے میں اللہ کی ذات پر توکل کرو بلکہ توکل کا معنی اس بھی کہیں زیادہ ہمہ گیر اور جامع ومانع ہیں، اس میں اللہ کی ذات پر منافع کے حصول اور مضرتوں سے دفاع کے بارے میں توکل کے معنی بھی شامل ہے اس کے علاوہ دیگر امور پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا قول ہے:

> ''توکل اپنے اندر اللہ کی ذات پر اعتماد اور بھروسا جیسے معانی ومفاہیم سموئے ہوئے ہے، تاکہ جس چیز کی انجام دہی کا اللہ تعالیٰ نے بندہ کو حکم دیا ہے اس کی انجام دہی میں اللہ تعالیٰ اس کی مدد واعانت کرے اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کو وہ کچھ عطا فرمادے جس کے حصول کی بظاہر اس کے اندر طاقت وقدرت نہیں ہے مگر استعانت کا تعلق اعمال کی انجام دہی میں اللہ کی مدد طلب کرنے سے ہے، اسی لیے توکل استعانت کے مقابلہ میں عام ہے نیز اللہ کی ذات پر توکل منافع کے حصول اور مضرتوں سے بچاؤ کے لیے ہوا کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ۝﴾

(التوبة : ٥٩)

''اور کاش کہ واقعی وہ اس پر راضی ہو جاتے جو انھیں اللہ اور اس کے رسول نے دیا اور کہتے ہمیں اللہ کافی ہے، جلد ہی اللہ ہمیں اپنے فضل سے دے گا اور اس کا رسول بھی۔ بے شک ہم اللہ ہی کی طرف رغبت رکھنے والے ہیں۔'' [1]

توکل اور استعانت میں جوہری فرق یہ ہے کہ توکل منافع کے حصول اور مضرتوں کو رفع دفع کرنے کی غرض سے ہوتا ہے اور استعانت کا استعمال صرف عبادت و ریاضت کے سیاق میں ہوتا ہے، لہٰذا توکل استعانت کے مقابلہ میں معنی کے اعتبار سے زیادہ عمومیت کا حامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں اصولوں کو ایک جگہ ایک ہی آیت میں جمع کر دیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۝﴾ (الفاتحة: ٥)

''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں۔''

اس آیت کریمہ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ عبادت صرف اور صرف اللہ ہی کی ذات کے لیے خاص ہے اور استعانت بھی صرف اسی ذات باری سے طلب کرنی چاہیے اور توکل بھی اسی قادر مطلق (وحدہ لاشریک لہ) کی ذات پر کرنا چاہیے اس بارے میں عربی کے مشہور شاعر کا قول ہے:

إِذَا مَا حَذِرْتَ الْأَمْرَ فَاجْعَلْ إِذَاءَهُ
رُجُوْعًا إِلَى رَبٍّ يَقِيْكَ الْمَحَاذِرَا
وَلَا تَخْشَ أَمْرًا أَنْتَ فِيْهِ مُفَوِّضٌ
إِلَى اللّٰهِ غَايَاتٍ لَهُ وَمَصَادِرًا
وَكُنْ لِلَّذِيْ يَقْضِي بِهِ اللّٰهُ وَحْدَهُ
وَإِنْ لَمْ تُوَافِقْهُ الْأَمَانِيْ شَاكِرًا

[1] مجموع الفتاوی: ۱۷۷/۸.

وَاِنِّــیْ كَـفِـیْـلٌ بِـالـنَّـجَـاةِ مِنَ الاَذٰی
لَـمِـنْ لَمْ یَبِتْ یَدْعُوْ سِوَی اللّٰه نَاصِرًا

''جب کبھی تم کسی معاملہ میں اندیشہ یا خوف کا شکار ہو جاؤ تو اس کو رب کریم کی ذات کے بھروسا چھوڑ دو تم کو خوف واندیشہ سے اس کی ذات بچا لے گی، اور اس معاملہ میں تم کو اندیشہ کی قطعی ضرورت نہیں ہے جس میں تم نے اللہ کی ذات پر بھروسا کیا ہے، لہٰذا اس کی غرض وغایت کو مدنظر رکھو اور اس کے مصدر پر یقین کرو اور اس فیصلہ کو برضا ورغبت شکر بجالاتے ہوئے قبول کرلو جو اللہ وحدہ لاشریک نے کیا ہے اگر چہ وہ تمہاری خواہش کے برخلاف ہی کیوں نہ ہو؟ ہم اس شخص کے لیے آفتوں اور مضرتوں سے نجات کی گارنٹی دیتے ہیں جو اللہ کے علاوہ کسی اور سے لو نہیں لگا تا اس حال میں کہ اللہ کے علاوہ کوئی اور معین ومددگار نہیں۔''

اگر تمہاری رضا ورغبت کے خلاف اللہ کا فیصلہ ہو اور جس چیز کی تم کو تمنا تھی اس کے برخلاف معاملات منظر عام پر آتے دکھائی دیں تو دل برداشتہ نہ ہو بلکہ اس حال میں بھی اللہ کا شکر ادا کرو اور کسی طرح کا اندیشہ اور خوف نہ کرو جبکہ تم نے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کردیا ہے اب کس چیز کا خوف اور کاہے کا اندیشہ وڈر! اب اللہ کی ذات پر بھروسا کرتے ہوئے اس کی طرف رجوع وانابت کرو اور اسی پر توکل کرو تو پھر اللہ تعالیٰ تمہاری نصرت واعانت کرے گا اور تائید غیبی سے تم کو نوازتا چلا جائے گا۔

اسباب ووسائل اختیار کرنے کا طریقہ

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات پر توکل کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اسباب ووسائل کو اختیار نہ کیا جائے، کیونکہ توکل کا دارومدار دو چیزوں پر ہے:

ا۔ اللہ کی ذات پر اعتماد اور بھروسا

۲۔ اس کے لیے اسباب ووسائل کا اختیار کرنا

مراد یہ ہے کہ اللہ کی ذات پر اسباب و وسائل اختیار کرتے ہوئے اعتماد اور بھروسا یا یقین رکھنے کا نام توکل ہے۔

یہاں جس چیز کی طرف توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے وہ اسباب و وسائل کو اختیار کر کے اسی پر تکیہ اور بھروسا نہ کرنے کا معاملہ ہے، بلکہ بندۂ مومن کو اس بات کا بخوبی علم ہونا چاہیے کہ اسباب و وسائل تو دنیاوی دستور کے مطابق راہ ہموار کرنے کی غرض سے اختیار کیے جاتے ہیں ورنہ حقیقت میں نفع ونقصان پہنچانے والی ذات اللہ وحدہ لاشریک کی ہے، نافع اور ضارّ ہونے میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات یکتا و یگانہ ہے اس میں اس کا کوئی شریک نہیں۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''توکل کا راز اور اس کی حقیقت اللہ وحدہ لاشریک لہ کی ذات پر صدق نیت سے اعتماد اور بھروسا ہے چنانچہ اللہ کی ذات پر اعتماد اور بھروسا اور اس کی طرف طبیعت کا میلان اور رجحان نہ ہوتے ہوئے قلب کا اسباب و وسائل اختیار کرنے سے کوئی فائدہ نہیں اور نہ ہی توکل کرنے والے کے لیے اس میں کوئی مضائقہ کی بات ہے۔'' [1]

یہی وہ جوہری فرق ہے جو اللہ کی ذات پر حقیقی توکل کرنے والے اور زبانی توکل کرنے والے کے درمیان ہوا کرتا ہے، مراد یہ ہے کہ صرف اسباب و وسائل کا سہارا حقیقی توکل کرنے والے کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا، کیونکہ توکل کرنے والے کو اس بات کا بخوبی علم ہوتا ہے کہ اللہ کی ذات جس پر اعتماد اور بھروسا کیا جاتا ہے ہمیشہ باقی اور موجود رہنے والی ہے۔

جہاں تک اس شخص کا معاملہ ہے جو اللہ کی ذات پر توکل کا صرف زبانی دعوے دار ہے تو ایسے شخص کے ہاتھ سے جوں ہی اسباب و وسائل کی رسی کا سرا چھوٹتا ہے وہ چاروں شانے چت ہو کر اللہ کی ذات پر توکل و اعتماد میں کمزوری کی وجہ سے زمین پر آ کر ڈھیر ہو جاتا ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو: الفوائد: ۸۷.

توکل کے سلسلہ میں نبی کریم ﷺ کا اسباب ووسائل اختیار کرنے کا طریقہ:

نبی کریم ﷺ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ت پر توکل کرنے والوں کی صف میں سب سے زیادہ توکل کرنے والے انسان تھے اس کے باوجود آپ ﷺ نے بہت سے مواقع پر متعدد بار اسباب ووسائل اختیار کر کے اپنی امت کو بتلا دیا کہ اسباب ووسائل اختیار کرنا توکل کے منافی عمل نہیں۔

نبی کریم ﷺ نے جنگ وقتال کے دوران ایک موقع پر دو زِرہیں پہنیں یعنی ایک زِرہ کے اوپر دوسری زِرہ زیب تن فرمائی، چنانچہ سیّدنا سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جنگ احد کے دن دو زرہیں پہن کر مظاہرہ فرمایا۔ [1] اور ''اپنی زرہ بھی (حفاظت کی غرض سے بطور احتیاط) زیب تن فرمائی۔'' [2]

آپ ﷺ نے اپنے سر پر (خود) پہن کر اسباب ووسائل اختیار کرنے کا عملی طور پر مظاہرہ فرمایا، چنانچہ اس بارے میں سیّدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے دن (مکہ مکرمہ) میں اس حال میں داخل ہوئے کہ آپ ﷺ کے سر پر خود رکھا ہوا تھا۔ [3]

ہجرت کے موقع پر مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ جانے کے لیے آپ ﷺ نے بطور سبب ایک شخص کو راستے کی رہنمائی کے لیے بطور گائیڈ اپنے ساتھ لیا تھا تاکہ وہ ہجرت کے راستے میں آپ ﷺ کی راہنمائی کا فریضہ انجام دے کر راستے کا تعین کرے اسی طرح آپ ﷺ نے ہجرت کے راستے میں عمداً اپنے پاؤں کے نشان نہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور ہجرت کے لیے اس وقت آپ ﷺ گھر سے باہر نکلے جس وقت لوگ خواب خرگوش میں محو تھے اور آپ ﷺ نے ہجرت کے لیے اس راستے کو چھوڑ کر جسے عموما لوگ اختیار کرتے ہیں

---

[1] احمد: ۱۵۷۶۰ وصححه شعيب الارنؤوط

[2] رواه ابن حبان في صحيحه: ۷۰۲۸.

[3] صحيح بخاری، كتاب جزء الصيد، باب دخول الحرم و مكة: ۱۸٤٦.

غیرمعروف راستے کا انتخاب کیا یہ سارے کے سارے اعمال کی انجام دہی اسباب ووسائل اختیار کرنے کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔

مذکورہ سارے کے سارے اعمال کا توکل کے باب میں اسباب ووسائل اختیار کرنے کے ضمن میں شمار ہوتا ہے اور اس سے نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو اس بات کی تعلیم دی ہے کہ اسباب ووسائل اختیار کرنے کی بڑی اہمیت ہے جن سے ایک توکل کرنے والا مومن کسی حال میں مستغنی نہیں ہوسکتا۔

سیّدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اگر تم اللہ کی ذات پر حقیقی توکل کرنے لگو تو اللہ تعالیٰ تم کو ٹھیک اس طرح رزق سے نوازنے لگے جیسے کہ وہ چرند و پرند کو نوازتا ہے ذرا پرندوں کو دیکھو وہ صبح کو خالی پیٹ نکلتے ہیں اور شام شکم سیر ہو کر لوٹتے ہیں۔'' ❶

حدیث مذکورہ میں اسباب ووسائل اختیار کرنے کی اہمیت کا بیان ہے، چنانچہ پرندہ یا چڑیا اللہ تعالیٰ نے جس کو رزق بہم پہنچانے کی ذمہ داری لی ہے وہ بھی اپنے گھونسلے میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اس انتظار میں نہیں بیٹھتی کہ اس کا رزق بغیر اسباب اختیار کیے اس کے پاس چل کر پہنچ جائے گا بلکہ صبح سویرے بھوکے پیٹ رزق کی تلاش میں نکل پڑتی ہے جس کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ اس کی مراد پوری کرتا ہے اور اس کو اس پوزیشن سے بہرہ ور فرماتا ہے کہ وہ شام کو اپنے اپنے گھونسلوں میں شکم سیر ہو کر واپس آئیں۔

مرد مومن کو چاہیے کہ وہ اسباب ووسائل اختیار کرتے وقت ان کی چھان بین کرلے کہ یہ اسباب وسائل جنہیں وہ اختیار کررہا ہے شرعاً جائز بھی ہیں یا نہیں؟ کیونکہ ہمارے مشاہدہ میں ہے کہ بعض لوگ گورنمنٹ سرونٹ کو دنیوی مصالح کے حصول کی غرض سے رشوت وغیرہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسا میں نے بر بنائے توکل کیا ہے! میرے بھائی اس عمل کا توکل سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ یہ تو توکل کے منافی اور اس کے برخلاف عمل ہے، کیونکہ اگر اس شخص کو اللہ کی ذات پر بھرپور توکل اور اعتماد ہوتا تو وہ مخالف شریعت عمل نہ کرتا۔

توکل اور تواکل کے مابین فرق

جیسا کہ گزشتہ صفحات پر بتلایا جاچکا کہ توکل کے سلسلہ میں اسباب ووسائل کا سہارا لینا ضروری ہے اور اسباب ووسائل کے اختیار کیے بغیر توکل کر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے ہوئے عاجز محض بن کر ایک دوسرے پر تکیہ کر کے بیٹھ رہنا توکل نہیں بلکہ (تواکل) ہے، اللہ کی شریعت میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

اسی طرح جیسا کہ کہا جاتا ہے: ''جس شخص نے توکل کرنا ترک کر دیا اس نے عقیدۂ توحید پر کاری ضرب لگائی ہے اور جس شخص نے توکل کو اپنانے میں اسباب ووسائل کا سہارا لینا ترک کر دیا اس نے عقل وخرد کا ستیاناس کر ڈالا۔''

تواکل اُمت کی کمزوری اور کسم پرسی کے اسباب میں سے ایک سبب ہے، مراد یہ ہے کہ انسان اپنے گھر میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کسم پرسی کے عالم میں بیٹھ جائے اور غیب سے رزق پہنچنے کا انتظار کرنے لگے اور یہ کہتا پھرے کہ میں تو اللہ کی ذات پر توکل کرنے والا ہوں اور اپنی جگہ سے ہل کر پانی بھی نہ پیے تو یہ توکل نہیں بلکہ تواکل ہے اسے اس کی کسم پرسی اور عاجزی و بے بسی کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

کوئی جماعت اس خام خیالی میں منتظر بیٹھی رہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی طرف سے ان کے دشمنوں کے خلاف غیبی مدد کرے گا اور اپنے دشمنوں سے برسر پیکار ہونے کے لیے وہ تیاری اور ٹریننگ نہ کریں اور نہ ہی ان سے مدمقابل ہونے کے لیے علم جنگ بلند کریں تو کس طرح ان کو فتح وکامرانی مل سکتی ہے!

سیّدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے فرماتے ہیں:

''اہل یمن حج کے لیے سفر کر کے آتے تھے اور سفر کے لیے زادِ راہ نہیں لیتے تھے

---

❶ ترمذی، كتاب الزهد، باب في التوكل على الله: ٢٣٤٤ اور امام حاکم نے اپنی مستدرک میں اس کو نقل کیا ہے (٣٥٤/٤) اور کہا ہے۔ صحيح الاسناد ولم يخرجاه.

اور کہتے تھے کہ "ہم لوگ توکل کرنے والے ہیں اور جب مکہ مکرمہ پہنچتے تھے تو لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کیا کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى﴾ (البقرة: ١٩٧)

"اور زاد راہ لے لو کہ بے شک زاد راہ کی سب سے بہتر خوبی (سوال سے) بچنا ہے اور مجھ سے ڈرو۔"

ذرا اس آیت کریمہ پر غور وخوض کرو تو پتہ چل جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اہل یمن کے اس دعوے کا کتنے شدومد کے ساتھ انکار کیا ہے جو انہوں نے توکل کے متلق کیا تھا حالانکہ وہ حج کرتے وقت دوران حج اپنے ذاتی استعمال کے لیے بطور زاد راہ کچھ بھی لے کر نہیں آتے تھے جو ان کے لیے اس فریضہ کی ادائیگی کے دوران ان کے ذاتی مصروفات اور حج کے اخراجات میں مدومعاون ثابت ہو۔

یہاں اس تنبیہ سے یہ مقصود نہیں ہے کہ انسان اسباب ووسائل اختیار کرنے میں جان جوکھوں میں ڈالے اور اپنے نفس کو اس کام کی انجام دہی کے لیے مجبور کرے جو اس کی طاقت وقوت سے بالاتر ہو بلکہ کبھی تو توکل کے سلسلہ میں معمولی وسیلہ کا سہارا لینا کافی ہوتا ہے۔ سیّدہ مریم علیہا السلام کے قصہ میں ہمارے لیے توکل کے مسئلہ میں اسباب کا سہارا لینے کی دلیل موجود ہے بایں طور کہ اللہ تعالیٰ نے سیّدہ مریم علیہا السلام کو کھجور کے تنے کو ہلانے کا حکم دیا تاکہ کھجور کا پیڑ ان کے لیے پکی یا گدر کھجوریں گرانا شروع کر دے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ هُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ۝﴾

(مريم: ٢٥)

"اور کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلا، وہ تجھ پر تازہ پکی ہوئی کھجوریں گرائے گی۔"

بعض لوگوں کو اس بات سے تعجب محسوس ہوگا کہ اور وہ یہ کہنے کے لیے مجبور ہوں گے کہ یہ ضعیف وناتواں عورت، جو حمل وزچگی کی حالت سے دوچار ہے کھجور کے دیوہیکل قوی اور

ٹھوس تنے کو کیوں کر ہلا نے کی اہل ہوسکتی ہے تا کہ اس پر کھجوریں ٹپکنا شروع ہوں اور وہ اسے اپنے استعمال میں لائے۔

ہم اس اشکال کا جواب دیتے ہوئے کہنا چاہیں گے (ہاں ہاں) یہ بات بجا ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے اس قصہ سے ہمیں اسباب ووسائل اختیار کرنے کی اہمیت وافادیت کا درس دینا چاہا ہے اور اس بات سے آگاہ کرنا چاہا ہے کہ ہمیں اسباب ووسائل اختیار کرنا چاہیے، چاہے وہ اسباب ووسائل معمولی اور ادنیٰ سے ہی کیوں نہ ہوں؟ اس نیک وصالح عورت کے لیے اس معمولی سے کام کی انجام دہی کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ تھا لیکن جب اس عورت نے اللہ کی ذات پر بھرپور توکل کرلیا اور توکل کا جو حق تھا اسے ادا کردیا اور اس معمولی سبب اور وسیلہ کو بھی اختیار کرکے اسے انجام دے ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اس مرتبہ پر فائز فرمادیا جس کی اسے خواہش تھی اور اس کو وہ کچھ عطا فرمادیا جس کی اس نے تمنا کی تھی، کسی عربی شاعر کا قول ہے:

''ہر حاجت اور ضرورت کے وقت رحمٰن کی رحیمی وکریمی پر بھروسا کرو اور رب کریم سے مانگنے اور اس کے سامنے دست سوال دراز کرنے میں کبھی بے بسی کا مظاہرہ مت کرو، کیا تمہیں پتہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سیّدہ مریم علیہا السلام سے کہا تھا کہ ''کھجور کا تنا پکڑ کر ہلاؤ وہ تمہارے لیے پکی کھجوریں اوپر سے گرانے لگے گا۔'' اگر اللہ چاہتا تو کھجور کا درخت ہلائے بغیر سیّدہ مریم علیہا السلام کے ہاتھ میں کھجور پہنچا دیتا لیکن نہیں انہوں نے کھجوریں حاصل کیں مگر اسباب ووسائل اختیار کرکے کیونکہ ہر چیز کے حصول کے لیے اسباب ووسائل موجود ہیں۔'' [1]

عین ممکن تھا کہ بغیر کسی سبب اور ذریعہ کے اللہ تعالیٰ کھجوروں کی ان کے اوپر بارش کردیتا لیکن چونکہ اسباب کے ذریعہ مراد مطلوب کا حصول اس کائنات میں رائج طریقوں میں سے رائج شدہ طریقہ ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے سیّدہ مریم علیہا السلام کو کھجوروں کے حصول کے لیے اس کے تنے کو ہلانے کا حکم دیا۔

[1] بهجة المجالس وانس المجالس : ١/٢٦.

لیکن اگر ایسی صورت حال پیش آ جائے کہ انسان کے لیے سارے اسباب ووسائل منقطع ہو جائیں اور کوئی چارہ کار باقی نہ بچے تو اس موقع پر اسے عظیم الشان اسباب ووسائل میں سے اہم ترین سبب ووسیلہ کا سہارا نہیں چھوڑنا چاہیے اور وہ اللہ تعالیٰ کے روبرو دعا ومناجات اور استغاثہ واستعانت کا مضبوط اور مستحکم وسیلہ وسبب ہے۔

توکل کا شرعی حکم

اللہ کی ذات پر توکل کرنا واجب ہی نہیں بلکہ واجبات کی فہرست میں عظیم ترین واجب ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا قول ہے:

''اللہ کی ذات پر توکل واعتماد واجبات کی فہرست میں عظیم ترین واجب کی حیثیت رکھتا ہے، ٹھیک اس طرح جس طرح اللہ کی ذات کے ساتھ اخلاص بندے کے لیے واجب اور ضروری ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی کئی آیات میں توکل اختیار کرنے کا حکم صادر فرمایا ہے اور اس حکم کی تاکید وضو اور غسل جنابت سے بھی مؤکد انداز میں صادر فرمائی ہے اور غیر اللہ پر توکل اور بھروسا کرنے سے منع فرمایا ہے۔'' [1]

اس لیے توکل ایمان کی صحت کے لیے اہم ترین شرط ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کا مفہوم یہی ہے کہ ﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (المائدة: ٢٣) ''اور اللہ ہی پر پس بھروسا کرو، اگر تم مومن ہو۔'' اس آیت سے پتہ یہ چلا کہ: توکل کی نفی سے ایمان کی خود بخود نفی ہو جاتی ہے۔

توکل توحید الٰہی کی خشت اول ہے، اللہ تعالیٰ کا یہ قول اس امر کی غمازی کرتا ہوا نظر آتا ہے:

﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝﴾ (الفاتحة: ٥)

''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیری ہی مدد چاہتے ہیں۔''

---

[1] مجموع الفتاوى: ١٦/٧.

توکل کی فضیلت اور اس پر ترغیب دلانے والی آیات

قرآن کریم میں توکل کا لفظ (۴۲) مرتبہ مختلف جگہوں پر وارد ہوا ہے، کبھی مفرد آیا ہے تو کبھی جمع اور کبھی ماضی کے صیغہ میں استعمال ہوا ہے تو کبھی مضارع اور امر کے صیغوں میں وارد ہوا ہے بہرکیف ہر حال میں (توکل اور اعتماد) اور اللہ کے ذمہ معاملات کی سپردگی کے معنی میں اس کا ورود ہوا ہے۔

قرآن کریم کا اسلوب بیان توکل کی فضیلت اور اس کی ترغیب کے بارے میں تنوع اور متعدد صفات کا حامل ہے، اس سلسلہ میں اسلوب قرآنی کی گوناں گوں صورتوں میں سے چند صورتوں کا تذکرہ پیش خدمت ہے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو براہ راست توکل کرنے کا حکم دیا:

قرآن کریم کی کئی آیات میں بطور خاص اپنی نبی ﷺ کو توکل کا حکم دے کر شرف بخشا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ۝۷۹﴾ (النمل: ۷۹)

''پس اللہ پر بھروسا کر، یقیناً تو واضح حق پر ہے۔''

اور ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ؕ﴾ (ھود: ۱۲۳)

''سو اس کی عبادت کر اور اس پر بھروسا کر۔''

اسی طرح ایک جگہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ؕ وَ كَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا ۝۵۸﴾ (الفرقان: ۵۸)

''اور اس زندہ پر بھروسا کر جو نہیں مرے گا اور اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کر اور وہ اپنے بندوں کے گناہوں کی پوری خبر رکھنے والا کافی ہے۔''

ایک اور جگہ پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿١٥٩﴾ ﴾

(آل عمران: ١٥٩)

''پس اللہ کی طرف سے بڑی رحمت ہی کی وجہ سے تو ان کے لیے نرم ہوگیا ہے اور اگر تو بدخلق، سخت دل ہوتا تو یقیناً وہ تیرے گرد سے منتشر ہو جاتے، سو ان سے درگزر کر اور ان کے لیے بخشش کی دعا کر اور کام میں ان سے مشورہ کر، پھر جب تو پختہ ارادہ کر لے تو اللہ پر بھروسا کر، بے شک اللہ بھروسا کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

اور سورۂ توبہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ڶ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿١٢٩﴾ ﴾ (التوبة: ١٢٩)

''پھر اگر وہ منہ موڑیں تو کہہ دے مجھے اللہ ہی کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے اسی پر بھروسا کیا اور وہی عرش عظیم کا رب ہے۔''

اسی طرح سورۂ ملک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢٩﴾ ﴾ (الملك: ٢٩)

''کہہ دے وہی بے حد رحم والا ہے، ہم اس پر ایمان لائے اور ہم نے اسی پر بھروسا کیا، تو تم عنقریب جان لوگے کہ وہ کون ہے جو کھلی گمراہی میں ہے۔''

اللہ تعالیٰ کا اپنے نبی ﷺ کو توکل کے لیے مخاطب کرنے کا مطلب امت کو اس مہم کی ادائیگی کے لیے مکلّف قرار دینا ہے یعنی نبی ﷺ کو حکم دینا گویا کہ آپ کی اُمت کو حکم

دینا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو توکل کا حکم دیا:

بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مومنین بندوں کو توکل کرنے کا حکم دیا ہے کہ وہ اسی کی ذات پر توکل واعتماد کریں اور اس کی ترغیب بھی دی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے اس کی تائید ہو رہی ہے:

﴿وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿١٢٢﴾﴾ (آل عمران : ۱۲۲)

''اور اللہ ہی پر پس لازم ہے کہ مومن بھروسا کریں۔''

۳۔ مومنین اپنے رب پر ہی توکل وبھروسا کرتے ہیں:

اللہ کی ذات پر توکل اللہ کے نیک وصالح بندوں کی نمایاں صفات میں اہم ترین صفت ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل مومنین کاملین کا وہ وصف اور شعار ہے جو ان میں اور غیروں میں فرق کی حیثیت سے امتیازی شان رکھتا ہے اور جو اہل ایمان کی واضح نشانی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿٢﴾﴾ (الانفال : ۲)

''(اصل) مومن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان پر اس کی آیات پڑھی جائیں تو انھیں ایمان میں بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسا رکھتے ہیں۔''

مراد یہ ہے کہ مومنین اللہ کے سوا کسی اور سے امیدیں وابستہ نہیں کرتے اور نہ ہی کسی اور سے حاجت برآری کا ارادہ رکھتے ہیں اور اللہ کے علاوہ کسی کے دربار کی حاضری نہیں دیتے اور اللہ کے علاوہ کسی اور سے حاجت روائی کے خواہاں نہیں ہوتے اور اللہ ہی کے حضور اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہیں اور اس بات کا ان کو بخوبی علم ہے کہ اللہ جو چاہتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے اور جو نہیں چاہتا اس کا ہونا محال ہے اور اللہ ہی کی ذات تن تنہا پورے جہان کی دیکھ

بھال اور اس میں تصرف کا کام انجام دے رہی ہے اس کا کوئی شریک اور ساجھی نہیں اور نہ ہی اس کے حکم اور تصرف میں کوئی رخنہ اندازی کرسکتا ہے اور وہ سریع الحساب بھی ہے۔ ❶

۴۔ انبیاء ورسل علیہم السلام کا اللہ کی ذات پر توکل کرنا:

اللہ تعالیٰ نے ہمیں توکل کے سلسلہ میں سیّدنا ابراہیم علیہ السلام اور ان کا ساتھ دینے والے مومنین صادقین کا اسوۂ اختیار کرنے اور اپنی ذات کے لیے قدوہ بنانے کا حکم دیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ﴾

(الممتحنہ: ٤)

''یقیناً تمھارے لیے ابراہیم اور ان لوگوں میں جو اس کے ساتھ تھے ایک اچھا نمونہ تھا۔''

اللہ تعالیٰ نے سیّدنا ابراہیم علیہ السلام اور ان کا ساتھ دینے والے مومنوں کے بارے میں وصف بیانی کرتے ہوئے مزید فرمایا ہے کہ انہوں نے اپنی قوتِ ایمانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بے جھجک دوٹوک الفاظ میں بڑی جرأت کے ساتھ کہا تھا:

﴿رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝۴﴾

(الممتحنہ: ٤)

''اے ہمارے رب! ہم نے تجھی پر بھروسا کیا اور تیری ہی طرف رجوع کیا اور تیری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔''

یہ تھا ان مومنین کاملین کا توکل واعتماد کا جذبہ جس کا انہوں نے برملا اظہار کیا ہے مذکورہ آیت کریمہ سے سیّدنا ابراہیم علیہ السلام اور ان کا ساتھ دینے والے مومنوں کی اللہ کی ذات پر توکل کی تصویر کشی ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنے سارے کے سارے معاملات میں مطلقاً زمام کار اللہ کے سپرد کردی تھی اور اپنے تمام امور میں اللہ کی ذات پر توکل واعتماد کو اللہ کی

❶ تفسیر ابن کثیر: ۲/۳۷۹.

رضا وخوشنودی کے حصول میں پوری توانائی اور جد وجہد صرف کرتے ہوئے ، اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔

پھر ابراہیم علیہ السلام کی قوم نے سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کو نذر آتش کرنے کا پلان بنایا اور اس غرض کے پیش نظر انہوں نے لکڑیاں اکٹھی کرنا شروع کر دیں اور لکڑیوں کا بہت بڑا انبار لگا دیا

امام سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اس زمانہ میں عورت کو مرض کا عارضہ لاحق ہوتا تھا اور وہ نذر مانتی تھی کہ اگر اس کو شفا مل گئی تو وہ سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کو نذر آتش کرنے کے لیے اپنے کندھے پر لکڑی لاد کر لے جائے گی اور اسے بطور نذرانہ پیش کرے گی۔" [1]

پھر انہوں نے اس لکڑی کے انبار کو زمین میں گڑھا کھود کر اس میں رکھا اور آگ سلگا دی، جب آگ سلگ کر لپٹیں مارنے لگی اور ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی موجوں کے مانند شعلہ زن ہو کر بھڑکنے لگی اور آسمان سے باتیں کرنے والی اس کی لپٹیں اٹھنے لگیں تو انہوں نے سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کو منجنیق میں نذر آتش کرنے کی غرض سے بٹھا دیا اس وقت سیّدنا ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا:

"اللہ کی ذات میرے لیے کافی وشافی ہے اور وہی میرا بہترین کارساز ہے۔"

جیسا کہ سیّدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ((حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ .)) کا جملہ سیّدنا ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت کہا تھا جبکہ وہ آگ میں ڈالے جا رہے تھے۔" [2]

اسی طرح سیّدنا موسیٰ علیہ السلام نے بھی اللہ کی ذات پر توکل کیا تھا اور اپنی قوم کو اللہ کی ذات پر توکل کرنے کا حکم دیا تھا:

﴿وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿٨٤﴾﴾ (یونس : ٨٤)

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ٢٤٧/٣.

[2] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب قوله الذين قال لهم الناس: ٤٥٦٣.

''اور موسیٰ نے کہا اے میری قوم! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو اسی پر بھروسا کرو، اگر تم فرماں بردار ہو۔''

فضیلۃ الشیخ سلیمان بن عبداللہ بن محمد بن عبدالوھاب رحمہ اللہ اس آیت کی توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو ارض مقدس میں اس امر کے بموجب داخل ہونے کا حکم دیا جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے واجب قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ وہاں موجود زور آور اور دیوہیکل لوگوں کے ڈر سے پیٹھ پھیر کر نہ بھاگیں بلکہ ان سے مقابلہ کے لیے قدم بڑھاتے چلے جائیں، نہ تو ان سے کسی طرح کا خوف کھائیں اور نہ ہی وہ ان سے ہیبت کھا کر مرعوبیت کا شکار ہوں اور نہ ہی دہشت کھا کر انھیں پیٹھ دکھائیں اپنی شکست وہزیمت کے وقت اللہ کی ذات پر توکل کریں اور اللہ کے وعدہ کو برحق سمجھتے ہوئے اس پر یقین رکھیں اگر وہ ایمان کی دولت سے سرشار ہیں۔''[1]

ہمارے لیے ہمارے نبی محمد ﷺ اور ان کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگی بہترین نمونہ ہے چنانچہ غزوۂ احد کے موقعہ سے اس غزوہ کے بارے میں قرآنی تصویر کشی ملاحظہ فرمایئے:

﴿اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿١٧٣﴾﴾

(آل عمران : ۱۷۳)

''وہ لوگ کہ لوگوں نے ان سے کہا کہ بے شک لوگوں نے تمھارے لیے (فوج) جمع کر لی ہے، سو ان سے ڈرو، تو اس (بات) نے انھیں ایمان میں زیادہ کر دیا اور انھوں نے کہا ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔''

[1] تیسیر العزیز الحمید : ٤٣٨.

سیّدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما ((حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ.)) کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''سیّدنا ابراہیم علیہ السلام نے یہ جملہ اس وقت کہا تھا جب انھیں نذر آتش کیا جارہا تھا اور ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جملہ اس وقت کہا جب دشمنانِ اسلام نے یہ افواہیں اڑانا شروع کردی تھیں۔

''ان کا قصہ یاد کرو جب کہ ان سے لوگوں نے کہا تھا کہ کافروں نے تمہارے مقابلہ کے لیے لشکر جمع کر لیے ہیں تم ان سے خوف کھاؤ تو اس بات نے انھیں ایمان میں اور بڑھا دیا اور وہ کہنے لگے ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ بہت اچھا کارساز ہے۔'' (آل عمران: ۷۳)

تو معلوم ہوا کہ جب دشمنان اسلام مومنوں کو ڈرانے دھمکانے لگیں اور انھیں خوف وہراس کا شکار بنانے کے درپے ہوجائیں تو اس موقع پر توکل مومن کا ہتھیار ہے کسی عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

''اللہ کی ذات قریب اور نزدیک ہے تمہاری دعاؤں کو قبول کرنے والی ہے اور مصیبت کے وقت اسی کی ذات مدد کرنے والی ہے لٰہذا تم کو ((حَسْبِيَ اللّٰهُ)) کہہ کر زبان حال سے اقرار کرنا چاہیے کہ میرا معبود اور میرے توکل کی جائے قرار اللہ کی ذات مقدس ہے۔''

ان مواقع کا بیان جن کے سیاق میں توکل کا ذکر آیا ہے

جن امور سے توکل کی قدرومنزلت اور اس کے عظمت وفضل کی وضاحت ہوتی ہے ان میں سے توکل کے ورود کے وہ مواقع بھی ہیں جن کے سیاق میں اس کو ذکر کیا گیا ہے اور بلاشبہ نصوص شرعیہ میں مختلف مقامات پر توکل کا ذکر وارد ہوا ہے ان میں سے چند یہ ہیں:

ا۔عبادت کے سیاق میں توکل کا بیان:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ﴾ (ھود: ۱۲۳)

''سو اس کی عبادت کر اور اس پر بھروسا کر۔''

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ اور مومنین کے لیے اپنی عبادت اور توکل کا بیک وقت ایک ہی سیاق میں ایک ہی مقام پر ذکر کر کے توکل کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ایک دوسری جگہ اپنے نبی کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَّ اتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝ وَّ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝﴾

(الاحزاب: ۲، ۳)

''اور اس کی پیروی کر جو تیرے رب کی جانب سے تیری طرف وحی کی جاتی ہے۔ یقیناً اللہ اس سے جو تم کرتے ہو، ہمیشہ پورا باخبر ہے۔ اور اللہ پر بھروسا کر اور اللہ وکیل کی حیثیت سے کافی ہے۔''

چنانچہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ کو جہاں اپنی عبادت کا حکم دیا ہے اور ان کو جو بھی وحی کے ذریعہ بتلایا جا رہا ہے اس کی پیروی کا حکم دیا ہے وہیں ان کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی ذات پر توکل کا بھی حکم دیا ہے اور نبی ﷺ کو حکم دینے کا مطلب آپ ﷺ کے بعد قیامت تک آنے والے امتیوں کو اس حکم کا مکلّف قرار دینا ہے، کیونکہ یہ اصولی قاعدہ ہے کہ جب نبی کو خطاب کیا جاتا ہے تو وہ براہِ راست اس کی امت کو خطاب ہوتا ہے الا یہ کہ نبی کے لیے اس حکم کی تخصیص کی دلیل وارد ہو جائے تو پھر وہ حکم نبی کے لیے خاص ہو جاتا ہے۔

۲۔ مقام دعوت وتبلیغ کے سیاق میں توکل:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴿١٢٩﴾﴾ (التوبة: ۱۲۹)

''پھر اگر وہ منہ موڑیں تو کہہ دے مجھے اللہ ہی کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے اسی پر بھروسا کیا اور وہی عرش عظیم کا رب ہے۔''

بلاشبہ یہ اللہ ہی ذات عالی ہے جو طاقت وقوت، ملک وبادشاہت،عظمت وکبریائی، جاہ وجلال،شان وشوکت میں اوج کمال پر فائز ہے جو شخص بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جناب میں پناہ گزیں ہو گیا اور جس نے اس کی ذات کا سہارا پکڑ لیا اللہ تعالیٰ اس کے لیے کافی ہو گیا اور جو شخص بھی اللہ کی ذات سے اس کے حفظ وامان میں رہنے کی درخواست کرے اللہ اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے اور اس شخص سے شرور وفتن کو دور کر دیتا ہے اور اس کی ہر طرح حمایت و حفاظت کرتا ہے گویا کہ اس کو اللہ کے حفظ وامان کا پروانہ مل جاتا ہے،نوح علیہ السلام نے مقام دعوت پر فائز ہوتے ہوئے اللہ کی ذات پر توکل اور بھروسا کیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَقَامِي وَتَذْكِيرِي بِآيَاتِ اللَّهِ فَعَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجْمِعُوا أَمْرَكُمْ وَشُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوا إِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُونِ ﴿٧١﴾﴾ (یونس: ۷۱)

''اور ان پر نوح کی خبر پڑھ، جب اس نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم! اگر میرا کھڑا ہونا اور اللہ کی آیات کے ساتھ میرا نصیحت کرنا تم پر بھاری گزرا ہے تو میں نے اللہ ہی پر بھروسا کیا ہے،سوتم اپنا معاملہ اپنے شرکاء کے ساتھ مل کر پکا کر لو، پھر تمھارا معاملہ تم پر کسی طرح مخفی نہ رہے، پھر میرے ساتھ کر گزرو اور مجھے مہلت نہ دو۔''

سیّدنا نوح علیہ السلام کی قوم نے ایک طویل وعریض عرصہ تک اپنی قوم میں دعوت وتبلیغ کا کام انجام دیئے، اور ایک لمبے عرصہ تک دعوت الی اللہ کے کام میں صبر واستقامت کا مظاہرہ کرنے کے بعد بھی جب آپ کی قوم نے ان کی ایک نہ سنی اور اس کے باوجود مزید آپ کی تکذیب کی اور آپ کو جھٹلایا تو آپ نے یہ موقف اختیار کیا اور اللہ کی ذات پر بھروسا کرتے ہوئے اپنے معاملہ کو اللہ کے ہاتھ میں سونپ دیا اور دعوت وتبلیغ کا کام جاری رکھا جو آپ کی قوتِ ایمانی اور عزم راسخ کی بین دلیل ہے۔

اسلامی دعاۃ کی دعوت وتبلیغ کی راہوں میں یہ شان کریمانہ ہونی چاہیے، ان کو چاہیے کہ دعوت کی راہ میں درپیش تکلیفوں کو خندہ پیشانی سے قبول کرتے ہوئے اس پر صبر کریں اور دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دینے کی خاطر اللہ پر توکل اور بھرپور اعتماد کا مظاہرہ کریں۔

۳۔ حکومت اور مہام سلطنت ادا کرنے والے قاضی کے لیے توکل:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ مَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖۗ وَ اِلَيْهِ اُنِيْبُ ۝۱۰ ﴾ (الشوریٰ : ۱۰)

''اور وہ چیز جس میں تم نے اختلاف کیا، کوئی بھی چیز ہو تو اس کا فیصلہ اللہ کے سپرد ہے، وہی اللہ میرا رب ہے، اسی پر میں نے بھروسا کیا اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔''

آیت کریمہ میں اس بات کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ قاضی یا حاکم وقت اگر حق پر ہے تو اس کو چاہیے کہ اپنے فیصلہ میں اللہ کی ذات پر توکل اور بھروسا کرتے ہوئے اٹل رہے تاکہ: اللہ تعالیٰ اس کی زبان سے عدل وانصاف کا فیصلہ صادر فرمائے۔

۴۔ میدان جنگ اور دشمنوں سے برسرِ پیکار ہوتے وقت توکل:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَ اللّٰهُ

سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٢١﴾ إِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتَانِ مِنكُمْ أَن تَفْشَلَا وَاللَّهُ وَلِيُّهُمَا ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿١٢٢﴾ ﴾ (آل عمران : ۱۲۱، ۱۲۲)

''اور جب تو صبح سویرے اپنے گھر والوں کے پاس سے نکلا، مومنوں کو لڑائی کے لیے مختلف ٹھکانوں پر مقرر کرتا تھا اور اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔ جب تم میں سے دو جماعتوں نے ارادہ کیا کہ ہمت ہار دیں، حالانکہ اللہ ان دونوں کا دوست تھا اور اللہ ہی پر پس لازم ہے کہ مومن بھروسا کریں۔''

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں مومنین کو حکم دیا ہے کہ وہ اللہ ہی ذات پر توکل واعتماد کریں اس کے باوجود کہ انہوں نے بطور اسباب جنگی ساز وسامان اور ہتھیاروں نیز فوجی افراد سے لشکر تیار کر لیا تھا پھر بھی ان کو توکل کا حکم دیا گیا ہے، کیونکہ نصرت کے ذریعہ فتح سے ہمکنار کرنے والی اللہ ہی کی ذات ہے اور اسی کی ذات غالب اور زورآور ہے، اس کی وضاحت قرآن کریم کی اس آیت سے بخوبی ہوکر سامنے آ جاتی ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِن يَنصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۖ وَإِن يَخْذُلْكُمْ فَمَن ذَا الَّذِي يَنصُرُكُم مِّن بَعْدِهِ ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿١٦٠﴾ ﴾

(آل عمران : ۱٦٠)

''اگر اللہ تمھاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب آنے والا نہیں اور اگر وہ تمھارا ساتھ چھوڑ دے تو وہ کون ہے جو اس کے بعد تمھاری مدد کرے گا اور اللہ ہی پر پس لازم ہے کہ مومن بھروسا کریں۔''

تو پتہ یہ چلا کہ کمزوری اور لاچاری، بے کسی اور بے بسی کے موقع پر اللہ ہی کی ذات نصرت ومدد کرنے والی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ هَمَّ قَوْمٌ أَن يَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿١١﴾ ﴾ (المائدہ : ۱۱)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو۔ جب کچھ لوگوں نے ارادہ کیا کہ تمھاری طرف اپنے ہاتھ بڑھائیں تو اس نے ان کے ہاتھ تم سے روک دیے اور اللہ سے ڈرو اور اللہ ہی پر پس لازم ہے کہ مومن بھروسا کریں۔"

یہی نہیں بلکہ اللہ نے قوت وشوکت سے مالا مال رہتے ہوئے بھی اپنے بندوں کی نصرت ومدد کرنے کا وعدہ کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا﴾ (التوبۃ: ۲۵)

بلاشبہ یقیناً اللہ نے بہت سی جگہوں میں تمھاری مدد فرمائی اور حنین کے دن بھی، جب تمھاری کثرت نے تمھیں خود پسند بنا دیا پھر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی۔"

اس سلسلہ میں ذرا موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بھی قرآنی سیاق میں ملاحظہ فرمائیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ﴿٢٢﴾ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۬ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٢٣﴾﴾

(المائدۃ: ۲۲، ۲۳)

"انھوں نے کہا اے موسیٰ! بے شک اس میں ایک بہت زبردست قوم ہے اور بے شک ہم ہرگز اس میں داخل نہ ہوں گے، یہاں تک کہ وہ اس سے نکل جائیں، پس اگر وہ اس سے نکل جائیں تو ہم ضرور داخل ہونے والے ہیں۔ دو آدمیوں نے کہا، جو ان لوگوں میں سے تھے جو ڈرتے تھے، ان دونوں پر اللہ نے انعام کیا تھا، تم ان پر دروازے میں داخل ہو جاؤ، پھر جب تم اس میں داخل ہو گئے تو یقیناً تم غالب ہو اور اللہ ہی پر پس بھروسا کرو، اگر تم مومن ہو۔"

۵۔ حالت امن میں اللہ پر توکل کرنا:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۶۱﴾ (الانفال : ٦١)

''اور اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تو بھی اس کی طرف مائل ہو جا اور اللہ پر بھروسا کر۔ بے شک وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔''

بعض لوگ (صلح) اور معاہدہ کے سیاق میں توکل کا حکم سن کر تعجب کی کیفیت سے دوچار ہو سکتے ہیں جب کہ جنگ وجدال اور معرکہ آرائی کی صورتحال یکسر ختم ہو چکی ہے اور دشمنوں نے مسلمانوں کے خلاف محاذ آرائی ختم کر دی ہے تو اس صورت میں توکل کا کیا فائدہ ہے؟

توکل کی اثر پذیری یا اس کے فائدے کے بہت سے مظاہر ہیں، انھی میں سے توکل کا واضح ترین مظہر وہ حالت بھی ہے جو صلح حدیبیہ کے بعد پیش آئی وہ اس موقع سے جبکہ قبیلہ قریش سے تعلق رکھنے والے مشرکین مکہ نے صلح کی رغبت کا اظہار کیا تھا تو نبی کریم ﷺ نے ان کی پیش کش کے بموجب مشرکین مکہ سے صلح کر لی تھی، اس صلح یا امن وامان کے معاہدے میں اللہ کی ذات پر توکل اور اعتماد کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی وجہ سے جزیرۂ عرب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد کشاں کشاں دامن اسلام کے سایہ تلے داخل ہوتی چلی گئی گویا کہ یہ صلح اللہ کی ذات پر توکل کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے فتح مبین ثابت ہوئی۔

۶۔ باہم مشورہ کے وقت اللہ کی ذات پر توکل اور اعتماد کرنا:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۠ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْھُمْ فِي

الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿١٥٩﴾

(آل عمران: ۱۵۹)

''پس اللہ کی طرف سے بڑی رحمت ہی کی وجہ سے تو ان کے لیے نرم ہو گیا ہے اور اگر تو بد خلق، سخت دل ہوتا تو یقیناً وہ تیرے گرد سے منتشر ہو جاتے، سو ان سے درگزر کر اور ان کے لیے بخشش کی دعا کر اور کام میں ان سے مشورہ کر، پھر جب تو پختہ ارادہ کر لے تو اللہ پر بھروسا کر، بے شک اللہ بھروسا کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

آیت مذکورہ میں اس بات کا واضح اشارہ ہے کہ باہمی طور پر مشورہ اور رائے زنی گویا کہ اسباب ووسائل اختیار کرنا ہے اور کسی معاملہ میں عزم جازم کر لینے کے بعد اپنی غرض کے حصول تک رسائی حاصل کرنے کا وسیلہ اور ذریعہ توکل علی اللہ ہے۔

ذرا بڑے بڑے لیڈروں اور نیتاؤں نیز اونچی اونچی پوسٹ پر فائز اہم شخصیات کے تعامل کا جائزہ لیں، ان میں سے بہت سے کبھی کسی مسئلہ کے حل کرنے کی غرض سے سیکڑوں لوگوں کو مشورے اور تجربہ کار شخصیات کو ان کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے اپنے اردگرد جمع کرتے ہیں اور وہ ان کو اپنے تئیں بیش قیمت مشوروں سے بھی نوازتے ہیں لیکن بالآخر نتیجہ کے طور پر ان کی پیش کردہ آراء اور ان کی طرف سے دیئے گئے مشورے مبنی برخطا ثابت ہوتے ہیں۔

تو پتہ یہ چلا کہ مشورے اور اسباب ووسائل اختیار کرنے کے بعد توکل علی اللہ ضروری ہے، اسے اس باب میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔

۷۔ رزق طلب کرنے کے بارے میں اللہ پر توکل اور بھروسا کرنا:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ؕ

ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۬ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۭ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۭ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝﴾ (الطلاق : ۲، ۳)

''پھر جب وہ اپنی میعاد کو پہنچنے لگیں تو انھیں اچھے طریقے سے روک لو، یا اچھے طریقے سے ان سے جدا ہو جاؤ اور اپنوں میں سے دو صاحب عدل آدمی گواہ بنا لو اور شہادت اللہ کے لیے قائم کرو۔ یہ وہ (حکم) ہے جس سے اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہے اور جو اللہ سے ڈرے گا وہ اس کے لیے نکلنے کا کوئی راستہ بنا دے گا۔ اور اسے رزق دے گا جہاں سے وہ گمان نہیں کرتا اور جو کوئی اللہ پر بھروسا کرے تو وہ اسے کافی ہے، بے شک اللہ اپنے کام کو پورا کرنے والا ہے، یقیناً اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کیا ہے۔''

سیّدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انھوں نے ارشاد فرمایا ہے:

''کتاب اللہ میں تفویض یا اپنے معاملہ کو اللہ کے سپرد کرنے بالفاظ دیگر توکل کرنے کے بارے میں عظیم ترین آیت سورۂ طلاق میں وارد شدہ مذکورہ آیت کریمہ ہے جس کا ترجمہ ابھی ابھی پیش کیا جا چکا ہے۔''[1]

سیّدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

''کوئی شخص کسی حال میں بھی اس وقت تک موت کی نیند نہیں سو سکتا جب تک کہ اس کا رزق اس کو بہم پہنچ نہ جائے اگرچہ دیر سویر ہی اس کو اس کا رزق کیوں نہ ملے (مگر مل کر رہے گا اتنا تو طے ہے) لہٰذا اللہ سے ڈرتے رہو اور اللہ سے مانگنے میں سلیقہ مندی کا انداز اختیار کرو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو حلال قرار دیا ہے اسے لے لو اور جس چیز کو اس نے حرام اور پلید قرار دیا ہے اسے چھوڑ دو۔''[2]

---

[1] ملاحظہ ہو: المعجم الکبیر : ۹/۱۳۳۔ [2] ابن ماجة : ۲۱۴۴ وصححه الالبانی۔

۸۔ عہد و پیمان اور قول و قرار کے سیاق میں توکل:

اللہ تعالیٰ نے سیّدنا یعقوب علیہ السلام کے قصہ کے سیاق میں اس موقع سے ان کے توکل کی تصویر کشی ہے جب کہ ان سے ان کی اولاد نے کہا تھا:

﴿ فَأَرْسِلْ مَعَنَآ أَخَانَا ﴾ (یوسف : ٦٣)

''ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو جانے دیں۔''

تو سیّدنا یعقوب علیہ السلام نے ان کو جواب دیا تھا:

﴿ قَالَ لَنْ أُرْسِلَهُ مَعَكُمْ حَتَّىٰ تُؤْتُونِ مَوْثِقًا مِّنَ اللَّهِ لَتَأْتُنَّنِي بِهِ إِلَّآ أَن يُحَاطَ بِكُمْ ۖ فَلَمَّآ آتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللَّهُ عَلَىٰ مَا نَقُولُ وَكِيلٌ ﴿٦٦﴾ ﴾ (یوسف : ٦٦)

''اس نے کہا میں اسے تمھارے ساتھ ہرگز نہ بھیجوں گا، یہاں تک کہ تم مجھے اللہ کا پختہ عہد دو گے کہ تم ہر صورت اسے میرے پاس لاؤ گے، مگر یہ کہ تمھیں گھیر لیا جائے۔ پھر جب انھوں نے اسے اپنا پختہ عہد دے دیا تو اس نے کہا اللہ اس پر جو ہم کہہ رہے ہیں، ضامن ہے۔''

کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ ''قول و قرار سے مراد کیا ہے؟'' تو اس سے مراد عہد و پیمان اور یمین مغلظہ (پکی قسم) ہے:

﴿ وَقَالَ يَٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوا مِنۢ بَابٍ وَٰحِدٍ وَادْخُلُوا مِنْ أَبْوَٰبٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۖ وَمَآ أُغْنِي عَنكُم مِّنَ اللَّهِ مِن شَيْءٍ ۖ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ ﴿٦٧﴾ ﴾ (یوسف : ٦٧)

''اور اس نے کہا اے میرے بیٹو! ایک دروازے سے داخل نہ ہونا اور الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا اور میں تم سے اللہ کی طرف سے (آنے والی) کوئی چیز نہیں ہٹا سکتا، حکم اللہ کے سوا کسی کا نہیں، اسی پر میں نے بھروسا کیا اور اسی پر پس لازم ہے کہ بھروسا کرنے والے بھروسا کریں۔''

۹۔ اللہ کے راستے میں ہجرت کرنے کرانے کے متعلق توکل:

دل پر رنج وغم کی اثر پذیری سے نڈھال اپنے متوکلین بندوں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے بڑے دلکش انداز میں ان کی تصویر کشی کی ہے، بایں طور کہ انسان ہجرت کے موقع پر اپنا گھر بار، وطن، مالوف ودیار محبوب اور مال ودولت چھوڑ کر غربت اختیار کرتا ہے اور اپنے کنبہ برادری، خاندان وگھر والوں اور ان کے ساتھ وابستہ یادوں کے نقوش بھلانے کی قربانی پیش کرتا ہے، مگر یہ ساری کی ساری قربانیاں اللہ کی ذات پر توکل واعتماد کرنے کی وجہ سے اس کے لیے آسان ہوجاتی ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَ لَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۴۲﴾﴾ (النحل: ۴۱ تا ۴۲)

''اور جن لوگوں نے اللہ کی خاطر وطن چھوڑا، اس کے بعد کہ ان پر ظلم کیا گیا، بلاشبہ ہم انھیں دنیا میں ضرور اچھا ٹھکانا دیں گے اور یقیناً آخرت کا اجر سب سے بڑا ہے۔ کاش! وہ جانتے ہوتے۔ وہ لوگ جنھوں نے صبر کیا اور اپنے رب ہی پر بھروسا کرتے ہیں۔''

ذرا نبی کریم ﷺ اور آپ کے یار غار کے توکل کا اندازہ لگایئے جو انہوں نے ہجرت کے راستہ میں محض اللہ کی خاطر کیا تھا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَ اَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَ جَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۰﴾﴾

(التوبة: ۴۰)

''اگر تم اس کی مدد نہ کرو تو بلاشبہ اللہ نے اس کی مدد کی، جب اسے ان لوگوں نے

نکال دیا جنھوں نے کفر کیا، جب کہ وہ دو میں دوسرا تھا، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا غم نہ کر، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ تو اللہ نے اپنی سکینت اس پر اتار دی اور اسے ان لشکروں کے ساتھ قوت دی جو تم نے نہیں دیکھے اور ان لوگوں کی بات نیچی کر دی جنھوں نے کفر کیا اور اللہ کی بات ہی سب سے اونچی ہے اور اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔"

۱۰۔ بیع وشراء، نوکری ومزدوری، شادی بیاہ میں توکل کا بیان:

اس قسم کا معاہدہ سیّدنا موسیٰ علیہ السلام کے قصہ سے متعلق ہے، خصوصاً اس موقع سے جو انہوں نے اللہ کے نیک وصالح بندے سے اس شرط پر اتفاق کرتے ہوئے کیا تھا کہ وہ آپ علیہ السلام سے اپنی بیٹی کی شادی کر دے گا مگر آپ ان کے یہاں آٹھ سال یا دس سال مزدوری یا نوکری کریں گے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قَالَ اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ عَلٰٓى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ ۚ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَ مَآ اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَيْكَ ؕ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۲۷ قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكَ ؕ اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ۝۲۸ ﴾ (القصص : ۲۷تا۲۸)

"اس نے کہا بے شک میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تجھ سے کر دوں، اس (شرط) پر کہ تو آٹھ سال میری مزدوری کرے گا، پھر اگر تو دس پورے کر دے تو وہ تیری طرف سے ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تجھ پر مشقت ڈالوں، اگر اللہ نے چاہا تو یقیناً تو مجھے نیک لوگوں سے پائے گا۔ کہا یہ بات میرے درمیان اور تیرے درمیان (طے) ہے، ان دونوں میں سے جو مدت میں پوری کر دوں تو مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہوگی اور ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں

اس پر اللہ گواہ ہے۔“

پھر کیا تھا موسیٰ علیہ السلام نے ان کے یہاں دس سال پورے کیے اور ان کو بخوبی نیز بحسن وکمال معاہدے کے مطابق گزارا جیسا کہ لڑکی کے والد سے وعدہ کیا تھا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس جگہ ایک لطیف اشارہ کیا ہے فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے مدت میں سے جو اکثر مدت تھی اس کو بحسن وخوبی پورا کیا کیونکہ اللہ کے رسول جو وعدہ کرتے ہیں وہ پورا کرتے ہیں اور نبی کے شایان شان بات یہی ہے کہ وہ اپنے وعدے کو من وعن بلکہ اس سے بھی اتم واکمل طریقہ پر پورا کرے۔

۱۱۔ آخرت طلب کرنے کے بارے میں توکل:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ؀﴾ (الشوریٰ: ۳۶)

”پس تمھیں جو بھی چیز دی گئی ہے وہ دنیا کی زندگی کا معمولی سامان ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہ بہتر اور زیادہ باقی رہنے والا ہے، ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اور صرف اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں۔“

کیا توکل کے لیے اس سے بھی اعظم کوئی مقام ہوگا اس لیے کہ آخرت تمناؤں اور آرزوؤں کی آماجگاہ ہے اور ہر مومن ومتقی کی حقیقی مراد آخرت ہی ہے اس لیے مومن کو چاہیے کہ وہ دار آخرت کو طلب کرنے اور وہاں کے عیش وعشرت کے حصول کی غرض سے اللہ پر توکل کرتے ہوئے اس نعمت کو اللہ کی ذات سے مانگے۔

ذاتِ باری تعالیٰ پر توکل اور بھروسا کرنے کے فوائد

❀ جو شخص اللہ کی ذات پر توکل اور اعتماد کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے کافی وشافی ہو جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۭ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۭ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝ ﴾ (الطلاق : ۲، ۳)

''اور جو اللہ سے ڈرے گا وہ اس کے لیے نکلنے کا کوئی راستہ بنا دے گا۔ اور اسے رزق دے گا جہاں سے وہ گمان نہیں کرتا اور جو کوئی اللہ پر بھروسا کرے تو وہ اسے کافی ہے، بے شک اللہ اپنے کام کو پورا کرنے والا ہے، یقیناً اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کیا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے ہر عمل کا بدلہ اس کے شایان شان مقرر کر رکھا ہے اور توکل کا بدلہ (توکل کرنے والے کے لیے) اللہ کی ذات کا کافی ہونا متعین کر دیا گیا ہے، جو شخص اللہ کی ذات کو اپنے لیے کافی ہونے کا سبب اور ذریعہ سمجھتا ہے اللہ تعالیٰ خود بخود اس کے لیے کافی ہونے کا وعدہ کرتا ہے اور جو شخص اللہ پر توکل کرتا ہے تو اللہ کی ذات اس کے لیے کافی وشافی ہے، کسی عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

''تم پر جب مصائب وآلام کا گھٹاٹوپ اندھیرا چھا جائے اور ناگفتہ بہ حالات کی گرداب میں جب تم پھنس جاؤ اور ہر طرف سے ناامیدی ہی ناامیدی دکھائی دے، نجات کے سارے راستے مسدود ہوتے ہوئے نظر آنے لگیں اور کسی صورت میں امید کی کوئی کرن دکھائی نہ دے رہی ہو، مایوسی میں ہو کا عالم ہو اور تمہاری یہ کیفیت ہو کہ تمہارے لیے ساحل سے ہم کنار ہونے کی کوئی صورت باقی نہ بچی ہو، نہ تو کوئی اسباب ہی تمہاری دسترس میں ہوں اور اس گھمبیر صورتحال میں نہ ہی تمہیں کوئی سہارا ملنے کی امید ہو اس کیفیت میں اللہ کی جانب سے اس کی نظر لطف وعنایت متوجہ ہو اور اس کی طرف سے مدد آجائے جو تمہارے وہم وگمان میں بھی نہ ہو بلکہ غفلت کی وجہ سے یہ کیفیت تمہارے دماغ سے محو ہو چکی ہو، اس حال میں اللہ تعالیٰ کے الطاف کریمانہ کا رخ تمہارے طرف ہو جائے

جبکہ تم اس پہلو سے یکسر غافل ہو۔'' [1]

اگر دیکھا جائے تو نبی کریم ﷺ اللہ کی ذات پر لوگوں کی بہ نسبت حد سے زیادہ توکل کرنے والے تھے، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس کا بدلہ دنیا ہی میں اپنی عنایات کی شکل میں عطا فرما کر سرخروئی سے ہم کنار کیا، وہ یوں کہ اللہ تعالیٰ بذات خود آپ ﷺ کے لیے کافی ہو گیا اور آپ ﷺ کی ذمہ داری اپنے ذمہ لے لی، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٤﴾ ﴾ (الانفال : ٦٤)

''اے نبی! تجھے اللہ کافی ہے اور ان مومنوں کو بھی جو تیرے پیچھے چلے ہیں۔''

مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بذات خود آپ ﷺ کے لیے اور ان مومنوں کے لیے جنہوں نے صدق دل سے اللہ کی ذات پر توکل کیا ہے کافی ہونے کا وعدہ کر لیا ہے اب کیا ہے؟ آپ کو اللہ کی کفالت مل گئی ہے یہ بہت روح افزا اور خوشی کی بات ہے، اس کے علاوہ ایک دوسری آیت کریمہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاِنْ يُّرِيْدُوْۤا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِيْۤ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٢﴾ ﴾ (الانفال : ٦٢)

''اور اگر وہ ارادہ کریں کہ تجھے دھوکا دیں تو بے شک تجھے اللہ ہی کافی ہے۔ وہی ہے جس نے تجھے اپنی مدد کے ساتھ اور مومنوں کے ساتھ قوت بخشی۔''

''اگر وہ آپ سے دغا بازی کرنا چاہیں تو اللہ کی ذات آپ کے لیے کافی ہے اللہ ہی نے اپنی نصرت و مدد اور مومنین کے ذریعہ آپ کی تائید کروائی ہے۔''

امام ابن قیم رحمہ اللہ حَسْبُكَ اللّٰهُ کی توضیح کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

''حَسْبُكَ کے معنی کافی وافی ہونے کے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات جس کے لیے کافی و وافی ہو جائے تو اس پر اس کے دشمن کے لیے وار کرنے کا کوئی

[1] ملاحظہ ہو: حیاۃ الحیوان الکبری : ۲/۱۷.

پہلو باقی نہیں بچتا اور اس صورت میں دشمن نہ ہی اپنے مد مقابل کو کوئی ایذاء پہنچا سکتا ہے الا یہ کہ جو اس کو پہنچنا ضروری ہے۔ اس آیت قرآنی کے پیش نظر ﴿لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى﴾ ''یہ تمہیں ستانے کے علاوہ اور کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے۔'' (آل عمران : ١١١)

جیسے گرمی کی شدت اور جاڑے کی حد سے زیادہ برودت، بھوک اور پیاس کی تکلیفیں یہ تو فطری امور ہیں، یہ انسان کے ساتھ لگے رہتے ہیں انھیں حسبك کے معانی ومفہوم میں داخل نہیں سمجھا جائے گا مراد یہ ہے کہ کوئی دشمن آپ ﷺ کو مضرت پہنچا کر اپنی تمنا اور آرزو پوری کر سکے ایسا نہیں ہو سکتا، کیونکہ تائید الٰہی آپ ﷺ کے ساتھ ہے اور اللہ نے آپ ﷺ کے لیے اپنے کافی ووافی ہونے کا وعدہ کر لیا ہے۔'' [1]

شیخ حفظہ اللہ فرماتے ہیں:

''ایک شیشانی شخص نے موسم حج میں آپ حفظہ اللہ کے سامنے یہ قصہ آ کر سنایا کہ روسیوں نے ان کے گھر کا گھراؤ کر لیا اور ان کے سارے گھر والے مارے خوف ودہشت کے گھر چھوڑ کر بھاگ گئے، مگر یہ شیشانی گھر سے بھاگ نکلنے میں کامیاب نہ ہو سکا، شیشانی کا کہنا ہے کہ جب میرے اوپر سخت گھڑی کا وقت آ گیا تو گھر کے قریب واقع کوڑے کرکٹ ڈالنے کے لیے مختص گڑھے میں جا کر میں چھپ گیا اور اس گڑھے میں چھپا رہا کیونکہ میرے پاس اسلحہ وغیرہ نہیں تھا کہ میں اپنی مدافعت کر سکوں اور نہ ہی اب میرے لیے بھاگنے کی مہلت تھی کہ جان بچا کر بھاگ جاؤں، روسی فوج کے نوجوان تلاش کرتے اور ڈھونڈتے ہوئے اس گڑھے کے قریب آ پہنچے جس میں میں چھپا ہوا تھا، اب میرے پاس اللہ کی ذات پر توکل کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ تھا، چنانچہ میں نے اللہ کی

[1] بدائع الفوائد : ٤٦٥/٢.

ذات پر توکل اور بھروسا کیا اور یہ آیت کریمہ کی تلاوت کرنے لگا:

﴿وَ جَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّ مِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝۹﴾ (یٰسٓ : ۹)

''اور ہم نے ان کے آگے سے ایک دیوار کر دی اور ان کے پیچھے سے ایک دیوار، پھر ہم نے انھیں ڈھانپ دیا تو وہ نہیں دیکھتے۔''

حتی کہ روسی فوجیوں میں سے ایک فوجی اس گڑھے تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا جس میں ہم چھپے ہوئے تھے اور اس نے میری آنکھ میں آنکھ ڈال کر ایک نظر میری طرف دیکھا بھی، اس کے باوجود اس نے اپنی بٹالین کے فوجیوں کو جا کر رپورٹ دی کہ اس گڑھے میں کوئی نہیں ہے، اس طرح وہ لوگ میرے گھر سے نکل گئے اور مجھے میری حالت پر چھوڑ دیا۔

یہ ہے اللہ کی ذات پر صدق دل سے توکل کرنے کے فوائد میں سے ایک اہم ترین فائدہ جس کا ذکر ابھی اس قصہ میں ہوا۔

☆ اللہ کی معیت کا صحیح معنوں میں شعور بھی اللہ کی ذات پر توکل کے فوائد میں سے ایک فائدہ ہے۔

کیوں کہ انسان جب بھی اللہ کی ذات پر توکل واعتماد کامل کرتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی معیت میں ہے اور اللہ ہی اس کی دلی تمنا تک رسائی کے لیے اس کا ناصر ومعین اور مددگار رہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایسے شخص کے دل ودماغ میں صحیح معنوں میں ہر وقت اور ہر لمحہ اللہ کی معیت واستحضار کا شعور کروٹیں لیتا رہتا ہے وہ کبھی اللہ کی یاد سے غافل نہیں رہتا۔

☆ رب کریم کی محبت کے حصول کا ذریعہ توکل ہے۔

اللہ تعالیٰ ہر اس شخص سے محبت کرتا ہے جو اس کی ذات پر صحیح معنوں میں توکل کرتا ہے، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس توکل کرنے والے شخص نے اللہ کے حکم کے بموجب عمل کرتے ہوئے اللہ کی ذات پر بھروسا اور اعتماد کیا ہے اور ان اسباب ووسائل کو بھی اختیار کیا

ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے توکل کرنے کے بارے میں اختیار کرنے کو مشروع قرار دیا ہے گویا کہ اس کا قلب وقالب رب کریم کی ذات سے تعلق کی دولت سے سرشار اور ہر وقت اسی سے لو لگائے ہوئے ہے۔

اسی طرح توکل کی وجہ سے رب کریم اور اپنے خالق و مالک سے بندے کی محبت میں روز افزوں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، کیونکہ بندے کو بخوبی علم ہے کہ اللہ کی ذات ہی اس کی محافظ، نگہبان، معین ومددگار، آسودگی واطمینان اور روزی روٹی کا انتظام وانصرام کرنے والی ہے۔

☆ اللہ کی ذات پر توکل دشمنوں اور حاسدوں پر فتح ونصرت دلانے میں معین ومددگار بن کر نمودار ہوتا ہے۔

جو شخص اللہ کی ذات پر بھروسا کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو دشمنوں پر فتح وکامیابی سے ہم کنار کرتا ہے اور اس کے لیے دشمنوں پر کامیابی کے حصول کے اسباب مہیا کرتا چلا جاتا ہے اور اس کے دشمنوں کو اس کی نگاہوں کے سامنے ذلیل و رسوا کر دیتا ہے اس بدیہی حقیقت کا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے چشم دید مشاہدہ کیا تھا، کیونکہ اس پر ان کا یقین تھا اسی لیے تو انہوں نے کہا تھا:

﴿ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾ ﴾ (آل عمران : ۱۷۳تا۱۷۴)

”ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔ تو وہ اللہ کی طرف سے عظیم نعمت اور فضل کے ساتھ لوٹے، انھیں کوئی برائی نہیں پہنچی اور انھوں نے اللہ کی رضا کی پیروی کی اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے۔“

اللہ تعالیٰ نے غزوۂ احزاب کے موقع سے مومنوں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ وَ لَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ

رَسُولُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ﴿۲۲﴾

(الاحزاب: ۲۲)

''اور جب مومنوں نے لشکروں کو دیکھا تو انھوں نے کہا یہ وہی ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا، اور اس چیز نے ان کو ایمان اور فرماں برداری ہی میں زیادہ کیا۔''

☆ توکل کے فوائد میں سے ایک فائدہ جنت میں بے حساب وکتاب داخلہ بھی ہے۔

توکل کے فضائل میں یہ بھی وارد ہوا ہے کہ اللہ کی ذات پر توکل کرنے کی وجہ سے امت محمدیہ (علی صاحبہا الصلاۃ والسلام) میں سے ستر ہزار امتی بغیر حساب وکتاب کے براہِ راست جنت میں داخل ہونے کی سعادت حاصل کریں گے، سیّدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''(مجھ پر (سابقہ) امتوں کو پیش کیا گیا تو ایک ایک دو دو نبی گزرنے لگے اور ان کے ساتھ (ان کی امت کے افراد کی معمولی نفری بھی تھی) اور بعض نبی ایسے بھی گزرے جن کے ساتھ کوئی نہ تھا (یہاں تک دور سے ایک سواد اعظم آتا ہوا دکھائی دیا) تو میں نے کہا (یہ کیا ہے؟) کیا یہ میری امت ہے؟ جواب ملا یہ موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم ہے، پھر کہا گیا کہ ذرا اُفق کی طرف نظر اٹھا کر دیکھو، تو دیکھتے کیا ہیں ایک کالے بادل کے مانند سواد اعظم ہے جو افق پر چھا گیا ہے، پھر مجھ سے کہا گیا! ذرا ادھر ادھر آسمان کے افق کا مشاہدہ کرو تو دیکھتا کیا ہوں کہ ایک کالی بدلی ہے جس نے افق کو ڈھانپ لیا ہے، تو کہا گیا یہ آپ کی امت ہے! ان میں سے ستر ہزار افراد بغیر حساب وکتاب کے جنت میں داخل ہوں گے، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گھر کے اندر داخل ہو گئے اور مزید توضیح نہیں فرمائی تو لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔ ان میں سے بعض کہنے لگے: بغیر حساب کے ہم داخل ہوں گے کیونکہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور ہم نے اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اور پیروی کی، لہٰذا اس سے مراد ہم لوگ ہی ہیں، یا ہماری اولاد ہے جس نے حالت اسلام میں آنکھیں کھولی ہیں ہم تو دور جاہلیت میں پیدا ہوئے ہیں۔ یہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک

پہنچی تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''یہ وہ لوگ ہیں جو تعویذ گنڈے نہیں کرتے اور نہ ہی شگون لیتے ہیں اور فال نکلواتے ہیں اور نہ ہی مثلہ کرتے ہیں اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔'' تو سیّدنا عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: ''میرا شمار بھی ان لوگوں میں ہے (اے اللہ کے رسول!) جن کا تذکرہ آپ نے فرمایا ہے۔'' تو نبی کریم ﷺ نے جواب دیا: ''ہاں، تم بھی انہی میں سے ہو۔'' یہ سن کر ایک اور شخص کھڑا ہوا اور اس نے بھی نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: ''میں بھی انھیں میں سے ہوں؟'' تو نبی کریم ﷺ نے جواب دیا: ''اس بارے میں عکاشہ تم سے بازی لے گئے۔''[1]

☆ اللہ کی ذات پر توکل حصول رزق کی کنجی ہے۔

سیّدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:
''اگر تم اللہ کی ذات پر حقیقی توکل کرنے لگو تو اللہ تعالیٰ تم کو ٹھیک اس طرح رزق سے نوازنے لگے جیسے کہ وہ چرند و پرند کو نوازتا ہے، ذرا پرندوں کو دیکھو وہ صبح کو خالی پیٹ نکلتے ہیں اور شام کو شکم سیر ہو کر لوٹتے ہیں۔''[2]

☆ توکل جان و مال عزت و آبرو اہل و عیال کی حفاظت کا ذریعہ ہے۔

اسی لیے سیّدنا یعقوب علیہ السلام نے جب اپنے بیٹوں کو حفظان جان کے بارے میں نصیحتیں کیں تو اس کے بعد اپنے معاملہ کو اللہ کی ذات پر توکل کرتے ہوئے اس کے بھروسا پر چھوڑ دیا، جیسا کہ اس آیت سے پتہ چلتا ہے:

﴿ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ ﴾

(یوسف: ٦٧)

''حکم اللہ کے سوا کسی کا نہیں، اسی پر میں نے بھروسا کیا اور اسی پر پس لازم ہے کہ بھروسا کرنے والے بھروسا کریں۔''

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الطب، باب من اکتوی أو کوی غیره: ٥٧٠٥.

[2] ترمذي، کتاب الزهد، باب في التوکل علی الله: ٢٣٤٤ وصححه الحاکم

کیونکہ اللہ ہی کی ذات محافظ ونگہبان ہے، لہٰذا اسی کی ذات پر جان ومال عزت وآبرو اہل وعیال کی حفاظت کے بارے میں اعتماد اور بھروسا کرنا چاہیے کیونکہ وہی معتمد علیہ ہے۔

☆ توکل کے فوائد میں سے ایک فائدہ شیطان رجیم سے حفاظت وحراست بھی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّمَا النَّجْوَىٰ مِنَ الشَّيْطَانِ لِيَحْزُنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَيْسَ بِضَارِّهِمْ شَيْئًا إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿١٠﴾﴾

(المجادلة: ١٠)

''یہ سرگوشی تو شیطان ہی کی طرف سے ہے، تاکہ وہ ان لوگوں کو غم میں مبتلا کرے جو ایمان لائے، حالانکہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر انھیں ہرگز کوئی نقصان پہنچانے والا نہیں اور اللہ ہی پر پس لازم ہے کہ مومن بھروسا کریں۔''

آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ شیطان اللہ کے بندوں کو اللہ کی اجازت کے بغیر نقصان نہیں پہنچا سکتا، اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے بندوں کو اپنی ذات اقدس پر توکل کرنے کا حکم دیا ہے تاکہ ان کو شیطان سے حفاظت وحراست کا پروانہ مل جائے اور وہ اللہ کی حفاظت کے حصار میں حصار بند ہو جائیں۔ سیّدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس شخص نے گھر سے نکلتے وقت یہ دعا پڑھی:

((بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ.))

''میں اللہ کا نام لے کر ابتداء کرتے ہوئے کہنا چاہ رہا ہوں کہ میں نے اللہ کی ذات پر توکل اور اعتماد کیا ہے اللہ کی ذات کے علاوہ کوئی طاقت وقوت اور بچاؤ نہیں۔''

اس سے کہا جاتا ہے تو کفایت یافتہ، نجات یافتہ ہوگیا اور شیطان اس سے دور ہٹ جاتا ہے۔'' [1]

---

[1] ترمذي، كتاب الدعوات، باب ما جاء ما يقول إذا خرج من بيته: ٣٤٢٦ وصححه الالباني

☆ اللہ کی ذات پر توکل نفسانی راحت اور حقیقی چین وسکون کا ذریعہ ہے۔

بندہ اپنی مراد تک رسائی کے لیے چاہے جتنے اسباب ووسائل کا سہارا اختیار کرلے مگر بربنائے تقاضا بشریت کہیں نہ کہیں خلل ضرور باقی رہ جاتا ہے سو فیصد نقص وضعف کا ازالہ ناممکن ہے، کہیں نہ کہیں کمزور پہلو کی وجہ سے تشنگی ضرور باقی رہ جاتی ہے جہاں سے ناکامی کا خطرہ منڈلاتا رہتا ہے اور سو فیصد اس دروازے کو بند کرنا محال ہے جہاں سے اسے اپنی دلی مراد تک رسائی میں ناکامی کا اندیشہ ہے لیکن بندہ جب اللہ کی ذات پر بھروسا کر کے صدقِ دل سے توکل واعتماد کر لیتا ہے اور اس بات پر اس کو پختہ یقین ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے بہرصورت تمام معاملات میں کافی ہے تو پھر اسے اپنے مقصد تک رسائی میں پیش آمدہ خطرات کا خدشہ نہیں رہتا اور اس کو راحت نفس اور دلی چین وسکون نصیب ہو جاتا ہے۔

پھر اللہ کی ذات پر توکل واعتماد کی وجہ سے انسان نفسیاتی بے چینی واضطراب اور اعصابی تناؤ سے مامون ومحفوظ ہو جاتا ہے، اگر نفسیاتی علاج ومعالجہ کرنے والے اسپیشلسٹ ڈاکٹرز کو توکل کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے اور ان کی توجہ اس جانب مرکوز ہو جائے تو وہ توکل کو اپنے علاج ومعالجہ میں سرفہرست جگہ دینے لگیں۔

عصر حاضر میں آزاد خیالی کا نعرہ لگانے والے اور ان کے ہم نوائی میں رطب اللسان رہنے والے لوگ اگر اللہ کی ذات پر حقیقی توکل کرنے لگیں تو انھیں خودکشی یا خودسوزی کی راہ اختیار کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے اور نہ ہی وہ خودکشی جیسے شیطانی حربہ کا سہارا لینے کے لیے آمادگی کا اظہار کریں بلکہ وہ اس طرح کے موقع پر اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرنے کے عادی بن جائیں اور اپنے آپ کو اسی رب کریم کی جناب میں پناہ گزینی کے لیے پیش کر دیں جو خالق ومالک ہے اور اللہ کی طرف سے مقدر قضا وقدر پر راضی ہو جائیں تو یہ نوبت درپیش نہ ہو جس سے آج یہ آزاد خیالی کا نعرہ لگانے والا گروہ دوچار ہے۔

☆ توکل عمل کی انجام دہی کے لیے عزم پیدا کرنے کا سبب ہے۔

اللہ کی ذات پر توکل قلب وقالب میں نشاط پیدا کرنے کا ذریعہ ہے اور عمل کی انجام

دہی کے لیے عزم کو بیدار کرنے کا آلہ کار ہے، کیونکہ توکل کی راہ اختیار کرنے میں مشروع اسباب ووسائل کا دروازہ کھول کر عمل کی انجام دہی کے لیے بندہ کے اندر عزم بیدار کرنا ہے اور جب انسان صحیح طور پر توکل کے معنی مفہوم سے آشنا ہوجاتا ہے تو وہ اسباب ووسائل اختیار کرتے ہوئے توکل کی ڈگر پر گامزن ہونے کے لیے تیار ہوکر چل پڑتا ہے اور توکل سے کام کی انجام دہی میں حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور نتائج حاصل ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔

☆ توکل عزت وکرامت، تونگری وغنیٰ نفسی کے حصول کا ذریعہ ہے۔

بندۂ مومن جب بھی اللہ کی ذات پر توکل کرتا ہے اور اپنے معاملہ کو اللہ کے حوالہ کر دیتا ہے تو اپنے آپ کو عزت وشرف سے محظوظ ہوتے ہوئے محسوس کرتا ہے کیونکہ اس نے اس ذات باری تعالیٰ پر اعتماد اور بھروسا کیا ہے جس کی صفت (عزیز) ہے اور توکل کرنے والے کو اللہ تعالیٰ لذت آشنائی عطا فرمالوگوں کی طرف سے بے نیازی کی دولت سے سرفراز فرمادیتا ہے، کیونکہ اس توکل کی وجہ سے بندہ نے اس ذات سے تعلق جوڑلیا ہے جو (غنی) ہے جس کی وجہ سے اس کی ذات بندوں کی طرف سے مستغنی ہوگئی۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَإِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝٤٩﴾ (الانفال : ٤٩)

''اور جو اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرے تو بے شک اللہ تعالیٰ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔''

آیت کریمہ میں توکل کے ذکر کرنے بعد اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے اسم (عزیز) کا استعمال وارد ہوا ہے، یہ اس بات کی غمازی ہے کہ جو شخص اللہ کی ذات پر توکل اور اعتماد کرتا ہے اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کو مقام عز وشرف سے نواز دیتا ہے اور جو شخص اللہ کی پناہ میں آجاتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے اپنی پناہ کا دامن کبھی نہیں کھینچتا بلکہ اس کو ہر طرح کی پناہ سے نوازتا چلا جاتا ہے۔

توکل بیک وقت علم قلب اور عمل قلب میں سے دونوں پہلوؤں کا جامع ہے

علم قلب اور عمل قلب جیسے دونوں پہلوؤں میں حصار بند ہونے کا نام توکل ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر علم قلب ہے کیا؟

علم قلب سے مراد:...... اس بات کا استحضار کہ ہر چیز تقدیر حکم الٰہی کی محتاج ہے، کائنات کے تمام امور کی زمام کار اللہ تعالیٰ کے قبضہ تصرف میں ہے۔

عمل قلب سے مراد:...... اس بات کا یقین کہ قلب کی تسکین خالق کائنات پر اعتماد و توکل اور اس کی ذات پر بھرپور اعتماد و بھروسا کرنے میں پنہاں ہے۔

اس اجمال کی وضاحت کے لیے ہم کہیں گے کہ اللہ پر توکل کرنے والے بندے کے لیے ضروری ہے کہ وہ مندرجہ ذیل امور کی تعلیم و تعلم کی کوشش کر کے ان پر بھرپور عبور حاصل کرے اس کے بعد ان کے بموجب عمل کرنے کا فریضہ انجام دے۔

۱۔ رب کریم کی اور اس کی صفات عظمیٰ کی معرفت حاصل کرے۔

بندے کے لیے ضروری ہے کہ رب کریم کی معرفت اس کے اسمائے حسنیٰ اور صفات عظمیٰ کی روشنی میں حاصل کرے (اپنے رب کریم کی قدرت کاملہ، اور بندہ کس طرح اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں کفایت یافتہ اور نجات یافتہ ہوتا ہے اس کی کنہ تک رسائی اور اللہ کی ذات کی قیومیت نیز اس کی قوت وسطوت اس کی عظمت و کبریائی اور اس کی حیات مطلقہ، اور یہ کہ اس پر نہ نیند کا غلبہ ہوتا ہے اور نہ اسے اونگھ آتی ہے اور نہ ہی وہ تھکان اور کمزوری محسوس کرتا ہے مذکورہ تمام صفات کے معانی و مفاہیم کا استحضار بندے کے لیے از حد ضروری ہے۔

جب بندہ ان تمام صفات کے معانی و مفاہیم سے آشنا ہو جائے تو خود بخود توکل کرنے لگے گا اور اس کو توکل کرتے وقت اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ اس نے اپنے معاملہ کو اس

ذات وحدہ لاشریک لہ کے سپرد کر دیا ہے جو قوی بھی ہے اور غالب وزورآور بھی۔

۲۔ توحید کی راہ میں ثابت قدمی اور استقامت ورسوخ پیدا کرنا۔

اگر بندہ توحید باری تعالیٰ کو اپنی زندگی میں رچا بسا لے تو گویا کہ توکل کے میدان میں اس کو بڑی حد تک کامیابی نصیب ہوگئی اور اس نے بازی جیت لی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ﴾

(التوبہ: ۱۲۹)

''تو کہہ دے مجھے اللہ ہی کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے اسی پر بھروسا کیا۔''

۳۔ اپنے تمام امور میں اللہ کی ذات پر اعتماد اور بھروسا پیدا کرنا۔

ہم اس طرح کا رویہ اختیار نہ کریں جس طرح بعض جاہل اور نادان لوگ کیا کرتے ہیں بایں طور کہ جب اسباب ووسائل منقطع ہوجاتے ہیں اور وہ مصائب وآفات کی گرداب میں پھنس جاتے ہیں تو اس وقت تو اللہ کی ذات پر توکل کر کے اس کی طرف انابت اور رجوع کرلیا کرتے ہیں اور عاجزی وانکساری کے ساتھ دعا کرتے ہیں اور جب مصائب وآلام کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور اسباب ووسائل مہیا ہوجاتے ہیں تو وہ توکل علی اللہ کے فریضہ کو بالائے طاق رکھ کر بھول جاتے ہیں اور ان اسباب ووسائل پر توکل کا تعلق روا رکھنا شروع کر دیتے ہیں جن کی نہ کوئی حیثیت ہے اور نہ اہمیت، اصل تو اللہ کی ذات پر توکل واعتماد کرنا ہے۔

۴۔ اللہ کی ذات سے حسن ظن رکھنا بھی توکل کے لیے اہم ترین امر کی حیثیت رکھتا ہے۔

جب بندہ مومن نے اپنے رب کریم کی ذات پر توکل اور بھروسا کرلیا تو اس کو چاہیے کہ وہ رب کریم کی ذات والا صفات سے بھی حسن ظن رکھے اور اس کو اس بات کا یقین ہو کہ جس شخص نے اللہ کی ذات پر بھروسا کرلیا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے کافی ہوگیا اب اس کے قلب مضطر میں بے چینی اور اضطراب پیدا نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی دنیا کے عروج وزوال (اور اس کے اقبال وادبار) کی اسے کوئی پرواہ ہونی چاہیے، کیونکہ اس کا اللہ کی ذات ستودہ صفات پر

توکل واعتماد بحال ہو چکا ہے، اس کا حال اس شخص کی طرح ہے جس کو بادشاہ وقت نے بطور انعام ایک درہم عطا کیا ہو اتفاق سے اس کا درہم چوری ہو جائے، بادشاہ کو اس کا پتہ چل جائے کہ وہ درہم چوری ہو گیا ہے تو بادشاہ اس شخص کو بلا کر کہے کہ: میرے پاس اس جیسے بے حساب دراہم و دینار ہیں کوئی بات نہیں (بے فکر رہو) جب بھی تم ضرورت کے وقت حاضر ہو گے میں تم کو اپنے خزانہ سے اس سے کئی گنا زیادہ دوں گا تو جس شخص کو اس بات کا یقین ہو کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات (ملک الملوک) ہے وہ بادشاہوں کا بادشاہ ہے اور اس کے خزانے معمور ہیں، بالفرض اگر بندے کو حرماں نصیبی کا سامنا ہے تو اسے بے چین اور مضطرب نہیں ہونا چاہیے بلکہ اللہ کی ذات سے حسن ظن رکھنا چاہیے یہی مومن کی شان ہے اور حدیث قدسی میں وارد ہوا ہے اللہ جل جلالہ ارشاد فرماتا ہے: ''میں اپنے بندے کے وہم وگمان کے مطابق اس کے ساتھ ہوں۔'' [1] لہٰذا اللہ کی ذات سے حسن ظن روا رکھو، یہ حسن ظن ہی تم کو اللہ کی ذات پر توکل کے لیے آمادہ کرے گا اور اللہ کی ذات پر توکل کا مطلب ہی یہی ہے کہ اس میں اللہ کی ذات کریمی سے حسن ظن کی چاشنی آمیزاں ہو اور باری تعالیٰ کی ذات سے یہی حسن ظن توکل کہلاتا ہے۔

۵۔ اللہ کے سامنے قلب وقالب کے ساتھ سپر انداز ہو جانا توکل کا تقاضا ہے۔

اگر بندہ اللہ کی تابعداری کے لیے اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دے جیسے کہ ایک معمولی غلام اپنے آقا کی تابعداری کے لیے اور اپنے مالک کی خدمت کی خاطر ہر وقت تیار اور ریڈی رہتا ہے اس کے لیے خود سپردگی کا مظاہرہ کرتا ہے تو خود بخود توکل کے حصار میں داخل ہو جائے گا کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

''اگر تم مصائب وآلام سے دوچار ہو تو اللہ کی ذات پر بھروسا کرو اور راضی برضا رہو، بلاشبہ مصائب وآلام سے نجات دینے والی اللہ ہی کی ذات اقدس ہے۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ ﴿وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَه.....﴾ : ۷۴۰۵۔ صحیح مسلم : ۲۶۷۵۔

اور اگر اللہ نے تمہارے لیے ابتلاء و آزمائش مقدر کر دی ہے تو اس کی تقدیر کے سامنے سر تسلیم خم کر دو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تقدیر میں جو لکھ دیا ہے اس کو ٹالنے کی کسی کے اندر طاقت وقوت نہیں۔ نا اُمیدی انسان کو توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ لہٰذا ناامیدی کا ہرگز ہرگز شکار مت ہو کیونکہ اللہ کی ذات قادر مطلق ہے اور اس قادر مطلق کا کیا کہنا؟'' ❶

۶۔ اس کے بعد تفویض (یعنی اللہ کی تحویل میں) اپنے آپ کو سپرد کر دینا۔

آل فرعون میں سے مومن شخص کی زبانی اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ فَسَتَذْكُرُونَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ۭ وَ اُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ ﴾ (المومن: ٤٤)

''پس عنقریب تم یاد کرو گے جو میں تم سے کہہ رہا ہوں اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔''

سیّدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

''کتاب اللہ میں تفویض کے اعتبار سے عظیم ترین آیت کریمہ یہ ہے:

﴿ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۭ ﴾ (الطلاق: ۲، ۳)

''اور جو اللہ سے ڈرے گا وہ اس کے لیے نکلنے کا کوئی راستہ بنا دے گا۔ اور اسے رزق دے گا جہاں سے وہ گمان نہیں کرتا۔''

''جو شخص اللہ کا تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے گلو خلاصی کی مراد نکال دیتا ہے اور اس کے لیے ایسی جگہ سے روزی کا بندبست فرما دیتا ہے جس کا اس کو وہم و گمان تک نہیں ہوتا جو شخص اللہ کی ذات پر اعتماد اور بھروسا کرتا ہے اللہ تعالیٰ بذات خود اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے بلاشبہ اللہ تعالیٰ اپنے حکم کو پایہ تکمیل تک

❶ المستطرف: ۲/ ۱۵۱۔

پہنچا کر رہے گا۔ مراد یہ ہے کہ وہ جو چاہے وہ ہو کر رہے گا اسے کوئی روکنے والا یا اس کے حکم میں کوئی رخنہ اندازی کرنے والا نہیں) اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر فرمادیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ تنگیوں اور آسانیوں دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ نے ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔'' ❶

امام ابن قیم اپنے شیخ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں طے شدہ بات دو چیزوں کو اپنے جلو میں لیے ہوئے ہوتی ہیں، ایک تو تقدیر کے وقوع سے قبل توکل اور تقدیر کے واقع ہوجانے کے بعد اللہ کے فیصلہ پر رضامندی، یہ دونوں چیزیں مقدور کو آگے پیچھے سے گھیرے رہتی ہیں، چنانچہ جس شخص نے کام کی انجام دہی سے قبل اللہ کی ذات پر توکل اور بھروسا کیا اور کام انجام دہی کی بعد راضی برضا رہا اس نے عبودیت اور بندگی کا حق ادا کردیا۔'' ❷

اسی لیے ذرا دعائے استخارہ پر غور وخوض کیجئے تو آپ کو حدیث میں دعائے استخارہ کے اس جملہ کے اندر تفویض کی حقیقت بخوبی معلوم ہوجائے گی ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ استخارہ کرنے والا یہ بھی کہے:

''اے اللہ خیر وبھلائی میرے مقدر فرمادے، چاہے جہاں کہیں بھی ہو اسے میری جھولی میں لاکر ڈال دے اور پھر مجھ کو اس پر قناعت عطا فرمایا راضی برضا ہونے کی توفیق عطا فرمادے۔'' ❸

لہٰذا اللہ کی ذات پر توکل اس کے مقدر کیے ہوئے فیصلہ کے وقوع سے اور تقدیر میں کیے ہوئے فیصلہ کے وقوع کے بعد اس پر رضامندی کا اظہار تفویض کہلاتا ہے۔

۷۔ اسباب ومسبب حقیقی کے اثبات کا بیان اور اس بات کا انکشاف کہ اسباب یا مسببات

---

❶ المعجم الكبير : ۱۱۳/۹.	❷ مدارج السالكين : ۱۲۲/۲.

❸ صحيح بخاري : ۱۱۱٦.

بذاتِ خود اثر انداز ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

لہٰذا جو شخص اسباب ووسائل کے وجود کا انکار کرے یا انہیں بے کار سمجھے وہ غبی یا مجنون ہے اور جو شخص اسباب ووسائل پر اعتماد یا تکیہ کر کے بیٹھ جائے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت کاملہ وشاملہ پر اعتماد وبھروسا نہ کرے تو وہ شرک کا مرتکب گردانا جائے گا اسی لیے سیّدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص آیا اور اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت آ کر عرض کیا: (یارسول اللہ!) کیا میں اپنے اونٹ کو باندھ دوں اور توکل کروں؟ یا میں اس کو آزاد چھوڑ دوں اور توکل کروں؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا اسے رسی سے باندھ دو اور اللہ کی ذات پر توکل وبھروسا کرو (مراد یہ ہے کہ اسباب اختیار کرنے کے بعد توکل کرو۔) [1] اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کے پاس دعاء ومناجات کے علاوہ اور کوئی ایسا وسیلہ باقی نہیں رہتا جس کا وہ سہارا لے تو (دعاء کیا ہی خوب سہارا ہے؟)

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اسباب اختیار کرنے کا ہنر تک سکھلا دیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ﴾ (الملك: ١٥)

”وہی ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو تابع بنا دیا، سو اس کے کندھوں پر چلو اور اس کے دیے ہوئے میں سے کھاؤ۔“

اور ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝۱۰﴾ (الجمعة: ١٠)

”پھر جب نماز پوری کر لی جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل سے (حصہ) تلاش کرو اور اللہ کو بہت یاد کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔“

---

[1] ترمذی، كتاب صفة القيامة، باب حديث اعقلها و توكل: ٢٥١٧ و حسنة الالبانی۔

اسی طرح ایک جگہ اور بھی ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾

(المزمل: ٢٠)

''اور کچھ دوسرے زمین میں سفر کریں گے، اللہ کا فضل تلاش کریں گے۔''

اسی لیے جب امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے ان لوگوں کے بارے میں دریافت کیا گیا جو اپنے آپ کو خوامخواہ (متوکلین) کہلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر توکل کرکے بیٹھ جاتے ہیں اور ہماری روزی روٹی اللہ کے ذمہ ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے جواب دیا کہ یہ قول بڑا بودا اور بھونڈا ہے بلکہ ردّی کے ٹوکرے میں پھینک دینے کے لائق ہے، کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝﴾ (الجمعة: ٩، ١٠)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف لپکو اور خرید وفروخت چھوڑ دو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو۔ پھر جب نماز پوری کر لی جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل سے (حصہ) تلاش کرو اور اللہ کو بہت یاد کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

توکل کے منافی اُمور

۱۔ بدفالی اور شگون کرنا یا کروانا / یا بدقسمتی وبدتقدیری کا عقیدہ رکھنا:

بدفالی اور شومی بخت اس کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص کسی چیز کو دیکھے یا اس کے کانوں میں کوئی آواز پڑے اس سے وہ شگون لے یا فال نکالے، پھر اس کے ذریعہ یہ تکّا لگائے کہ

اس نے جس چیز کا مشاہدہ کیا یا دیکھا ہے یا اس کے کانوں میں جو آواز پڑی ہے اس کی نحوست کی وجہ سے اس کی دلی مراد ہرگز ہرگز پوری نہیں ہوسکتی، یا یہ عقیدہ رکھے کہ اب اس کو شگون کے طور پر اس کی وجہ سے اپنے کام کی انجام دہی کو فی الحال روک دینا چاہیے، اس قسم کی بدفالی یا بدشگونی توکل کے منافی امر ہے، کیونکہ انسان کے قلب کا تعلق اللہ وحدہ لاشریک کی ذات سے جڑا ہوا ہے اور اس متوکل کا اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس پر بھرپور اعتماد اور بھروسا ہے، کسی اندھے، کانے، لنگڑے لولے کو دیکھ لینے یا کسی پرندے کے الٹی اڑان بھرنے یا ہوائی جہاز میں ۱۳/ نمبر کی سیٹ بک ہونے یا اس کے علاوہ دیگر باطل نظریات اور من مانی اٹکل پچوؤں اور طرح طرح کی بے حمیت بدفالیوں سے اللہ کے ذات پر اعتماد اور توکل کرنے والے کی قسمت اور نصیب کو اللہ کے علاوہ اور کوئی ادنیٰ سی بھی گزند نہیں پہنچا سکتا، اللہ کے نبی ﷺ نے اس قسم کی بدفالی اور بدشگونی سے صراحتاً منع فرمایا ہے ارشاد نبوی ہے: ''اسلام میں بدفالی اور بدشگونی کا نام ونشان تک نہیں۔'' [1] اور بدفالی یا شومی بخت اور شومی قسمت صرف توکل ہی کے منافی امر نہیں بلکہ یہ تو عقیدۂ توحید کے منافی مسئلہ ہے، اس سے انسان توحید کے دائرے سے نکل کر شرک کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔

۲۔ فال گوئی یا کنڈلی نکالنا اور ستاروں یا پچھتر وغیرہ سے پیشین گوئی کرنا:

کاہنوں یا کنڈلی نکالنے والے پنڈتوں اور نجومیوں کے پاس غیبی امور کی معرفت حاصل کرنے کی غرض سے جانا یا آئندہ کیا ہونے والا ہے اس کی خبر لگانے کے لیے ان کے پاس آنا جانا توکل علی اللہ کے منافی امور میں سے ایک امر ہے اگر مومن اللہ کی ذات پر حقیقی توکل کرتا ہے اور اللہ کی ذات پر اس کا پختہ اعتماد ہے تو وہ اللہ کے علاوہ کسی کے پاس اپنی حاجت برآری کے لیے نہیں جاتا اور نہ وہ کسی ایسے شخص سے مستقبل کی خبریں معلوم کرنے کی غرض سے اس کے پاس جاتا ہے جو خود محتاج ہے اس کو کہاں سے غیب کی خبر کا علم ہوسکتا ہے، یہ بات غیر ممکن ہے کہ وہ غیب کی خبروں کا علم رکھتا ہو۔

---

[1] صحیح بخاری: ٤٥٥٧۔ صحیح مسلم: ٢٢٢٠۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس مسئلہ میں یوں رقمطراز ہیں کہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے خوارج سے جنگ کے لیے جب کوچ کرنا چاہا اس وقت ان کے سامنے ایک نجومی کو لاکر پیش کیا گیا اس نے سیّدنا علی رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: امیر المومنین! آپ اس وقت سفر کے لیے نہ نکلیں، کیونکہ چاند برج عقرب میں چل رہا ہے، اس صورتحال میں آپ کے لشکر کو شکشت خوردگی اٹھانی پڑے گی یہ اور اس طرح کی بات اس نے امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے سامنے عرض کی تو اس موقع پر سیّدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس کو برجستہ توکل علی اللہ سے سرشار خالص متوکلانہ جواب دیا کہ ہم تو اللہ کی ذات پر اعتماد اور بھروسا کرتے ہوئے اور تمہاری تکہ بازیوں کو جھٹلاتے ہوئے جنگ کے لیے ضرور کوچ کریں گے، چنانچہ امیر المومنین سیّدنا علی رضی اللہ عنہ اس مہم کو سر کرنے کی غرض سے سفر پر نکل گئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اس سفر کو باعث خیر و برکت بنایا، حتی کہ اس غزوہ میں تمام خوارج کا سرے سے صفایا ہوگیا اور یہ سفر مسلمانوں کے لیے عظیم الشان کارنامہ کی نوید بشارت ثابت ہوا کیونکہ خوارج سے یہ جنگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں عمل میں آئی تھی۔ [1]

تو پتہ یہ چلا کہ اگر مومن کامل کسی کاہن یا نجومی، یا کنڈلی نکال والے کے منہ سے کوئی تکہ بازی یا اٹکل بازی سنے تو اسے چاہیے کہ وہ اس کی مخالفت میں اس کے بتلائے طریقہ کے الٹا کام کرے اور اس نے جو کہا ہے اس کا کوئی اعتبار نہ کرے، تو ان شاء اللہ ایسے شخص کے لیے خیر ہی خیر ہے اور اسی میں اس کے لیے بھلائی واچھائی کا راز مضمر ہے۔

۳۔ توکل کے منافی امور میں تعویذ گنڈوں کا سہارا لینا بھی ہے:

اللہ کی ذات پر توکل اور اعتماد کے منافی امور میں سے تعویذ گنڈے لٹکانا بھی ہے، جیسا کہ بہت سے نادان لوگوں کا طور وطریقہ ہے کہ وہ ڈھونگیوں اور شعبدہ بازوں سے تعویذ اور گنڈے یا گھونگھے یا سیپیاں اور کوڈیاں لیتے ہیں اور اسے گردن یا گلے میں طوق بنا کر لٹکاتے ہیں، اس سے ان کی نظر میں ان کے معتقد کے اعتبار سے اپنی حفاظت مقصود ہوا کرتی ہے اس

[1] الفتاوی الکبری: ۱/ ۵۷۔

اجمال میں ہر طرح کے تعویذ وگنڈے داخل ہیں چاہے وہ سیپ یا گھونگھوں کی قبیل سے ہوں یا کاغذ پر لکھے ہوئے طلاسم کی شکل میں ہوں یا کوئی اور چیز سے بنے ہوئے ہوں ان ساری کی ساری چیزوں کا ایک ہی حکم ہے۔

جس شخص کا طرز عمل یہ ہو تو اس کا اللہ کی ذات پر توکل اور اعتماد کہاں گیا؟

اسی لیے ان لوگوں کی سزا بھی اسی نوعیت کی ہے جس نوعیت کا ان کا جرم ہے نبی کریم ﷺ نے اپنے اس قول کے ذریعہ صراحت کے ساتھ جس کی نشاندہی فرمادی ہے:

''جس شخص نے (گلے میں کوئی چیز لٹکائی) تو اس کو اسی کے حوالہ کردیا گیا۔'' [1]

چنانچہ جن لوگوں نے روشنائی سے لکھ کر بطور تعویذ کاغذ یا اس جیسی چیزوں سے اپنے تعلق واعتماد کا مظاہرہ کیا اور اللہ کی ذات پر توکل اور بھروسا نہ کیا تو اللہ تعالیٰ ان کی ذات کو انھیں سے متعلق فرما کر جن سے انہوں نے لو لگائی ہے ان کا دست نگر بنادیتا ہے اور انھیں ان کی لٹکائی ہوئی چیزوں کے سپرد کردیتا ہے اور اپنے ذمہ داری ان سے اٹھا لیتا ہے یہی چیز ان کے لیے گھاٹے اور خسارے کے اعتبار سے کافی اور وافی ہے۔

۴۔ پتھروں اور درختوں سے تبرک حاصل کرنا:

احجار واشجار اور ہر اس چیز سے تبرک حاصل کرنا جس سے تبرک حاصل کرنے کا جواز نہیں اللہ عزوجل کی ذات پر توکل کے منافی امور میں اس کا شمار ہوتا ہے اور اس طرح کا عمل انسان کو کبھی شرک تک رسائی کا باعث ہوتا ہے۔ (العیاذ باللہ)

۵۔ طلب رزق کے لیے جدوجہد نہ کرنا:

اس سے قبل ہم یہ بات ذکر کرچکے ہیں کہ اسباب ووسائل کا سہارا لینا توکل کی شرطوں میں سے اہم ترین شرط ہے اور اسباب ووسائل کا سہارا نہ لینا اور اس کی طرف سے استغناء برتنا توکل کے منافی امور میں سے اہم ترین امر ہے۔

ہم یہاں پر اس آفت کا ذکر کرنا چاہیں گے جو عصر حاضر کے پرفتن دور میں عام ہوگئی

[1] ترمذی: ۲۰۷۲۔ نسائی: ۴۰۷۹ قال شعیب الارناؤوط: حسن لغیرہ۔

ہے وہ (بے روزگاری اور نکما پن) ہے اس دور میں بے کاری اور نکمے پن کا یہ عالم ہے کہ بہت سے لوگ حصول رزق کے سلسلہ میں غیر اللہ پر بھروسا کرنے لگے ہیں چنانچہ بیٹا اپنے باپ پر حصول رزق کے بارے میں تکیہ کرتا ہے اور بھائی اپنی نوکری پیشہ بہن پر بوجھ بنا گزر بسر کر رہا ہے۔

کتاب وسنت نے اکتساب رزق کے مختلف طریقوں کی طرف رہنمائی کی ہے ہم یہاں پر ان میں سے بعض کا ان کاہلوں اور نکمے لوگوں کے لیے بطور تنبیہ ذکر کریں گے جو دوسروں پر بوجھ بنے کاہلی وسستی کا شکار ہیں:

ا۔ اوّلین اور عظیم رزق کا سبب، اور اس سرزمین پر پائے جانے والے حلال طریقوں میں حلال ترین طریقہ، جنگ کے موقع پر حاصل شدہ مال غنیمت ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَٰلًا طَيِّبًا﴾ (الانفال: ٦٩)

''سو اس میں سے کھاؤ جو تم نے غنیمت حاصل کی، اس حال میں کہ حلال، طیب ہے۔''

اور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

''میرا رزق میرے نیزے کی انی کے سایہ تلے رکھ دیا گیا ہے۔''❶

۲۔ ہاتھ سے کمانے کا پیشہ اختیار کرنا: نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

''شکم سیری کے لیے کبھی بھی اس شخص کے کھانے سے زیادہ بہتر کوئی کھانا نہیں ہوسکتا جو کہ اپنے ہاتھ کی کمائی سے اپنا پیٹ بھرے (مراد یہ ہے خون پسینہ کی حلال کمائی سے جو شخص شکم سیر ہو اس کے کھانے سے بہتر کوئی کھانا نہیں ہوسکتا) اور اللہ کے نبی سیدنا داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی کھایا کرتے تھے۔''❷

اللہ تعالیٰ کے آخری نبی، محمد کریم ﷺ کا فرمان ہے:

''کوئی شخص لکڑی کا گٹھا اپنی پیٹھ پر لاد کر (فروخت کرے) اس کے لیے اس سے

---

❶ احمد: ٥٠٩٤ وصححه الالبانی.

❷ صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب کسب الرجل و عمله بیده: ٢٠٧٢.

کہیں بہتر ہے کہ وہ کسی کے سامنے دست سوال دراز کرے (ہوسکتا ہے وہ اسے دے یا نہ دے)'' [1]

۳۔ تجارت اور بزنس کا پیشہ اختیار کرنا بھی اس سلسلہ کی اہم ترین کڑی ہے۔

مہاجرین وانصار میں سے بہت سے لوگ تجارت پیشہ تھے چنانچہ سیّدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے سامنے کسی انصاری شخص نے ازراہ ہمدردی اپنی کمائی کا نصف مال پیش کیا تھا تو انہوں نے اس کو لینے سے انکار کر دیا تھا اور فرمایا تھا:

''البتہ مجھے بازار کا یا مارکیٹ کا راستہ بتلا دو اور بس۔'' [2]

۴۔ کاشتکاری کھیتی باڑی، شجر کاری اور آنگن باڑی بھی اکتساب رزق کے مختلف طرق میں سے ایک اہم ترین طریقہ کار ہے۔

یہ طریقہ رزق حلال کی کوشش اور تگ ودو کے بارے میں اہم ترین طریقہ ہے کیونکہ اس میں اللہ کی ذات پر توکل کے مظاہر کی تجلیات کا وافر حصہ موجود ہے اس کے علاوہ دوسرے طریقوں میں شاذ ونادر ہی ایسا ہوتا ہے، مگر اس میں اللہ کی ذات سے حقیقی تعلق کا بھی پہلو نمایاں ہے کیونکہ کسان جب بیج بوتا ہے اور کھیت کی سینچائی کرتا ہے اور جوتائی وبوائی کرتا ہے تو اس وقت اس کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ کھیتی کی سرسبزی وہریالی اور اس کی بود وباش اللہ کی قدرت ومشیت کے تابع ہے اور اس کی کھیتی کی ناگہانی آفات سے حفاظت وحمایت اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی دست نگر ہے۔

چنانچہ کتنے کھیت کھلیان ایسے بھی ہیں کہ سرسبز لہلہا رہے ہوتے ہیں اور ٹڈیوں کا لشکر آ کر اس پر یکا یک حملہ کر دیتا ہے اور سرسبز وشاداب کھیتی دیکھتے ہی دیکھتے منٹوں میں بھوسے کی طرح روند کر چلا جاتا ہے اور بعض کھیتیاں قحط سالی یا سوکھے پن کا شکار ہو کر ہلاک و برباد ہو جاتی ہیں یا حد سے زیادہ بارش اور ژالہ باری کی وجہ سے وہ ہلاکت و بربادی کا شکار

---

[1] صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب کسب الرجل و عمله بیده : ۲۰۷۴.

[2] صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب قول الرجل لأخیه : ۵۰۷۲.

ہو جاتی ہیں۔

تو معلوم یہ ہوا کہ کھیتی باڑی یا آنگن باڑی کرنے والے لوگوں کو مختلف قسم کے پیشہ وروں کے مابین اللہ کی ذات سے تعلق جوڑنے کی ازحد ضرورت ہوتی ہے جیسا کہ تجربہ اور مشاہدہ بتلاتا ہے۔(واللہ اعلم)

٦۔ علاج ومعالجہ کروانے کی کوشش سے پہلوتہی کرنا:

توکل کے منافی امور میں سے ایک اہم ترین مسئلہ مرض لاحق ہونے کے بعد علاج ومعالجہ کی کوشش میں کوتاہی کرنا بھی ہے، جبکہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمادیا ہے:

''اللہ عزوجل نے امراض واسقام میں سے کوئی مرض ایسا نہیں اتارا جو لاعلاج ہو۔'' [1]

اسی طریقہ سے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

'' اے اللہ کے بندو علاج ومعالجہ کرکے اپنے امراض واسقام کی دوا دارو کر لیا کرو۔'' [2]

علاج ومعالجہ کا بھی ان اسباب ووسائل اختیار کرنے کے ضمن شمار ہوتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے مشروع قرار دیا ہے۔

متوکلین کاملین توکل علی اللہ کے آئینہ میں

وہ چیزیں جو بندوں کو اللہ کی ذات پر توکل اور اعتماد کرنے کے لیے راغب کرتی ہیں اوران کو قلبی طور پر اس جانب آمادہ کرتی ہیں ان میں اللہ کی ذات پر توکل اور بھروسا کرنے والوں کے قصوں کا بطور یاددہانی مذاکرہ اور سماعت وقراءت بھی ہے اور متوکلین کے قصوں پر اس ناحیہ سے غور وخوض کرنا ہے کہ ان کو اللہ کی ذات پر توکل کی بنا پر ہی انعامات واکرامات

[1] صحیح بخاری، کتاب الطب، باب ما أنزل الله داءً : ٥٦٧٨.

[2] ترمذی، کتاب الطب، باب ما جاء في الدواء والحث عليه : ٢٠٣٨۔ ابن ماجة : ٣٤٣٦ وصححه الالبانی۔

الٰہیہ سے نوازا گیا تھا، ان متوکلین صادقین میں سرفہرست ہمارے حبیب فداہ ابی وامی ﷺ کا نام نامی آتا ہے۔

نبی کریم ﷺ اور صاحب سیف کا قصہ:

نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ اپنے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ہمراہ ایک وادی میں پڑاؤ ڈالا اور اپنی تلوار ایک درخت پر لٹکادی اور صحابہ کرام وادی میں پیڑوں اور درخت کا سایہ تلاش کرتے ہوئے تتر بتر ہوگئے اور درختوں کے سائے میں جا کر بیٹھ گئے۔ اتنے میں نبی کریم ﷺ نے انھیں آواز دے کر بلایا آپ ﷺ کی آواز سن کر سب لوگ آپ ﷺ کے پاس جمع ہوگئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شخص موجود ہے اور تلوار زمین پر گری ہوئی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے قصہ بیان فرمایا کہ ''ایک شخص میرے پاس آیا اس حال میں کہ میں سورہا تھا اور اس نے تلوار سونت لی اتنے میں میں جاگ اٹھا اور وہ دشمن میرے سر پر تلوار سونتے کھڑا تھا، اسے میں محسوس بھی نہ کرسکا اتنے میں کیا دیکھتا ہوں تلوار اس کے ہاتھ میں سونتی ہوئی ہے اس شخص نے کہا کہ تم کو اس وقت مجھ سے کون بچائے گا؟ میں نے جواب دیا: اللہ، اس نے دوبارہ یہی جملہ دہرایا۔ میں نے کہا: اللہ۔ راوی کا کہنا ہے کہ اس کے بعد اس نے تلوار نیام میں ڈال دی۔ فرمایا وہ شخص یہی ہے جو تمہارے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔''[1]

اس کو کہتے ہیں توکل اور تفویض (خود سپردگی) اور حقیقی استعانت۔

نبی کریم ﷺ اور غار کا قصہ:

سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ: میں نے نبی کریم ﷺ سے اس موقع پر جبکہ ہم غار میں پناہ گزیں تھے کہا تھا کہ: ان میں سے کوئی اپنے پیروں کی طرف ایک نظر دیکھ لے تو اس کی نگاہ ہم لوگوں پر پڑ جائے گی، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا:

''اے ابوبکر! تمہارا ان دو کے بارے میں کیا خیال ہے جن کا تیسرا اللہ ہے۔''[2]

---

[1] صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب صلاۃ الخوف: ۸۴۳.

[2] صحیح بخاری: ۳۴۵۳۔ صحیح مسلم: ۲۳۸۱۔

یہ ہے حقیقی توکل اور خود سپردگی جس کا مصائب وتنگی ابتلا و آزمائش کے وقت واضح طور پر ظہور ہوتا ہے اس وقت پتہ چل جاتا ہے کہ بندہ قلب وقالب کے ساتھ رب کریم کا محتاج ہے اور اسی پر توکل واعتماد کرتا ہے اور اپنے معاملہ کو اسی ذات باری تعالیٰ کے سپرد کرتا ہے جو اس کا خالق و مالک ہے، خصوصاً اس موقع پر جب اسباب ووسائل منقطع ہو چکے ہوں پھر بندہ عاجز اس وقت اپنے معاملہ کو اللہ کے سپرد کر کے اللہ کی ذات پر اعتماد اور بھروسا کرے۔

عورت اور اس کی بکریوں کا قصہ:

اس باب میں ایک بڑا پرلطف قصہ ذکر کیا جاتا ہے جس سے توکل علی اللہ کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور اس بات کی وضاحت ہوجاتی ہے کہ توکل کی وجہ سے موکل کو کیا کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اس قصہ کو امام احمد رحمہ اللہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

> ''ایک عورت مسلمانوں کے سرایا میں سے کسی سریہ میں نکلی اور اس نے (اپنے پیچھے گھر میں) بارہ بکریاں اور تانا بانا درست کرنے والا ایک کرگھا (جس سے وہ کپڑے کی بنائی کیا کرتی تھی) اللہ کے بھروسے گھر پر چھوڑ کر اللہ کے راستہ میں نکل پڑی، واپسی پر اس کے گھر سے ایک بکری اور کرگھا (جس سے وہ بنائی کرتی تھی) اس کو غائب ملا اس نے (براہ راست) رب کریم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اے میرے رب! تیرے راستہ میں جو نکل کر جائے تو نے اس کی حفاظت اور دیکھ بھال کی ضمانت لی ہے اور میری بکریوں میں سے ایک بکری اور میرا سوت کاتنے کا چرخہ یا کپڑے بنائی کا کرگھا گم ہوگیا ہے میں گم شدہ اپنی بکری اور اپنے کرگھے کی تجھ سے مانگ کرتی ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کی شدت کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں دہائی لگانے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ رب کریم کی بارگاہ میں اپنی شکایت کا شکوہ کرتی رہی حتی کہ اس کو اس کی بکری اور اس کے مثل اور کرگھا یا کوچ یا چرخہ اور اس کے مثل غیب سے

مہیا ہو گیا۔'' ❶

سبحان اللہ! اللہ کی شان کتنی نرالی ہے؟

اس عورت نے اللہ کی ذات پر توکل اور بھرپور یقین واعتماد کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی بکری اور کپڑا بننے کے آلہ کی حفاظت ہی نہیں کی بلکہ سچے اور پکے توکل کی وجہ سے اس کو اس کی بکری اور آلہ تو واپس کیا ہی بلکہ اس کو اس کے بدلہ اس کا دو چند عطا فرمایا۔

عورت اور تنور کا قصہ:

امام احمد رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ سیّدنا ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا:

''گزشتہ زمانے میں ایک میاں بیوی معذوری کی حالت میں کسی صورت میں گزر بسر کیا کرتے تھے۔ کام کاج ان کے بس کا تھا نہیں، ایک دن اس کا آدمی کسی سفر سے تھک ہار کر بھوکا واپس آیا اور اس کو شدید بھوک کا سامنا تھا آتے ہی اس نے عورت سے کہا کہ تمہارے پاس (گھر) میں کھانے پینے کے لیے کچھ ہے؟ تو عورت نے شرم وحضوری میں کہہ دیا (ہاں) اللہ کی طرف سے کچھ کھانے پینے کا سامان تمہارے لیے آ گیا ہے، حالانکہ اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا، لیکن اس عورت نے اللہ کی ذات پر اعتماد اور بھروسا کرتے ہوئے اور اللہ کی بارگاہ سے امید لگاتے ہوئے اس سے یہ کہہ دیا پھر اس کے شوہر نے عورت کو برانگیختہ یا اکسانے کی غرض سے کہا اگر کچھ ہو تو ڈھونڈ کے لے آؤ۔ عورت نے جواب دیا ذرا صبر کرو ہم اللہ کی رحمت سے امید لگائے ہوئے ہیں حتی کہ اس کے شوہر کی بھوک برداشت سے باہر ہو گئی تو اس آدمی نے عورت سے کہا اٹھو تمہارا اللہ بھلا کرے اگر تمہارے پاس کچھ روٹی وغیرہ ہو تو وہی لے آؤ (ہم تو مارے بھوک کے نڈھال ہی ہو چکے ہیں) تو عورت نے جواب دیا: اچھا ذرا رُکو! تنور گرم ہو

❶ احمد : ۱۰۱٤۱ وصححه الالبانی۔

جائے (جلد بازی سے کام مت لو!)۔

چنانچہ تھوڑی دیر سکوت کا وقفہ چھایا رہا۔ وہ انتظار کی حالت میں تھا ابھی اسی حال تھا کہ وہ اپنی عورت سے مطالبہ کرے اسی اثناء میں اس کی عورت نے خود ہی اپنے دل میں یہ کہا کہ کیا ہی بہتر ہے کہ میں کھڑی ہو جاؤں اور جا کر ایک بار پھر تنور کا مشاہدہ کرلوں! جب اس نے تندور کا مشاہدہ کیا تو اس کو تندور میں بکری کا گوشت بھنا ہوا ملا اور اس کی آٹا پیسنے والی چکی آٹا پیستے ہوئے ملی۔

چنانچہ وہ آٹے کی چکی کے پاس گئی اور اس میں جو کچھ تھا اسے جھاڑ بٹور کر لے لیا اور تندور میں جو کچھ بکری کا گوشت تھا اسے نکال لیا۔"

(سیّدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ) راوی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں ابوالقاسم کی جان ہے! اگر اس عورت نے چکی میں جو کچھ تھا اسے لے لیا ہوتا چکی کو جھاڑا بٹورا نہ ہوتا تو وہ چکی قیامت تک اسے آٹا پیس پیس کر کھلاتی رہتی۔" [1]

عمر رضی اللہ عنہ و مرض جذام میں مبتلا شخص اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور زہر خورانی کا قصہ:

کتب حدیث میں دو قصے وارد ہوئے ہیں (دونوں قصوں کے بارے میں بعض لوگ مغالطہ کا شکار ہو جاتے ہیں) ان میں سے ایک تو سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ کا مجذوم کے ساتھ کھانا کھانے کا قصہ اور دوسرا سیّدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا زہر خورانی کا قصہ ہے۔ [2]

چنانچہ سیّدنا ابو السفر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: "سیّدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جب حیرہ میں پڑاؤ ڈالا تو لوگوں نے ان کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ ذرا خیال رکھنا کہیں اعاجم تمہیں زہر نہ پلا دیں۔ یہ بات سن کر سیّدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: جاؤ زہر لے کر

[1] احمد: ۹۱٦۸۔ مجمع الزوائد میں اس کے رجال کی امام ہیثمی رحمہ اللہ نے توثیق کی ہے (۱۷۸۷۴)۔

[2] سنن الترمذی، کتاب الأطعمة، باب ما جاء فی الأکل مع المجذوم: ۱۸۱۷.

آ ؤ چنانچہ زہر حاضر کیا گیا۔ سیّدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے زہر کا جام اپنے ہاتھ میں لیا اور پی گئے اور فرمایا (بسم اللہ) اس کی برکت سے زہر کا اثر جاتا رہا اور سیّدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ [1]

سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ کے قصہ سے ان کا اللہ کی ذات پر بھرپور اعتماد اور بھروسا نیز شدت توکل علی اللہ کا پہلو نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے علمائے کرام نے اس قصہ کی بہت سی توجیہات کی ہیں ان میں سے چند توجیہات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عمل سے چھوت چھات کی ہے اور مجذوم سے فرار کی راہ اس لیے اختیار نہیں کی کہ آپ رضی اللہ عنہ اللہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت مول لینے سے گریز کرنے کی راہ اپنانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

۲۔ سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مجذوم کے ساتھ کھانا تناول فرما کر انسانیت کے جذبہ کے پیش نظر اس کی دلجوئی کرنا چاہی تھی کیونکہ مجذوم ناقص الخلقت ہوا کرتا ہے لوگ اس سے گھن کھاتے ہیں۔

۳۔ جہاں تک (لَا عَـدْوٰی) والی حدیث ہے اس پر عمل کرنا عزیمت کی علامت ہے اس حدیث پر وہی شخص عمل پیرا ہو سکتا ہے جس کا اللہ کی ذات پر بھرپور توکل اور اعتماد ہو اور جہاں تک (فِـرَّ مِنَ الْمَجْذُوْمِ) والی حدیث پر تعامل کا معاملہ ہے تو اس پر عمل کرنا رخصت کا پہلو اختیار کرنا ہے اس کے بموجب عمل کرنا توکل علی اللہ میں ضعف کی دلیل ہے۔ [2]

جہاں تک سیّدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے قصہ کا تعلق ہے تو اس سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ: سیّدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اللہ کی ذات پر سچا اور پکا توکل کیا تھا اسی لیے ان پر زہر اثر انداز نہ ہو سکا۔

لیکن کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ وہ اس معاملہ میں سیّدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی پیروی

---

[1] مسند ابی یعلی: ۷۱۸۶۔ [2] فتح الباری: ۱۰/۱۶۰۔

اور تقلید کرے کیونکہ علمائے کرام نے ان کے زہر خوارنی کے قصہ کی توجیہات بیان کی ہیں ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔ زہر خورانی کا مسئلہ سیّدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی کرامت ہے یہ ان کے لیے خاص ہے اب کسی کے لیے یہ جواز نہیں بنتا کہ وہ سیّدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا اسوہ اختیار کرکے اپنی جان کو ہلاکت سے دوچار کرے اور جان بوجھ کر قتل نفس کا ارتکاب کرے خواہ وہ اپنی ہی جان کیوں نہ ہو۔

۲۔ ہوسکتا ہے کہ سیّدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بشارت مل چکی ہو کہ زہر خورانی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے گی، اسی لیے سیّدنا خالد بن رضی اللہ عنہ نے اس معاملہ میں اللہ کی ذات پر توکل واعتماد کرکے زہر خورانی کی ہے۔ [1]

۳۔ بعض روایات میں صراحت ملتی ہے کہ انہوں نے ایسا اس لیے کیا تاکہ دشمن ان کی کرامت دیکھ کر ان کے سامنے سپرانداز ہوجائیں اور ہتھیار ڈال دیں یقیناً سیّدنا خالد رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی جان ومال کی حفاظت کرنے کے پیش نظر ایسا کیا ہوگا اس میں کسی طرح کے شک کی گنجائش نہیں۔ (واللہ اعلم بالصواب)

---

[1] فتح الباری: ۱۰/۲۴۸.

خاتمہ بحث

توکل کے موضوع پر اس سیر حاصل بحث کے بعد آپ کو بخوبی پتہ چل گیا ہوگا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک اس فریضہ کا کتنا بلند مقام ہے اور اس کو کتنی عظیم الشان فضیلت واہمیت حاصل ہے۔

ہم نے اس کتابچہ میں بحث کے دوران اس بات کی واضح انداز میں صراحت کردی ہے کہ توکل کرنا اسباب ووسائل اختیار کرنے کے منافی عمل نہیں اگر توکل کرتے ہوئے اسباب ووسائل اختیار نہ کیے جائیں تو وہ توکل نہیں کہلائے گا بلکہ وہ (تواکل) کہلائے گا اور تواکل نکموں، کاہلوں، بے کار اوباش لوگوں کا وتیرہ ہے۔

ہم نے اس کتابچہ میں اللہ کی ذات پر توکل واعتماد کرنے کے حکم کی وضاحت کردی ہے اور اسی کے ساتھ ہم نے ان مواقع کا بھی ذکر کیا ہے جہاں توکل کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔اس کے بعد ہم نے اللہ پر بھرپور توکل کرنے والوں کی سیرتوں کے اقتباس پیش کرکے اس قضیہ کی وضاحت کی ہے اور لگے ہاتھوں یہ بھی بیان کیا ہے کہ توکل کے نتائج کیا برآمد ہوتے ہیں۔

یہ بحث کا خلاصہ ہے جو کچھ توکل کے موضوع پر سردست میسر ہوسکا اس کا میں نے ذکر کردیا ہے، اخیر میں اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہوں کہ وہ ہمیں اور آپ تمام لوگوں کو اپنی ذات پر حقیقی توکل کرنے والا بنادے اور ہم تمام لوگوں کو خالص موحد بنائے اور عقیدۂ توحید کو گلے لگا کر اس پر مٹنے کی سعادت نصیب فرمائے اور ہم کو ان لوگوں کے زمرے میں شامل فرمالے جو حق بات کہتے ہیں اور حق پر گامزن رہتے ہوئے اسی کے بموجب فیصلہ صادر فرماتے ہیں۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ أَجْمَعِيْنَ .

اپنے فہم وادراک کا امتحان لیں!

ذیل میں اس موضوع سے متعلق سوالات کو دو مرحلوں کو مدنظر رکھتے ہوئے وضع کیا گیا ہے:

سوالوں کی ایک قسم تو وہ ہے جن کا جواب فوراً دینا ہے (اس قسم کے سوالات کو پہلے مرحلہ میں رکھا گیا ہے)۔

سوالوں کی دوسری قسم وہ ہے جو بحث ونظر اور غور وفکر کی متقاضی ہے اس قسم کے سوالات کو دوسرے مرحلہ میں رکھا گیا ہے۔

پہلے مرحلہ کے سوالات جن کا جواب فوراً دینا ہے:

۱۔ توکل نصف دین کیوں کر ہو سکتا ہے؟

۲۔ فضیلۃ الشیخ / ابن عثیمین رحمہ اللہ کی زبان حق سے کی گئی توکل کی تعریف ذکر کریں۔

۳۔ نبی کریم ﷺ نے توکل کے بارے میں جن اسباب و وسائل کو اختیار کیا تھا ان میں سے بعض کا تذکرہ کریں۔

۴۔ اللہ تعالیٰ نے سیّدہ مریم علیہا السلام کو کھجور کا تنا ہلانے کا حکم کیوں دیا اور بغیر تنا ہلائے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان پر کھجوریں کیوں نہ گرا دیں۔

۵۔ گھر سے نکل کر باہر جاتے وقت پڑھی جانے والی وہ کون سی دعا ہے جس میں اللہ کی ذات پر توکل کا ذکر وارد ہوا ہے۔

۶۔ توکل علم قلب اور عمل قلب دونوں کا جامع ہے (ذرا اس عبارت کی تشریح کریں)۔

۷۔ توکل علی اللہ کرنے سے تم کیوں کر غنی بن سکتے ہو؟ کیا یہ ممکن ہے؟

۸۔ اس شخص کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے جس کی نوکری چھوٹ گئی ہو اور اس کے چھوٹنے پر فقر وفاقہ کے ڈر سے وہ رونا دھونا شروع کر دے (کیا ایسے شخص کو توکل

کرنے والا کہا جا سکتا ہے؟ توضیح فرمائیں) اور اس کا صحیح جواب دیں۔

۹۔ توکل اور تواکل کے مابین کیا فرق ہے؟

۱۰۔ توکل کرنے کا شرعی حکم کیا ہے؟ تفصیل سے بیان کریں۔

دوسرے مرحلہ کے سوالات جو استنباطی انداز کے ہیں:

ا:...... کب ہم صرف اور صرف توکل علی اللہ کا سہارا لیں؟ اور کس موقع پر لیا کریں؟ اور مندرجہ ذیل مواقعوں میں سے کن کن موقعوں پر توکل کرنا چاہیے؟
یا بروقت استعانت اور توکل دونوں سے کام لیا جائے گا؟

ا۔ جب تم امتحان کے دوران اپنے کلاس کا پیپر حل کر رہے ہو۔

ب۔ یا امتحان کے نتائج کے اعلان کے انتظار کے دوران۔

ج۔ یا گھر کا سامان گاڑی سے اتروا کر گھر منتقل کرتے وقت۔

د۔ یا سروس کا فارم بھرنے کے بعد سروس اپائمنٹ لیٹر ملنے کا انتظار کرتے ہوئے۔

۲:...... عمل توکل کا انبیاء علیہم السلام کی صفات میں شمار ہوتا ہے ایک داعی اس سے کیسے مستفید ہو سکتا ہے؟

۳:...... اس شخص کے بارے میں تمہاری رائے کیا ہے جو اپنی گاڑی کی چابی گاڑی میں رہنے دے اور گاڑی کے دروازے پاٹوں پاٹ کھلے چھوڑ دے اور یہ کہے کہ گاڑی نہ چوری ہونے کے بارے میں میں نے اللہ کی ذات پر اعتماد اور بھروسا کر لیا ہے۔

۴:...... مندرجہ ذیل صورتوں میں آپ کی رائے کیا ہے؟

ا:...... ایک شخص ہے اس نے دنیا کے کسی کونے میں زلزلہ آنے کی خبر سنی، اس خبر کو سننے کے بعد اس دن وہ گھر سے نہ نکلے۔

ب:...... ایک شخص نے (آج کے دن) سروس کے اپائمنٹ لینے کے لیے درخواست پیش کرنے کا ارادہ کیا دروازے پر کسی اخبار میں اس دن کے (برج) پر

اس کی نظر پڑ جاتی ہے اس میں لکھا ہوتا ہے سروس کے لیے فلاں دن اپلائی کرنا چاہیے اس کا کیا حکم ہے؟

ج:......ایک شخص ہے وہ گھر سے نکلا اور دیکھتا کیا ہے لفٹ معطل پڑی ہوئی ہے یہ دیکھ کر گھر واپس آ جاتا ہے اس خوف کے پیش نظر کہ کہیں اس دن اسے کسی مصیبت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

۵۔ (اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ) اس آیت کریمہ میں مفعول بہ کو مقدم کرنے کی کیا حکمت ہے؟

۶۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

''پرندوں کے ذریعہ بدفالی لینا شرک ہے، جو بدفالی کرے وہ ہم میں سے نہیں لیکن اللہ تعالیٰ پر توکل سے بدفالی کی نحوست ختم کر دیتا ہے۔''

اس حدیث کی تشریح کریں۔

۷۔ آیت کریمہ میں وارد ہوا ہے:

''اور سیّدنا موسیٰ علیہ السلام صبح صبح ڈرتے ڈرتے ادھر ادھر جھانکتے ہوئے اپنے بارے میں اندیشوں میں مبتلا شہر کی طرف نکل کر گئے۔''

کیا موسیٰ علیہ السلام کا یہ خوف توکل علی اللہ کے منافی عمل ہے؟

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ أَجْمَعِيْنَ .

أعمال
القلوب
محبت
اخلاص
صبر
خوف
رجا
شکر
غور و فکر
رضا
زہد
تقویٰ

مقدمہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى اَشْرَفِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ ، نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ . أما بعد !

اس کتابچہ میں ہم محبت کی قدر ومنزلت اور اس کے مقام ومرتبہ کا تذکرہ کریں گے، اعمال قلوب سے متعلق لکھے گئے مقالات میں یہ تیسرے نمبر پر ہے۔اللہ کی توفیق سے جنہیں آپ کے سامنے فائدہ کی غرض سے پیش کرنے کی مجھے سعادت نصیب ہوئی،اس کے ترجمہ وتیاری میں الفرقان ٹرسٹ نے تعاون کیا اور آج یہی مکتبہ والے اس کتابچہ کو چھاپ کر اس کی نشر واشاعت میں حصہ لے رہے ہیں۔

دراصل بندہ کو اللہ کی رضا وخوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے (حب اللہ) اورخوف وخشیت،امید وبیم جیسے مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا ہے کہا جاتا ہے کہ (حب) سر کے قائم مقام ہے اورخوف ورجاء کے دوش پر یہ قائم ہے ''گویا کہ خوف وخشیت خداوندی اور امید وبیم اس کے دونوں پر یا بازو ہیں۔''

اسی لیے اللہ والوں نے اس میدان میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش اور تگ ودو کی ہے اور عاملین ربانیین نے اسی عمل جلیل کی طرف نگاہیں مرکوز کی ہیں بلکہ اللہ کی محبت سے سرشار لوگوں نے اس راہ میں تن من دھن کی بازی لگادی ہے، پھر اس کی بادنسیم کے عطر بیز جھونکوں سے عباد وزہاد نے اپنے وجود کو معطر کیا ہے،گویا کہ اللہ کی محبت سے سرشاری دلوں کی دواء ہے اور روحوں یا خواہشات نفسانی کی غذا ہے،اسی میں آنکھوں کا کیف وسرور، دلوں کی تازگی وخوشی،عقلوں کی روشنی ونور، باطن کی آرائش وزیبائش، امنگوں کی منتہاء اورغایت، آرزوؤں کی آخری حد، زندگی کا جوہر

اور روحوں کی زندگی کا راز مضمر ہے۔

دراصل محبت سے سرشار زندگی ہی اصل زندگی ہے جو شخص اس حیات ابدی سے محروم ہے اس کا جینا مرنا دونوں برابر ہے گویا کہ اس کا وجود کالعدم ہے، اس کا شمار زندوں میں نہیں مردوں میں ہے اور محبت الٰہی ہی دراصل نور ہے۔ جو اس نورالٰہی سے محروم ہو وہ گویا کہ اندھیروں کے بے اتاہ سمندر میں غوطہ لگا رہا ہے۔ محبت الٰہی ہی حقیقت میں وہ نسخہ کیمیا ہے جس سے محرومی انسان کو تمام قسم کی روحانی بیماریوں میں مبتلا کر دینے کا ذریعہ ہے ایسے شخص کے دل اور اندرون سے چین وسکون کی نعمت چھن جاتی ہے اور محبت الٰہی وہ لذت ہے جو اسے حاصل نہ کر سکے اس کی زندگی بیکار ہے اس کی زندگی گویا کہ ہموم وغموم، مصائب وآلام کی آماجگاہ ہے، چنانچہ یہ ایمان کی روح اور اعمال کی اساس وبنیاد ہے، اگر بندے کے اندر یہ ایمانی کیفیت کا وجود نہ ہو تو اس کی حیثیت اس جسم کی ہے جو بے جان ہے اور اس جثہ کی سی ہے جس کے اندر ذرہ برابر حرکت اور جنبش نہیں۔ لائق صد ستائش ہے وہ شخص جس کو ایمان کا یہ مرتبہ اور مقام مل جائے اور وہ یقین محکم، عمل پیہم، کی بنیاد پر محبت کے اس مقام تک رسائی پا جائے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم کو اور آپ تمام لوگوں کو اس بلند وبالا مقام تک رسائی کی توفیق عطا فرمائے ہمیں زندہ دلوں اور محبین مخلصین میں سے بنائے۔

دنیا میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے محبت کا دعویٰ کیا ہے، مگر ان کو پتہ نہیں کہ اس حب الٰہی کی علامات کیا ہیں؟ اور اس کے حصول کا طریقہ کیا ہے؟ اور اس کے فوائد وثمرات کیا ہیں؟ تو آیئے ہم آپ کو (قلب سے تعلق رکھنے والے) اس عمل کے بارے میں چند باتیں بتلا کر اس عمل جلیل کی توضیح وتشریح کا فریضہ انجام دیں شاید اللہ تعالیٰ ہم کو اور آپ کو اعمالِ صالحہ کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارا شمار بھی اہل قلوب میں ہو جائے۔

محمد بن صالح المنجد

محبت کی لغوی واصطلاحی تعریف

لغوی تعریف:

ابن منظور محبت کی لغوی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''کلمہ حب/کلمہ بغض کی ضد ہے اور الحب کے معنی اردو زبان میں '' پیار، محبت، الفت، لگن، چاہت اور عشق'' کے ہوتے ہیں اسی طرح اگر حاء پر زبر کے بجائے زیر آئے تو وہ بھی اسی کے مرادف ہے اور کہا جاتا ہے:" اَحَبُّهُ فَهُوَ مُحِبٌّ وَهُوَ مَحْبُوْبٌ." ❶

امام ابن قیم رحمہ اللہ نے محبت کے معانی ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''محبت صفاء اور بیاض جیسے پاکیزہ معانی ومفاہیم پر مبنی ہے، اسی لیے دانت کی صفائی ستھرائی اور اس کی چمک دمک کے لیے بھی حبب الاسنان کی تعبیر استعمال کی جاتی ہے۔''

کہا جاتا ہے اس کے معنی علو سے مشتق ہیں کیونکہ اس میں علو اور ظہور کے معانی پائے جاتے ہیں اسی لیے عربی زبان میں ''حبب الماء وحبابہ'' اس وقت کہا جاتا ہے جب بارش کی شدت کی وجہ پانی سر سے اونچا ہو جائے اسی سے پانی سے لبریز چھلکتے جام کو عربی زبان میں ''حبب الکاس'' کہا جاتا ہے۔

اس اعتبار سے ''فرط محبت میں محبوب سے ملنے کے شوق میں دل میں ابال آنے کے کیفیت پیدا ہونے'' کو محبت کہا جاتا ہے۔

ایک قول کے اعتبار سے اس کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ محبت لزوم اور دل جمعی کے معنی سے مشتق ہے اسی لیے جب اونٹ بیٹھ جائے اور کسی طرح اٹھائے نہ اٹھے تو اس کیفیت کو

عربی زبان میں ''حب البعیر واحب'' کہا جاتا ہے کسی عربی شاعر کا قول ہے:

''صحرا میں اس پر اس اڑیل اونٹ کی طرح مار پڑی جو اپنے اڑیل پن اور ڈھٹائی کی وجہ سے اٹھنے کا نام نہ لے اور جم کر بیٹھ جائے۔''

مراد یہ ہے کسی شخص نے کسی مقام پر پڑاؤ ڈالا اور اس کا اونٹ وہیں جم کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اٹھنے کے لیے کسی صورت پر تیار نہیں ٹھیک اسی طرح محبت کرنے والے کا دل اپنے محبوب سے جا کر لگ جاتا ہے اور پھر اس کے پاس سے کسی صورت میں ٹلنے کے لیے تیار نہیں ہوتا مراد یہ ہے کہ ''حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے۔''

کہا گیا ہے کہ یہ ''الحب'' حاء کے زیر کے ساتھ والے کلمہ سے مشتق ہے، اس کی جمع حبۃ آتی ہے اور اس کو کہہ کر کسی چیز کا لب لباب یا اس کا خلاصہ یا نچوڑ یا اس کی اساس و بنیاد مراد ہوا کرتی ہے کیونکہ بیج گھاس پھوس اور درخت پودوں کی اصل ہوا کرتا ہے، اس سے مراد اصل یا اس کا لب لباب ہے۔ [1]

ایک قول کے مطابق یہ حب سے (حاء کی زیر کے ساتھ) ماخوذ ہے اور اس سے مراد وہ ''بھاری بھرکم برتن ہوا کرتا ہے'' جیسے کہ ٹب وغیرہ جس میں کوئی چیز اسٹور کی جا سکے اور وہ اتنا بھر جائے کہ اب اس میں کسی دوسری چیز رکھنے کی گنجائش باقی نہ ہو اسی طرح محبت کرنے والے کا دل اپنے محبوب کی محبت سے سرشار ہوتا ہے۔ بایں طور کہ اب اس میں اپنے محبوب کے علاوہ کسی اور سے تعلق کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں یہ پانچ چیزیں محبت کے لوازمات میں سے اہم ترین عنصر کی حیثیت رکھتی ہیں یعنی محبت محبوب کے لیے قلب میں پائی جانے والی خالص مودت والفت اور قلب کی کیفیت، نیز اس کا ظہور اور محبوب سے تعلق کی وجہ سے دل میں پیدا ہونے والے ابال اور اس کے لیے دل جمعی اور ثبات کی کیفیت بایں طور کہ اب وہ اس کے دل سے نکلنے کا نام نہ لے دراصل محبت کرنے والے کو اپنا دل دے بیٹھنے کی کیفیت کو ہی محبت کہا جاتا

[1] ملاحظہ ہو: لسان العرب : ۲۸۹/۱.

ہے بلاشبہ محبت کرنے والا اپنے محبوب کو اپنی معزز ومکرم چیز دے دیتا ہے اور یہ بدیہی حقیقت ہے کہ انسان کے نزدیک قلب سے بڑھ کر کوئی چیز معزز ومکرم نہیں۔ ❶

اصطلاحی تعریف:

اصلی محبت تو وہ ہے جو بندہ اللہ کے لیے کرتا ہے بایں طور کہ اللہ کی ذات سے محبت اور تعظیم نیز اجلال واکرام اور امید ورجاء کا معاملہ روا رکھتے ہوئے تعلق استوار کیا جائے ❷ اس اعتبار سے گویا کہ محبت عمل قلبی کے مظاہر میں سے اہم ترین مظہر ہے اس میں زیادتی ونقصان یا کمی وبیشی ہوتی رہتی ہے، اس سلسلہ میں دل کی کیفیت کے اعتبار سے لوگوں کے الگ الگ مراتب ہوا کرتے ہیں اکثر وبیشتر لوگ محبت کے بارے میں جو تعریف کیا کرتے ہیں وہ محبت کے اسباب ووسائل، اس کے بواعث وعلل، نیز اس کی علامات ونشانیاں، اس کے شواہد وثمرات اور اس کے واجبات وفرائض کے مدار میں چکر کاٹا کرتی ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ محبت ایک ایسی کیفیت ہے جس کی صحیح معنوں میں واضح طور پر وصف بیانی یا تصویر کشی نہیں کی جاسکتی اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو محبت سے زیادہ واضح اور بین ہو۔ ❸

اللہ تعالیٰ کی ذات سے محبت وتعلق کا شرعی حکم

اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے محبت دین کی اصل وبنیاد ہے اور اسلام میں محبت کو اساسی حیثیت حاصل ہے، اسی کے مدار میں اس کا ستارہ گردش کیا کرتا ہے۔ بلاشبہ محبت الٰہی سے سرشاری میں دین کا کمال واتمام پنہاں ہے اور محبت الٰہی کی کمی کے بقدر بندے کے عقیدہ میں نقص کا وجود موجود گھٹتا بڑھتا ہے۔

یہ محبت جس کا تذکرہ چل رہا ہے امت مسلمہ کا اس کے وجوب پر اجماع ہے اور بندہ

---

❶ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مدارج السالکین: ۳/۹۔۱۰.

❷ ملاحظہ فرمائیں: شرح كتاب التوحيد من صحيح البخاري للغنيمان: ۱/۶۶.

❸ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مدارج السالکین: ۳/۹۔۱۰.

اس بات کا مکلّف قرار دیا گیا ہے وہ وہی کام انجام دے جو اس کو اللہ تعالیٰ کی محبت تک رسائی میں ممد ومعاون ثابت ہوتا کہ ایمان کے لوازمات اور اس کی شرطوں کا اتمام ہو جائے اور بندہ پورے طور پر دین اسلام کا حامل قرار پائے۔

ایک مرتبہ حسن بصری رحمہ اللہ ابو العباس سریج رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ابن سریج رحمہ اللہ نے ان سے مخاطب ہو کر سوال کیا کہ ''کیا تمہارے علم کے مطابق نص کتاب میں کہیں وارد ہوا ہے کہ اللہ کی محبت فرض ہے؟'' تو انہوں نے جواب دیا: ''مجھے اس کا علم نہیں؟ میں نہیں جانتا۔'' تو ابن سریج نے ان کو جواب دیا: ''اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴾

(التوبة: ٢٤)

''کہہ دے اگر تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے اور تمھارے بھائی اور تمھاری بیویاں اور تمھارا خاندان اور وہ اموال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے مندا پڑنے سے تم ڈرتے ہو اور رہنے کے مکانات، جنھیں تم پسند کرتے ہو، تمھیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

آیت کریمہ میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت نہ کرنے پر شدید وعید سنائی گئی ہے اور وعید فرض ترک پر ہی وارد ہوا کرتی ہے یہ دلیل ہے اس بات کی کہ محبت فرض ہے۔'' [1]

---

[1] شعب الایمان: ١/ ٣٦٥۔

بندے کی اللہ تعالیٰ کی ذات سے محبت کرنا واجب ہے، اس محبت کو محبت تعظیم واجلال یا محبت عبادت سے تعبیر کیا جاتا ہے بندے کی رب کریم کے ساتھ ایک خاص قسم کی محبت ہے اس کو دوسری قسم کی عام محبت پر قیاس نہ کیا جائے۔

سلیمان بن عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ اس موضوع کے بارے میں فرماتے ہیں:

''محبت کی دو قسمیں ہیں:

نمبر۱......مشترک اور نمبر۲......خاص۔''

محبت مشترک کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ ایک تو طبعی محبت/ جیسے کہ بھوکے کھانا کھانے کی اشتہا کی محبت اور پیاسے کی پینے والے پانی کی دستیابی کی محبت یہ اور اس طرح کی چیزوں کو طبعی محبت سے تعبیر کیا جاتا ہے اس میں تعظیم کی قید نہیں۔

۲۔ رحم وکرم، شفقت ومہربانی، لطف وعنایت کی محبت جو باپ کی بچوں کے ساتھ ہوتی ہے، اس قسم کی محبت میں بھی تعظیم کی شرط نہیں ہے یہ بھی طبعی محبت ہے۔

۳۔ الفت وانس یا میل جول راہ ورسم والی محبت جو کہ مشرکین اور کفار کے درمیان ہوتی ہے کسی پیشہ یا حرفہ یا علم وفن یا اختلاط اور آپسی میل جول یا تجارت وبزنس یا سفر میں مصاحبت کی وجہ سے ایک دوسرے سے متعارف ہونے کی وجہ سے ہوجاتی ہے یا جیسے بھائی بھائی میں محبت ہوتی ہے اس کو محبت الفت وانس کہا جاتا ہے۔

محبت کی یہ تین قسمیں ایسی ہیں جو مخلوق خدا کے مابین جس کے وجود پذیر ہونے میں کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ یہ تینوں طرح کی محبتیں آپس میں ازراہ انسانیت جائز ہیں اس طرح کی محبت کرنا اللہ کی ذات سے محبت میں شرک نہیں کہلاتا۔

محبت کی دوسری قسم وہ ہے جس کو محبت خاص سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس قسم کی محبت صرف اور صرف اللہ کی ذات کے لیے خاص ہے اور جب بھی بندہ اللہ کے علاوہ کسی اور سے اس قسم کی محبت کرے گا اس کو اللہ کی ذات کے ساتھ شرک شمار کیا جائے گا، اس کا نام محبت عبودیت

ہے جس میں محبّ کو محبوب کے سامنے ذلت وخواری اور خشوع وخضوع اختیار کرنا پڑتا ہے اور محبوب کی تعظیم بجالانی پڑتی ہے اور اس کی بھرپور اطاعت وفرمانبرداری کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے اور محبوب کو دوسروں پر ترجیح دینا پڑتی ہے، غیر اللہ سے اس قسم کی محبت روا رکھنے کی کسی صورت میں سرے سے جواز نہیں ہے۔ [1]

بندے کی اللہ تعالیٰ سے محبت کی علامتیں اور نشانیاں

چونکہ محبت دل میں پوشیدہ ہوتی ہے اس لیے دنیا کے ہر شخص کے لیے یہ بات سہل اور آسان ہے کہ وہ محبت کا دعویٰ کرنے لگے جیسے کہ یہودیوں اور نصرانیوں نے دعویٰ کیا ہے:

﴿ وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ۭ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ۭ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۡ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ⑱ ﴾ (المائدۃ: ۱۸)

”اور یہود ونصاریٰ نے کہا ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں، کہہ دے پھر وہ تمھیں تمھارے گناہوں کی وجہ سے سزا کیوں دیتا ہے، بلکہ تم اس (مخلوق) میں سے ایک بشر ہو جو اس نے پیدا کی ہے، وہ جسے چاہتا ہے بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے اور اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور اس کی بھی جو ان دونوں کے درمیان ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔“

کتنا سہل دعویٰ ہے جو یہود ونصاریٰ نے کیا ہے، لیکن حقیقت اس سے بھی زیادہ واضح اور عیاں ہے!

انسان کو شیطان کے دام میں پھنس کر دھوکا نہیں کھانا چاہیے اور نفس کے بہکاوے میں آ کر خالی اللہ کی محبت کا زبانی دعویٰ نہیں کرنا چاہیے جب تک کہ وہ اپنے نفس کا دعویٰ محبت

---

[1] تیسیر العزیز الحمید: ٤١١.

کی علامات کی کسوٹی پر کھ نہ لے اور اپنے نفس سے محبت کے تقاضوں پر عمل پیرا ہونے کا مطالبہ کرکے اس سے محبت کے بتلائے ہوئے طریقہ پر چلنے کا تقاضا نہ کرلے تاکہ اس کو پتہ چل جائے کہ اس کا نفس اپنے اس دعویٰ میں کھرا ہے یا صرف زبانی جمع خرچ ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں بلکہ اس کا دعویٰ سراسر جھوٹ اور دروغ گوئی کا پلندہ ہے۔

محبت کی مثال ایک پاکیزہ درخت کی طرح ہے جس کی جڑ مضبوط ہے اور اس کی شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں، اس کی علامات اور نشانیوں کا ظہور قلب و جوارح سے چھن چھن کر نمودار ہوتا ہے چنانچہ یہ علامات اور نشانیاں محبت کرنے والے کی محبت کا بھرپور پتہ دیتی ہیں، جیسے کہ درختوں پر پھل فصل آنے کا پتہ دیتے ہیں اور دھواں آگ سلگنے کا پتہ دیتا ہے، اسی طرح محبت کی علامات اور نشانیوں کا معاملہ ہے، محبت کی بے شمار علامات و نشانیاں ہیں ان میں بھی اہم ترین علامات کا ذیل میں تذکرہ کیا جارہا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا بے تابی سے خواہش مند ہونا:

بندے کی اللہ سے سچی اور پکی محبت کی علامت اس کا اللہ سے ملاقات کا بے تابی سے خواہش اور تمنا ہے۔

اس بات کا کوئی شخص تصور بھی نہیں کرسکتا کہ کوئی بندہ اپنے محبوب سے دلی محبت کرتا ہو اور اپنے محبوب سے ملنا نہ چاہے یا اسے اپنے محبوب کے دیدار کی تمنا نہ ہو بلاشبہ دنیا میں ایسا معاملہ محال اور غیر ممکن ہے سیّدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس شخص کے دل میں اللہ سے ملنے کی لگن اور خواہش ہوتی ہے اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملنے کا خواہاں رہتا ہے اور جو شخص اللہ سے ملاقات کرنے کے بارے میں کان کتراتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملنے کے لیے ناپسندیدگی کا اظہار فرماتا ہے۔[1] اور یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ سچا محبّ اپنے محبوب کی یاد میں ہمیشہ سرگرداں رہتا ہے اور اپنے محبوب سے ملاقات کی گھڑی کو اپنے گوشہ دماغ سے کسی صورت میں محو ہونے نہیں دیتا۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب من أحب لقاء اللہ: ٦٥٠٧۔ صحیح مسلم: ٢٦٨٣.

جب اللہ تعالیٰ کو اپنے محبّ بندوں اور اطاعت گذار لوگوں کی نشاندہی ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اور اپنے درمیان ملاقات کا ایک وقت متعین کر دیا اس وقت معین پر ان کی رب العالمین سے دوبدو ملاقات ہوگی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝﴾ (العنکبوت: ۵)

''جو شخص اللہ سے ملنے کی امید رکھتا ہو تو بے شک اللہ کا مقرر وقت ضرور آنے والا ہے اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔''

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رب کریم اور بندے کے درمیان ملاقات کی مقررشدہ گھڑی کب آئے گی؟

بلاشبہ بندے اور رب کریم کے درمیان ملاقات کے کئی ایک مواقع ہیں ''سب پہلی ملاقات تو بندے اور رب کریم کے درمیان موت کے وقت ہوتی ہے، دوسری ملاقات قیامت کے دن ہوگی اور تیسری ملاقات دونوں کے مابین جنت میں رب کریم کے رخ انور کے دیدار کے موقع پر ہوگی۔''

لیکن اس سے یہ بات متبادر الی الذہن نہ ہو کہ اگر بندہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے کا دعوے دار ہے تو موت کی تمنا کرنے لگے، نہیں ایسا ہرگز نہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ محبوب الٰہی کو اگر موت کی گھڑی آلے تو وہ اس کا استقبال برضا ورغبت کرے، کیونکہ وہ موت کے دوش پر اپنے محبوب سے ملاقات اور اس سے قربت کے لیے رخت سفر باندھ رہا ہے اور اس کے لیے اللہ کے نزدیک جو ثواب اور طرح کی نعمتیں وراحتیں تیار ہیں ان سے محظوظ ہونے کے لیے وہ دنیا سے رخصت ہو رہا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ۝ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ۝﴾ (القمر: ۵۴،۵۵)

''بے شک بچ کر چلنے والے باغوں اور نہروں میں ہوں گے۔ صدق کی مجلس

میں، عظیم بادشاہ کے پاس، جو بے حد قدرت والا ہے۔"

اللہ تعالیٰ کے ساتھ خلوت، مناجات اور تلاوت میں سکون ہونا:

اللہ کے ساتھ خلوت اختیار کرنے اور مناجات کے وقت اور تلاوت کتاب اللہ میں سکون واطمینان، راحت وچین محسوس ہوتا ہے۔

محمد بن علاء رحمہ اللہ کا قول ہے:

"جس شخص کو اللہ کی ذات سے محبت ہو جاتی ہے اس کو یہ بات گوارہ نہیں ہوتی کہ لوگوں پر یہ راز منکشف ہو اور لوگوں کو اس کے بارے میں اس بات کا پتہ چلے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والا ہے۔"[1]

جناب جنید رحمہ اللہ کا قول ہے:

"جس شخص کو اللہ کی سچی محبت نصیب ہو جاتی ہے پھر غیر اللہ کی طرف سے اس کی توجہ ہٹ جاتی ہے اور وہ اللہ کے علاوہ ساری چیزوں کو بھول جاتا ہے۔"[2]

جو شخص اللہ کی ذات سے محبت کرتا ہے وہ تہجد کی نماز کی خود بخود پابندی کرنے لگتا ہے اور رات کے سناٹے کو آہ وزاری کے لیے سنہرا موقع گردانتا ہے اور وقت کے سہانے اور پر لطف سماں سے مستفید ہوتا ہے اور دنیا کے جھمیلوں سے اس وقت کے چین وسکون کو غنیمت جان کر آہ وسحر گاہی کرتا ہے، اس موقع سے اللہ کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ کم از کم بندہ اس اجابت کے وقت رب کریم کی بارگاہ میں دعا ومناجات کر کے اپنی محبت کا ثبوت پیش کرے مگر جس شخص کو نیند پیاری ہو اور رات کو جاگنا اللہ تعالیٰ کی ذات سے دعا ومناجات کرنے سے زیادہ مرغوب ہو تو وہ اسی سے محبت کرے اور لو لگائے جس سے اس کو محبت ہے۔ رب کریم سے محبت کا دعویٰ اس کے لیے صحیح نہیں، کیونکہ سچی اور پکی محبت کرنے والا اپنے محبوب کی خدمت کرنے اور اس کی طاعت وبندگی میں وقت گزارنے میں لذت وسرور محسوس کرتا ہے اور محبت جتنی گہری اور پکی

---

[1] ملاحظہ ہو: التواضع والخمول لابن ابی الدنیا : ٦٤۔ تفسیر ابن کثیر : ٥٨٨/٣.

[2] تفسیر القرطبی : ١٧٤/١٨.

ہوگی اتنی ہی طاعت وبندگی اور خدمت میں سرور وکیف محسوس ہوگا۔

ہمارے نبی محمد ﷺ کو دنیا کی پاکیزہ چیزوں میں سے بہت سی چیزیں مرغوب تھیں لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ کی آنکھوں کی ٹھنڈک نماز کی حالت میں اپنے محبوب حقیقی سے مناجات اور سرگوشی میں ہوا کرتی تھی، چنانچہ سیّدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

''تمہاری دنیا سے تعلق رکھنے والی چیزوں میں عورت اور خوشبو میرے لیے مرغوب ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔'' ❶

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''(قرۃ العین) کا درجہ محبت سے بھی بڑھ کر ہے اور خوشبو اور عورت بھی اللہ کے نبی ﷺ کی مرغوب ترین چیزوں میں سے تھیں اور اس حدیث میں اس بات کی صراحت کے ساتھ نشاندہی کی گئی ہے اور بتلا دیا گیا ہے کہ آنکھوں کی ٹھنڈک کا مقصد یہ ہے کہ محبوب ترین چیز تک رسائی حاصل کر لینے کے بعد دل کو اطمینان اور چین وسکون نصیب ہوتا ہے، بلاشبہ خالص لذت وسرور، انبساط و کیف، شادمانی وتر وتازگی نماز کی ادائیگی میں ہے، کیونکہ نماز ہی اللہ سے رشتہ جوڑنے کا ذریعہ ہے اور اللہ کی جناب میں حاضری کا سبب ہے اور رب کریم سے سرگوشی ومناجات کا وسیلہ ہے اور اللہ تعالیٰ سے قربت کا طریقہ ہے، لہٰذا نماز کیوں کر آنکھوں کی ٹھنڈک نہ ہو؟ اور اللہ سے محبت کرنے والے کی آنکھ نماز کے بغیر کیوں کر ٹھنڈی ہو؟'' ❷

امام ابن قیم رحمہ اللہ ایک جگہ یوں رقم طراز ہیں:

''جس شخص کی آنکھ دنیا میں نماز کی ادائیگی سے ٹھنڈک محسوس کرے تو نماز آخرت

---

❶ نسائی : ۳۹۳۹ وصححہ الحاکم۔

❷ طریق الھجرتین : ۷۱۔

میں رب کریم کے قرب سے اس کی آنکھوں کو جلا بہم پہنچے گی اور دنیا میں تو اس کی آنکھ کو دنیاوی کیف وسرور نصیب ہوگا ہی، اور جس شخص کی آنکھوں کو اللہ کے دیدار سے سرخروئی نصیب ہوگئی تو اس کے وجود سے دنیا کی تمام آنکھیں ٹھنڈک محسوس کریں گی اور جس شخص کی آنکھ اللہ کی محبت سے ٹھنڈک محسوس نہ کرے تو ایسے شخص کا دل مارے حسرت وندامت کے دنیا سے الجھ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوکر بکھر جاتا ہے۔''[1]

اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی پر صبر کرنا:

اللہ کی محبت پر دلالت کرنے والی نشانیوں میں ایک نشانی اللہ کی اطاعت و بندگی پر صبر کرنا بھی ہے۔امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''محبت کرنے والے کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور اس کے دل کا سروراور اس کے روح کا اطمینان اپنے محبوب کی اطاعت وفرمانبرداری میں پنہاں ہے برخلاف اس شخص کے جو بادل ناخواستہ اطاعت وفرمانبرداری کرتا ہواور آقا کی خدمت کو بوجھ سمجھ کر برداشت کررہا ہو،بس روٹین میں کر رہا ہو اور محبّ کی اطاعت مجبورا بے دلی کے ساتھ بغیر چاہے کررہا ہو، گویا کہ اس پر اسے تھوپ دیا گیا ہے اور اس کواس کے کرنے کے لیے مجبور کرکے اس کی اہانت کی گئی ہے بادل ناخواستہ اس کے ناچاہتے ہوئے اسے اس کے کرنے کے لیے مجبور کیا گیا ہے برخلاف اس محبّ حقیقی کے جو اپنے محبوب کی اطاعت وفرمانبرداری کودل کی غذا سمجھے اور اپنے اس عمل کونعمت عظمیٰ شمار کرے اور محبوب کی اطاعت میں لذت وچاشنی سرور وکیف محسوس کرے تو یہ چیز گویا کہ طبیعی ہے اس حالت سے دوچار محبّ کومحبوب کی اطاعت وپیروی میں ذرہ برابر بوجھ محسوس نہیں ہوتا کیونکہ اطاعت وفرمانبرداری یا عبادت وریاضت اس کے سرتھوپی نہیں گئی ہے اور نہ اس کو ذلیل وخوار کر کے اس

---

[1] الوابل الصیب : ۳۸.

پر عمل کروایا گیا ہے بلکہ اس نے تو محبوب کی اطاعت طبعی طور پر انشراح صدر کے ساتھ کی ہے۔'' ❶

حقیقی محبت کرنے والا یا محبّ صادق کی دلی خواہشات اور محبت کی کشش اس کو اللہ کی طرف خود بخود غیر ارادی طور پر آنے کے لیے تیار کر دیتی ہے، محبت و طاعت اور اپنے اوپر محبوب کی رضا و خوشنودی کا جذبہ اور ایثار کا پہلو بندے کو کھینچ کر اپنے محبوب کی طرف لے آتا ہے جیسے کہ پانی خود بخود ڈھلوان اور نشیب کی طرف بہہ کر چلا جاتا ہے ٹھیک یہی حال محبین صادقین کا ہے کہ ان کی عبادت و ریاضت، فرمانبرداری و بندگی اور عبادت گزاری محبت کے جذبہ سے ہوتی ہے اور بلاشبہ اس کی محبت و الفت سرشاری خوشی مرضی مولی ہمہ تن اولیٰ کے پیش نظر ہوتی ہے اسی میں محبین صادقین کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور ان کے دلوں کا سرور اور ان کی روحوں کے کیف کا سامان مہیا ہوتا ہے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم مذکورہ قضیہ اور اس کیفیت پر کیا حکم لگائیں گے جس میں مبتلا انسان کو عبادات کی ادائیگی میں مشقت اور تنگی محسوس ہوتی ہے؟ جیسا کہ ہمارے مشاہدہ میں ہے کہ لوگوں کو نماز فجر کی ادائیگی نفسیاتی طور پر شاق گزرتی ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ اس قسم کے انسان کے دل میں اللہ کی محبت نہیں؟ یا ایسا شخص اللہ سے محبت نہیں کرتا؟

جواب: ......اس مرحلہ تک رسائی جس میں عابد اس مقام تک پہنچ جائے جہاں طبعی طور پر عبادات میں لذت و کیف محسوس ہونے لگے اور خود بخود غیر ارادی طور پر اس کی طبیعت کا میلان حب الٰہی کی طرف ہو جائے جیسے کہ (پانی غیر ارادی طور پر ڈھلوان کی طرف بہہ نکلتا ہے) یہ کیفیت ابتدائی مرحلہ میں پیدا نہیں ہوتی، اور بندہ پہلے مرحلہ میں عبادت و ریاضت یا عمل صالح کر کے اس مقام تک رسائی نہیں پاتا بلکہ اس مقام تک رسائی بڑے مجاہدے، بڑی مشقتوں اور عبادت کی بے پناہ صعوبتوں، ٹریننگوں اور عبادت و ریاضت میں دن رات کے مجاہدوں اور انتھک کوششوں کے بعد نصیب ہوتی ہے اس لیے کہا جا سکتا ہے طاعات وعبادات

❶ مدارج السالکین : ۲/۱۰۲۔۱۰۳ تصرف کے ساتھ۔

کی ادائیگی میں لذت وچاشنی اور کیف وسرور بڑے مجاہدوں اورکوششوں اورنفسانی وشہوانی قوت پر کنٹرول کر کے ہی نصیب ہوتی ہے یہ تو اس کا پہلا مرحلہ ہے اس کے بعد صبر ورضا اورصدق وفا کا مرحلہ آتا ہے اگر اس نے اس میں بھی محنت ومشقت برداشت کرلی اور صحیح معنوں میں وہ صبر ورضا کا پیکر بنا رہا تو گویا کہ اس کی اس مقام تک رسائی ہوجاتی ہے جہاں عبادت وریاضت کی ادائیگی میں کیف وسرور محسوس ہوتا ہے اس کے بعد اس کو خود بخود عبادت کی لذت وچاشنی محسوس ہونے لگتی ہے، ٹھیک اس طرح جس طرح پانی خود بخود نشیبی زمین کی طرف بہہ کر چلا جاتا ہے۔اسی لیے ثابت بنانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''میں نے ۲۰ سال تک نماز کی ادائیگی میں محنت ومشقت کا سامنا کیا اور اس کے بعد ۲۰ سال تک اس کی لذت وچاشنی میں نے محسوس کی۔'' [1]

اسی لیے اس راہ کا سالک ہمیشہ عبادت وریاضت میں فتور یا خلل اندازی یا آفات و مصائب کے نشانہ پر رہتا ہے یہاں تک کہ اس کی اس مرحلہ تک رسائی ہوجائے، لہٰذا عبادت وریاضت میں محنت ومشقت صرف کرنے کا جو مرحلہ ہے اس میں بندہ کو عبادت وریاضت سے اعراض یا جذبہ بندگی میں فتور اور برودت یا پست ہمتی کا برابر خطرہ لاحق رہتا ہے حتی کہ اس کی رسائی اس مرحلہ تک ہوجائے جس میں طاعت وبندگی کا کیف وسرور آنا شروع ہوجائے اور اس کو عبادت وریاضت کی لذت وچاشنی محسوس ہونے لگے اور کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ بندہ کی کیفیت دگرگوں رہنے لگتی ہے کبھی تو اس کو طاعت وبندگی میں لذت محسوس ہوتی ہے اور کبھی اس پر عبادت وریاضت شاق گزرنے لگتی ہے اور اس کا دل ہیر پھیر کا شکار رہنے لگتا ہے یہاں تک کہ طاعت وبندگی سے محظوظ والی کیفیت تک اس کی رسائی ہوجائے، جس شخص کو اس کیفیت کا علم ہوجائے وہ خود بخود جان لے گا یہی اللہ سے محبت کا راستہ ہے، اور اسے اس بات کا پتہ چل جائے گا کہ اللہ سے محبت کی ابتداء کہاں سے ہوتی ہے اور انتہا کہاں ہے اور اس راہ میں اس کو کن کن گھاٹیوں سے گزرنا پڑتا ہے؟ کیا اس نے اپنے آپ کو ان مراحل

---

[1] حلیۃ الاولیاء: ۲/ ۳۱۲.

سے گزرنے کے لیے تیار کرلیا ہے؟ کیونکہ یہ طریقہ محبت کی راہ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

اللہ کے لیے کیے گئے اعمال اور عبادات کے بھی مراتب ودرجات ہیں چنانچہ جس کو ان مراتب تک زینہ بزینہ چڑھنے کی کیفیت معلوم ہوگئی اور وہ اس بات سے آشنا ہوگیا کہ ان بلند مراتب تک کیسے رسائی ہوسکتی ہے؟ وہ حقیقت میں کامیاب ہوگیا اس کے برعکس جس شخص کو اس موضوع کے متعلق ذرہ برابر شُد بُد نہیں تو اس کی عبادات کی کوئی قیمت نہیں بلکہ وہ محض روٹین ہے کیونکہ وہ عبادات کے محل سرا میں داخلہ کے ابتدائی مرحلہ سے ناآشنا ہے تو کیسے وہ اس پر قائم ودائم رہ سکتا ہے؟ اور وہ تو اس نہتے مسافر کی طرح ہے جو خطرناک راستہ پر چل رہا ہو اور راستہ کے خطروں سے ناآشنا ہو اس کو پتہ ہی نہ ہو کہ راستہ میں کیا کیا آفتیں اور مصیبتیں موجود ہیں جس کا اس کو سامنا کرنا ہے۔

مکروہات پر صبر واستقامت:

مکروہات پر صبر و استقامت بھی اللہ سے محبت کرنے کی اہم ترین نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ دل کی ناپسندیدگی کے باوجود اللہ کی محبت میں دل کو لگائے رکھنا بھی محبت کی راہ کا تاکیدی تقاضا ہے اور سچے محبّین کے لیے الزامی زادراہ ہے کیونکہ حقیقی محبت کرنے والوں کے نزدیک صبر وشکر سے بڑھ کر کسی چیز کی قدرومنزلت اور ضرورت نہیں ہوتی۔

کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ سچے اور پکے محبّ کو صبر اور استقامت کا سہارا لینا کیوں کر ضروری ہوسکتا ہے جبکہ یہ صورت کمال محبت کے منافی امر ہے کیونکہ صبر اس وقت تک وجود پذیر نہیں ہوسکتا جب تک کہ نفس کی چاہتوں کا خون کرکے محبوب کی مراد تک رسائی کا کام انجام نہ دیا جائے۔

اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ یہی نکتہ اہم ترین نکتہ ہے اور موضوع کا لب لباب ہے اور شارع حکیم کی مراد کا محور ہے اور اس عظیم الشان فائدہ کا ذریعہ ہے جس کی حصول کی غرض سے صبر کو محبت کی راہ میں درپیش منازل یا مراحل میں مؤکد ترین منزل اور اس سے متعلق اجزاء میں سے جزء لاینفک گردانا گیا ہے، یہی وہ کسوٹی ہے جس پر رکھ کر سچی اور جھوٹی محبت کو

پرکھا جاتا ہے اور اصلی محبت کو بناوٹی یا نقلی محبت سے ممیّز کر کے جانا پہچانا جاتا ہے دل کی ناپسندیدگی کے باوجود صبر و استقامت محبوب کی مراد تک رسائی کے عمل سے محبت کی اصلیت کو پرکھا جاتا ہے اور صبر وشکر میں جتنی پختگی ہوگی اسی کے بقدر محبت میں چاشنی اور لذت کا اثر نمایاں ہوتا چلا جائے گا اسی سے محبت کا راز کھل کر سامنے آتا ہے، یہی وہ چوراہا ہے جہاں سے محبت کی سچائی اور اس کا جھوٹا پن نمایاں ہوکر سامنے آجاتا ہے اور حقیقت میں اس کسوٹی پر پرکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اکثر و بیشتر لوگ اپنی محبت کے اعتبار سے دھوکے کا شکار ہیں کیونکہ ان کی محبت بناوٹی ہے، اس لیے ان میں سے ہر ایک محبت کا دعوے دار ہے لیکن جب پانی پتہ ایک کرنے کی باری آتی ہے تو وہ صابرین وشاکرین کی صف سے پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے ہیں اور حقیقت کا چولا سر بازار اتار کر چلتے بنتے ہیں اور میدان میں صرف اور صرف صابرین و شاکرین ہی ڈٹے ہوئے نظر آتے ہیں اگر اس راہ میں مشقتوں اور مصیبتوں کو گلے لگانے اور دلی خواہشات کو قربان کرنے اور پانی پتہ ایک کرنے اور صبر وشکر کا دامن تھامتے ہوئے من چاہی زندگی چھوڑنے کی خاطر سختیاں جھیلنے کی شرط نہ ہوتی تو محبت کی صحت کا دعوی درست نہ ہوتا اور یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے اللہ تعالیٰ کی ذات سے محبت کرنے میں بلند ترین مرتبہ پر فائز وہ شخص ہے جو صبر و استقامت کی راہ میں بھی سب سے ماہر ہو، یہی وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء واصفیاء اور چنیدہ لوگوں کے جس پر فائز ہونے کی وصف بیانی کی ہے، چنانچہ سیّدنا ایوب علیہ السلام کے بارے میں اس موقع پر جبکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں آزمایا تھا وصف بیانی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ إِنَّا وَجَدْنَٰهُ صَابِرًا ۚ نِّعْمَ ٱلْعَبْدُ ۖ إِنَّهُۥٓ أَوَّابٌ ﴿٤٤﴾ ﴾ (ص : ٤٤)

”بے شک ہم نے اسے صبر کرنے والا پایا، اچھا بندہ تھا۔ یقیناً وہ بہت رجوع کرنے والا تھا۔“

اللہ تعالیٰ نے مخلوق میں محبوب ترین شخص کو اپنے احکام کی بجا آوری کے لیے صبر سے کام لینے کا حکم دیا ہے اور یہ بھی بتلادیا کہ صبر وشکر اللہ ہی کی ذات کے لیے خاص ہے تو بندہ صبر کرے

تو صرف اور صرف (للّٰہ وفی اللّٰہ) کرے اور یہ بدیہی امر ہے کہ صبر کا وقوع اللہ کی مدد واستعانت کا مرہون منت ہے بغیر توفیق الٰہی کے صبر کا وجود ناممکن ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اصْبِرْ وَ مَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَ لَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَ لَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿١٢٧﴾ ﴾ (النحل : ۱۲۷)

''اور صبر کر اور نہیں تیرا صبر مگر اللہ کے ساتھ اور ان پر غم نہ کر اور نہ کسی تنگی میں مبتلا ہو، اس سے جو وہ تدبیریں کرتے ہیں۔''

یحییٰ بن معاذ رحمہ اللہ کا فرمان ہے:

''محبت کے گرداب میں پھنسنے کے بعد مصائب وآلام کی سختیاں برداشت کرنا ہی پڑتی ہیں۔'' [1]

اور ایک جگہ اور ارشاد فرماتے ہیں:

''محبت کی حقیقت یہ ہے: وہ نیکی اور خیر سگالی کے کاموں سے نہ بڑھتی ہے اور نہ ہی جفاء وتشدد یا ظلم وزیادتی سے گھٹتی ہے۔'' [2]

اور حلیمی رحمہ اللہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں:

''جس شخص کو اللہ کی ذات سے محبت کی چاشنی نصیب ہو جاتی ہے تو اس راہ میں اسے جن مشقتوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے اسے وہ اللہ کی طرف اپنے لیے باعث تکلیف نہیں سمجھتا اور نہ ہی اپنی شان میں اس کو بوجھ محسوس کرتا ہے اور نہ ہی اللہ کے لیے عبادات سے متعلق فرائض واحکامات کی انجام دہی کو اپنے اوپر گراں بار سمجھتا ہے اور نہ ہی وہ ان چیزوں کو جن کی انجام دہی کا اس کو شرعاً مکلّف قرار دیا گیا ان کی ادائیگی کو اپنے اوپر بوجھ گردانتا ہے۔'' [3]

---

[1] شعب الایمان : ۱۳/۲.

[2] شعب الایمان : ۳۸۳/۱.

[3] شعب الایمان : ۳۶۸/۱.

حقیقی محبّ اپنے محبوب پر مرغوب ترین چیزوں کو بھی ترجیح نہیں دیتا:

اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے سچی محبت کرنے والے کے نزدیک اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کے مقابلہ میں دوسری چیزوں کی محبت وچاہت ماند پڑ جاتی ہے سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میرے نفس کے علاوہ تمام چیزوں سے زیادہ آپ ﷺ مجھے محبوب وپیارے ہیں تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم مجھ سے محبت میں اس وقت تک سچے نہیں ہو سکتے جب تک میں تمہیں تمہارے دل وجان سے بھی زیادہ پیارا نہ ہو جاؤں۔ تو سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: اب آپ مجھے میری جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''یہ بات ہوئی اے عمر۔'' [1]

اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ محبت کی سچائی کی علامتوں میں سے ایک علامت یہ بھی ہے کہ بندہ کسی چیز کو بھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت پر فوقیت نہ دے، حتیٰ کہ اپنی اولاد، اپنے ماں باپ، عزیز واقارب، کنبہ برادری، غرضیکہ دنیا کی کسی چیز کو یا اپنی شہوات غریزیہ کو بھی اس پر فوقیت نہ دے، جو شخص اللہ کی ذات پر اپنی مرغوبات اور محبوب چیزوں کو ترجیح دے سمجھ لو اس کا دل مریض ہے، کسی عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

> ''تم الٰہ العالمین کی نافرمانی کرنے کے باوجود اس کی محبت اور عشق کے دعوے دار ہو یہ چیز قیاس کے اعتبار سے محال ہے اور ان ہونی اور انوکھی وشاذ ہے اگر تم اپنی محبت میں سچے اور پکے ہوتے تو تم ضرور اپنے محبوب کی محبت میں اس کی اطاعت وفرمانبرداری بجالاتے کیونکہ عاشق اپنے معشوق کے حکم کی تعمیل میں سربکف کھڑا رہتا ہے۔'' [2]

حسین بن مالک رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا گیا کہ محبت اور چاہت کی علامت کیا ہے؟

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور، باب کیف کانت یمین النبی ﷺ: ٦٦٣٢.

[2] روضۃ المحبین: ٢٦٦.

انہوں نے برملا جواب دیتے ہوئے فرمایا: ''محبوب کی چاہت پر اپنے دل کی پسندیدہ یا مرغوب ترین چیز کو قربان کر دینا محبت کی علامت ہے۔''❶

اس مسئلہ میں ایک اہم ترین ملاحظہ:

زیر نظر مسئلہ میں جو قابل غور بات ہے اس کا تعلق داعیان اور مبلغوں کا اپنے مدعوین سے تعامل کے بارے میں ہے وہ اس طرح کہ نافرمانی یا گناہوں کا ارتکاب سچی محبت کے منافی امر نہیں بلکہ نافرمانی کو کمال محبت کے خلاف عمل کہا جا سکتا ہے۔

مثال کے طور پر اگر کوئی شخص شراب نوشی کر لیتا ہے تو اس پر یہ اتہام نہیں لگایا جا سکتا کہ اس کے دل میں ذرہ برابر اللہ کی محبت نہیں ہے کیونکہ محبت ہو بہو ایمان کی طرح ہے اس کی اصل ہوا کرتی ہے اور اس میں بھی مراتب ہوا کرتے ہیں اس کے بلند و بالا مقامات میں سے وہ مقام بھی ہوتا ہے جس کو کمالیت کا درجہ کہا جاتا ہے، جیسے کہ ایمان میں درجات تفاوت ہوتے ہیں، لہٰذا معاصی کی بلاخیزی کے بقدر اس کی کمالیت میں نقص رونما ہوتا رہتا ہے لیکن جس شخص کے دل میں سرے سے اللہ کی محبت کا شائبہ تک موجود نہ ہو تو ایسا شخص کافر و مرتد اور نفاق اکبر سے متصف منافق ہے دین سے اس کا کوئی سروکار نہیں۔

سیّدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں لوگوں کو ہنسایا کرتا، اس کا کام لوگوں کو ہنسانا اور ان سے دل لگی کرنا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر حد نافذ کی تھی۔ ایک دن اس کو لایا گیا اور شراب نوشی کے جرم میں اس پر کوڑے لگائے گئے حاضرین میں سے ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا: ''اے اللہ! اس پر لعنت فرما'' کہ بار بار یہ حد شراب کے نفاذ کی خاطر پکڑ کر لایا جاتا ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''اس پر لعن طعن مت کرو اللہ کی قسم! جہاں تک مجھے علم ہے کہ یہ شخص اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہے۔''❷

---

❶ شعب الایمان : ۱/۳۸۱.

❷ صحیح بخاری ، کتاب الحدود، باب یکرہ من بعض شارب الخمر : ٦٧٨٠.

امام ابن حجر رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

"اس حدیث میں اس بات کی صراحت کردی گئی ہے کہ حرام کا ارتکاب کر لینے کو مرتکب کے دل میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کے وجود کے منافی گردانا نہیں جاسکتا کیونکہ حدیث مذکور میں نبی کریم ﷺ نے اس شخص کے بارے میں جس پر حد سکر قائم کی گئی، یہ بات صراحت کے ساتھ بتلادی ہے کہ شخص مذکور اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرتا ہے یہ اور بات ہے کہ اس سے خلاف شرع عمل صادر ہوگیا ہے اور جس شخص سے بار بار معصیت سرزد ہوجاتی ہو اس کے بارے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت سے دستبرداری کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔"

بلاشبہ اس امر کا یقینی امکان اس بات کے ساتھ مقید ہے کہ عاصی اور نافرمان کے دل میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے دائمی محبت جاگزیں ہو بشرطیکہ معصیت و نافرمانی کے بعد وہ نادم اور شرمندہ ہوتا ہو، اس پر حد نافذ کردی جاتی ہو جو اس کے گناہوں کا کفارہ بن کر تزکیۂ نفس کا فریضہ انجام دیتی ہو برخلاف اس شخص کے جس کو معصیت اور گناہوں کے ارتکاب پر ندامت نہ ہو اور نہ ہی اس پر حد نافذ کی جائے تو ایسے شخص کے بارے میں خطرہ اس بات کا ہے کہ وہ بار بار اسی گناہ کا ارتکاب کرتا رہے بایں طور اس کے دل پر مہر ثبت کردی جائے حتی کہ محبت کا داعیہ اس کے دل سے سلب کرلیا جائے۔ اللہ تعالیٰ سے ہم اس صورتحال میں دوچار سے پناہ اور عافیت چاہتے ہیں۔ [1]

محبّ کا ذکر الٰہی کا عادی ہوجانا:

محبت کی علامتوں میں سے ایک علامت یہ بھی ہے کہ محبّ اللہ کے ذکر کا عادی بن جائے۔ ابراہیم بن جنید رحمہ اللہ کا قول ہے:

"عابدوں اور زاہدوں میں سے بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ اللہ کے سچے اور پکے

---

[1] فتح الباری : ۱۲/۸۷.

عاشق زاروں کی عادتوں میں سے یہ عادت بھی ہے کہ وہ دن اور رات کے ہر لمحے میں دل وزبان سے بکثرت اللہ کا ذکر کیا کرتے ہیں اگر زبان ذکر کرتے کرتے تھک جاتی ہے تو ان کا قلب بہرحال ذکر وفکر میں مشغول رہتا ہے اور قلب کا ذکر بندے کے لیے زبان کے ذکر سے زیادہ مؤثر اورسودمند ہے۔'' ❶

سچا اور پکا محبّ تو وہ ہے جس کی زبان اللہ کے ذکر سے اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتی اور اس کا دل کسی وقت اللہ کے ذکر سے خالی نہیں رہتا کیونکہ وہ شخص جو محبت میں سچا اور پکا ہے وہ اپنے محبوب کے ذکر میں ہمیشہ رطب اللسان رہتا ہے اس کی زبان پرخود بخود محبوب کا نام آہی جاتا ہے اور ذکر سے متعلق اشیاء کی اثر پذیری یہ ہوتی ہے کہ محبّ صادق کو اللہ کی عبادت وریاضت، اوراس سے دعاء ومناجات کے ذریعہ ہم کلامی کرکے اوراس کے ذکر وفکر اوراس کی اطاعت وفرمانبرداری کے کاموں کی انجام دہی اور اس کے اولیاء واتقیاء سے محبت اسے دل وجان سے مرغوب ہوجاتی ہے بلاشبہ یہی حقیقی محبت ہے۔

مالک بن دینار رحمہ اللہ محبت کے ضمن میں ارشاد فرماتے ہیں:

''اللہ سے محبت وتعلق کی علامت اس کے ذکر پر مداومت ہے کیونکہ جو شخص جس سے محبت کرتا ہے اس کا ذکر اس کی زباں سے جاری رہتا ہے۔'' ❷

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو خطرناک سے خطرناک ترین موقعوں پر اپنے ذکر کی تلقین کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا ﴾

(الانفال: ٤٥)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم کسی گروہ کے مقابل ہوتو جمے رہو اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

مراد یہ ہے کہ میدان کارزار میں تلواروں کی چھاؤں میں اس کی گھن گرج کے باوجود

❶ حلیة الاولیاء: ١٠/١٨٦. ❷ شعب الایمان: ١/٣٨٨.

اپنے رب کریم کے ذکر سے غفلت کا شکار مت ہو۔

سچی محبت کی پہچان محبوب کی یاد سے دل کا سرشار رہنا ہے چاہے وہ پریشان کن صورتحال ہو یا مسرت کن لمحہ ہو، ہر حال میں محبوب کی یاد سے دل سرشار رہے چنانچہ دورِ جاہلیت میں عرب شعراء اپنی محبوبہ کا ذکر کر کے جنگوں کے دوران اسلحوں کی چھاؤں میں فخر ومباہات کا مظاہرہ کرتے ہوئے دشمنوں کو دعوتِ مبارزت دیتے تھے تو اہل ایمان بدرجہ اولیٰ اس موقع پر اپنے رب کریم سے محبت وتعلق کے مستحق ہیں اور اہل ایمان ان لوگوں سے زیادہ اپنے خالق ومالک سے محبت وتعلق کے حق دار ہیں جو کہ دنیاوی عاشقوں اور اوباش قسم کے پریمیوں کا اپنی محبوباؤں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔

اسی طرح محبت کی سچائی پر دلالت کرنے کی باتوں میں قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، غیر شعوری طور پر محبوب کا ذکر محبّ کے دل ودماغ اور کام ودہن پر چھایا رہے اور بہرصورت محبوب کا ذکر زبان پر سب سے پہلے آئے چاہے وہ صبح سویرے سو کر اٹھتے وقت ہو یا شام کو سونے کے لیے بستر پر جاتے وقت سونے سے پہلے پہلے، بہرحال بندہ نیند کی آغوش میں جائے تو اللہ کا ذکر کرتے ہوئے اور خوب خرگوش سے بیدار ہو تو بھی اللہ کا ذکر زباں سے جاری ہو، اسی لیے سونے اور سوکر اٹھنے کی دعاؤں پر پابندی سے عمل پیرا ہونا بندے کی رب کریم (جو سب سے بلند وبالا اور سب سے عظیم وبڑا ہے) سے محبت کی بیّن دلیل ہے۔

محبوب سے سچی محبت کرنے والے کا خلوت میں بھی خوف وخشیت سے رونا:

محبوب سے سچی وپکی محبت کرنے والا تو وہ ہے جو خلوت میں بھی اپنے محبوب کو یاد رکھے اور جب اللہ تعالیٰ کا اس کے سامنے ذکر آئے تو مارے خوف وخشیت کے اس کا دل دہل جائے اور آنکھیں پرنم ہو جائیں اور آنسو بہہ پڑیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ

عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ ﴾

(الانفال : ٢)

''(اصل) مومن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان پر اس کی آیات پڑھی جائیں تو انھیں ایمان میں بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسا رکھتے ہیں۔''

ذرا دنیاوی عاشقوں اور پریمیوں کی مضبوطی محبت کا اندازہ لگائیں، جب ان کے محبوب یا معشوق کا ذکر آتا ہے تو ان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں اور وہ دل تھام کر یکسوئی کے ساتھ توجہ مرکوز کر کے بیٹھ جاتے ہیں، تو پھر ان کامل مومنین کا کیا وتیرہ ہوتا ہوگا جو اللہ کی محبت سے سرشار ہر وقت اسی کی تسبیح وتحمید میں مشغول رہتے ہیں آپ خود تصور کیجیے کہ محبانِ الٰہی کا اس وقت کیا حال ہوتا ہوگا جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر آجاتا ہوگا۔''

محبّ، اللہ کی خاطر غیرت وحمیت کا مجسم پیکر ہوتا ہے:

اگر بے غیرت لوگ اللہ کی حرام کردہ چیزوں کے حرمت کی پامالی کرنے پر اُتر آتے ہیں یا اللہ کے حقوق کی ادائیگی میں بے حس لوگ غلط روش اختیار کرنے لگتے ہیں تو یہ بات پاک طینت شخص کو طبعی طور پر آگ بگولہ کر دیتی ہے دراصل ایک محبّ حقیقی کی غیرت ایمانی کا تقاضا اور خاصہ بھی یہی ہے بلکہ دین ایمان کی اساس یہی غیرت ایمانی ہے لہٰذا دینداری کے اعتبار سے مضبوط ترین اور محبت کے اعتبار سے بلند مرتبہ پر فائز اور غیرت اسلامی میں عظیم ترین مقام کا حامل وہ شخص ہے جو اللہ کی حرام کردہ چیزوں کی طرف سے لوگوں میں زیادہ زیادہ غیرت وحمیت کا پاس ولحاظ رکھنے والا ہو، اسی لیے کامل مومنین کا خصوصی وصف یہی ہے وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور نہی عن المنکر کے کام کو اپنی غیرت وحمیت کا پرتو سمجھ کر انجام دیتے ہیں کیونکہ ان کو علم ہے کہ ان کے محبوب کو منکر کا ارتکاب کسی صورت میں پسند نہیں اسی لیے وہ بھی منکرات کے ارتکاب کو پسند نہیں کرتے اور نہ ہی اس کی انجام دہی کی طرف کسی طرح راغب ہوتے ہیں بلکہ وہ تو منکرات وفواحش کا قلع

قمع کر کے ہی چین وسکون کا سانس لیتے ہیں۔

کلام الٰہی کی محبت اور اس سے لگاؤ بھی اللہ سے محبت کی علامت ہے:

اگر تم یہ بات جاننا چاہتے ہو کہ اللہ کی محبت میں تم کتنے سچے اور پکے ہو تو ذرا اپنے دل کوٹٹول کر دیکھو کہ اس میں کتاب اللہ کی محبت کس حد تک جاگزیں ہے اور یہ بات مجرب اور معروف ہے کہ اگر کسی کو کسی سے محبت ہوتی ہے تو اس کے نزدیک اپنے محبوب کا کلام اس کی گفتگو حد سے زیادہ پسندیدہ اور مرغوب ہوتی ہے کیونکہ عاشقوں کے نزدیک اپنے محبوب کے کلام سے بڑھ کر کوئی چیز لذیذ اور باعث سرور نہیں ہوتی ان کے نزدیک محبوب کا کلام باعث تسکین ہوتا ہے اور وہی ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کی آماج گاہ اور محور ہوتا ہے وہی ان کا مطلوب ومقصود ہوتا ہے یہی وہ راز ہے جس کی وجہ سے عاشقان پاک طینت، جو عشق الٰہی سے سرشار ہوتے ہیں، کتاب اللہ کی تلاوت وقراءت اس کی تفسیر وتشریح اس میں تدبر وتفکر اور زندگی کے ہر موڑ پر اور روزمرہ کے پیش آنے والے قضایا و معاملات میں اس سے استشہاد واستنباط ان کا اوڑنا بچھونا بن جاتا ہے لہٰذا وہ ہر وقت بکثرت تلاوت کرتے ہوئے ملتے ہیں چاہے وہ زبانی ہو یا ناظرہ بہرصورت وہ تلاوت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ ان کی کتاب اللہ سے محبت کی دلیل ہے گویا کہ وہ اسی کے ہو کر رہ جاتے ہیں اور اسی کی محبت میں سرشار جینے اور مرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ جب کوئی شخص کسی سے محبت کرتا ہے تو اکثر وبیشتر اس کی باتوں کا حوالہ دیتا ہے اور اپنے محبوب کے کلام کے اقتباسات بطور استشہاد جابجا پیش کرتا ہے اور اس کی نقل کرنے کی کوشش کرتا ہے، بلکہ اسی کی طرح ایکٹنگ کرنا پسند کرتا ہے تو تم خود ہی بتاؤ جب عارضی محبت کرنے والوں کا حال یہ ہے تو اللہ سے حقیقی محبت کرنے والوں کا رب کریم اور اس کی کتاب حکیم کے ساتھ کیا حال ہونا چاہیے، سیّدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں:

''جو اس بات کی جانچ پڑتال کرنا چاہے کہ آیا وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے یا

نہیں تو اس کو چاہیے کہ اپنے نفس کو کتاب اللہ کی کسوٹی پر رکھ کر پرکھے، اگر اس کا نفس قرآن کریم کی محبت سے سرشار ہے تو گویا کہ وہ بھی اللہ کی محبت کے دعویٰ میں سچا اور کھرا ہے کیونکہ قرآن کریم اللہ کا کلام ہے۔'' ❶

اور سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ کا فرمان ہے:

''اللہ کی قسم! تم اس وقت تک محبت کی کنہ تک رسائی نہیں پا سکتے جب تک کہ دنیا کی ساری چیزیں اللہ کی محبت کے سامنے تمہاری نگاہ میں ہیچ نہ ہو جائیں اور دنیا میں سے کسی چیز کی محبت کا تمہارے دل میں شائبہ تک نہ پایا جائے اور جس شخص نے قرآن کریم سے محبت کا رشتہ جوڑ لیا گویا کہ اس کی محبت اللہ سے پکی ہوگئی۔'' ❷

نیک اعمال میں سستی پر حسرت وندامت کا اظہار بھی محبت ہے:

اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرماں برداری نیز ادعیہ واذکار میں سے اگر کسی چیز کی انجام دہی نہ ہو پائے تو اس پر حسرت وندامت کا اظہار بھی اللہ سے محبت کی علامت ہے۔

اللہ تعالیٰ کے محبوب لوگوں کے نزدیک وقت کا ضیاع یعنی بغیر عمل یا بغیر اطاعت وفرمانبرداری کے وقت ضائع کر دینا پہاڑ ڈھا دینے سے بھی زیادہ سخت اور خطرناک ہوا کرتا ہے اگر اللہ والوں میں سے کسی بندے کا کوئی وظیفہ یا ورد کسی دن فوت ہو جاتا تو وہ اس کا الم اور دکھ درد مال ودولت کے ضائع ہونے سے زیادہ محسوس کرتے اور اللہ والوں کو مال کے چوری ہو جانے یا تلف ہو جانے سے زیادہ اپنے اوراد واذکار سے محرومی کھلتی ہے بلکہ وہ اس کی ٹیس کو اپنے دل میں واضح طور پر محسوس کرتے ہیں اور مارے شرم وندامت کے فوراً اس کی خانہ پوری کی کوشش کرتا اور جلد از جلد اس کی ادائیگی کا بندوبست کر کے اس سے دست بردار ہو جانا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں جیسا کہ صادق ومصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا۔

---

❶ ملاحظہ ہو: (السنة لعبدالله بن احمد : ١٢٥ اور امام ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد میں فرمایا ہے۔ ٧/٢٤٢ اس کے رجال ثقہ ہیں۔ ❷ شعب الایمان : ١/٣٦٥.

سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، فرماتی ہیں:

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی کوئی عمل بطور ورد شروع کرتے تو اس کو پابندی کے ساتھ مستقل مزاجی سے کرتے اور اگر کبھی رات کو نیند کا شکار ہو جاتے یا بیماری سے دوچار ہو جاتے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت ناساز ہوتی تو دن کو ۱۲/ رکعتیں ادا کرکے اس کی تلافی کرلیا کرتے تھے۔'' [1]

محبّ اپنے محبوب کی عظمت و کبریائی کے سامنے اپنے اعمال کو ہیچ سمجھتا ہے:

محبّ اپنے محبوب کی عظمت و کبریائی کے سامنے اپنے سارے اعمال کو ہیچ سمجھے بلکہ رب کریم کی جلالت شان کے مقابلہ میں محبّ کو اپنے اعمال پر ذرہ برابر نازاں نہیں ہونا چاہیے، اس کے آنکھوں میں اس کی کوئی حیثیت نہ ہو۔

لہٰذا محبّ الٰہی تو وہ ہے جو اپنی عبادات اور اس کی انجام دہی میں مشقت و پریشانی کو ذرہ برابر اہمیت نہ دے اور اپنے افعال و کردار اور انجام شدہ اعمال کو کم مایہ و کم قیمت سمجھے اور ہمیشہ یہ باور کرے کہ اللہ کے احسانات کے سامنے اس کے اعمال کی کوئی قدر و قیمت نہیں بلکہ ہم تو اس کا حق ادا کر ہی نہیں کر سکتے، ہمارے اعمال و افعال اس کے احسانات کے مقابلہ میں کسی گنتی اور شمار کے نہیں اور اپنے محبوب کی شان کو اس کے لیے کیے گئے ہر طرح کے عمل سے کہیں بلند و بالا تصور کرے اور قدر و منزلت میں اپنے محبوب کو اعلیٰ و ارفع تصور کرے اور اپنے عمل کے بل بوتے پر نازاں نہ ہو، بلکہ اپنے انجام شدہ اعمال کو مورد الزام ٹھہرائے اور اسے اللہ کی شان و شوکت کے سامنے حقیر و بے وقعت تصور کرے بلکہ بندے کو ہمیشہ اس بات کا خدشہ رہے کہ اس نے اپنے محبوب کی شان کے مطابق عمل نہ کرکے اس کا حق ادا نہ کیا اور جو نقص و کمی کا اندیشہ ہو توبہ سے اس کی تلافی کرے، اسی لیے تو بندہ نماز ادا کر لینے کے بعد أَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ کہتا ہے: ''اے اللہ! میں تجھ سے بخشش اور مغفرت چاہتا ہوں'' لہٰذا بندہ کو رب کریم کی عبادت کما حقہ نہ ہونے کے نقص کی تلافی کے لیے توبہ و استغفار کرتے رہنا چاہیے

[1] صحيح مسلم: ٧٤٦.

کیونکہ عبادات میں نقص وکمی رہ جاتی ہے یہ انسان کی فطرت کا خاصہ ہے اور اللہ کی ذات سے جتنی محبت بڑھتی جائے گی، اتنے ہی باری تعالیٰ کی معرفت کے رموز واسرار کھلتے چلے جائیں گے اور اس کی نگاہ میں اپنے اعمال کی قدر وقیمت ہیچ ہوتی چلی جائے گی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ الَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ﴿٦٠﴾ ﴾ (المومنون : ٦٠)

''اور وہ کہ انھوں نے جو کچھ دیا اس حال میں دیتے ہیں کہ ان کے دل ڈرنے والے ہوتے ہیں کہ یقیناً وہ اپنے رب ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔''

مسلمانوں کے لیے نرم خو اور کافروں کے لیے تند وسخت اور جہاد کی تیاری:

اللہ سے محبت کی علامات میں سے ایک علامت یہ بھی ہے کہ بندۂ مومن مسلمانوں کے لیے نرم خو اور نیک مزاج وخوش اخلاق ہو اور کافروں کے لیے تند وسخت ہو اور اللہ کی راہ میں جنگ کرنے لیے سربکف تیار رہتا ہو اور اللہ کے بارے میں کسی لعنت ملامت کرنے والے کی لعنت ملامت کی پروا نہ کرتا ہو۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ۭ ﴾ (المائدة : ٥٤)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ عنقریب ایسے لوگ لائے گا کہ وہ ان سے محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے، مومنوں پر بہت نرم ہوں گے، کافروں پر بہت سخت، اللہ کے راستے میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔''

آیت کریمہ میں ایمان والوں کے چار اوصاف بیان ہوئے ہیں:

۱۔ مومنین کے لیے ان کا نرم خو یا خوش مزاج ہونا اور ان پر رحم وکرم، شفقت ومہربانی کا معاملہ کرنے والا ہونا۔

۲۔ کافروں کے لیے سخت اور ترش رو ہونا۔

۳۔ اللہ کی راہ میں جنگ وجدال کرنے کے لیے تیار رہنا۔

۴۔ اور اللہ کی راہ میں کسی لعنت ملامت کرنے والے کی لعنت ملامت کی پروا نہ کرنا۔

یہ ہیں ایک مومن کے اوصاف حمیدہ جس کا تذکرہ آیت کریمہ میں وارد ہوا ہے۔

ذوالنون مصری رحمہ اللہ سے محبت کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

> ''جو چیز اللہ کو محبوب ہو وہی تمہارے دل کو بھائے اور جو چیز اللہ کو ناپسند ہو اس کی طرف تمہاری طبیعت راغب نہ ہو اور تم محض اللہ کی خوشنودی کی خاطر انسانیت کی فلاح وبہبود کے لیے نیک کام کرو اور جو چیز اللہ کی یاد سے غافل کر دینے کا ذریعہ ہو اس کا بائیکاٹ کرنا تمہاری عادت بن جائے اور اللہ کی خاطر کسی لعنت وملامت کرنے والے کی لعنت ملامت کی تم کو کوئی پروا نہ ہو اور مومنین کے لیے نرمی تمہارا طرۂ امتیاز بن جائے اور کفار ومشرکین سے برسر پیکار ہونے کا معاملہ ہو تو تم فولاد کی صلابت رکھنے والے بن جاؤ اور دین کے معاملہ میں اتباع سنت رسول تمہارا شیوہ بن جائے۔''[1]

شرعی احکامات کی اتباع بھی محبت کی علامت ہے:

اللہ تعالیٰ کے شرعی احکامات کی اتباع بھی اللہ سے محبت کی علامت ہے بارگاہ الٰہی میں متبع احکام شریعت کو محبوبیت کا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ

---

[1] شعب الایمان : ۳۶۹/۱.

ذُنُوبَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٣١﴾ (آل عمران : ٣١)

''کہہ دے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھیں تمھارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔''

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ علیہ آیت کریمہ کی توضیح وتفسیر بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''یہ آیت کریمہ ہر اس شخص کے بارے میں حاکم عدل کی حیثیت رکھتی ہے جو اللہ کی محبت کا خالی دعویٰ کرے مگر ملت محمدیہ ﷺ سے روگرداں ہو اور جادۂ محمدی سے ہٹ کر کسی دوسری راہ کو اختیار کیے ہوئے ہو، بلاشبہ ایسا شخص اپنے زبانی دعوے میں جھوٹا اور دروغ گوئی سے کام لینے والا ہے اس وقت تک وہ محبت کے دعویٰ میں حق بجانب نہیں ہوسکتا حتی کہ وہ شریعت محمدیہ اور دین نبوی کے تمام اقوال وافعال اور تمام احوال وکوائف میں اتباع اور پیروی نہ کرنے لگے۔''[1]

امام زمخشری رحمہ اللہ اس آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جو شخص اللہ کی محبت کا زبانی طور پر دعویٰ کرے اور عملی طور پر رسول اللہ ﷺ کی سنت کی مخالفت پر کاربند ہو تو وہ جھوٹا اور کذاب و دجال ہے۔ کتاب اللہ بذات خود اس کی تکذیب کر رہی ہے اور اگر تم کسی ایسے شخص کو دیکھو جو اللہ کی محبت کا ذکر کر کے اپنے منہ میاں مٹھو بنا ہوا ہو اور اللہ کا ذکر کرتے ہوئے تالیاں بجائے، قوالیاں گائے، نعرے بازی کرے اور طرب ومستی میں وجد وحال کا سماں بنائے تو اس بات میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ ایسا شخص اللہ کی معرفت سے کوسوں دور ہے اس کو پتہ ہی نہیں کہ اللہ کی محبت ہوتی کیا ہے؟ جہاں تک قوالیاں گاتے ہوئے تالیاں بجانے، جھومنے اور حال آنے، گانے بجانے اور نعرے بازی اور طرب ومستی کی کیفیت میں وجد وحال آنے کا معاملہ ہے تو یہ

[1] تفسیر ابن کثیر : ١/٤٧٧.

اس کے نفس میں خبیث تصور کا نتیجہ ہے یہ ایک تصوراتی عشق و پریم کی کیفیت ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کی اس جاہلانہ اور فاسقانہ حرکت کی نشان دہی کر دی ہے اس کے بعد تالیاں بجانے اور ناچنے گانے کیف وسرمستی، نعرے بازی اور شور وشرابہ، اور تصور عشق میں جھومنے اور حال آنے کی باری آتی ہے اور کبھی تو اس بات کا بھی مشاہدہ کیا گیا ہے کہ منی اور غلاظت اس سرمست شخص کے پاجامہ یا لنگی میں وجد و حال کی کیفیت میں نکل کر لت پت ہو جاتی ہے اور جاہل عوام حماقت کا پتلا بنے اس کے اردگرد کھڑے ہوتے ہیں ان کے حال اور وجد کی کیفیت کو دیکھ کر عوام پر رقت اور وجد کا سماں بندھ جاتا ہے اور آنسو بہنے کی وجہ سے ان کے کپڑے بھیگ جاتے یا نم ہو جاتے ہیں۔'' ❶

عداوت ومحبت کا معیار اللہ ہی کے واسطے ہونا:

اللہ ہی کے لیے باہم محبت و دوستی کا ہاتھ بڑھانا اور اللہ ہی کے لیے عداوت اور دشمنی کا شکنجہ کسنا بھی اللہ سے محبت کی علامت ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اللہ اور اس کے رسول سے محبت کے اتمام کا مظہر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مخالفت کرنے والوں سے بغض وعداوت کا معاملہ روا رکھنا ہے۔'' ❷

اور امام مناوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''محض اللہ کی خاطر محبت کرنا گویا کہ اللہ سے محبت کرنا ہے۔'' ❸

صالح بندوں سے محبت کرنا:

اللہ کے مطیع وفرمانبردار اور نیک وصالح بندوں سے محبت کرنا بھی اللہ سے محبت کی علامت ہے۔ اس بارے میں شاہ کرمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

❶ الكشاف: ١٧٣. ❷ مجموع الفتاوى: ٣٦١/٨.

❸ فيض القدير: ٤٨٥/٤.

”اولیاء اللہ سے محبت و تعلق اللہ سے محبت و تعلق استوار ہونے کی دلیل ہے۔“ ❶

اور علامہ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”اہل ملت اسلام سے محبت کرنا گویا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنا ہے۔“ ❷

مثال کے طور پر آل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنا۔

سیّدنا یعلیٰ بن مرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

”حسین (رضی اللہ عنہ) مجھ سے ہیں اور میں حسین سے ہوں، جس نے حسین سے محبت کی اس نے گویا کہ اللہ سے محبت کی، حسین میری اولاد میں سے ایک ہیں۔“ ❸

سیّدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، فرماتی ہیں:

”میں اس بات کی گواہی دیتے ہوئے کہتی ہوں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے: جس شخص نے علی سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی اس نے اللہ سے محبت کی اور جس نے علی سے بغض وعداوت کا معاملہ روا رکھا اس نے مجھ سے بغض و عداوت کی اور جس نے مجھ سے عداوت کی اس نے اللہ سے بغض وعداوت کا معاملہ کیا۔“ ❹

اسی ضمن میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے محبت کا تذکرہ بھی آتا ہے۔ چنانچہ سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ارشاد فرماتی ہیں:

”کسی شخص کو اس بات کا قطعی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اسامہ کو برا بھلا کہے یا ان سے

---

❶ حلية الاولياء: ۱۰/ ۲۳۷۔ ❷ فتح الباری: ۱/ ۱۴۹۔

❸ ترمذی، كتاب المناقب، باب حلمه و وضعه صلى الله عليه وسلم: ۳۷۷۵ - ابن ماجة: ۱۴۴ وصححه الحاكم و وافقه الذهبی۔

❹ المعجم الكبير للطبرانی: ۲۴/ ۳۸۰ وصححه الحاكم و وافقه الذهبی۔

بغض وعداوت کا رویہ اپنائے جبکہ میں رسول اللہ ﷺ کو ان کے بارے میں یہ کہتے ہوئے سن چکی ہوں کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کا رشتہ استوار رکھنا چاہتا ہے اس کو چاہیے کہ وہ اسامہ رضی اللہ عنہ سے محبت کرے۔'' ❶

دنیاوی زندگی سے بے رغبتی اور زہد بھی اللہ سے محبت کی علامت ہے:

امام محمد بن مبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''کیا اس شخص کو اللہ کی محبت کے دعوے کا حق حاصل ہے جبکہ اس کا حال یہ ہے کہ وہ ثرید کو اپنی تینوں انگلیوں سے لپیٹ کر کھانے میں جتا ہوا ہو۔'' ❷

مراد یہ ہے زیادہ سے زیادہ کھانے کی رغبت رکھتا ہے بلکہ کھانے پینے کا لالچی ہے اس لیے کہ اللہ کی محبت اس دنیا کی محبت سے بغض وعداوت اور زہد و بے رغبتی کی خواہاں ہے کیونکہ اللہ سے محبت کرنے والے شخص کے قلب کا تعلق اس سے کہیں بلند وبالا مقاصد تک رسائی کی تگ ودو میں اٹکا رہتا ہے اسے کام ودہن کی لذت سے کیا سروکار؟

حصولِ محبت الٰہی کے اسباب اور ذرائع

مسلمان کا بحیثیت مسلمان یہ شیوہ ہونا چاہیے کہ وہ محبت الٰہی کے حصول کی حتی الامکان کوشش کرے، بلکہ دل و جان سے محبت الٰہی کے مرتبہ تک رسائی کی تگ و دو کرے یا بالفاظ دیگر اپنی پوری قوت وتوانائی اللہ کی محبت کے حصول کی کوشش میں صرف کر دے اس غرض کے پیش نظر ہم یہاں پر ان بعض اسباب ووسائل کا تذکرہ کرنے جا رہے ہیں جو بندۂ مومن کے دل میں محبت الٰہی کی لذت اور چاشنی پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں:

قرآن کریم کی تدبر وتفکر، فہم وادراک کے ارادے سے تلاوت وقراءت کرنا:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ﴿٢٤﴾﴾ (محمد: ٢٤)

---

❶ رواہ احمد: ٢٥٢٧٣ وقال شعیب الارنؤوط: صحیح لغیرہ۔ ❷ حلیہ الاولیاء: ٩/٢٩٨۔

”تو کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے یا کچھ دلوں پر ان کے قفل پڑے ہوئے ہیں؟“

دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَ لِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴾ (ص : ٢٩)

”یہ ایک کتاب ہے، ہم نے اسے تیری طرف نازل کیا ہے، بہت بابرکت ہے، تاکہ وہ اس کی آیات میں غور وفکر کریں اور تاکہ عقلوں والے نصیحت حاصل کریں۔“

قرآن کریم کے نازل ہونے کا دراصل یہی بنیادی مقصد اور عظیم ترین ہدف واساسی محور ہے کہ بندے کا دل اس بات میں لگا رہے کہ اس نے جو آیات کریمہ تلاوت کیں ہیں اس کی غرض وغایت کیا ہے؟ ہر وقت اس کو یہی فکر دامن گیر رہے۔ توبہ واستغفار کا معاملہ ہو یا اُمید و رجاء کا مسئلہ ہو، غرضیکہ یہ اور ان جیسے جو بھی معاملات درپیش ہوں ان میں بندۂ مومن قرآن کریم کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے۔

سیّدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں:

”ایک رات میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ قیام اللیل کیا، نبی کریم ﷺ نے سورۂ بقرۃ کی تلاوت شروع کی میں سمجھ رہا تھا: شاید سو آیات پوری کرکے رکوع فرمائیں گے۔ آپ ﷺ پڑھتے رہے اور سو آیتیں پوری ہوگئیں: (پھر میں نے خیال کیا کہ آپ سورۂ بقرہ ختم کرلینے کے بعد ہی رکوع فرمائیں گے) چنانچہ سورۂ بقرہ ختم ہوگئی اور آپ ﷺ پڑھتے رہے اور سورۂ نساء پڑھنا شروع کردی اور اس کے ختم ہوجانے کے بعد سورۂ آل عمران پڑھنا شروع کردی (آپ خوش الحانی کے ساتھ آرام سے ٹھہر ٹھہر کر ترتیل کے انداز میں تلاوت فرمارہے تھے) جب کسی ایسی آیت سے گزر ہوتا جہاں اللہ کی تسبیح وتقدیس بیان کا ہوتو آپ ﷺ تسبیح وتقدیس فرماتے اور اگر کسی ایسی آیت سے گزرتے

جس میں اللہ سے مانگنے کی ترغیب دی گئی ہے تو وہاں اللہ سے مانگتے اور سوال کرتے اور اگر کسی ایسی آیت سے آپ ﷺ کا گزر ہوتا جہاں اللہ کی پناہ طلب کرنے کی ضرورت ہوتی تو وہاں اللہ کی پناہ طلب فرماتے (یہ تھی نبی کریم ﷺ کی تدبر وتفکر کے ساتھ تلاوت)۔''❶

سیّدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

''نبی کریم ﷺ جب ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى﴾ یعنی (سورۃ الاعلی) کی تلاوت شروع کرتے تو (سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى) کہتے (یعنی اللہ کی تسبیح وتقدیس بیان فرماتے۔''❷

کیونکہ یہاں اللہ کی تسبیح وتقدیس بیان کرنے کا حکم وارد ہوا ہے۔

اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ قرآن کریم کی تدبر وتفکر کے ساتھ تلاوت وقراءت سے بڑھ کر کوئی چیز اللہ کی محبت کے حصول کا ذریعہ نہیں، یہی وہ سودمند طریقہ ہے جس کو اپنا کر اللہ کی محبت تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے کیونکہ یہ طریقہ سالکین کے منازل سلوک اور مخلص عاملین کے عمل صادق کا نچوڑ اور خلاصہ ہے یہی وہ نفع بخش طریقہ ہے جو محبت وچاہت، شوق رغبت، خوف وڈر، امید وبیم، رجوع وانابت، توکل واعتماد، رضا وخوشنودی، شکر وطاعت، صبر واستقامت غرض یہ کہ اعمال قلوب میں سے ہر ایک عمل کو بندہ کے خانہ دل میں جاگزیں کرنے کا وسیلہ اور سبب بنتا ہے اور اسی کے ساتھ قراءت قرآن بندۂ مومن کے قلب کو گندی اور قابل مذمت عادتوں، نیز ان فحش افعال واعمال سے دور رکھنے کا سبب وذریعہ ہوا کرتی ہے جو قلب کو فاسد وبے کار کرکے اسے مردہ وبے جان بنا ڈالنے کا پیش خیمہ ہیں۔

لوگ تلاوت قرآن کریم کے بارے میں اس پہلو سے اہمال کا شکار ہیں انہوں نے اس

---

❶ صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين، باب استحباب تطويل القرأة في صلاة الليل: ٧٧٢.

❷ ابو داؤد، كتاب الصلاة، باب الدعاء في الصلاة: ٨٨٣۔ احمد: ٢٠٦٦۔ وصححه الحاكم ووافقه الذهبي وقال: على شرطهما۔

زاویہ سے اس کی قدر و قیمت کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی ہے اور نہ ہی اس کی طرف توجہ مرکوز کرنے کی ان کو کبھی فکر دامن گیر ہوئی ہے اسی لیے امام حسن بصری رحمہ اللہ کا فرمان ہے:

''قرآن کا نزول ہی اس لیے ہوا ہے کہ اس کے حکم کے بموجب اس پر عمل کیا جائے مگر لوگوں نے اس کی تلاوت کو عمل کے قائم مقام بنا ڈالا ہے۔'' ❶

مراد یہ ہے کہ انہوں نے اپنی توجہ صرف تلاوت قرآن کریم کی طرف مرکوز کردی ہے اور اسی پر اکتفاء کرلیا ہے اور اس پر عمل درآمد کرنے کے پہلو کو پس پشت ڈال دیا ہے۔

قرآن کریم میں تدبر وتفکر اصلاح قلب کی اساس وبنیاد ہے اور اس کے حکم کے بموجب عمل کرنا اس کا اتمام یا انجام ہے، اس لیے دونوں کا بیک وقت پایا جانا لازم وملزوم کی حیثیت رکھتا ہے ان میں سے دونوں ایک دوسرے کے بغیر ناقص اور ادھورے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی انجام دہی اور مخالف شریعت کاموں سے اجتناب:

امام ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''بندے کی اللہ سے محبت کے حصول کا راز اللہ کی طاعت وفرمانبرداری اور اس کی مخالفت سے کنارہ کشی میں مضمر ہے۔'' ❷

یحییٰ بن معاذ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جو شخص اللہ کی محبت کا دعویٰ کرے اور حال یہ ہو کہ وہ اللہ کی حدود کا پاس ولحاظ نہ رکھتا ہو ایسا شخص اپنے دعوے میں جھوٹا اور دروغ گو ہے۔'' ❸

امام ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''نماز کی قدر و قیمت بڑی عجیب وغریب ہے، نماز سے اس بندے کے لیے اللہ کی محبت کا فیضان ہوتا ہے جو اللہ کے تقرب کا خواہاں ہو، کیونکہ نماز بندے اور رب کے درمیان مناجات سرگوشی اور قربت وتعلق کا ذریعہ ہے اس لیے کہ نماز کی

---

❶ تلبیس ابلیس : ۱۳۷.
❷ فتح الباری : ۱/ ٦١.
❸ کلمة الاخلاص : ۳۲.

حالت میں اس کے اور رب کے درمیان کوئی واسطہ یا حجاب حائل نہیں ہوتا، نماز کی حالت میں رب کریم اور بندے کے درمیان پردے اٹھ جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بندۂ مومن کے لیے نماز سے بڑھ کر کسی چیز میں لطف وسرور اور آنکھوں کا چین وقرار نہیں ہوتا اور جس شخص کو کسی چیز میں اپنے آنکھوں کی ٹھنڈک محسوس ہوتی ہو وہ کبھی اس کو چھوڑنا یا اس سے علیحدگی اختیار کرنا پسند نہیں کرے گا اور نہ ہی وہ اس پرکیف ماحول سے نکل کر کہیں جانا چاہے گا کیونکہ اس پُر کیف فضا میں وہ اپنے آپ کو خوش نصیب محسوس کرتا ہے گویا کہ وہ ناز ونعم کے ماحول میں باسعادت لحات سے محظوظ ہو رہا ہے، کیونکہ اسی ماحول سے اس کی زندگی کے حسین صبح وشام وابستہ ہیں، مراد یہ ہے کہ وہ نعیم مقیم کے عالم میں زندگی گزار رہا ہے اور یہ نعمت صرف اور صرف اس مخلص عابد وزاہد بندے کو نصیب ہوتی ہے جو اللہ کی بارگا میں نیت باندھ کر صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے ستون کی طرح نماز دوگانہ ادا کرنے کی غرض سے دنیا سے رشتہ ناتا توڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جنبش ہی نہیں ہے۔'' [1]

فرائض کی ادائیگی کے بعد نوافل ادا کر کے اللہ کا تقرب حاصل کرنا:

سیّدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: جس نے میرے چاہنے والے سے دشمنی کی، میرا اس سے جنگ کا اعلان ہے اور جو کچھ میں نے اپنے بندے پر فرض کیا ہے بندے کی طرف سے میرے لیے اس سے زیادہ بڑھ کر کوئی چیز باعث تقرب نہیں ہے اور میرا بندہ مستقل نوافل نماز ادا کر کے مجھ سے قربت حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، حتی کہ جب میں اس کو اپنا محبوب بنالیتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس

[1] فتح الباری: ۱۱/۳۴۵.

کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پیر بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے مانگتا ہے تو میں اس کو عطاء کرتا ہوں اور اگر وہ میری پناہ طلب کرتا ہے تو میں اس کو پناہ سے دے کر محفوظ و مامون کر دیتا ہے۔'' [1]

اس حدیث قدسی شریف میں محبت کے اسباب کو دو چیزوں کے ضمن میں محصور قرار دیا گیا ہے جس کے بیان پر صراحت کے ساتھ یہ حدیث الٰہی شریف دلالت کر رہی ہے:

۱۔ اللہ کے فرائض کی ادئیگی۔

۲۔ نوافل کے ذریعہ اللہ کی قربت کا حصول، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس حدیث میں اس بات کی نشان دہی کر دی ہے کہ فرائض کی ادائیگی اللہ کی قربت کے حصول کا بہترین مشغلہ ہے اس کے بعد نوافل کا نمبر آتا ہے، بندۂ مومن بکثرت نوافل ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور برابر نوافل کی زیادہ زیادہ پابندی کرتا رہتا ہے اور اس کی ادائیگی میں روز افزوں اضافہ کرتا جاتا ہے حتی کہ اللہ کے نزدیک اس عمل عظیم کے باعث محبوبیت کے مقام تک رسائی پانے میں کامیاب ہو جاتا ہے پھر جب اس کو اللہ کے نزدیک محبوبیت کا مقام مل جاتا ہے تو اللہ کی محبت دنیاوی افکار وخیالات، اور نفسانی وساوس وشبہات یا عبادت وریاضت سے میل نہ کھانے والے خارجی امور سے اسے بے نیاز کر دیتی ہے، اب اللہ کی ذات سے سچا اور پکا تعلق ہو جانے کے بعد دنیاوی افکار وخواطر کے لیے اس کے دل میں جگہ باقی نہیں رہتی، چنانچہ اب اگر مقام محبوبیت سے میل نہ کھانے والے افکار وخیالات بالفرض سر اٹھاتے بھی ہیں تو اللہ سے تعلق کی بنا پر وہ خود بخود ختم ہو کر بے کار ہو جاتے ہیں یا انھیں بہت جلدی جان بچا کر بھاگنے پر خود بخود مجبور ہو جاتے ہیں کیونکہ اس مرتبہ تک رسائی کے بعد اس شخص پر اللہ کی جانب سے مراقب بٹھا دیا جاتا ہے جو ان افکار وخیالات کو اس کے پاس آنے سے روکنے کا فریضہ انجام دیتا ہے جن کی

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع: ٦٥٠٢.

یلغار ایک انسان پر ہوا کرتی ہے اور اس قسم کے بندے کے دل میں اللہ کی ذات کی ہیبت اور اس کی جلالت شان کی عظمت ایسی چھا جاتی ہے جو اسے عبادت کی راہ میں روڑا اٹکانے والی چیزوں میں مشغول ہونے سے منع کرتی اور روکتی ہے، پھر اس محبوب الٰہی بندہ کے دل میں اللہ کی تعظیم وتقدیس اور رب کریم سے انس ومحبت اور اس سے ملاقات کا ایسا اشتیاق اور جذبہ پیدا ہو جاتا ہے جو اس کو ذکر وفکر، قرآن کریم کی تدبر وتفکر کے ساتھ تلاوت، عبادت وریاضت، پر مداومت کرنے والا عامل باعمل بنا دیتا ہے۔

کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں۔ بلکہ اکثر وبیشتر مسلمانوں کا یہی حال ہے۔ کہ وہ نوافل بکثرت پابندی کے ساتھ ادا کرتے ہیں لیکن واجبات کی ادائیگی میں کوتاہی کا شکار ہیں اور گناہ ومعاصی کے کام کی انجام دہی بھی ان کی عادت بن چکی ہے، بلکہ وہ اس کے کھلم کھلا عادی بن گئے ہیں تو اس کا حل کیا ہے؟

جواب:...... اس کا حل نوافل کا ترک نہیں ہے، نوافل ترک کر دینے سے ان کی حالت زار مزید ابتر ہونے کا خطرہ ہے، کیونکہ فرائض کے نقص کو پورا کرنے کا کام نوافل سے ہی انجام پاتا ہے بلاشبہ اس کا حل یہی ہے کہ نوافل کی پابندی پر گامزن رہا جائے لیکن ایسے شخص کو چاہیے کہ اپنے واجبات کی ادائیگی میں تقصیر کی عادت کی اصلاح کا فریضہ انجام دے اور محرمات سے اجتناب کرے اور نوافل کی عادت میں اضافہ کی کوشش کرے یہی اس کی تلافی کا کارگر راستہ ہے۔

زبان اور قلب وجوارح سے اللہ کا بکثرت ذکر کرنا:

بندہ اللہ کے ذکر واذکار کی عادت سے جتنا سرشار ہوگا اسی کے بقدر اللہ کی محبت اس کے دل میں جاگزیں ہوتی چلی جائے گی، اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے بندوں کو بکثرت ذکر واذکار کرتے رہنے کا حکم دیا ہے اور اس بات کی صراحت کر دی ہے کہ ذکر خداوندی نجات وکامیابی کا سبب ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴾ (الانفال: ٤٥)

''اور کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کیا کرو تاکہ تمہیں کامیابی وکامرانی حاصل ہو۔''

اللہ تعالیٰ نے ذکر واذکار میں مشغول رہنے والوں کی تعریف کرتے ہوئے بڑے والہانہ انداز میں اپنے نبی کو ذکر کی اہمیت سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اللہ کے ذکر کا مرتبہ جہاد سے بھی بلند وبالا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی عظیم ترین عبادات کے بعد اعمال صالحہ کے تتمہ وتکملہ کے طور پر ذکر واذکار کو مشروع قرار دیا ہے چنانچہ روزے پورے کر لینے کے بعد ذکر کرنے کا حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝۱۸۵﴾ (البقرۃ: ۱۸۵)

''اور تاکہ تم گنتی پوری کرو اور تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو، اس پر جو اس نے تمھیں ہدایت دی اور تاکہ تم شکر کرو۔''

فریضہ حج کی ادائیگی کے بعد بھی اللہ نے بندوں کو ذکر کی تلقین فرمائی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ﴾ (البقرۃ: ۲۰۰)

''پھر جب تم اپنے حج کے احکام پورے کر لو تو اللہ کو یاد کرو۔''

فریضہ نماز ادا کر لینے کے بعد اللہ تعالیٰ بندوں کو ذکر واذکار کی تلقین کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

﴿فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ﴾

(النساء: ۱۰۳)

''پھر جب تم نماز پوری کر لو تو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوئے یاد کرو۔''

نماز جمعہ ادا کر لینے کے بعد ذکر واذکار کی تلقین وارد ہوئی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝۱۰﴾ (الجمعۃ: ۱۰)

’’پھر جب نماز پوری کر لی جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل سے (حصہ) تلاش کرو اور اللہ کو بہت یاد کرو، تا کہ تم فلاح پاؤ۔‘‘

تو پتہ یہ چلا کہ اللہ کا ذکر ان عظیم ترین اسباب ووسائل میں سے ایک ہے جو اللہ کی محبت تک بندے کی رسائی کا ذریعہ ہیں۔

اللہ کی محبت کے سامنے ہوا پرستی کے موقع پر نفس کے نہ چاہتے ہوئے اپنی خواہش نفس کو قربان کر دینا اور اللہ کی محبت کے ارتقاء کی منازل طے کرنے کی تگ ودو میں لگے رہنا اگر چہ ان منازل تک رسائی جوئے شیر لانے کے مترادف ہو:

حصولِ محبت الٰہی کے اس مرتبہ تک رسائی کی دو علامتیں ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ کاموں کی انجام دہی اگر چہ بادل ناخواستہ ہی کیوں نہ ہو۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کے منع کیے ہوئے کاموں سے اجتناب اگر چہ دل میں ان کی محبت وچاہت کا داعیہ ہی کیوں نہ پایا جاتا ہو؟

ان دونوں شرطوں پر عمل کرنے کے بعد ہی ایثار کے بلند ترین مرتبہ تک رسائی کا صحیح تصور کیا جا سکتا ہے، شہوانی قوتوں کے رسم ورواج کے معاملے ایسے ہیں جہاں اس قسم کے ایثار کی مہنگی قیمت چکانا پڑتی ہے لیکن سچا مومن جو محبت وچاہت کی بلند وبالا مقام تک رسائی کا خواہاں ہوتا ہے اور اللہ کی سچی محبت کے حصول کا خواہش مند ہوتا ہے وہ اس قسم کی باتوں کی پروانہیں کرتا وہ اس راستہ میں اپنی نفسانی خواہشات کو بھی پس پشت ڈال کر اپنی چاہت ورغبت کا گلا گھونٹ دیتا ہے اور مکمل محنت کے ساتھ اس بلند وبالا مقام تک رسائی حاصل کرنے میں کسی قسم کے دریغ سے کام نہیں لیتا تا کہ اپنے ہدف اور ٹارگٹ تک پہنچ جائے اور ایثار مذکور کا حصول اس کے لیے پکا ہو جائے اس کے لیے وہ ہر طرح سے کمر بستگی ومستعدی کا مظاہرہ کرتا ہے چاہے اسے اس کی جو بھی قیمت چکانا پڑے، بندۂ مومن اس راہ میں حائل بڑے سے بڑے خطروں وپیچیدگیوں کو محض رب کریم کی محبت ورضا مندی کی خاطر برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے تا کہ اس کو مالک حقیقی کی رضا مل جائے اور اس عظیم کامیابی

کاحصول اس کا مقدر بن جائے جو اس کا اصلی ہدف ہے، اس سے قطع نظر کہ اسے اس کی کیا قیمت چکانا پڑے گی، کیونکہ توقع سے کہیں زیادہ عظیم اس ایثار کا فائدہ دیر یا سویر ضرور مل کر رہے گا اللہ تعالیٰ اس کے بدلہ جو عوض عطا فرمائے، اس کی مثال دینا محال ہے اس کے مقابلہ میں دنیا کے تمام اعزازات وٹائٹلز ہیچ ہیں۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندے کو جب بھی نفس پرستی یا شہوت پرستی یا گناہوں ومعاصی کی محبت وچاہت یا اس کی طرف رجحان کی کیفیت یا حصول لذت کے شوق میں برے خیالات وافکار کے چکر میں من جانب اللہ لگا دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ اس کو اس حقیقی محبت کی طرف کھینچ کر لے جانا چاہتا ہے جو کہ اس سے بناوٹی اور نقلی محبت سے کہیں افضل وبہتر ہے اور جس میں اس کے لیے خیر وبھلائی کا پہلو پنہاں ہے جو اس کے لیے ہر طرح سے نفع بخش وسود مند ہونے کا آلہ کار ہے، بلاشبہ یہی وہ حقیقی محبت ہے جو قائم ودائم رہنے والی ہے تاکہ بندہ مومن نفس امارہ سے برسرِ پیکار ہو کر دل وجان سے اس کے خلاف مجاہدہ کر کے اللہ کے لیے اس عارضی محبت سے جان چھڑانے کی تگ ودو کرے یہی وہ مجاہدۂ نفس ہے، جو اس محبوب حقیقی تک رسائی کا زینہ ہے جس کی ذات عظیم اور اعلیٰ وارفع ہے، چنانچہ جب بھی بندۂ مومن کا نفس شہوات نفسانیہ میں مبتلا ہوتا ہے اور شہوت پرستی کی طرف میلان اور اس کی جانب شدت شوق کی کیفیت اختیار کرتا ہے تو یہ شوق وارادہ اور عارضی محبت اس کو اس محبت وچاہت کی طرف رسائی کی گائیڈنگ کرتی ہے جو اس عارضی محبت سے کہیں اعلیٰ وارفع اور بلند وبالا نیز پائیدار ومستحکم ہے۔''[1]

یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ انسان اپنے دل کو مرغوب چیز سے اس وقت دستبردار نہیں ہوسکتا

[1] الفوائد: ۱۱۰۔۱۱۱۔

جب تک اس کو اس سے کہیں بہتر اور موزوں ترین محبوب نعم البدل کے طور پر مل نہ جائے اسی لیے کہا جاتا ہے جو شخص اپنے محبوب کے دیدار اور اس سے ملاقات کے شوق میں سلگتے ہوئے انگاروں اور کانٹوں کی سیج پر چل کر جائے اس کی محبت اس شخص کی محبت سے زیادہ باعظمت ہے جو محبوب تک رسائی حاصل کرنے کی غرض سے دبلی پتلی پھرتیلی، تنومند اونٹنیوں پر سوار ہو کر حاضری دے لہٰذا یہ شخص اس شخص کی کیونکر برابری کر سکتا ہے جس نے اپنے محبوب کی محبت کی خاطر اپنی نفسانی شہوات سے مجاہدہ کر کے ان کا گلا گھونٹ دیا ہو اور اس راہ میں حائل رکاوٹوں سے برسر پیکار ہونے کی قطعی پروا نہ کی ہو برخلاف اس شخص کے جس نے محبوب تک رسائی کے لیے ذرہ برابر مجاہدہ اور محنت نہ کی۔

کبھی تم نے اس بات پر غور وفکر کیا ہے کہ اس کائنات میں پائے جانے والے نیک وصالح لوگوں کو فرشتوں سے افضل کیوں کہا گیا ہے؟

کیونکہ فرشتوں کو نہ تو شہوت پرستی یا شہوانیت یا باہمی جھگڑوں اور تنازعات سے کوئی سروکار ہوتا ہے اور نہ ان کے نزدیک قوت غریزیہ کا مادہ پایا جاتا ہے اور نہ ہی انھیں نزاع باہمی کی ضرورت پیش آتی ہے وہ اپنی طبیعت اور جبلت کے اعتبار سے اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کا مجسم پیکر ہوا کرتے ہیں رات ودن اللہ کی تسبیح وتحمید، تہلیل وتکبیر میں مشغول رہتے ہیں اور کبھی تھک کر نہیں بیٹھتے سرزمین آسمان پر چار انگلیوں کے برابر بھی کوئی ایسی خالی جگہ نہیں ملے گی جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ قیام یا رکوع یا سجود کی حالت میں مصروف عبادت نہ ہو۔

اسی لیے آسمان ان ملائکہ کے بوجھ سے بوجھل ہو کر چرمرانے لگا جو اس کی پشت پر مصروف عبادت ہیں یہ تو ان ملائکہ کی بات ہوئی جن کو نزاع باہمی اور شہوت نفسانیہ سے کوئی واسطہ نہیں، مگر حضرت انسان کو دیکھ لیجئے وہ اللہ کی تسبیح وتحمید کے ساتھ عبادت وریاضت بھی کرتا ہے اور اس کی ہمت پست نہیں پڑتی اس کے ساتھ اپنے نفس اور شہوات سے برسر پیکار بھی رہتا ہے اس راستہ میں اسے رکاوٹوں اور مزاحمتوں کا بھی صبر واستقامت سے سامنا کرنا پڑتا ہے ہمارا سوال ہے اب آپ ہی بتلائیں کہ اس صورتحال میں کون افضل قرار پائے گا؟

انسان یا ملائکہ؟

جنت میں یہ دنیا والی بشری عورت حور عین سے کیوں افضل و برتر اور قدر و منزلت کے اعتبار اعلیٰ ہوگی؟

محض اپنے نفس سے مجاہدہ اور نفس کو اللہ کے اوامر ونواہی کے سامنے جھکنے پر آمادہ کرنے کی وجہ سے اور شہوات نفسانیہ پر غلبہ اور کنٹرول کرتے رہنے کی وجہ سے اور اپنے صبر و شکر، نماز وروزہ عبادت وریاضت کی پابندی کی وجہ سے اس کا مرتبہ حور عین سے بلند و بالا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ اپنے مقرب بندے کو شہوات نفسانیہ کا اسیر بنا کر آزمائش سے دوچار کرتا ہے یا تو وہ اللہ کی محبت ورضا کی راہ میں آڑے آکر بذات خود اس کے لیے حجاب بن کر حائل ہوجاتا ہے یا وہ بندے کی قوت عزیمت کی وجہ سے حجاب بن کر بندے کو رضائے الٰہی تک رسائی کا ذریعہ اور سبب بن جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا عبرت کے ارادے سے مشاہدہ و معائنہ کرنا:

اللہ تعالیٰ کے جود وکرم بخشش اس کے احسانات اور اس کی ظاہری و باطنی نعمتوں اور مہربانیوں کا عبرت کے ارادے سے مشاہدہ اور معائنہ بھی اس سلسلہ کی اہم ترین کڑی ہے۔

اس طرح کے مشاہدہ اور معائنہ کو بھی اللہ کی محبت کے دواعی واسباب میں گردانا جاتا ہے کیونکہ بندوں کے دل اس شخص کی محبت و چاہت کی طرف فطری طور پر مائل ہوجاتے ہیں جو ان پر احسان کرتا ہے اور جو شخص بھی بندوں کے ساتھ برا سلوک کرتا ہے وہ اس سے بغض وکراہت کرنے لگتے ہیں تو کیا اللہ سے بڑھ کر بھی کوئی بندوں پر احسان وکرم کا معاملہ کرنے والا ہوگا، بندہ کی ایک ایک سانس اور ایک ایک لمحہ اللہ کے احسانات والطاف وعنایات سے سرشار ہے بندہ رب کریم کی دی ہوئی نعمتوں سے ہر وقت محظوظ ہو رہا ہے اور ہر حال میں اللہ کی نعمتیں اس کو اپنے جلو میں لیے ہوئے ہیں وہ ان کے سایہ تلے آرام کے ساتھ نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے بندہ کے لیے اس بات کا علم کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ہر ۲۴ گھنٹے میں ۲۴ ہزار نعمتوں سے نوازتا ہے وہ نعمت انسان کی سانس کا آنا جانا ہے یہ تو رب کریم کی صرف

ایک نعمت کا یہ تذکرہ ہے جس کو تنفس کی نعمت سے موسوم کیا جاتا ہے چوبیس گھنٹے میں ۲۴ ہزار مرتبہ انسان سانس لیتا ہے اگر سانس بند ہو جائے تو انسان زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

ایسا کیوں کر وقوع پذیر ہوتا ہے؟

تو میرے عزیزو!۔جیسا کہ علوم طبیعہ۔ (physics) کے ماہرین کا کہنا ہے کہ انسان ایک گھنٹے میں ہزار مرتبہ سانس لیتا ہے بایں طور ۲۴ گھنٹوں میں چوبیس ہزار مرتبہ اسے سانس لینا پڑتی ہے اس لیے انسان رات ودن کے وقفہ میں ۲۴ ہزار مرتبہ اس نعمت الٰہی سے محظوظ ہوتا ہے اب تم خود ہی اندازہ لگاؤ کہ اللہ تعالیٰ کی کتنی نعمتوں سے تم محظوظ ہوتے ہو بلاشبہ اس کا تم کو خود پتہ نہیں حقیقت میں وہ بے حد وحساب ہیں ان کی کوئی گنتی یا شمار نہیں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا﴾ (ابراھیم: ٣٤)

”اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو تم انھیں شمار نہیں کر سکتے۔“

ان نعمتوں اور احسانات واکرامات کے ساتھ ان ضرر رساں اور نقصان وہ چیزوں کا بھی تصور کرو اللہ تعالیٰ جن سے تمہاری حفاظت کرتا ہے اور ان کے مہلک اثرات کی اثر پذیری سے تمہارے جان ومال کی سلامتی کا سامان مہیا کرتا ہے، باری تعالیٰ نے تمہاری حراست اور نگہبانی کے پیش نظر فرشتوں کا تم پر پہرا لگا رکھا ہے وہ تمہارے لیے باڈی گارڈ کے طور پر ہر وقت تعینات تمہاری چوکیداری کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَهُ مُعَقِّبَاتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَهُ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ﴾

(الرعد: ١١)

”اس کے لیے اس کے آگے اور اس کے پیچھے یکے بعد دیگرے آنے والے کئی پہرے دار ہیں، جو اللہ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔“

اللہ تعالیٰ رات اور دن کے ایک ایک لمحہ میں ہمارے لیے تحفظ وسلامتی کے اسباب مہیا فرماتا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ﴾ (الانبیاء: ٤٢)

''کہہ کون ہے جو رات اور دن میں رحمان سے تمھاری حفاظت کرتا ہے۔''

ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ انسان کو ہر گھڑی اور ہر لمحہ امراض واسقام کا عارضہ ہونے کا خطرہ لاحق رہتا ہے جس کے وسائل واسباب کی بہتات ہے اور حد سے زیادہ جس کی وجوہات ہیں لیکن ہم کو احساس تک نہیں ہوتا اور شرور وفتن خود بخود رفع دفع ہو جاتے ہیں اور ہمیں پتہ تک نہیں چل پاتا کہ کیسے اور کن اسباب کی بنیاد پر ان کا دفاع ممکن ہو سکا، دراصل یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ورحمت اور اس کے فضل وکرم کی دین ہے، کیونکہ رب کریم کی ذات حفاظت ونگہبانی، سلامتی وتحفظ، ہر موذی چیز سے حراست وبچاؤ کا ذریعہ ہے۔ اللہ سبحانہ کی ذات ہی بندوں کی حفاظت کا بندوبست کرنے والی ہے اس کے علاوہ کوئی ان کی نگہبانی اور حفاظت کی ذمہ دار نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿٦٤﴾﴾ (یوسف: ٦٤)

''بلاشبہ اللہ ہی بہترین حافظ ہے وہ سب مہربانوں سے بڑا مہربان ہے۔''

ہماری ذات سے سرزد گناہوں اور نافرمانیوں، برائیوں وشراتوں نیز کوتاہیوں ونادانیوں کے باوجود باری تعالیٰ ہمیں انعامات واحسانات سے نوازتا رہتا ہے اور ہم پر اپنی نعمتوں کا فیضان بند نہیں کرتا اگر وہ ہماری کوتاہیوں اور نافرمانیوں کا نوٹس لے لے تو ہم لوگ کہیں کے نہ رہیں بلکہ تباہ وبرباد ہو جائیں۔

چنانچہ سیّدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ کوئی اس اذیت پر صبر نہیں کر سکتا جس کو وہ خود اپنے بندوں کی زبانی سنتا ہے، اس کے بندے اس کی قدوسیت کو اس کا بیٹا ہونے کا دعویٰ کر کے گدلا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ذاتِ باری تعالیٰ کے حلم کا ذرا اندازہ لگائیں اس کے باوجود وہ ان کو صحت وعافیت سے نوازتا رہتا ہے اور ان کی روزی روٹی کا بندوبست کرتا ہے۔ [1]

[1] صحيح بخاري، كتاب الأدب، باب الصبر في الأذى: ٦٠٩٩.

اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور صفاتِ عظمیٰ پر غور وفکر کرنا:

دل کے دریچے کھول کر اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور اس کی صفات عظمیٰ کا مطالعہ اور ان پر غور وفکر بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کی محبت وچاہت کا معاملہ ہے تو میں اس بارے میں صراحتاً بتلا دینا چاہتا ہوں کہ رب کریم کی محبت کا معاملہ اپنے اندر ہیبت اور کبریائی کا پہلو سموئے ہوئے ہے اور یہ بھی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے محبت سے فضل وکرم کے سوتے پھوٹتے چلے جاتے ہیں، اس کی قدر وقیمت کا ادراک وہی شخص کرسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفات کی قدر شناسی اسی پیرایہ بیان میں جانتا ہو جس انداز میں حق سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی صفات کی وصف بیانی کی ہے۔ چنانچہ جس شخص کو اللہ کے اسمائے حسنیٰ وصفات عظمیٰ اور اس کے افعال حمیدہ کی روشنی میں معرفت کی سعادت نصیب ہوجائے اس کو بہر حال اللہ کی محبت کی لذت وچاشنی کا مزہ مل کر رہتا ہے اور جتنی معرفت بڑھتی جاتی ہے اللہ کی معرفت کا فیضان بھی اتنا ہی اپنا رنگ دکھاتا چلا جاتا ہے اس کے برعکس معرفت الٰہی میں جتنی کمی ہوتی ہے اتنی ہی محبت الٰہی کے فیوض وبرکات کا فیضان کم ہوتا چلا جاتا ہے اور یہ قاعدۂ کلیہ ہے اور بدیہی حقیقت ہے کہ ہم اس ذات سے کس بنیاد پر محبت کرنے کا دعویٰ کریں جسے ہم جانتے پہچانتے نہ ہوں یا جس کی معرفت سے ہم ناآشنا ہوں؟

امام عتبہ رحمہ اللہ کا قول ہے:

''جس شخص کو اللہ کی معرفت تک رسائی مل جائے تو سمجھ لو وہ اللہ کا محبّ ہوگیا۔'' [1]

قاسم جوعی رحمہ اللہ کا فرمان ہے:

''محبت کی اصل وبنیاد معرفت الٰہی کا فیضان ہے۔'' [2]

یہ وہ صدر دروازہ ہے جہاں سے اولیاء اللہ اور مخلص لوگوں کو اپنے محبوب کے دربار تک

---

[1] حلیة الاولیاء : ۲/۲۳٦.

[2] صحیح مسلم ، کتاب الإیمان، باب تحریم الکبر و بیانه : ۹۱.

رسائی ملتی ہے بلاشبہ محبوب تک پہنچنے کا یہی رسمی دروازہ ہے۔ سچے محبین کے علاوہ اور کوئی اس دروازے سے داخل نہیں ہوسکتا اور اولیاء اللہ کی شان ہی یہی ہے کہ ان کو اللہ کی معرفت وآشنائی میں ایسی لذت اور سرور ملتا ہے کہ وہ اس کے حصول کی زیادہ سے زیادہ تگ ودو میں لگے رہتے ہیں گویا کہ اللہ کی معرفت سے کسی حال میں ان کو آسودگی میسر نہیں ہوتی ہے، معرفت الٰہی کی گہرائی میں جوں جوں ان کی رسائی ہوتی ہے اتنے ہی علوم ومعرفت کے خزانے ان پر کھلتے چلے جاتے ہیں اور اللہ کی محبت کا شوق اور اس کی معرفت کے اسرار پنہاں کی گتھیاں ان پر سلجھتی چلی جاتی ہیں اور ان کی محبت وشوق کا جذبہ بڑھتا چلا جاتا ہے، اس کے بعد اگر کمال وجمال کے دواعی کے ساتھ اللہ کے احسان وانعام کے پہلو کا بھی استحضار ہو جائے اور اس موقع سے یہ دونوں اہم ترین پہلو باہم شیر وشکر ہو جائیں تو پھر محبت پکی اور پختہ ہو جاتی ہے اس محبت کے حصول سے مریض قلب یا خبیث النفس یا خیر وبھلائی سے راندۂ درگاہ شخص ہی پہلو تہی برت سکتا ہے اور اس قافلہ کی ہم رکابی سے بدنصیب شخص ہی پیچھے رہ سکتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس ذات سے محبت وتعلق رکھنے کا عادی بنایا ہے جو اس پر احسان کرنے میں اوج کمال پر فائز ہو اور اپنے اوصاف حمیدہ اور خصالِ مجیدہ میں بے مثال ہو جب یہ قاعدہ کلی ٹھہرا کہ اللہ تعالیٰ نے خلقی طور پر فطرت انسانی کو اس سانچے میں ڈھالا ہے جس پر عمل درآمد کی خاطر بندوں کے دل خلقی طور پر مجبور ہیں: تو یہ بات بھی معروف ومشہور ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے بڑھ کر کوئی ذات بندوں پر احسانات وانعامات کرنے والی نہیں، اور نہ ہی باری تعالیٰ کی ذات سے زیادہ اکمل اور جامع کوئی ذات ہے اور نہ ہی حسن وجمال میں حق تعالیٰ شانہ سے بڑھ کر کوئی حسین وجمیل ہے دراصل مخلوق کائنات میں جو جمال وکمال کا شائبہ پایا جاتا ہے وہ اصلاً اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صناعی وکاریگری کا پرتو ہے، اس میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی شان خلاقی نمایاں طور پر نظر آ رہی ہے بلاشبہ اللہ کے جلال وجمال کی تصویر کشی محال ہے اس کی مخلوق میں سے کوئی شخص اس کی صفات کی وصف بیانی اس کے احسانات وانعامات کی ثنا خوانی اور اس کے بے مثال افعال وکردار کی نعت خوانی نہیں کرسکتا ہے، بلکہ اس کی

ذات ہو بہو ویسی ہے جیسی کہ اس نے خود بیان کر کے بتلادی ہے مخلوق کائنات میں کوئی شخص اس کی توصیف بیانی کی اس سے زیادہ سکت نہیں رکھتا جتنی کہ خود اللہ تعالیٰ نے بیان کر کے صراحت کردی ہے۔

مخلوق کائنات میں بعض لوگ ایسے ہیں جو خوبصورتی کے عاشق ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ہر چیز سے زیادہ حسین وجمیل ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس حسن وجمال کا پیکر ہے اسی لیے تو اس کو صفت جمال سے موصوف کیا گیا ہے بلاشبہ جمال اس کی صفت حقیقی ہے۔ سیّدنا عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہوئے بیان فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ حسین وجمیل ہے۔'' [1]

کہا جاتا ہے سیّدنا یوسف علیہ السلام کو کرۂ ارض پر پائی جانے والی پوری کائنات کے حسن وجمال کا نصف حصہ ملا تھا تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ جو سیّدنا یوسف علیہ السلام کو حسن وجمال عطاء کرنے والا ہے اس کے ذاتی حسن وجمال کا کیا کہنا وہ تو اپنی تمام مخلوقات سے کہیں حسین وجمیل ہے اسی لیے اہل جنت کو جب دیدار الٰہی کی سعادت نصیب ہوگی تو وہ اس میں اتنے محو ہوں گے کہ اس موقع پر وہ دنیا ومافیہا سے غافل ہوجائیں انھیں دیدار الٰہی کے سامنے کچھ یاد نہ رہے گا جو شخص اس پہلو سے تدبر وتفکر کرے تو اس کو اس دنیائے فانی کے حسن وجمال کے سحر میں ڈوب کر رنگ رلیوں اور ذنوب ومعاصی کی خرمستیوں پر قابو پانے کا گر مل جائے گا اور اسے معلوم ہوجائے گا کہ کیسے خوبصورتی کی آرائش وزیبائش اور جمال کائنات کی فتنہ انگیزیوں اور سحر خیزیوں پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

اللہ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہر اسم اور اس کی صفات عظمیٰ میں سے ہر صفت اپنے اندر محبت کا خاص رنگ وروپ لیے ہوئے ہے، اگر تم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اسم الکریم پر غور وخوض کرو گے تو تم پر اس کی محبت کے اسرار پنہاں کی گتھیاں اپنے خاص رنگ وروپ کھلتی ہوئی نظر آئیں گی اور اگر تم اس کے اسم الجلیل کے معانی ومفاہیم پر غور وخوض کرو گے تو تم پر

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان تحریم الکبر وبیانہ: ۹۱.

محبت کی معرفت کے پوشیدہ راز کچھ اور ہی انداز سے منکشف ہوں گے اور اگر تم اللہ کے نام التواب کے معانی ومفاہیم میں تدبر وتفکر کرو گے اور تو اللہ کی محبت کے زاویے کسی اور انداز سے کھل کر سامنے آئیں گے۔ اسی طرح اسمائے حسنیٰ اور صفات الٰہیہ میں سے ایک ایک اسم وصفت کی خاصیت کا معاملہ ہے اللہ کے اسمائے حسنی میں سے ہر اسم اعظم اور اس کی صفات میں سے ہر صفت عظمیٰ تم کو اللہ کی محبت کی طرف بھرپور رہنمائی کرنے کا ذریعہ ہے، دراصل اسمائے حسنیٰ اور اس کی صفات عظمیٰ سے محبت الٰہی کے سرچشمے پھوٹتے ہیں اور اس سے جو معانی ومفاہیم مستنبط ہوتے ہیں اس پر تدبر وتفکر اور اس کے بموجب عمل کی انجام دہی محبت الٰہی تک رسائی کا وسیلہ ہے اس لیے کہ اللہ کی ذات محبوب اور قابل ستائش ہے ہر اس فعل کی انجام دہی میں جو اس کا خاصہ ہے اور ہر اس حکم کے صادر کرنے میں جو اس کی خو ہے کیونکہ اس کے افعال واعمال فضول اور بے فائدہ یا عبث نہیں اور نہ ہی اس کے اوامر حکمت ودانائی سے خالی ہیں، ان میں ناسمجھی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا بلکہ اس کے اعمال وافعال (حکمت ودانائی، خوبیوں وبھلائیوں، عدل وانصاف، فضل وکرم، رحمت وشفقت) سے عبارت ہیں یہ تمام کی تمام خصال حمیدہ اور اوصاف جلیلہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی حمد وثناء کی موجب ہیں۔ کسی عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

> ''اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات پر بندوں کا کوئی استحقاق نہیں پہنچتا اور نہ اس کی ذات بے نیاز پر بندوں کا کوئی حق واجب ٹھہرتا ہے بندوں کی جانب سے ذات باری تعالیٰ پر ایسی کوئی صورت نہیں نکلتی ہاں اتنا ضرور ہے کہ اس کے نزدیک کسی قسم کی کوشش اور جد وجہد رائیگاں نہیں جاتی اگر بالفرض بندوں کو عذاب الٰہی کا سامنا کرنا پڑے تو یہ اس کے عدل وانصاف کا تقاضا ہے اور اگر انھیں نعیم جنت سے لطف اندوزی کا موقع میسر آجائے تو یہ محض اس کے فضل وکرم کی وجہ سے ہے اور اس کی ذات (بڑی کریم) اور سخی وداتا ہے۔'' [1]

اس مقام عظیم کا بندے کا ذہن ودماغ حقیقی اندازہ لگا ہی نہیں سکتا چہ جائیکہ وہ اس کا

---

[1] بدائع الفوائد: ۲/۳۹۰.

پوراپورا حق ادا کرے، اس کی حقیقی معرفت سے سب سے زیادہ سرشار اور اللہ کے نزدیک محبوبیت کے مقام کے اعتبار سے بندوں میں سب محبوب ترین شخصیت محمد ﷺ کا فرمان ہے: ''اے اللہ! میں تیری حمد وثناء کا اس طرح احاطہ نہیں کرسکتا جیسا کہ خود بخود تونے اپنی ذات کے لیے کیا ہے۔'' ❶ لہٰذا اس کی مخلوق میں سے کوئی بشر اس کی ثناء خوانی کا احصاء اور احاطہ کرنے کا کسی صورت میں بھی دعویٰ نہیں کرسکتا۔

کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے بعض اوصاف وہ بھی ہے جن کا کسی کو علم نہیں، نہ تو مقربین بارگاہ فرشتے اور نہ ہی نبی مرسل علیہم السلام اس کے علم سے آشنا ہیں، اسی لیے قیامت کے دن عرش الٰہی کے سامنے اللہ کے نبی ﷺ سجدہ ریز ہوں اس موقع سے اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کو ان اسمائے حسنیٰ کی معرفت سے سرفراز فرمائے گا جو کسی کے ذہن ودماغ میں کبھی کھٹکے تک نہ ہوں گے یہی وہ موقع ہوگا جبکہ رب کریم ان اوصاف حمیدہ کی ذریعہ اپنی ثناخوانی کرے گا اس سے قبل جس پر کسی کو اس نے مطلع تک نہ کیا ہوگا۔

اگر بندۂ مومن دل کی گہرائی سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اوصاف کمال میں سے کسی ایک وصف کا حقیقی استحضار کرلے تو وہ اس کے حق میں اللہ کی محبت سے سرشاری کے لیے کافی ہوجائے لہٰذا اس شخص کا کیا کہنا جس کو تمام اسمائے حسنیٰ اور صفات الٰہیہ اور افعال ربانیہ کا استحضار نصیب ہوجائے اور ہم تو اللہ کے اسمائے حسنیٰ وصفات عظمیٰ کے بارے میں اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا کہ چڑیا اگر سمندر میں اپنی چونچ ڈبوئے تو اس کی چونچ میں جتنا پانی لگ کر آئے، اتنا یا اس سے بھی کم، ہم اسمائے حسنیٰ اور صفات علیٰ کی معرفت وواقفیت رکھتے ہیں! اللہ کی ذات کے بارے میں ہماری معرفت عینی مشاہدہ کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ ہم نے تو باری تعالیٰ کو اس کے اسمائے حسنیٰ اور صفات علیٰ کی معرفت اور اس کے معانی ومفاہیم کے دریچے کھول کر جانا پہچانا ہے بلاشبہ بندوں تک اللہ کی ذات کی معرفت کا علم وحی الٰہی کے ذریعے پہنچا ہے اور جو کچھ دنیا میں اللہ کی کرشمہ سازیوں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں یہ درحقیقت اللہ کے

❶ صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب ما يقال في الركوع والسجود: ٤٨٦.

اسمائے حسنیٰ اوراس کی صفات علیٰ کی اثر پذیری کا کرشمہ ہیں دراصل استنباط کرنے والوں نے معرفت الٰہی کی کنہ تک پہنچ کر باقی چیزوں پر استدلال کیا ہے ،اگر وہ رب کریم کا مشاہدہ کرلیتے یا انھیں اس کی رخ انورکا دیدار ہوجاتا توان کا کیا حال ہوتا؟اگر یہ اللہ والے اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس کا مشاہدہ کرلیتے اوراس کے جلال و جمال وکمال کوسامنے دیکھ لیتے تو پھر تو ان کی محبت کی شان ہی نرالی ہوتی۔ اسی لیے مومنین جنت میں جب دیدارِ الٰہی کرتے ہوئے رب کریم کو دوبدو دیکھیں گےتو جنت کے سارے ناز ونعم اوراس کی لذت وسرور کو بھول جائیں گے اور دیدارِالٰہی کی طرف پورے طور پر متوجہ ہوجائیں گے۔

اسی لیے اللہ سے محبت کرنے والے محبین کی معرفت الٰہی اورذات الٰہی سے آشنائی کے سلسلہ میں ان کے درمیان مراتب ودرجات میں تفاوت ہونے کی وجہ سے ان کی الگ الگ اقسام ہیں۔ بلاشبہ محبت الٰہی میں سچے و خالص محبت کے الگ الگ مراتب ودرجات ہیں ان میں اللہ تعالیٰ کی معرفت سے سب زیادہ آشنا شخص ہی لوگوں میں سب سے زیادہ باری تعالیٰ سے محبت کرنے والا گردانا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسولوں کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے سب سے زیادہ محبت کرنے والا سمجھا گیا ہے اور رسولوں ونبیوں میں بھی اللہ کے دونوں خلیل مخلوق کائنات میں اللہ کی ذات کی معرفت سے آشنا اورمحبت الٰہی میں عظیم الشان مرتبہ پر فائز تھے اور وہ دونوں ابراہیم علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے، بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کواس سلسلہ میں ایک طرح سے ان پر بھی فوقیت حاصل ہے۔

اس کے بعد علمائے کرام کا نمبرآتا ہے۔ علمائے کرام لوگوں میں سب سے زیادہ محبت الٰہی سے سرشار ہوا کرتے ہیں، کیونکہ وہ اسماء وصفات کے معانی ومفاہیم اوراس کے اوصاف وکمالات سے آشنا ہوتے ہیں، عامۃ الناس کواس کا کیا پتہ وہ تو اس علم سے عاری ہوتے ہیں، اسی لیے علمائے کرام کوعوام الناس پر فضیلت حاصل ہے۔

رب کریم کے سامنے بندے کی عاجزی وانکساری ،ضرورت مندی اور مفلسی کا اظہار بھی اس سلسلہ کی اہم ترین کڑی ہے:

اللہ کی جناب میں خشوع وخضوع، تذلل وانکساری و عاجزی اوراللہ کے حکم کے سامنے سرتسلیم خم کردینا یا قضاء وقدر پر راضی برضا رہنا اور رب کریم کی چوکھٹ پر جا کر پڑ جانا اس کے سامنے ذلت وخواری کا اظہار کرنا یہ اور اس قسم کی تمام چیزیں محبت کے اسباب ووسائل میں سے اہم ترین وسائل ہیں، اس قلب مکسور کی جبر خاطر کے لیے اللہ سے زیادہ قریب کون ہوسکتا ہے؟ جو اللہ کی محبت میں بے چین اور سرگرداں ہو، اور اللہ کی نصرت ومدد، اس کی رحمت ومہربانی، رزق ومعاش کی فراہمی کے اسباب وسائل کا نزول اس بندے سے زیادہ کس شخص کے قریب ہوسکتا ہے جو اپنے نفس کو رب العالمین کی رضا وخوشنودی کی خاطر ذلیل وخوار کرے اور اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کی جانب سے یہ بات پسندیدہ اور مرغوب ہے کہ وہ اللہ کے حضور بوجہ اتم عاجزی وخواری کا مظاہرہ کرے اور اس کی جناب میں ذلت ومسکنت کی آخری حد کو پہنچ جائے یہی عبودیت اور بندگی کی اصل غرض وغایت ہے۔

تذلل وانکساری کی انواع واقسام ہیں اور ذلت وخواری کی منتہا محبّ کی اپنے محبوب کے سامنے عاجزی وخواری کا اظہار ہے اس کے علاوہ مالک کی اپنے مملوک کے سامنے عاجزی وانکساری بھی اس کی ایک قسم ہے، اس کے علاوہ مجرم کی اپنے محسن کے سامنے عجز وانکساری کا مظاہرہ کرنا بھی اس کی ایک قسم ہے اور عاجز وبے بس شخص کی حیثیت رکھنے والے شخص کے سامنے عاجزی وانکساری بھی اس کی ایک قسم ہے باحیثیت شخص کے سامنے وہ لاچار ومجبور شخص اس لیے عاجزی کرے تاکہ باحیثیت شخص اس کے کھانے پینے، رہنے سہنے اور نان نفقہ کا بندوبست اور انتظام وانصرام کردے لیکن اگر ذلت ومسکنت، عاجزی وانکساری کی انجام دہی اللہ کے لیے کی جائے تو یہ محبت وعشق الٰہی کا بلندترین مرتبہ ہے اور اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ بندۂ مومن مذکورہ تمام قسم کی عاجزی وانکساری کا مظاہرہ اللہ کے سامنے سرتسلیم خم کرتے ہوئے باخوشی انجام دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نزولِ آسمان کے وقت اس سے خلوت ومناجات:

اللہ باری تعالیٰ سے خلوت میں مناجاہ وسرگوشی، اس کی کتاب کریم کی تلاوت وقراءت،

اس کے سامنے تنہائی میں توبہ استغفار کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی عبودیت وبندگی کے اظہار کی غرض سے کھڑا ہونا بھی اللہ کی محبت کے اہم ترین مظاہر میں سے ایک مظہر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ۟ وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴾ (السجدة: ١٦)

''ان کے پہلو بستروں سے جدا رہتے ہیں، وہ اپنے رب کو ڈرتے ہوئے اور طمع کرتے ہوئے پکارتے ہیں اور ہم نے انھیں جو کچھ دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَ يَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِی الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ ﴾ (الزمر: ٩)

''(کیا یہ بہتر ہے) یا وہ شخص جو رات کی گھڑیوں میں سجدہ کرتے ہوئے اور قیام کرتے ہوئے عبادت کرنے والا ہے، آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے رب کی رحمت کی امید رکھتا ہے؟ کہہ دے کیا برابر ہیں وہ لوگ جو جانتے ہیں اور وہ جو نہیں جانتے؟''

قرآن کریم کی تلاوت بھی محبت الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے:

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، بیان کرتے ہیں:

''جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے سرشار ہونا چاہتا ہو اس کو چاہیے کہ قرآن کریم کی قراءت وتلاوت کرے۔'' [1]

کیونکہ دیکھ کر قرآن کریم کی تلاوت کرنے میں اللہ کی ذات وصفات میں تدبر وتفکر کی

[1] حلية الاولياء: ٧/٢٠٩.

طرف بھرپور توجہ مرکوز ہوتی ہے اور تلاوت قرآن کریم کا حقیقی لطف وسرور حاصل ہوتا ہے اور خشوع وخضوع کا زیادہ امکان ہے، دیکھ کر قرآن کریم کی تلاوت میں اللہ سے تعلق وآشنائی میں اضافہ ہوتا ہے جس سے محبت وچاہت مؤکد ہو جاتی ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے اسباب و ذرائع ہیں جو انسان کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے محبت کے راستہ پر گامزن کرنے میں ممد ومعاون ہوا کرتے ہیں ایک سچے محبّ کی پہچان ہی یہی ہے کہ وہ محبت الٰہی کے حصول کے وسائل کی تلاش اور اس کی تگ ودو میں لگا رہے تاکہ محبت کی اوج کمال تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب وبامراد ہو جائے اور اس کی دلی تمنا شرمندۂ تعبیر ہو اور محبت کا اتمام واکمال بھی ہو جائے پھر اس کا سچے محبین میں شمار ہونے لگے۔

محبت الٰہی کے نتائج اور ثمرات

کسی چیز کے نتائج اور ثمرات کی معرفت اس چیز کے حصول اور دستیابی کی کوششوں کے بارے میں مہمیز کا کام کرتے ہیں اس لیے ہم یہاں پر محبت کے نتائج اور ثمرات بیان کر رہے ہیں ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

توکل سے جنت میں داخلہ اور جہنم سے دُوری:

توکل کے اہم ترین نتائج اور ثمرات میں سے جنت میں داخلہ کی گارنٹی اور جہنم سے دوری کی پیشگی ضمانت ہے۔

اگر اللہ کی محبت اختیار کرنے کے نتیجہ میں صرف یہ فائدہ مدنظر ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محب کو اپنے عذاب سے نجات دینے کا وعدہ کیا ہے تو حقیقت میں بندے کے لیے اس کا کوئی عوض اور بدیل نہیں کیونکہ ایک طرح سے بندے کے لیے بڑا ہی سودمند سودا ہے وہ اس کے بدلہ کسی چیز کو لینے کے لیے ہرگز ہرگز آمادہ نہیں ہوسکتا کیونکہ بندۂ مومن کی یہی معراج ہے۔

توکل سے اللہ تعالیٰ کی محبت و رضا کا حصول:

توکل کے اہم ترین نتائج اور ثمرات میں سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی محبت و رضا کا حصول ہے۔ ادریس خولانی رحمہ اللہ سے روایت ہے، بیان کرتے ہیں:

''میں دمشق کی ایک مسجد میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں ایک خوبرو اور وجیہ نوجوان حلقہ بنائے بیٹھا ہوا ہے، اس کے اردگرد لوگ جمع ہیں اور علمی مذاکرہ میں مشغول ہیں، جب کسی مسئلہ میں اختلاف پیدا ہو جاتا تو وہ اس مسئلہ کو اس نوجوان کے سامنے پیش کر دیتے اور اس کی رائے پر متفق ہو جاتے، میں نے لوگوں سے اس نوجوان کے بارے میں دریافت کیا کہ آخر یہ ہے کون؟ تو مجھے پتہ چلا کہ یہ سیّدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہیں، چنانچہ دوسرے دن میں دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں نکل کر مسجد آ گیا تو دیکھتا کیا ہوں کہ وہ نوجوان وہاں ہم سے پہلے موجود ہے اور نماز کی ادائیگی میں منہمک ہے میں نے اس کے نماز سے فارغ ہونے کا انتظار کیا جب وہ نوجوان نماز ادا کر چکا تو میں نے اس کے سامنے کی جانب سے آ کر اس کو سلام کیا اور اس نوجوان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: اللہ کی قسم! میں تم سے محض اللہ کی خاطر محبت کرتا ہوں۔ یہ سن کر اس نوجوان نے کہا: واقعتاً۔ میں نے کہا: ہاں اللہ کو علیم وخبیر جانتے ہوئے میں یہ کہہ رہا ہوں، تو اس نوجوان نے پھر اللہ کا واسطہ دیا کہ واقعی تم محبت کرتے ہو، میں نے بعینہ وہی جواب دیا جو اس سے قبل دیا تھا۔ اس نوجوان تیسری مرتبہ پھر اللہ کا واسطہ دیا اور کہنے لگا: کیا واقعی تم مجھ سے اللہ کے لیے محبت کرتے ہو؟ میں نے پھر وہی جواب دہرایا جو پہلے دیا تھا، تو اس نوجوان نے میری چادر کے دونوں سرے پکڑ کر مجھے اپنی طرف کھینچا اور کہا: میں تم کو اس موقع سے وہ بشارت سنا دوں جو میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی، اپنے کانوں سے گوش گزار کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث قدسی بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے محض میری ذات

کی خاطر دو آپس میں محبت کرنے والوں اور دو آپس میں ہم نشینی اختیار کرنے والوں اور دو آپس میں زیارت کرنے والوں اور دو آپس میں میری خاطر خرچ کرنے والوں کے لیے میری محبت اور چاہت واجب اور پکی ہوگئی۔'' ❶

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''ایک شخص اپنے مسلمان بھائی کی زیارت کی غرض سے کسی دوسرے گاؤں جانے کے ارادے سے نکلا، اللہ تعالیٰ نے اس کے راستہ میں ایک فرشتہ کو اس کے انتظار میں بٹھا دیا جب وہ شخص اس فرشتہ کے پاس پہنچا جو راستہ میں اس کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا، تو اس فرشتہ نے اس شخص سے سوال کیا؟ تم کہاں جا رہے ہو؟ یا کہاں کا ارادہ ہے؟ اس شخص نے جواب دیا اس گاؤں میں اپنے ایک دوست کے پاس جا رہا ہوں۔ فرشتے نے پوچھا: کیا تم پر اس کا کوئی احسان ہے جس کی وجہ سے تم اس کی زیارت کو جا رہے ہو؟ اس شخص نے جواب دیا نہیں! الا یہ کہ میں محض اللہ کی خاطر اس سے محبت کرتا ہوں تو اس فرشتہ نے جواب دیا: کہ میں اللہ کا فرستادہ ہوں تمہارے پاس بھیجا گیا ہوں تاکہ تم کو بتلا دوں کہ اللہ تعالیٰ تم سے اسی طرح محبت کرتا ہے جس طرح تم محض اللہ کی خاطر اس بندے سے محبت کرتے ہو۔'' ❷

مومنین کی آپس میں محبت جتنی زیادہ مضبوط ہوتی جاتی ہے ان کو اتنا ہی رب کریم کا قرب اور انس ملتا چلا جاتا ہے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب بھی کوئی دو اشخاص اللہ کے لیے آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں تو ان دونوں میں جس کی محبت جتنی شدت اختیار کرتی جاتی ہے وہ اتنا ہی

---

❶ احمد: ۲۲۰۸۳ وصححه الحاکم ووافقه الذهبي۔

❷ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل الحب فی اللہ تعالیٰ: ۲۵۶۷۔

اپنے ساتھی کے مقابلہ میں اللہ کی نگاہوں میں محبوب بنتا چلا جاتا ہے۔"[1]

سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو کسی سریہ میں شرکت کی غرض سے روانہ فرمایا، دورانِ سفر وہ اپنے ہم نشینوں اور دوستوں کو نماز پڑھاتے ہوئے (قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ) یعنی سورۂ اخلاص کی تلاوت کیا کرتا تھا، واپسی پر اس کے ساتھیوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس بات کا تذکرہ کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس شخص سے دریافت کرو کہ اس نے یہ طریقہ کار کیوں اختیار کیا؟ چنانچہ اس کے ساتھیوں نے اس سے اس بارے میں سوال کیا تو اس نے جواب دیا کہ اس سورۃ میں رحمٰن کی صفات کا بیان ہے، مجھے یہ بات مرغوب اور پسند ہے کہ میں اس سورہ کو اس کی اس خوبی کے پیش نظر تلاوت کیا کروں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جاؤ، جا کر اسے بتلا دو کہ اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرتا ہے۔"[2]

سیّدنا ابوطفیل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے سیّدنا علی رضی اللہ عنہ کو اس موقع پر کہتے ہوئے سنا ہے جب لوگوں نے ان سے ذوالقرنین کے بارے میں سوال کیا کہ آیا وہ نبی تھے؟ تو انہوں نے جواب دیتے ہوئے فرمایا:

"وہ ایک نیک وصالح بندے تھے انہوں نے اللہ سے محبت کی تو محبوب الٰہی بن گئے۔"[3]

دنیاوی زندگی میں زبانِ خلق کا اس کی مدح سرائی کے لیے مسخر ہونا:

توکل کے اہم ترین نتائج اور ثمرات میں سے دنیاوی زندگی میں زبان خلق کا اس کی مدح سرائی کے لیے مسخر ہونا بھی ہے۔

سیّدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ایک

---

[1] رواہ الطبرانی فی المعجم الاوسط : ۲۸۹۹ وصححه الالبانی۔

[2] صحیح بخاری ، کتاب التوحید، باب فی دعاء النبیؐ امته : ۷۳۷۵۔ صحیح مسلم : ۸۱۳.

[3] تفسیر الطبری : ۸/۲۷۰.

جنازے کا گزر ہوا تو آپ ﷺ نے لوگوں سے کہا کہ اس کے اوصاف بیان کرو۔ لوگوں نے جواب دیا کہ ہمیں تو اس شخص کے بارے میں صرف اتنا پتہ ہے کہ یہ شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرتا تھا اور اس کی تعریف میں لوگوں نے اپنی زبان سے کلمات خیر کے ساتھ اس کی مدح سرائی کی۔ [1]

بندے کی ملعون و مطعون ہونے سے حمایت اور حفاظت:

توکل کے اہم ترین نتائج اور ثمرات میں سے بندے کی ملعون اور مطعون ہونے سے حمایت اور حفاظت ہے۔

سیّدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں ایک شخص ایسا بھی تھا جو نبی کریم ﷺ کو ہنسایا کرتا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے اس پر شراب کی حد بھی نافذ فرمائی تھی ایک دن اسے پکڑ کر لایا گیا اور فیصلہ کی رو سے اس پر حد نافذ کی گئی تو لوگوں میں سے کسی شخص نے کہا: اس پر اللہ کی لعنت ہو۔ اپنی حرکت سے باز نہیں آتا اور بار بار کوڑوں سے مارا جاتا ہے تو نبی کریم ﷺ نے اس شخص کی لعنت ملامت کے کلمات سن کر ارشاد فرمایا:

"اس پر لعن طعن مت کرو، اللہ کی قسم! میں اس شخص کے بارے میں میں یقینی طور پر یہ جانتا ہوں کہ یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے۔" [2]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس حدیث کی توضیح اور تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اس حدیث سے اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت نہ کرے وہ لعن طعن کیے جانے کا مستحق ہے۔" [3]

---

[1] احمد: ١٣٠٦٢ وصححه الالبانی۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب ما یکره من لعن شارب الخمر: ٦٧٨٠.

[3] تفسیر ابن کثیر: ٢٧٢/١.

خاتمہ

دبستان محبین کی سیر وسیاحت کے سلسلہ میں سفر اپنے اختتام کو پہنچا۔ اس موقع پر ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں اے اللہ: تو ہمیں اپنی محبت عطا فرما، اور اپنی محبت کی چاشنی میرے دل میں ایسی گھول دے کہ تیری ذات ہمیں چلچلاتی گرمی میں شدت پیاس کے وقت ٹھنڈے پانی کی حد سے زیادہ خواہش سے بھی کہیں بڑھ کر محبوب ومرغوب ہو جائے اور ہمیں ان مخلص محبین میں شامل کر دے جو دن رات اللہ کی محبت کے حصول کی تگ ودو میں سربکف کھڑے اللہ کے ذکر وفکر، اس کی تسبیح وتہلیل، تحمید وتمجید میں مشغول رہتے ہیں۔ اے رب کریم! جس کے سامنے کمال عاجزی کے ساتھ چہرے جھک جاتے ہیں ہمیں اپنے دیدار کی سعادت سے بہرہ ور فرما اور ہمارے دلوں کو اپنی محبت اور چاہت سے سرشار کر دے اور کل قیامت کے دن برسر عام اپنے روبرو سرزنش وملامت کی رسوائی کا منہ دیکھنے سے ہمیں پناہ عطا فرما۔ اے اللہ! ہمیں اپنی کتاب کریم کے مبارک علم کا حامل بنا دے اور اس پر عمل کی توفیق عطا فرما تاکہ کل تیرے روبرو حاضری کے موقع پر وہ میرے حق میں گواہی دینے والا عادل گواہ بن کر میرا سہارا بنے اور تیری جنت کی طرف میری رہنمائی کرنے والا قائد بن کر مرے ہم رکاب ہو اور قبر کی وحشت دور کرنے والا میرا مونس وغمگسار بن جائے اور یوم محشر کو میرا معاون ومددگار بن کر مجھے اپنے جلو میں لیے لیے پھرے۔ اے اللہ! ہمیں اپنے قرآن کریم کے احکامات پر عمل پیرا ہونے والا بنا دے اور اس کے اوامر کی اتباع کرنے والا بنا دے اور اس کے نواہی سے اجتناب کرنے والوں کے زمرے میں شامل فرما لے۔ اے اللہ! ہماری برائیوں کو نیکیوں میں تبدیل فرما دے، اور ہمارے اعمال کو ہمارے لیے باعث حسرت وندامت نہ بنا، اور ہمیں اپنی طرف قلب وقالب کے ساتھ متوجہ فرما دے، اور اپنے روبرو وقوف کے موقع پر ہمیں رسوائی وشرمندگی سے بچا لے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ أَجْمَعِيْنَ.

اپنے فہم وادراک کا امتحان لیں

ذیل میں اس موضوع سے متعلق سوالات کو دو مرحلوں کو مدنظر رکھتے ہوئے وضع کیا گیا ہے:

سوالوں کی ایک قسم تو وہ ہے جن کا جواب فوراً دینا ہے۔اس قسم کے سوالات کو پہلے مرحلہ میں رکھا گیا ہے۔

سوالوں کی دوسری قسم وہ ہے جو بحث ونظر اور غور وفکر کی متقاضی ہے اس قسم کے سوالات کو دوسرے مرحلہ میں رکھا گیا ہے۔

(پہلے مرحلہ کے سوالات) جن کا جواب فوراً دینا ہے:

۱۔ محبت سے اصطلاحاً کیا مراد ہے؟

۲۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی محبت کا کیا حکم ہے؟

۳۔ محبت کی مختلف اور متنوع اقسام ہیں، انھیں بیان کیجیے؟

۴۔ بندے کی رب کریم سے محبت اس کے لیے عظیم ترین شرف کی بات ہے. لہٰذا بندے کی رب کریم سے محبت کی علامات کیا ہیں وضاحت فرمائیں۔

۵۔ محبت کے ثمرات وفوائد ہیں. ان میں سے اہم ترین فوائد کون کون سے ہیں؟

دوسرے مرحلہ کے سوالات (جو استنباطی انداز کے ہیں):

۱۔ اللہ کے اس قول ﴿قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۝٢٤﴾ (التوبة: ٢٤) کے بارے میں علمائے کرام کا کہنا ہے کہ اللہ کی ذات سے محبت کرنا فرضِ عین ہے، آیت

کریمہ کی رو سے محبت الٰہی کے فرض ہونے کا کیسے استدلال کیا جاسکتا ہے؟

۲۔ اللہ تعالیٰ سے محبت خاص کا کیا ضابطہ اور قاعدہ ہے؟

۳۔ کیا نبی کریم ﷺ کے اس قول مَنْ اَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ اَحَبَّ اللّٰهُ لِقَاءَهٗ احب لقاء الله احب الله لقاء ہ سے موت کی تمنا کرنے کی مشروعیت کا جواز نکلتا ہے؟ اور اس حدیث سے کیا معنی مراد ہیں؟

۴۔ بعض لوگوں پر بعض شعائر دینیہ کی انجام دہی شاق گزرتی ہے مثلاً نماز فجر کی ادائیگی وغیرہ تو کیا اس کا مطلب یہ ہے ایسا شخص اللہ سے محبت نہیں کرتا؟

۵۔ ذنوب ومعاصی کی وجہ سے محبت کی سرے سے نفی نہیں ہوتی، اس کی دلیل دیں؟

۶۔ جو شخص فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی سے کام لیتا ہے اور نوافل کی پابندی کرتا ہے اس کا شرعی حل کیا ہے؟

۷۔ اللہ کی پسندیدگی کو اپنی پسندیدگی پر قربان کردینے کی علامات کیا ہیں؟

۸۔ کیا اس شخص کو لعن طعن کرنے کا شرعاً جواز ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت نہ کرتا ہو؟ دلیل کے ساتھ بیان کریں اور اس کی دلالت کی بھی توجیہ فرمائیں؟

۱۰۔ محبت کے موضوع پر اہل علم کی بہت سی تالیفات ہیں، ان میں سے جن کا علم ہے، ان کے نام بتائیں۔

أعمال
القلوب
خوف وخشیت
خوف
شکر
غور وفکر
تقویٰ
ورع
رضا

مقدمہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ، وَالصَّلاۃُ وَالسَّلامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ ، نَبِیِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی آلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ .

أما بعد !

اللہ سے ڈرنا اور خوف وخشیت کا پہلو اختیار کرنا مومنین کی نمایاں صفت ہے اور متقین کی پہچان ہے اور عارفین باللہ کا مشغلہ ہے۔ دنیا میں اللہ کی ذات سے خوف اور خشیت کا رشتہ استوار رکھنا آخرت میں امن وامان کے حصول کا ذریعہ اور دنیاوآخرت میں سعادت مندی و نیک بختی کا وسیلہ ہے اور کمال ایمان کی دلیل ہے اور حسن اسلام، دل کی پاکیزگی اور طہارت نفس کی علامت اور نشانی ہے۔

اس کتابچہ میں ہم خوف الٰہی کے معانی و مفاہیم ، اس کی اہمیت و افادیت اور خوف وخشیت کے درمیان فرق کی وضاحت کرنے کی کوشش کریں گے ، پھر مختصراً خوف کے دنیاوی اور اُخروی ثمرات وفوائد اور اس کے حصول کے اسباب و وسائل کا تذکرہ کریں گے ۔

اعمال قلوب سے متعلق لکھے گئے مقالات میں یہ چوتھا مقالہ ہے۔ اللہ کی توفیق سے جنھیں آپ کے سامنے فائدہ کی غرض سے پیش کرنے کی مجھے سعادت نصیب ہوئی، اس کے ترجمہ وتیاری میں الفرقان ٹرسٹ نے تعاون کیا اور آج یہی مکتبہ والے اس کتابچہ کو چھاپ کر اس کی نشر واشاعت میں حصہ لے رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم تمام لوگوں کو خوف کی دولت سے نواز دے اور ہمیں اپنی

ذات سے امیدیں وابستہ رکھنے والا بنادے اور اپنی رحمت وعطا سے توقع رکھنے والا اور آس لگانے والا بنادے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ
وَّعَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ أَجْمَعِيْنَ.

محمد صالح المنجد

خوف کی اہمیت کا بیان

شریعت اسلامیہ میں اللہ سے ڈرنے اور خوف کھانے کی بڑی وقعت اور منزلت وارد ہوئی ہے کیونکہ خوف ہی ایسا کارگر وسیلہ ہے جو لوگوں کو اعمال صالحہ تک کھینچ کر لانے کا ذریعہ ہے اور فسق و فجور، نافرمانیوں اور معصیتوں سے دور رکھنے کے لیے حد فاصل ہے۔

خوف خدا کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ خوف اللہ سے تقرب کی روشن اور تابناک شاہراہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی خوف ہے جو عارفین باللہ جیسے مومنوں کے لیے جو کہ آخرت کی سرخروئی کے خواہاں ہوں اور اعمال صالحہ کی انجام دہی جن کا شیوہ ہو، جد و جہد کرنے کا میدان ہے۔

امام ابوحفص رحمہ اللہ خوف کے بارے میں صراحت کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

"دل کے اندر خوف کی حیثیت چراغ کی ہے۔ اسی کی روشنی کی بنیاد پر دل خیر اور شر کی چھان بین کر کے دل کو لذت آشنائی سے ہم کنار کرتا ہے اور ہر وہ چیز جو خوفناک ہو اس سے تم دور بھاگتے ہو سوائے خوف الٰہی کے۔ اس کا معاملہ برعکس ہے، اگر تم کو خوف خدا نصیب ہو جائے تو تم بھاگنے کے بجائے اس کی طرف کشاں کشاں کھنچتے چلے آتے ہو لہٰذا خائف خوف سے پیچھا چھڑانے کی خاطر اپنے رب کریم کی جوار میں آ کر پناہ لینے کی تگ و دو کرتا ہے۔"[1]

اللہ تعالیٰ نے خوف کرنے والے بندوں کا اپنی کتاب کریم میں بڑے والہانہ انداز میں تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ هُمْ مِّنْ خَشْیَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝۵۷ وَ الَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ یُؤْمِنُوْنَ ۝۵۸ وَ الَّذِیْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا یُشْرِكُوْنَ ۝۵۹ وَ

---

[1] مدارج السالکین: ۱/۵۱۳۔

﴿ الَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ هُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ۝ ﴾

(المومنون : ٥٧ تا ٦١)

"یقیناً جولوگ اپنے رب کریم کی ہیبت سے ڈرتے ہیں اور جولوگ اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب کے ساتھ شرک نہیں کرتے اور جو لوگ (اللہ کی میں راہ خرچ کرتے ہیں) یعنی انھیں جو کچھ میسر ہے اس میں سے اللہ کی راہ میں دیتے ہیں اس حال میں کہ ان کے دل مارے خوف کے لرزہ براندام ہوتے ہیں (کہیں ہمارا عمل یا صدقہ نامقبول نہ قرار پا جائے) اور یہ کہ انھیں اپنے رب کریم کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خیر اور بھلائی کے کاموں میں سبقت کرنے والے ہیں اس حال میں کہ یہ سبّاق الی الخیرات ہیں۔)"

ام المومنین سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرماتی ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مذکورہ آیت ﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ ﴾ (المومنون : ٦٠) کے بارے میں دریافت کیا کہ کیا ڈرنے والوں سے مراد شراب نوشی کرنے والے، بدکاری کرنے والے اور وہ جو چوریاں کرتے ہیں یہ اور جیسے لوگ ہیں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا نہیں اے بنت صدیق! نہیں بلکہ یہ تو وہ لوگ ہیں جو نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں اور صدقہ خیرات کرتے ہیں لیکن اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں یہ اعمال نامقبول نہ ٹھہر جائیں۔ [1]

حسن رحمہ اللہ کا قول ہے کہ "اللہ کی قسم! ان لوگوں کا اللہ کی اطاعت وفرماں برداری کا مشغلہ ہوا کرتا ہے اور اس میں جدوجہد ان کا شعار مگر احتیاط کا یہ عالم ہے کہ مارے خوف کے سہمے ہوئے ہیں کہ کہیں ان کے اعمال ردّ نہ کر دیے جائیں، مومن کی شان ہی یہی ہے کہ وہ مرتبہ احسان پر فائز ہو کر خوف کا دامن مضبوطی سے تھامے رہتا ہے اور منافق کا حال یہ ہے

[1] ترمذی، کتاب التفسیر، باب و من سورۃ المومنین : ٣١٧٥ وصححه الحاکم ووافقه الذهبي۔

کہ عمل میں کورا ہوتا ہے اور عذاب سے اپنے آپ کو مأمون سمجھتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ عمل کے میدان میں سب سے پیچھے نظر آتا ہے اور اللہ کے عذاب سے مامون رہنے کے بلند و بانگ دعوے کرتا ہے۔ [1]

جس دل سے خوف الٰہی رخصت ہو جائے، اس دل میں ویرانی ڈیرا ڈال لیتی ہے اور جس دل میں خوف الٰہی کی قندیلیں فروزاں ہوں اس قلب کے اندر شہوت پرستی کے مظاہر جل کر راکھ ہو جاتے ہیں اور مادیت و دنیاداری کی چاہت جان چھڑا کر بھاگنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

لذت کام و دہن کے کتنے ہی اسیروں کو خوف نے لذت پرستی کے چنگل میں پھنس جانے کے بعد اس کی قید و بند کی صعوبتوں سے رہائی دلائی جبکہ لذت کام و دہن کی غلامی کا طوق ان کے گلے میں پڑ چکا تھا اور کتنے خواہش پرستوں کو خوف نے شہوانیت اور عیش پرستی کی کال کوٹھری سے نکال کر آزادی کے پرفضا ماحول میں لا کر کھڑا کیا جبکہ اس دلدل میں پھنسنے کے بعد ان کی ہمت جواب دے چکی تھی اور کتنے ہی غفلت زدہ لوگ ایسے ہیں جو لاپرواہی و بے خبری کا لحاف اوڑھ کر سو چکے تھے، خوف نے ان کو اس کیفیت سے بیدار کرنے کا فریضہ سرانجام دیا اور کتنے والدین کی نافرمانی کرنے والے ہیں جن کو خوف نے نافرمانی سے روک کر فرماں برداری کرنے کے لیے آمادہ کیا اور کتنے لوگ جو فسق و فجور کی دنیا میں مست تھے، خوف نے ان کو ان کی اس بے خوابی سے جگا کر ہوش و حواس کے ناخن لینے کے لیے مجبور کیا اور کتنے عابد و زاہد ایسے ہیں، اللہ کی خشیت نے انھیں آہ وزاری کرنے والا بنا دیا! اور کتنے مسافر ایسے ہیں جنھوں نے خوف کو اپنے سفر کے لیے زاد راہ بنا کر دلی تسلی کا سامان مہیا کیا! اور کتنے اللہ کے محبین اور صادقین ایسے ہیں جن کے آنسوؤں کے سیل رواں سے پیاسی سرزمین کی آبیاری ہوئی! وغیرہ وغیرہ۔

تو بخدا خوف وخشیت کا بڑا عظیم الشان مرتبہ ہے اس کے لیے جو اس کی عظمت اور

[1] مدارج السالکین: ۱/۵۱۲۔

قدر و منزلت کا قدرداں ہو اور جس پر خوف وخشیت کی معرفت کا فیضان ہو۔

یادر ہے! خوف بذات خود مقصود نہیں ہے، یہاں پر شارع حکیم کا خوف سے مقصود ڈرانا دھمکانا یا لوگوں کو دہشت زدہ کرنا نہیں ہے کہ وہ مارے خوف کے دہشت زدہ رہیں بلکہ شارع کی غرض و غایت یہ ہے کہ خوف ہمارے احوال وکوائف کی اصلاح یا ہماری اصلاح حال کا وسیلہ اور ذریعہ بن جائے۔

اگر خوف سے دہشت میں ڈالنا یا دھمکانا مقصود ہوتا تو اہل جنت سے خوف اور ڈر کی کیفیت کبھی ختم نہ ہوتی، لیکن اس کے برعکس جب اہل جنت جنت میں داخل ہو جائیں گے تو اس میں نہ عمل ہوگا اور نہ ہی مجاہدہ نفس کی ضرورت درپیش ہوگی اور نہ ہی عبادات کی انجام دہی کی خاطر اور خواہشاتِ نفس یا شہوات نفسانیہ سے مقابلہ کے لیے دل مارنا پڑے گا اور نہ ہی وہاں (یعنی دار آخرت میں) خوف اور دہشت کا سامنا ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿١١٢﴾﴾ (البقرۃ: ۱۱۲)

''جنتیوں پر نہ تو خوف طاری ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔''

عربی زبان میں محاورہ ہے کہ جس شخص نے آج دنیاوی زندگی میں خوف الٰہی کا اہتمام کیا وہ کل آخرت کے دن کے خوف سے محفوظ و مامون رہے گا اور جس شخص نے دنیاوی زندگی میں خوف خدا کا اہتمام نہ کیا وہ کل قیامت کے دن خوف و ہراس سے دوچار رہے گا۔

امام ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے مخلوق کائنات کو اس لیے وجود بخشا ہے تاکہ وہ معرفت الٰہی سے سرشار ہونے کی تگ و دو کریں اور اس کی عبادت و ریاضت کی انجام دہی کا فریضہ ادا کریں اور اس سے خوف وخشیت کا معاملہ کریں اور اپنی عظمت و کبریائی کے لیے دلائل و براہین قائم کر کے حجت تمام کر دی تاکہ لوگ اللہ سے ڈریں اور اس سے خوف کھائیں اور اس کی جلالت شان کے سامنے مارے خوف کے چوں تک نہ کریں اور بندوں کو اپنے عذاب کی شدت اور ہولناکی سے بھی آشنا کر دیا اور اپنے سزا خانے سے بھی مطلع کر دیا جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے نافرمانوں اور عاصیوں کے لیے تیار کیا ہے تاکہ بندے اعمال

صالحہ کی انجام دہی کی طرف متوجہ ہو کر اللہ کے عذاب سے ڈرتے اور گھبراتے رہیں۔ [1]

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے بار ہا جہنم کا ذکر فرمایا ہے اور اس میں اپنے دشمنوں کے لیے جو عذاب اور عبرتناک سزائیں رکھی ہیں اس کا جابجا تذکرہ کیا ہے اور جہنم میں پینے کے لیے بطور عذاب جو زقومٌ اور کھانے کے لیے ضریعٌ کا کانٹے دار درخت اور حمیمٌ کھولتا ہوا پانی، زنجیروں اور بیڑیوں وغیرہ کا تذکرہ کر کے عذاب کی ہولناکی اور اس کی حد سے زیادہ شدت وسختی کا تصور پیش کیا ہے۔

اس کے تذکرہ کا مقصد بندوں کو خشیت الٰہی اور تقویٰ کا درس دینا ہے اور جن احکامات کی بجا آوری کا انھیں حکم دیا گیا ہے ان کی برضا ورغبت خوشدلی کے ساتھ انجام دہی میں سبقت سے کام لینا ایک بندہ مومن سے مطلوب ہے اور جن چیزوں سے اجتناب کا شارع حکیم نے حکم دیا ہے یا جن چیزوں کی انجام دہی اسے ناپسند ہے اس سے اجتناب ایک بندہ مومن کا شعار ہونا چاہیے چنانچہ جو شخص قرآن کریم میں غور وفکر کرے گا اور اس میں تدبر وتفکر کا سہارا لے گا اس پر اسرار پنہاں کے راز کھلتے چلے جائیں ہے اور ایک نئے عالم سے اس کو واقفیت ہونا شروع ہو جائے گی، اسی طرح جو شخص سنت مطہرہ جو کہ قرآن کریم کی ترجمان وتفسیر ہے اس کا مطالعہ کرے گا اسے اس کی عجیب وغریب لذت وسرور محسوس ہوگی۔ اسی طرح سلف صالحین مراد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اُجمعین جو اہل علم وایمان تھے اور تابعین عظام رحمہم اللہ جنھوں نے بحسن وخوبی اپنے اسلاف کے مشن پر قائم رہتے ہوئے دِیے سے دِیا جلاتے ہوئے اسلاف کی تحریک کو عروج بخشا اگر کوئی شخص ان لوگوں کی زندگی کے احوال وکوائف اور ان کے خوف وخشیت اور خشوع وخضوع سے متصف ہونے اور اس میں اوج کمال پر کمندیں ڈالنے کے واقعات پر نظر دوڑائے گا تو اسے اس بات کا بخوبی پتہ چل جائے گا کہ یہی وہ صفات جلیلہ ہیں جس نے انھیں عزت اور شرف کے اس بلند وبالا مقام پر فائز کیا اور اللہ کی اطاعت وفرماں برداری کے حصول کی خاطر انتھک کوشش اور مکروہات شرعیہ سے

---

[1] التخويف من النار : ٥.

اجتناب میں حد سے زیادہ احتیاط کی وجہ سے ہی وہ ان مقامات عالیہ تک رسائی حاصل کر سکے، یہ تو مکروہات میں ان کی احتیاط کی بات ہے چہ جائیکہ محرمات کی بات کی جائے اس کی طرف تو ان کو ادنیٰ توجہ دینا بھی گوارا نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مقبولیت اور شہرت، عزت و شرف اور سعادت وخوش بختی کی اوج ثریا پر کمندیں ڈال دیں۔

خوف کی تعریف

خوف عربی زبان میں (خ و ف) سے مشتق ہے اس کے معنی گھبراہٹ حیرانی و پریشانی اور ڈر وغیرہ کے ہیں۔

کہا جاتا ہے: خافه، يخافه، خوفًا، وخيفًا، ومخافة، والأمر منه: خَف اور اسی سے تخويف اور اخافة اور التخويف وغیرہ مشتق ہیں۔ اس کا اسم فاعل خائف ہے، اس سے مراد وہ شخص ہے جو مارے ڈر کے گھبراہٹ میں مبتلا ہو اور جب کہا جائے: خوّف الرجل: تشدید واو کے ساتھ، اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ لوگ اسے دیکھ کر ڈرنے اور گھبرانے لگے ہیں اور قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّمَا ذَٰلِكُمُ الشَّيْطَٰنُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَآءَهُۥ﴾ (آل عمران: ١٧٥)

"یہ خبر دینے والا شیطان ہی ہے جو اپنے دوستوں سے (تم کو) ڈراتا ہے۔"

مراد یہ ہے کہ شیطان تم کو وسوسہ اور وہم میں مبتلا کرنے کے درپے ہے تاکہ تم اس کے حوالیوں موالیوں سے خوف کھانے لگو۔

امام ثعلب لغوی کا قول ہے کہ "اس کے معنی یہ ہیں کہ شیطان تم پر اپنے دوستوں اور ہمراہیوں کا رعب اور دبدبہ ڈال کر تمہیں ہولناکی اور گھبراہٹ کی کیفیت سے دوچار کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے ڈراؤنے اور خطرناک راستہ کو طریق مخوف و مخیف کہا جاتا ہے [1] اور جب کہا جائے قوم خائفون تو اس سے مراد گھبراہٹ اور ڈر سے دوچار لوگ ہوتے ہیں۔

[1] لسان العرب: ٩/٩٩-١٠٠۔

اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا﴾ (الاعراف: ٥٦)

''تم اللہ سے دعا ومناجاۃ کرو اس سے ڈرتے ہوئے اور امید وار رہتے ہوئے۔''

یعنی اس کے عذاب سے ڈرتے ہوئے اور اس کے اجر وثواب کی امید کرتے ہوئے [1]

مراد یہ ہے کہ امید و بیم کی کیفیت میں تمہاری صبح وشام گزرا کریں، یہی بندۂ مومن کا طرۂ امتیاز ہے۔

خوف کی اصطلاحی تعریف:

کسی ظنی یا قطعی علامت کی بنیاد پر ناپسندیدہ اور غیر مرغوب چیز کے وقوع کی توقع یا مرغوب ترین چیز کے فوت ہونے کی امید یا آس لگانا خوف کہلاتا ہے۔

دل میں پیدا ہونے والے اضطراب و بے چینی اور اس میں ہیجان اور کسی ناپسندیدہ معاملے کے پیش آنے کی وجہ سے حاصل ہونے والی دل کی گھبراہٹ یا کسی مرغوب معاملہ کے وقوع سے پیدا ہونے والی دلی کشمکش کا نام خوف ہے۔

امام ابن قدامہ رحمہ اللہ خوف کی تعریف میں رقم طراز ہیں: ''تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ آئندہ پیش آنے والے ناپسندیدہ امر کے وقوع کی توقع کے سبب دل میں پیدا ہونے والے الم اور بے چینی کا نام خوف ہے۔''

مثال کے طور پر اگر کوئی شخص بادشاہ وقت کی شان میں گستاخی کرے اور اتفاقاً اس جرم کی پاداش میں پکڑ کر بادشاہ کے روبرو پیش کیا جائے تو اس قع پر اس کو خوف لاحق ہوگا کہ اب اس جرم کی پاداش میں یا تو اسے قتل کر دیا جائے گا یا اسے معاف کر دیا جائے گا۔ اس موقع پر اس کے دل میں امید وبیم کی جو کیفیت پیدا ہوگی وہ خوف کہلائے گی لیکن اس دل میں الم کی شدت کا احساس اس کو تختہ دار تک پہنچانے والے اسباب و وسائل کے متعلق اس کے علم کی شمولیت کے بقدر ہوگا اور اس کے جرم کی شناعت اور بادشاہ کی نظر میں اس کی قوت

---

[1] تاج العروس، مادة (خوف).

تاثیر کی مقدار کی شدت اور عدم شدت کے ہم مثل ہوگا اور اگر جرم معمولی قسم کا ہے تو جرم کی اہمیت اور عدم اہمیت کے بقدر اس کے خوف میں شدت اور کمی کا توازن موجود ملے گا اور کبھی کبھار خوف کسی جرم کی وجہ سے نہیں ہوتا ہے بلکہ خوفنا کی وہولنا کی کی صفت اس کی جلالت شان کی وجہ سے درپیش ہوتا ہے مثال کے طور پر یہ چیز معلوم ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اگر دونوں عالم کو ہلاک کردے تو اس کو اس کی کوئی پرواہ نہیں اور نہ ہی کوئی چیز اس کو اس کی انجام دہی سے آڑے آسکتی ہے لہٰذا کہا جاسکتا ہے انسان کی اپنے عیوب ونقائص اور اللہ تعالیٰ کی جلالت شان اور اس کے استغناء کے بقدر خوف کا وجود عمل پذیر ہوتا ہے اور کون ہے جو اللہ کی مشیت کے بارے میں اس سے سوال و جواب کرے اور اس کے اعمال وافعال میں اس سے سین وجیم کرے۔ [1]

قرآن کریم میں بیان ہونے والے خوف کے معانی ومفاہیم:

قرآن کریم میں کلمہ خوف کا ورود ہوا ہے اور اس سے متعدد معانی مراد لیے گئے ہیں۔ ہر ایک معنی کا محور خوف ہے۔ اس میں سے چند کا ذکر مندرجہ ذیل ہے:

ا۔ قتل اور موت کے معنی میں کلمہ خوف کے ورود کا بیان۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ﴾

(النساء: ۸۳)

”اور جہاں انھیں کوئی خبر امن کی یا خوف کی ملی انہوں نے اسے مشہور کرنا شروع کردیا۔“

ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ﴾ (البقرہ: ۱۵۵)

”اور ہم کسی نہ کسی طرح تمہاری آزمائش ضرور کریں گے چاہے وہ دشمن کے ڈر سے ہو۔“

[1] مختصر منهاج القاصدين : ٤/ ٦٢.

۲۔ کلمہ خوف کا قتال کے سیاق میں بیان آیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَأَيْتَهُمْ يَنظُرُونَ إِلَيْكَ تَدُورُ أَعْيُنُهُمْ كَالَّذِي يُغْشَىٰ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۖ فَإِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوكُم بِأَلْسِنَةٍ حِدَادٍ﴾ (الاحزاب: ۱۹)

''پھر جب خوف و دہشت کا موقع آجائے تو آپ انھیں دیکھیں گے کہ آپ کی طرف نظریں جما دیتے ہیں اور ان کی آنکھیں اس طرح گھومتی ہیں جیسے اس شخص کی جس پر موت کی غشی طاری ہو پھر جب خوف جاتا رہتا ہے تو تم پر اپنی تیز و ترار زبانوں سے بڑی باتیں بناتے ہیں۔''

۳۔ کبھی کلمہ خوف غیر مرغوب چیز کے حصول کے متوقع ہونے کی پیشین گوئی کے طور پر وارد ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنْ خَافَ مِن مُّوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا﴾ (البقرہ: ۱۸۲)

''ہاں جو شخص وصیت کرنے والے کی جانب داری یا گناہ کی وصیت کر دینے سے ڈرے۔''

جنفا غلطی یا بھول چوک سے کسی ایک رشتہ دار کی طرف مائل ہو کر دوسروں کی حق تلفی کرے یا أثما سے مراد جان بوجھ کر ایسا کرے۔ اشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِلَّآ أَن يَخَافَآ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ﴾ (البقرہ: ۲۲۹)

''اور ہاں یہ اور بات ہے کہ دونوں کو اللہ کی حدیں قائم نہ رکھ سکنے کا خوف ہو۔''

مراد یہ ہے کہ دونوں کو یقینی طور پر اس معاملہ کے پیش آنے کی توقع ہو۔ ایک اور جگہ بھی ارشاد ربانی ہے:

﴿وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ﴾ (النساء: ۳)

''اور اگر تمہیں ڈر ہو کہ یتیم لڑکیوں سے نکاح کر کے تم انصاف نہ رکھ سکو گے۔''

یعنی تم کو اس بات کا یقین ہو جائے اور ایک جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ﴾ (النساء: ۱۲۸)

''اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی بد دماغی اور بے پرواہی کا خوف ہو تو دونوں آپس میں جو صلح کر لیں اس میں کسی پر کوئی گناہ نہیں۔''

۴۔ کبھی کلمہ خوف نقص یا کوتاہی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ ﴾ (النحل: ۴۷)

''یا اچانک خوف کے عالم میں ان کا مؤاخذہ کر لے اس حال میں کہ وہ ڈرے اور سہمے ہوئے ہوں۔''

۵۔ عذاب وعقاب سے خوف وخشیت کے معنی میں آتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ﴾ (السجدة: ۱۶)

''وہ اپنے رب کریم کو خوف وامید کے حال میں پکارتے ہیں۔''

امام ابن حجر رحمہ اللہ صحیح بخاری کی شرح فتح الباری میں ''باب الخوف من اللہ عزوجل'' کے ضمن میں باب باندھتے ہوئے لکھتے ہیں: ''باب: اللہ تعالیٰ سے خوف کھانے اور خشیت اختیار کرنے کے بارے میں [1] اور اللہ کا خوف اور اس کی خشیت کا بڑا بلند وبالا مرتبہ ہے اور خوف وخشیت ایمان کے لوازمات میں سے ہے'' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ (آل وعمران: ۱۷۵)

''اگر تم مومن ہو تو مجھ سے ڈرا کرو۔''

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ ﴾ (المائدة: ۴۴)

''لوگوں سے مت ڈرو ہمارا خوف اختیار کرو۔''

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

[1] صحیح البخاری، : ۵/۲۳۷۷.

﴿اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ ﴾ (فاطر : ۲۸)

''اللہ سے تو علمائے کرام ہی ڈرتے ہیں [خوف الٰہی اور خشیت الٰہی علمائے کرام کی صفت ہے] اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑا زبردست ہے اور عفو و درگزر سے نوازنے والا ہے۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

''میں تم سب سے زیادہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے والا اور خائف رہنے والا بندہ ہوں۔'' ❶

بندے کو رب کریم کی جتنی زیادہ قربت ملتی جاتی ہے اتنی ہی اس کی خوف اور خشیت کی کیفیت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کا وصف بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

﴿یَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ﴾ (النحل : ۵۰)

''اور اپنے رب سے جو ان کے اوپر ہے مارے ڈر کے کپکپاتے رہتے ہیں۔''

انبیاء علیہم السلام کی وصف بیانی کرتے ہوئے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَ یَخْشَوْنَهٗ وَ لَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ﴾

(الاحزاب : ۳۹)

''یہ سب لوگ ایسے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچایا کرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔'' ❷

خوف اور خشیت کے درمیان فرق

خوف اور خشیت دونوں معنی کے اعتبار سے ہم جنس ہیں۔ دونوں کے درمیان معمولی سا فرق پایا جاتا ہے۔ خوف کسی بھی چیز سے ڈر جانے کو کہا جاتا ہے اور خشیت معزز و مکرم چیز

❶ صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب بیان أن القبلة فی الصوم: ۱۱۰۸

❷ فتح الباری : ۱۱/۳۱۳.

سے ڈرنے اور گھبراہٹ محسوس کرنے کو کہتے ہیں۔امام مناوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''خشیت کا اس خوف پر اطلاق ہوتا ہے جس میں تعظیم کا پہلو آمیزاں ہو اور اکثر وبیشتر اس ذات کے علم ومعرفت سے سرشاری کی بنیاد پر خوف پیدا ہوتا ہے جس سے خوف وخشیت اختیار کیا جاتا ہے اسی لیے قرآن کریم میں خشیت کو علمائے کرام کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے۔'' ❶

امام زبیدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''خشیت دراصل وہ خوف ہے جس میں احترام وتعظیم کی چاشنی آمیزاں ہو۔'' ❷

فضیلۃ الشیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''خشیت بلاشبہ وہ خوف ہے جو اس ذات کی عظمت شان کے علم ومعرفت پر مبنی ہوتا ہے جس کی ذات سے اس کی کمال حکمرانی وفرمانروائی کے مدنظر خوف و خشیت اختیار کرنے کو کہا گیا ہے۔''

اس بنیاد پر خشیت خوف کے مقابلہ میں اس اعتبار سے خاص ہوگئی کہ جس ذات سے خوف اختیار کیا جائے وہ بذات خود معزز ومکرم بھی ہو اور وہ اللہ کی تبارک وتعالیٰ کی ذات گرامی ہے۔

اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ خشیت اس اعتبار سے خاص ہے کہ اس کا صدور جس سے ہو رہا ہے وہ خشوع وخضوع اختیار کرنے کا اہل ہے۔ اسی لیے تو خشیت کو علمائے کرام کی ذات سے مخصوص کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ (فاطر: ٢٨)

''اللہ تعالیٰ سے اس کے بندوں میں سے علمائے کرام ہی ڈرتے اور خوف کھاتے ہیں۔''

یعنی علمائے کرام کا خوف معرفت الٰہی سے سرشار ہوا کرتا ہے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ

❶ التعاريف: ٣١٤.   ❷ تاج العروس: ٤٥/١.

نے ارشاد فرمایا:

”جہاں تک میرا معاملہ ہے تو اللہ کی قسم! میں تم میں سب سے زیادہ اللہ کا خشوع وخضوع اختیار کرنے والا ہوں۔“ ❶

کیونکہ آپ ﷺ عالموں اور عارفوں کے امام اور پیشوا ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”اللہ کی قسم! اگر تم وہ کچھ جان لو جو میرے علم میں ہے تو ہنسو کم اور زیادہ روؤ، اور بستروں پر عورتوں سے محظوظ ہونا چھوڑ دو اور اللہ سے دعا اور مناجات کرنے کی غرض سے پہاڑوں کی چوٹیوں کی طرف نکل پڑو۔“ ❷

حدیث مذکور میں خوف اور خشیت کی وجہ سے زیادہ رونے اور کم ہنسنے کو علم سے منسوب کیا گیا ہے۔ لہٰذا خوف تو سارے مومنین کے لیے عام ہے اور خشیت علمائے کرام اور عارفین باللہ کے ساتھ خاص ہے اور علوم و معرفت کے فیضان کے بقدر خوف وخشیت کا نزول ہوتا ہے۔

خوف اور خشیت کا وجوب

اللہ تعالیٰ کا خوف بندے کے لیے شرعی واجبات میں سے اہم ترین واجب ہے بلکہ اس کی بڑی قدر و منزلت ہے کیونکہ اس کی بنیاد پر اہم ترین اثرات مرتب ہوتے ہیں اسی لیے امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”خوف کی قدر و منزلت معرفت الٰہی کی راہ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اور خوف دل کے لیے بہت نفع مند ہے اور وہ ہر ایک پر فرض عین ہے۔“ ❸

ابن وزیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”جہاں تک امان اور سلامتی کا معاملہ ہے تو اس کی گارنٹی کا کوئی راستہ نہیں اور خوف وخشیت صالحین اور نیکوکاروں کا شعار ہے۔“ ❹

---

❶ مسلم، كتاب الصيام، باب بيان أن القبلة في الصوم: ۱۱۰۸.

❷ ترمذی، كتاب الزهد، باب في قول النبيّ لو تعلمون ما اعلم: ۲۳۱۲۔

❸ ابن ماجة: ٤١٠٩ وصححه الحاكم ووافقه الذهبي۔ ❹ مدارج السالكين: ۱/۵۱۱.

خوف کے وجوب پر کتاب وسنت میں جابجا نصوص موجود ہیں ان میں سے بعض مندرجہ ذیل ہیں۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے خوف کا حکم دیا ہے:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ﴾ (البقرة : ٤٠)

''اور مجھ سے ہی خوف کھاؤ۔''

اس آیت کریمہ میں اللہ سے ڈرنے اور خوف کھانے کا حکم وارد ہوا ہے اور جب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی چیز کی انجام دہی کا حکم وارد ہو تو اس کا تقاضہ یہی ہوتا ہے کہ وہ واجب ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ﴾ (المائدة : ٤٤)

''لہٰذا لوگوں سے مت ڈرو اور صرف مجھ سے خوف کھاؤ اور ڈرو۔''

امام سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں اپنی خشیت کا حکم دیا ہے اور اللہ کی ذات سے خوف کھانا اور اس کی خشیت اختیار کرنا ہر بھلائی کی بنیاد ہے جو شخص اللہ کا خوف اختیار نہیں کرتا وہ گناہوں سے اجتناب نہیں کر سکتا اور نہ ہی اللہ کے اوامر و نواہی کی کوئی پرواہ کرتا ہے۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے خوف کو ایمان کی شرطوں میں ایک شرط قرار دیا ہے:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَ خَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (آل عمران : ١٧٥)

[1] تيسير الكريم الرحمن : ١/١٥٧.

”یہ خبر دینے والا صرف شیطان ہی ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے تم ان کافروں سے نہ ڈرو اور میرا خوف اختیار کرو اگر تم مومن ہو۔“

امام سعدی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

”اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ سے خوف کے وجوب کا حکم دیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا خوف ایمان کے لوازمات میں سے ایک لازمہ ہے۔ اسی لیے بندہ کے ایمان کے بقدر اس کے دل میں خوف کا ظہور ہوتا چلا جاتا ہے۔“ ❶

تبلیغ کی مہم کی اہم ترین کڑی انذار و تخویف، رسولوں کا وصف:

عربی زبان میں انـذار سے مراد کسی ڈرانے والی چیز سے باخبر کرنا ہوا کرتا ہے۔ امام راغب اصفہانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”انذار اس خبر کو کہتے ہیں جس کا مقصود ڈرانا دھمکانا ہو جیسے کہ تبشیر ہے۔ اس میں خوشی کی خبر پنہاں ہوتی ہے۔“ ❷

قرآن کریم میں بہت سی آیات ایسی بھی وارد ہوئی ہیں جن کی رو سے رسل علیہم السلام کی یہ وصف بیانی وارد ہوئی ہے کہ ”ان کا خاص وصف یہ تھا کہ وہ (ڈرانے والے تھے) ان آیات میں سے اللہ تعالیٰ کا یہ قول بھی ہے:

﴿وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ﴾ (الانعام: ٤٨)

”اور ہم پیغمبروں کو صرف اس واسطہ بھیجا کرتے ہیں کہ وہ بشارت دیں اور ڈرائیں۔“

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈرانے اور خوف دلانے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿٢١٤﴾﴾ (الشعراء: ٢١٤)

”اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ۔“

---

❶ تیسیر الکریم الرحمن: ١/١٥٧.

❷ المفردات (مادة: نذر)

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی ﴿وَ اَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ﴾ نبی کریم ﷺ صفا نامی پہاڑ پر چڑھ کر بآنگ دہل اعلان کرنے لگے ''اے بنی فہر! اور اے بنی عدی!'' آپ ﷺ کی پکار سن کر سارے قبیلے والے جمع ہو گئے اور جو شخص نہ آسکا اس نے اپنا قاصد بھیج دیا تاکہ معاملہ سے باخبر ہو کر اسے آکر مطلع کرے۔ چنانچہ اس موقع پر ابولہب اور قریش کے اعیان وسردار بھی حاضر ہوئے تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر میں تم کو اس بات کی خبر دوں کہ اس وادی کے پچھلے حصہ سے تم پر گھڑ سواروں کا ایک دستہ اچانک حملہ کرنے والا ہے۔ کیا تم میری تصدیق کرو گے؟'' تو تمام لوگوں نے بیک آواز جواب دیا کیوں نہیں! ہم نے آپ ﷺ کی زبان سے سچ کے علاوہ اور کچھ سنا ہی نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کان کھول کر سن لو! میں تم کو سخت عذاب سے ڈرانے والا ہوں قبل اس کے کہ وہ تم کو آلے۔'' [1]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ قُلۡ اِنِّیۡۤ اَنَا النَّذِیۡرُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۸۹﴾﴾ (الحجر : ۸۹)

''اور آپ کہہ دیجئے کہ میں تو کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں۔''

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَفِرُّوۡۤا اِلَی اللّٰہِ ؕ اِنِّیۡ لَکُمۡ مِّنۡہُ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۵۰﴾﴾ (الذاريات : ۵۰)

''اور تم اللہ کی طرف دوڑ بھاگ (یعنی رجوع کرو) یقیناً میں تمہیں اس کی طرف سے صاف صاف تنبیہ کرنے والا ہوں۔''

اللہ تعالیٰ کے ان ابتدائی احکامات میں سے جس کا مخاطب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو بنایا۔ انذار بھی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰۤاَیُّہَا الۡمُدَّثِّرُ ۙ﴿۱﴾ قُمۡ فَاَنۡذِرۡ ۪ۙ﴿۲﴾﴾ (المدثر : ۱۔۲)

---

[1] بخاری، کتاب التفسیر، باب وأنذر عشيرتك الاقربين : ۴۷۷۰۔ صحیح مسلم : ۲۰۸۔

''اے کپڑا اوڑھنے والے، کھڑے ہو جاؤ اور (لوگوں کو) ڈراؤ یا آگاہ کرو۔''

امام قرطبی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ''آپ ﷺ کو خطاب کر کے کہا جارہا ہے کہ آپ ﷺ اہل مکہ کو ڈرائیں اور اگر وہ ایمان نہیں لاتے تو انھیں عذاب کا الٹی میٹم دے دیں۔'' [1]

سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''میری اور مجھے جس چیز کو دے کر بھیجا گیا ہے اس کی مثال اس شخص کی ہے جو کسی قوم کے لوگوں کے پاس آئے تو آ کر قوم کے لوگوں کو پیشگی خبر کے طور پر بتلائے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے لشکر کو حملہ کے لیے آتے ہوئے دیکھا ہے اور میں تم کو کھلم کھلا اس سے ڈرانے والا اور آگاہ کرنے والا ہوں لہٰذا نجات اور بچاؤ کا طریقہ اختیار کرو تو قوم کے ایک گروہ نے اس کی بات مان لی اور راتوں رات وہ وہاں سے بھاگ نکلے اور نجات پا گئے اور انھیں میں سے ایک دوسرے گروہ نے اس شخص کی بات سنی ان سنی کر دی تو صبح ہوتے ہی لشکر نے ان پر چڑھائی کر دی اور انھیں روند ڈالا۔'' [2]

اس حدیث میں عربی کا ایک محاورہ بیان کیا گیا ہے: النذیر العریان ۔ اس کی اصل یہ ہے کہ ایک شخص کو کسی لشکر سے سابقہ پڑا۔ اس لشکر کے سپاہیوں نے اس کے مال و اسباب کو لوٹ لیا اور اسے قیدی بنا لیا۔ اس حالت سے دوچار ہو کر جب وہ اپنی قوم کے لوگوں کے پاس واپس آیا تو اس نے اپنی قوم کے لوگوں کو یہ خبر دی کہ ''اس نے لشکر کو دیکھا ہے بلکہ اس کی قوم کے لوگوں نے اس کی حالت کا بھی مشاہدہ کیا کہ وہ ننگا دھڑنگا واپس آیا تھا۔ اس لیے اس کی قوم کے لوگوں نے اس کی بات کی تصدیق کی کیونکہ وہ اس کو بخوبی جانتے پہچانتے تھے اور نصیحت کے معاملہ میں اس کو متہم قرار نہیں دیتے تھے اور نہ ہی ننگا رہنے کی اس شخص کی عادت

---

[1] الجامع لأحکام القرآن: ۱۹/ ۶۱.

[2] صحیح بخاری: ۶۴۸۲۔ صحیح مسلم: ۲۲۸۳.

تھی۔ ان قرائن وشواہد کی بنیاد پر انہوں نے قطعی طور پر بیک آواز اس کی تصدیق کی۔ وہاں سے یہ مثل مشہور ہوگئی۔

اسی لیے عربوں کی عادت تھی کہ اگر کوئی شخص کسی لشکر کو اپنے قبیلہ یا کنبہ برادری کے لوگوں پر حملہ آور ہوتا ہوا دیکھتا اور اسے محسوس ہو جاتا کہ بس اس کے قبیلہ پر حملہ ہونے والا ہے اور وہ سپاہیوں یا فوجیوں کو لاؤ لشکر کے ساتھ اپنی بستی کی طرف حملہ کی غرض سے باہر سے آتے ہوئے دیکھ کر اپنے علاقے میں آتا اور اس کے قبیلہ والوں کو اس چڑھائی کی خبر نہ ہوتی تو وہ دوڑتا، بھاگتا اور اپنے کپڑے اتار کر پھینک دیتا اور بلند آواز سے چیختا چلاتا تاکہ اس کے قبیلہ والے اس مصیبت کی ہولناکی سے آگاہ ہو جائیں جو ان پر تھوڑی دیر بعد نازل ہونے والی ہے اور اس خطرے سے نپٹنے کے لیے ہوشیار ہو جائیں۔ عربوں کے نزدیک یہ ڈرانے دھمکانے یا خطرے کا سائرن بجانے کے اسباب ووسائل میں بلیغ ترین طریقہ تھا۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے خطاب میں اس محاورہ کو بطور استعارہ استعمال کیا ہے اور عربوں کو ان کی زبان حال کے مطابق مخاطب کر کے انذار کی ہولناکی سے آگاہ کر دیا تاکہ حجت تمام ہو جائے۔ [1]

اللہ کی ذات سے ڈرنے کے اسباب ووسائل میں عذاب الٰہی کا ذکر:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَ مِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ۭ ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ ۭ يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ ⑯ ﴾ (الزمر: ١٦)

''انھیں نیچے اوپر سے آگ کے شعلے مثل سائبان کے ڈھانکے ہوئے ہوں گے یہی عذاب ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ڈرایا ہے۔ اے میرے بندو! اور مجھ سے ڈرتے رہا کرو۔''

امام ابن کثیر رحمہ اللہ ﴿يُخَوِّفُ اللّٰهُ عِبَادَهٗ﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ

[1] فتح الباری (۱۱/ ۳۱۷).

''اللہ تعالیٰ نے بہر صورت اس خبر کے وقوع پذیر ہونے کی خبر دی ہے تا کہ اس کے ذریعے اپنے بندوں کو ڈرائے اور دھمکائے'' اور فرمایا ہے کہ ''اس خبر کو یہاں لانے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ وہ خوف کھا کر اللہ کی حرام کردہ چیزوں اور گناہوں کے ارتکاب سے باز آجائیں'' اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول ﴿يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ﴾ اس بات کا اشارہ اور بندوں کو آگاہ کرنا ہے کہ ''میری پکڑ اور میری گرفت نیز میرے عذاب اور میری سزا سے ڈرتے رہو اور بچنے کی کوشش کرو۔'' [1]

خشیت الٰہی کے لیے آیات قرآنیہ کا ورود:

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی کتاب کریم میں اس بات کی صراحت کردی ہے کہ اس نے انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کے لیے جونشانیاں اور آیات ومعجزات نازل فرمائے ان کا نزول دراصل بندوں کا ڈرانے اور خوف دلانے کی غرض سے ہوا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ؕ وَ مَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ﴿۵۹﴾﴾ (الاسراء: ۵۹)

''اور ہم نے ثمود علیہ السلام کو بطور بصیرت اُونٹنی دی لیکن انہوں نے اس پر ظلم وزیادتی کا سلوک روا رکھا اور ہم تو لوگوں کو ڈرانے اور خوف دلانے کے لیے ہی نشانیاں بھیجتے ہیں۔''

اسی طرح اس جہاں ہستی یا کائنات میں رونما ہونے والی نشانیوں کا معاملہ ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اس لیے معرض وجود میں لا کر افق عالم پر نمودار کرتا ہے تا کہ بندے اس سے خوف کھائیں اور ڈریں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ يُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ﴾

(الرعد: ۱۲)

''وہ اللہ ہی کی ذات جو تمہیں بجلی کی چمک ڈرانے اور امید دلانے کے لیے

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ٤/٦٣.

دکھاتا ہے اور بھاری بھرکم بادلوں کو بنا کر اڑاتا ہے۔“

اسی طرح سورج گرہن اور چاند گرہن کا معاملہ ہے۔ یہ دونوں بھی اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہیں۔ اللہ تعالیٰ بندوں کو یہ نشانیاں محض اس لیے دکھاتا ہے تاکہ بندے آخرت کی یاد تازہ کریں اور یوم آخرت کی خوفناکی کو یاد کریں کیونکہ جب قیامت قائم ہوگی تو سورج اور چاند کی روشنی خود بخود ختم ہوجائے گی اور یہ دونوں بے نور ہوجائیں گے سیّدنا ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

”قیامت کے دن سورج اور چاند کی روشنی ختم ہوجائے گی“ [1]

خسوف اور کسوف ہمیں قیامت کے قیام کی یاد دلاتے ہیں۔ سیّدنا ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔ کسی کے مرنے اور جینے سے ان میں گرہن واقع نہیں ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ سورج اور چاند گرہن کی رونمائی کر کے بندوں کو ڈرانا چاہتا ہے۔“ [2]

صحابہ اور مسلمانوں کی آزمائش خشیت الٰہی کی پرکھ کے لیے ہوتی:

اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو بڑی آزمائشوں میں مبتلا کیا تاکہ پتہ چل جائے کہ ان میں سے کون اللہ کا خوف کھانے والا ہے اور کون نہیں۔ شکار کے بارے اللہ تعالیٰ کا قول ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَيَبْلُوَنَّكُمُ ٱللَّهُ بِشَيْءٍ مِّنَ ٱلصَّيْدِ تَنَالُهُۥٓ أَيْدِيكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ ٱللَّهُ مَن يَخَافُهُۥ بِٱلْغَيْبِ ۚ فَمَنِ ٱعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُۥ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٩٤﴾ ﴾ (المائدۃ: ۹٤)

[1] صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب صفۃ الشمس والقمر: ۳۲۰۰۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الکسوف، باب قول النبیؐ یخوف عبادہ بالکسوف: ۱۰٤۸۔ صحیح مسلم: ۹۱۵۔

''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ قدرے شکار سے تمہارا امتحان لے گا (اس شکار سے) جن تک تمہارے نیزے پہنچ سکیں (یعنی تمہاری دسترس میں ہوں) تا کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہو جائے کہ کون شخص اس سے بن دیکھے ڈرتا اور خوف کھاتا ہے لہٰذا جو شخص اس کے بعد حد سے تجاوز کرے گا اس کے واسطے دردناک عذاب ہے۔''

چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے بہت سے لوگ ایسے تھے جن کی روزی روٹی کا تعلق شکار سے تھا اور شکار ان کے نزدیک مرغوب ترین چیز تھی۔ ان کے دلوں میں شکار کی محبت جاگزیں تھی اور شکار ان کی روزمرہ کی زندگی میں محبوب ترین مشق تھی جس کے بغیر انھیں کسی صورت میں چین نہ تھا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر ان کو شکار سے منع کر کے آزمایا تا کہ یہ بات واضح ہو کر سامنے آجائے اور پتہ چل جائے اور ڈرنے والوں کا نہ ڈرنے والوں کے درمیان تصفیہ ہو جائے اور اللہ کے نزدیک خوف کی عظمت شان کا پہلو واضح ہو کر سامنے آجائے۔ اسی لیے اس مقام عظیم پر شکار سے انھیں منع کیا گیا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اس امتحان میں کامیاب ہوئے اور یہ بات واضح ہو کر سامنے آگئی کہ وہ لوگ خلوت اور جلوت دونوں موقعوں پر اللہ سے ڈرتے اور اس سے خوف کھاتے ہیں۔ برخلاف یہودیوں کے کہ اللہ تعالیٰ نے (ہفتہ کے روز) ان پر مچھلی کا شکار حرام قرار دیا تھا۔ انہوں نے معمولی معمولی حیلے بہانے بنا کر اللہ کی حرمت کی پامالی کی اور انہوں نے جمعہ کے دن مچھلی کے شکار کی خاطر جمعہ کے دن جال لگا کر چھوڑ دینے کی عادت بنالی اور اتوار کے دن مچھلیوں سے بھرا جال نکالنا شروع کر دیا اور کہنے لگے ہم ہفتہ کے دن شکار نہیں کرتے اور اللہ کے خوف اور ڈر کو بالائے طاق رکھ دیا اور ہلاکت و بربادی مول لے لی۔ ان کا نام و نشان تک مٹ گیا لیکن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اللہ کے خوف کا پاس اور لحاظ رکھا اور نجات اور کامیابی سے ہم کنار ہوئے۔

جب ہمیں اس بات کا پتہ چل گیا کہ اللہ کا خوف واجب اور ضروری ہے اور اس کی

اہمیت ہمارے سامنے واضح ہوکر سامنے آگئی تو اس کے بعد ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم ایک اور اہم ترین نقطہ کی اہمیت تک رسائی حاصل کریں وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے خوف کے دو مقام ہوا کرتے ہیں۔

پہلا مقام:......اللہ کے عذاب اور اس کی جزا وسزاء سے خوف محسوس کرنا۔

دوسرا مقام:......ذات باری تعالیٰ سے بذات خود ڈرنا اور خوف کے پہلو کو مد نظر رکھنا۔

جہاں تک خوف کے پہلے مقام کا تعلق ہے، اس کا عوام الناس بھی پاس ولحاظ رکھتے ہیں چنانچہ عوام الناس جہنم میں جانے سے ڈرتے اور خوف کھاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے دنیوی اور اُخروی عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں اور اللہ کی عظمت کی طرف ان کی توجہ مبذول نہیں ہوتی اور نہ ہی ان کے نزدیک خوف الٰہی کی قدر و قیمت کا پاس ولحاظ ہوتا ہے نہ وہ خوف الٰہی کے معانی ومفاہیم سے باخبر ہوتے ہیں اور نہ اللہ کی ذات سے خوف کھانے کے مقصد کا انھیں علم ہوتا ہے۔

عوام الناس کو خوف کا اس وقت احساس ہوتا ہے جب دوزخ کی بلاخیزی کا تذکرہ کیا جائے یا جب جہنم میں قید وبند یا اس میں دیے جانے والے انواع واقسام کے عذاب کا ذکر آئے تب عوام الناس کے اندر خوف کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔

جہاں تک اہل علم کا تعلق ہے اور دین کی سمجھ رکھنے والوں کا معاملہ ہے اور اللہ کے اسماء حسنیٰ اور اس کی صفات اعلیٰ اور باری تعالیٰ کی جلالت شان کی معرفت رکھنے والوں کی بات ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے حد سے زیادہ ڈرنے والے اور خوف کھانے والے ہوتے ہیں محض اس بنیاد پر کہ وہ اللہ کی عظمت شان اور اس کی جلالت اور اس کی سخت گرفت نیز اس کے رعب ودبدبہ اور اس کی بزرگی اور اس کے جاہ وجلال اور اس کی شان وشوکت سے واقف ہوتے ہیں اور وہ اللہ کی ذات سے ڈرنے اور خوف کھانے کو اس کے عذاب وعقاب اور اس کی جزا وسزا کے خوف سے مقدم گردانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر آتے ہی ان کا وجود کانپ اٹھتا ہے۔

امام ابن قدامہ رحمہ اللہ خوف کے ان دونوں مقامات کا تجزیہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

خوف کا پہلا مقام:......اللہ کے عذاب سے ڈرنا اور خوف کھانا ہے۔ یہ عوام الناس کا خوف کہلاتا ہے اس نوعیت کے خوف کا حصول جنت و جہنم کے ذکر سے عمل میں آتا ہے اور ان دونوں پر ایمان لانے کا اطاعت و معصیت کے اجزا میں شمار ہوتا ہے۔

خوف کا دوسرا مقام:......وہ اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس سے ڈرتا اور خوف کھاتا ہے۔ یہ علماء عاملین اور عارفین کا شیوہ اور طرۂ امتیاز ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَٰٓؤُا ۗ﴾ (فاطر: ۲۸)

''اللہ کے بندوں میں علماء ہی اللہ کا خوف اور اس کی خشیت اختیار کرنے والے ہوا کرتے ہیں۔''

کیونکہ جب رب کریم کی ذات اور اس کے اسماء وصفات کی معرفت سے سرشار ہو جاتے ہیں تو خود بخود ان کے اعضاء و جوارح پر خوف الٰہی کا اثر نمایاں ہونا شروع ہو جاتا ہے پھر اس کے بعد ان کے دلوں پر معرفت الٰہی کا فیضان شروع ہونے لگتا ہے۔ اس کے بعد ان اعمال جلیلہ کی انجام دہی کی وجہ سے ان کے اعضاء و جوارح پر اس کی اثر پذیری نمایاں طور پر نظر آنے لگتی ہے۔

یہاں پر عذاب الٰہی اور سزائے اخروی یا جزا و سزائے الٰہی کی کسر شان مقصود نہیں ہے اور نہ اس کی اہمیت اور قدر و منزلت کی حقارت مقصود ہے بلکہ مذکورہ دونوں میں سے ایک مقام کی دوسرے مقام پر افضل اور برتر ہونے کی وضاحت پیش نظر ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے عذاب سے محفوظ و مامون رکھے اور ہمیں خوف کی دولت عطا فرما کر سعادت مندی کی توفیق عطا فرمائے۔

خوف کے مراتب و درجات

خوف کی متعدد انواع واقسام ہیں۔ ان میں سے بعض محمود ہیں اور بعض مذموم، بعض شرعاً جائز اور مطلوب ہیں اور بعض ناجائز وممنوع ہیں۔ اسی لیے مومن کے لیے ضروری ہے کہ

وہ خوف کی انواع واقسام کی معرفت حاصل کرے تا کہ اللہ کی عبادت، گمراہی اور جہالت و نادانی سے دور رہتے ہوئے بربنائے علم وبصیرت انجام دے سکے۔ خوف کی انواع واقسام درج ذیل ہیں:

ا۔ خوف کی پہلی قسم ''خوف واجب'' کی ہے:

خوف کی یہ وہ قسم ہے جو واجبات کی انجام دہی اور محرمات سے اجتناب کے لیے آمادہ کرنے میں مددومعاون ثابت ہوتی ہے بشرطیکہ بندے کے اندر اس بات کا یقین پایا جاتا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے جس کام کرنے کا حکم دیا ہے اگر اس کی بجا آوری چھوڑ دی تو اللہ تعالیٰ سزا دے گا اور جن امور کے ارتکاب سے اللہ تعالیٰ نے روکا یا منع کیا ہے اگر بندہ اس کو کرتا ہے تو اس کا محاسبہ ہوگا۔

اس قسم کا خوف ہر مسلمان بندے پر واجب ہے۔ ایک مسلمان شخص کو بحیثیت مسلمان اس سے آراستہ وپیراستہ ہونا چاہئے تا کہ یہ خوف اس کو جنت کی طرف رواں دواں رکھے اور جہنم سے دور لے جا کر حفاظت وسلامتی کے ساحل سے ہم کنار کرے۔

۲۔ خوف کی دوسری قسم ''خوف مستحب یا مندوب'' کی ہے:

خوف مستحب ہر اس خوف کو کہتے ہیں جو خوف واجب کی تجویز کی ہوئی مقدار سے زائد ہو اور خوف ممنوع کی مقرر کی ہوئی حدود تک اس کی رسائی نہ ہوئی ہے۔ یہی وہ خوف ہے جو بندۂ مسلم کو مستحبات کی انجام دہی کے لیے آمادہ کرتا ہے اور مکروہات ومشتبہات سے دور لے جاتا ہے۔

خوف کی یہی وہ مرغوب قسم ہے جس نے صالحین اور اولیاء اللہ کو قیام سحر کا عادی بنایا ہے اور سخت گرمی میں روزہ رکھنے پر آمادہ کیا ہے جس کی وجہ سے انہوں نے اللہ کی راہ میں صدقہ وخیرات کرنا اپنا شیوۂ زندگی بنایا اور اللہ کی راہ میں جان کی بازی لگا دینا ان کے لیے آسان ہوگیا۔ اللہ کی اطاعت وبندگی کے پیش نظر نوافل کی ادائیگی کے لیے کمربستہ رہنا ان کی عادت بن گئی اور ذرہ سے بھی زیادہ باریک قسم کے مکروہات سے اجتناب ان کا طرۂ امتیاز بن گیا اور

بھی اس قسم کے اعمال صالحہ ہیں جس کی انجام دہی کی بنیاد رب جبار وقہار کا خوف ہے۔ اللہ والے اسی کی بنیاد پر اس کی انجام دہی کے عادی بنے۔

احادیث شریفہ کے ذخیرہ میں بہت سی احادیث اس نوعیت کی پائی جاتی ہیں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے اس خوف پر دلالت کرتی ہیں جو واجب کے علاوہ دوسری نوعیت کے خوف کی طرف غمازی کرتی ہیں، جس سے صحابہ کرام متصف تھے۔ ہم یہاں پر ان میں سے چند احادیث کا تذکرہ کریں گے۔ ہوسکتا ہے وہ ہمارے لیے نمونہ بن کر نجات کا بہانہ بن جائیں۔

سیدنا عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ ''ایک دن ہمارے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعظ وارشاد کی غرض سے کھڑے ہوئے اور بڑا ہی فصیح و بلیغ وعظ فرمایا۔ جس سے دل سہم گئے اور آنکھیں ڈبڈبانے لگیں تو کسی نے سوال کیا: اے اللہ کے رسول! آپ نے ہمیں کسی رخصت ہونے والے یا دنیا کو داغ مفارقت دینے والے کی طرح نصیحت کی ہے تو ہم سے عہد و پیمان یا قول و قرار بھی لے لیں۔'' [1]

سیّدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن سورج کے رو بہ زوال ہوتے ہی گھر سے باہر نکل پڑے اور نماز ظہر ادا فرمائی اور قیامت کا تذکرہ فرمایا اور فرمایا کہ قیامت کے موقع پر بڑے بڑے واقعات رونما ہوں گے پھر فرمایا کہ جو شخص کسی مسئلہ کے بارے میں دریافت کرنا چاہتا ہے تو وہ ضرور دریافت کرے اور ہم سے اسی موضوع کے بارے میں دریافت کرو جس کی بابت میں نے تم کو آگاہ کیا ہے۔ جب تک میں اپنی اس نشست میں موجود ہوں، تو لوگوں پر گریہ طاری ہوگیا اور لوگ رونے لگے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برابر یہی کہتے رہے مجھ سے سوال کرو اور پوچھو!، تو حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: اے اللہ کے رسول! مجھے بتلایئے کہ میرے باپ کون ہیں؟ ان کی نسبت ان کے باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف کی جاتی تھی، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا:

[1] ابوداؤد، کتاب السنة، باب فی لزوم السنة: ٤٦٠٧ ۔ ابن ماجة: ٤٢ واللفظ له، وصححه الألبانی.

''تمہارے باپ حذافہ ہیں۔'' یا یں طور ان کے نسب کا اثبات بذریعہ وحی ہو گیا۔ اس کے بعد مزید فرمانے لگے کہ ''مجھ سے پوچھو اور سوال کرو'' تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ دوزانو بیٹھ گئے اور عرض کیا کہ ''ہم اللہ سے راضی ہو گئے بحیثیت رب کے اور دین اسلام سے بحیثیت دین و مذہب کے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے بحیثیت نبی اور رسول ہونے کے۔ یہ سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چپ ہو گئے'' پھر ارشاد فرمایا کہ ''ابھی ابھی اس دیوار کے پیچھے مجھے جنت اور دوزخ کا نظارہ کروایا گیا۔ میں نے ان دونوں کے مثل خیر اور شر کا کبھی نظارہ نہیں کیا۔''[1]

امام ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''مقربین بارگاہ الٰہی کا خوف بھی اپنی نوعیت کا شدید ترین خوف ہوتا ہے کیونکہ ان سے اس چیز کا مطالبہ کیا جاتا ہے جس کا عوام الناس سے مطالبہ نہیں کیا جاسکتا تو وہ اس مرتبہ ومقام کی رعایت کرتے ہوئے مطالبہ کو پورا کرتے ہیں کیونکہ اس مرتبہ تک رسائی کی وجہ سے ان پر اللہ کا شکر ادا کرنا واجب ہوتا ہے تو وہ اس نعمت عظمیٰ کی وجہ وہ اللہ عزوجل کا شکر بجالاتے ہیں تو ان کی قدر ومنزلت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور ان کا مقام ومرتبہ بلند سے بلندتر ہوتا چلا جاتا ہے۔''[2]

۳۔ خوف کی تیسری قسم ''خوف قاصر'' کی ہے:

یہ وہ خوف ہے جو پند ونصائح سننے یا قرآن کریم کی کوئی آیت تلاوت کرنے یا احادیث نبویہ میں سے کسی حدیث کا مطالعہ کرنے کی وجہ سے انسان کے اوپر وقتی طور پر طاری ہوتا ہے۔ اس کا اثر دیرپا نہیں ہوتا اور نہ ہی خوف وخشیت کی اثر پذیری کا وہ مقصد اس سے پورا ہوتا ہے جو کہ مطلوب ہے اور نہ ہی اس کے ذریعے خاطر خواہ نتائج تک رسائی ہوسکتی ہے۔ چنانچہ جوں ہی پند ونصائح کی مجلس برخواست ہوتی ہے یا انسان نماز کی حالت سے باہر آتا ہے کہ پھر وہی اعمال فاسدہ کی انجام وہی اور شرور وفتن والی حرکتیں شروع ہوجاتی ہیں اور وہ اپنی

---

[1] صحیح بخاری، کتاب مواقیت الصلاۃ، باب وقت الظهر عند الزوال: ٥٤٠ـ صحیح مسلم: ٢٣٥٩.

[2] فتح الباری: ٣١٣/١١.

سابقہ حالت پر واپس آ جاتا ہے، گویا کہ اس نے پند ونصائح کی مجلس میں کچھ سنا ہی نہیں یا ایک کان سے سنا اور دوسرے کان سے نکال دیا اور گویہ وہ شخص نہیں تھوڑی دیر قبل پند ونصائح سے متاثر ہو کر جس کی آنکھیں خوف خدا اور عذاب الٰہی کی ہولناکی سے ابل پڑی تھیں۔

خوف کے فائدے کا ظہور، اس کے ثمرات اور نتائج کے حصول پر منحصر ہوا کرتا ہے اور خوف الٰہی کا فائدہ سرزد شدہ گناہوں پر ندامت وپشیمانی اور گناہوں سے توبہ وکنارہ کشی میں مضمر ہے۔ یہی وہ فوائد ہیں جو خوف خداوندی میں پنہاں ہیں۔

ایسا انسان جس پر وقتی طور پر خوف طاری ہوتا ہے اس سے بڑی امیدیں وابستہ ہوا کرتی ہیں بشرطیکہ ایسا شخص پختہ عزم سے کام لے کر پختہ عہد کرے اور نیت میں اخلاص پیدا کرے تو پھر وقتی خوف اس کو حقیقی خوف تک رسائی کا ذریعہ ثابت ہوگا اور اس طرح اس کی اس خوف تک رسائی ہو جائے گی جو نیکی وبھلائی اور کار خیر کے لیے مدد ومعاون ہے۔

۴۔ حرام قرار دیا ہوا خوف یا مذموم خوف:

خوف کی ایک قسم وہ بھی ہے نہ تو شرعاً اس کو قابل تعریف سمجھا گیا ہے اور نہ عقلاً اس کی انجام دہی قابل تعریف ہے۔ وہ حد سے زیادہ ڈرتا اور خوف کھاتا ہے جو کہ انسان کو بیکار بنا کر اللہ کی بندگی اور اطاعت سے روگردانی پر آمادہ کرتا ہے۔

بعض لوگ اللہ کی طرف سے دی گئی دھمکی کی شدت اور اللہ کے عذاب جہنم کی ہولناکی اور اس کے عذاب کی سختی سن کر مایوسی اور دل شکنی کا شکار ہو جاتے ہیں اور اپنے دل میں یہ ہوّا بٹھا لیتے ہیں کہ اب چاہے جتنے بھی نیک اعمال کر ڈالیں جہنم کے عذاب سے نجات ملنا مشکل ہے۔ اس مایوسی کا شکار ہو کر وہ عمل صالح کرنا ترک کر دیتے ہیں کیونکہ ان کے بقول ''اب اعمال صالحہ کی انجام دہی سے کیا فائدہ؟''

اس قسم کے خوف کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے اور علمائے کرام کا اس کی حرمت پر متفقہ فیصلہ ہے کیونکہ یہ حرکت خوف کے مقصود ومطلوب کے منافی ہے نیز خشیت الٰہی کے لیے جو خطوط استوار کیے گئے ہیں۔ یہ حرکت بندے کو ان کی الٹی راہ پر گامزن کرنے کا پیش خیمہ

ہے۔ اس سے جنت کی روشن اور تابناک شاہراہ تک رسائی ناممکن ہے اور یہ حرکت کرنے والا شخص اعمال خیر کی انجام دہی کی طرف رواں دواں نہیں ہوسکتا، بلکہ یہ تو ہدف مطلوب تک رسائی کی راہ میں رکاوٹ ہے اور اس قسم کے خوف سے متصف انسان کو یہ خوف جہنم کی دہکتی ہوئی آگ میں بے دریغ جھونک دینے کا ذریعہ ہے۔

خوف خدا کے فوائد وثمرات

ہر وہ عبادت جسے اللہ تعالیٰ نے بندوں پر فرض کیا ہے اس کے دنیوی اور اُخروی فوائد و ثمرات ہیں۔ خوف الٰہی بھی اسی قبیل کی عبادات میں سے ایک عبادت الٰہیہ ہے جس کے متعدد ثمرات اور فوائد ہیں اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جو شخص کسی چیز کے ثمرات اور فوائد سے جتنا واقف ہوگا اتنی ہی اس میں اس کی دلچسپی بڑھتی چلی جائے گی۔ اس لیے آیئے خوف خدا کے فوائد وثمرات پر ایک نظر ڈال کر اس سے مطلع ہونے کی کوشش کریں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے خوف کے فوائد میں سب سے پہلے دُنیاوی فوائد وثمرات کو بیان کیا جاتا ہے، جو مندرجہ ذیل ہیں:

بندے کا اخلاص کی طرف رجحان بڑھ جاتا ہے:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ۝٩ إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا ۝١٠﴾ (الانسان: ۹، ۱۰)

''ہم تو تمہیں صرف اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لیے کھلاتے ہیں نہ تو تم سے بدلہ چاہتے ہیں اور نہ ہی شکر گزاری، بے شک ہم اپنے پروردگار سے اس دن کا خوف کرتے ہیں یا اس دن سے ڈرتے ہیں جو اداسی اور سختی والا ہوگا (مراد ہم اس دن سے ڈرتے ہیں جو نہایت سخت ہوگا اور سختیوں وہولناکیوں کی وجہ سے کافروں پر لمبا ہوگا۔)''

کیا انہوں نے لوگوں کو اس لیے کھانا کھلایا کہ دنیا میں فوری طور پر اس کا بدلہ حاصل کر کے سرخرو ہو جائیں یا عمل صالح کی انجام دہی اس لیے کی کہ لوگوں کی واہ واہ مل جائے اور لوگوں کی نظروں میں وقعت کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگیں اور لوگ ان کی تعریف کے ترانے گانے لگیں۔ نہیں ایسا نہیں! بلکہ انہوں نے اس کار خیر کی انجام دہی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے خوف اور خشیت کی وجہ سے کی اور اس سخت دن کی ہولناکی کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کار خیر انجام دیا جو بڑا ہی ڈراؤنا، ہیبت ناک، بھیانک اور خوفناک ہوگا اور اس دن کا معاملہ بڑا عجیب وغریب ہوگا۔

خوف الٰہی بندے کو اعمال صالحہ کی انجام دہی کے لیے ابھارتا ہے:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَ يُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ ﴿٣٦﴾ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَ الْاَبْصَارُ ﴿٣٧﴾﴾ (النور: ٣٦، ٣٧)

''اور ان گھروں کو بلند کرنے اور جن میں اپنے نام کی یاد کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے [مراد مسجدیں] وہاں صبح وشام (اہل ایمان) اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔ ایسے لوگ جنہیں تجارت اور خرید وفروخت اللہ کے ذکر سے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کرتی اس دن سے ڈرتے ہیں جس دن بہت سے دل اور بہت سی آنکھیں الٹ پلٹ ہو جائیں گی۔''

چنانچہ یہ اعمال صالحہ نماز کا قیام، زکوٰۃ کی ادائیگی اور تسبیح وتحمید وغیرہ کی انجام دہی کا داعیہ پیدا کرنے کا ذریعہ قیامت کے دن کا خوف اور ڈر ہے۔ اسی لیے سیّدنا ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جس شخص نے خوف اختیار کیا وہ صبح سویرے سفر کے لیے نکل پڑا اور جو سفر کی

راہ پر چل پڑے وہ منزل تک رسائی پا کر رہے گا اور یاد رکھو! اللہ سے سودے بازی بڑی قیمتی ہے اور اللہ کا سودا جنت ہے۔''[1]

اس حدیث میں (أدلــج) کا لفظ وارد ہوا ہے۔ اس سے مراد صبح سویرے سفر کرنا ہے۔ اس کلمہ کا مقصد پوری توانائی صرف کر کے سفر کی منازل طے کرنا ہے۔[2]

حدیث کے معنی یہ ہیں کہ جس شخص نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا خوف اختیار کیا اور اس کے عذاب کی ہولناکی کو مدنظر رکھا اور اعمال صالحہ کی انجام دہی خوف الٰہی کے پیش نظر اس کی سعی پیہم کا محور بن گئی اور جس شخص نے اعمال صالحہ کی ادائیگی میں محنت و جانفشانی سے کام لیا وہ منزل مقصود تک رسائی پانے میں کامیاب ہوگیا اور وہ منزل مقصود جنت ہے۔

خوف الٰہی سے گناہوں کی رنگینیاں ماند اور سرور و کیف مکدر ہو جاتا ہے:

امام ابن قدامہ حنبلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''خوف الٰہی کے ثمرات اور فوائد میں یہ بھی ہے کہ خوف خدا شہوات کا قلع قمع کر ڈالتا ہے اور گناہوں کی لذتوں کو بدمزہ کر دیتا ہے۔ چنانچہ اللہ سے ڈرنے اور خوف کھانے والوں کی نگاہوں میں پسندیدہ گناہ بھی مکروہ اور بدمزہ ہو جاتے ہیں۔''[3]

اس اقتباس کی وجہ سے کوئی شخص یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ مباح چیزوں کی لذتوں اور مسرتوں کو مکدر کر کے رکھ دیا جائے، نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو سید الخائفین تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں پائی جانے والی مباح چیزوں سے محظوظ ہوا کرتے تھے۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ ''تمہارے دنیاوی مال و متاع میں میرے نزدیک عورت اور خوشبو پسندیدہ ہے۔''[4]

---

[1] ترمذی، کتاب صفة القيامة، باب ما جاء في صفة أواني الحوض: ۲۴۵۰۔ وصححه الحاكم في المستدرك و وافقه الذهبي.
[2] فيض القدير: ۱۲۳/٦.
[3] مختصر منهاج القاصدين: ٦٣/٤.
[4] نسائی، كتاب المزارعة، باب ذكر الاحاديث المختلفة: ۳۹۳۹ وصححه الحاكم و وافقه الذهبي۔

بلکہ یہاں پر خوف الٰہی کی بنیاد پر حرام قسم کی خرمستیاں اور ناجائز عیش وطرب کے ساز و سامان سے محظوظ ہونے کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔

حرام قسم کی لذتوں اور مستیوں سے اجتناب کی کیا شکل ہوسکتی ہے؟اور کس طریقہ سے حرام چیزوں کی رنگینیوں کو اپنی نظروں سے گرایا جاسکتا ہے؟

شرعاً حرام قرار دی گئی چیزوں کے سرور وکیف کو اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اس کے وعد وعید کے استحضار کے ذریعہ مکدر کیا جاسکتا ہے چنانچہ ایک زانی اور زانیہ یوم آخرت کو زانیوں کو جو عذاب دیا جائے گا اس کی یاد تازہ کرلیں اور اس لہو اور پیپ کے بارے میں تصور کریں جو ان کے جسم سے اس دن بہہ رہا ہوگا اور زانی لوگ اس پیپ اور لہو کو پی کر اپنی پیاس بجھائیں گے۔ یہ تو یوم آخرت کی بات ہے اگر ان کو قبر کے عذاب کا پتہ چل جائے جو انہیں قبر میں ملنے والا ہے تو یہ حرام کی خرمستیاں مکدر ہو کر رہ جائیں اور عیش وعشرت کی ساری دھماں چوکڑیاں وہ بھول جائیں اور بدکاری وفحش کاری کا مزہ مکدر اور بدمزہ ہو جائے۔

شراب نوشی کرنے والے کو اگر اس بات کا علم ہو جائے کہ اگر اس نے دنیا میں شراب نوشی کی تو جنت کی شراب طہور کا جام پینے سے محرومیت کا سامنا کرنا پڑے گا تو دنیا کی گندی اور سڑی بدبودار شراب پینے کی طرف اس کی طبیعت راغب نہ ہو اور اس بدبودار اور سڑی شراب کو وہ منہ لگانا گوارا نہ کرے۔

اس کے بعد امام ابن قدامہ حنبلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ”جیسے کہ شہد اس شخص کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہوجاتا ہے جس کو اس بات کا پتہ چل جائے کہ اس میں زہر ملا ہوا ہے یہ بات سنتے ہی مارے خوف کے شہد نوشی کی خواہش سرے سے ختم ہوجاتی ہے اور اعضا وجوارح میں شائستگی پیدا ہوجاتی ہے، دل ودماغ کو تسکین ہوجاتی ہے۔ تکبر اور غرور خود بخود اس خبر کو سن کر چلتا بنتا ہے اور خوف کی وجہ سے پورے طور پر اس کو یہی فکر لاحق رہتی ہے اور اس کے انجام کار کے خطرے کی طرف اس کی نگاہ لگی رہتی ہے۔ اب اس کی نیند حرام ہوجاتی

ہے۔ اس کی توجہ کسی اور طرف نہیں ہٹتی ہے۔ اب اس کا اہم ترین مشغلہ یہی خبر بن جاتی ہے۔ اسی کی سوچ بچار، اسی کا غور و خوض، اسی کے تصور اور جانچ پڑتال اور حساب و شمار اور اسی خبر کی تحقیق وجد وجہد میں سانسیں گھٹنے لگتی ہیں اور پھر وہ خطرات کے موقع پر یا کسی عمل کے اقدام کے وقت یا زبان سے الفاظ نکالتے وقت پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے۔ اس کا حال اس شخص کی طرح ہو جاتا ہے جو چیر پھاڑ کھانے والے درندوں کے چنگل میں پھنس گیا ہو۔ اس کا کچھ پتہ نہ ہو کہ آیا اسے مہلت ملے گی تا کہ ان کے چنگل سے نکل بھاگے یا اس پر وہ درندے حملہ کر کے اسے چیر پھاڑ ڈالیں گے؟ اس کے ذہن اور دماغ میں وہی بات گردش کرتی رہتی ہے جس صورتحال سے وہ دوچار ہے۔

جتنا خوف الٰہی دل میں جاگزیں ہوگا اسی کے بمقدار حضوری دل سے اللہ کا دھیان اور محاسبہ نفس کی کیفیت میں تقویت پیدا ہوتی چلی جائے گی اور اللہ تعالیٰ کی جلالت شان اور اس کی صفات کا جتنا زیادہ خیال ہوگا اتنا ہی خوف الٰہی رنگ لاتا چلا جائے گا اور جتنا اپنے نفس کے عیوب و نقائص اور اس کے ارد گرد جو خطرات اور ہولناک آفتیں منڈلا رہی ہیں اس کا استحضار ہوگا اتنا ہی خوف الٰہی کا رشتہ مستحکم ہوتا چلا جائے گا۔'' [1]

خوف الٰہی سے سرشاروں کو اللہ کی طرف سے ثنا خوانی کے حصول کی بشارت:

اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرب ترین بندوں کی محض خوف الٰہی سے متصف ہونے کی وجہ سے مدح سرائی کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَ وَهَبْنَا لَهُ يَحْيٰى وَ اَصْلَحْنَا لَهُ زَوْجَهُ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا وَ كَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ۝﴾

(الانبیاء: ۹۰)

[1] مختصر منهاج القاصدين: ٤/٦٣.

''تو ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اسے یحییٰ عطا کیا اور اس کی بیوی کو اس کے لیے درست کر دیا، بے شک وہ نیکیوں میں جلدی کرتے تھے اور ہمیں رغبت اور خوف سے پکارتے تھے اور وہ ہمارے ہی لیے عاجزی کرنے والے تھے۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے مومنین کی ان کے عذاب الٰہی سے خوف اور ڈر کی کیفیت سے متصف ہونے کی بنیاد پر وصف بیانی کرتے ہوئے تعریف کی ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِينَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُونَ ۝ إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ ۝﴾ (المعارج: ۲۷، ۲۸)

''اور یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں۔ بلاشبہ ان کے رب کا عذاب بے خوف ہونے کی چیز نہیں۔''

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿أَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ اللَّيْلِ سَاجِدًا وَقَائِمًا يَحْذَرُ الْآخِرَةَ وَيَرْجُو رَحْمَةَ رَبِّهِ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ﴾ (الزمر: ۹)

''بھلا جو شخص راتوں کے اوقات سجدے اور قیام کی حالت میں (مراد عبادت میں) گزارتا ہو، آخرت سے ڈرتا ہو اور اپنے رب کی رحمت کی امید رکھتا ہو (اور جو اس کے برعکس ہو) برابر ہو سکتے ہیں (آپ کہہ دیجیے) ذرا بتاؤ تو علم والے اور بے علم برابر ہو سکتے ہیں، یقیناً نصیحت وہی حاصل کرتے ہیں جو عقل و دانش سے بہرہ ور ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے عقل مندوں اور دانش مندوں کی تعریف کی ہے اور ان کی وصف بیانی کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

''عقل و دانش سے بہرہ ور لوگ خوف الٰہی کی حقیقت سے آشنا ہوا کرتے ہیں۔''

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَفَمَنْ یَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰی ؕ اِنَّمَا یَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا یَنْقُضُوْنَ الْمِیْثَاقَ ۝ وَالَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ وَیَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَیَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ۝﴾ (الرعد: ۱۹، ۲۱)

''کیا وہ شخص جو اس بات کا علم رکھتا ہو کہ جو آپ کی طرف آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے وہ مبنی برحق ہے۔ اس شخص جیسا ہو سکتا ہے جو اندھا ہو نصیحت پر وہی لوگ کان دھرتے ہیں جو عقل ودانش سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ جو اللہ کے عہد وپیمان کو پورا کرتے ہیں اور قول وقرار کو توڑتے نہیں ہیں۔ اور اللہ نے جن رشتوں کو جوڑنے کا حکم دیا ہے وہ اس کو (صلہ رحمی) کی بنیاد پر جوڑتے ہیں اور اپنے پروردگار سے ڈرتے اور خوف کھاتے ہیں اور حساب وکتاب کی سختی کا اندیشہ رکھتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کے خوف کا مطلب یہ ہے کہ ڈرنے والا شخص عقل مند اور دانش والا ہے، اور اس کی بنیاد پر اسے عقلمندوں میں شمار کیا جاتا ہے گویا کہ خوف الٰہی سے سرشار لوگ ہی سمجھ بوجھ رکھنے والے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی عقلیں دانشمندی اور دانشوری کی دولت سے مالا مال ہیں۔ انھیں پتہ ہے کہ کس سے ڈرا جائے اور کس سے نہ ڈرا جائے اور خوف خداوندی اختیار کرنے کے اسباب اور وسائل کے فہم وادراک سے ان کی عقلیں آشنا ہیں۔ وہ اس بات کی سمجھ بوجھ رکھنے والے ہیں کہ کہاں خوف کرنا چاہیے اور کہاں نہیں؟

خوف خداوندی کے فوائد وثمرات سے اللہ کی سرزمین پر غلبہ وقوت ملنا:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا ؕ فَاَوْحٰٓی اِلَیْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِیْنَ ۝ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِیْ وَخَافَ وَعِیْدِ ۝﴾

(ابراهیم: ۱۳، ۱۴)

''اور کافروں نے اپنے رسولوں سے کہا کہ ہم تمہیں ملک بدر کر دیں گے یا تم پھر سے ہمارے مذہب میں لوٹ آؤ، تو ان کے پروردگار نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ ہم ان ظالموں کو ہی غارت کر دیں گے اور ان کے بعد ہم خود تمہیں اس زمین پر بسائیں گے یہ ہے ان کے لیے جو میرے سامنے کھڑے ہونے کا ڈر رکھیں اور میری وعید سے خوف زدہ رہیں۔''

لہٰذا اللہ کا خوف ''تمکین فی الارض'' کا ذریعہ ہے اور دشمنوں پر قوت وغلبہ کا سبب ہے اور ان کی ملکیت و اراضی کے بطور وراثت حصول کا وسیلہ اور ذریعہ ہے۔

خوف الٰہی ہر قسم کی مصیبت سے نجات کا ذریعہ ہے:

سیّدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''تین چیزیں نجات سے ہم کنار کرنے کا ذریعہ ہیں۔ ایک تو خفیہ یا علانیہ طور پر اللہ کا خوف اور اس کی خشیت، دوسرے کیف وسرور یا غیظ وغضب دونوں کیفیتوں میں عدل وانصاف سے کام لینا اور تیسرے مالداری اور فقر دونوں حالتوں میں میانہ روی اختیار کرنا۔'' [1]

یہی وہ خوف ہے جو بندے کی حفاظت اور سلامتی کا ضامن ہے اور اسے ہر قسم کی مصیبت سے نجات سے ہم کنار کرنے کا سبب اور ذریعہ ہے اور حدیث مذکور میں نجات کا لفظ بغیر کسی قید کے استعمال ہوا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے مراد دنیا و آخرت کی نجات اور کامیابی و کامرانی ہے کیونکہ یہ اپنے عموم پر دلالت کر رہی ہے۔ یہ تو خوف الٰہی کے فوری فوائد کا بیان تھا اب اس کے اُخروی فوائد کا بیان پیش خدمت ہے:

عرش الٰہی کے سایہ سے محظوظ ہونے کی سعادت کا حصول:

اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں ان سات آدمیوں کا صراحتاً ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ

[1] رواہ البیہقی فی شعب الأیمان: ۷۲۵۲ وحسنہ الألبانی.

اس دن جس دن اس کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا اپنے عرش کے سایہ میں جگہ دے گا۔ اس حدیث میں یہ وضاحت موجود ہے کہ ''وہ شخص جس کو بڑے مرتبہ اور عالی منصب نیز حسن و جمال کا پیکر عورت دعوتِ گناہ دے مگر وہ یہ کہہ کر کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اس کی پیش کش ردّ کر دے۔'' (1) مراد یہ ہے کہ اللہ کا خوف اس عورت کے ساتھ بدکاری کرنے سے روک دے۔ یہی وہ خوف الٰہی ہے جو اس کے لیے اللہ کے عرش کے سایہ تلے پناہ لینے کا سبب بن جائے گا خصوصاً اس موقعہ سے اس کو عرش الٰہی کے سایہ میں جگہ ملے گی جبکہ سورج لوگوں کے سروں پر ایک میل کے فاصلہ پر منڈلا رہا ہوگا اور لوگ اس کی شدت حرارت سے پسینہ میں غرق ہوں گے!

اس شخص کا اس عورت سے یہ کہنا کہ ''میں اللہ سے ڈرتا ہوں'' اس حدیث کا ظاہری سیاق یہ بتلا رہا ہے کہ اس شخص نے اپنی زبان سے یہ بات کہی ہے تاکہ اس عورت کو فحش کاری کے ارادے سے باز رکھ سکے اور اپنے نفس کو اللہ کے خوف کی یاد دہانی کروا کر اپنے موقف اور ارادے کی پختگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ اپنے عزم مصمم کو منظر عام پر لائے اور ان مبادی واصول کے اعلان کے بعد الٹے پاؤں پسپائی اختیار نہ کرے۔

اسی طرح ان سات اشخاص میں اس شخص کا بھی تذکرہ ہے کہ ''جس نے خلوت میں اللہ کو یاد کیا ہو اور اس کی آنکھوں سے مارے خوف اور خشیت کے سیل رواں جاری ہو جائے'' تو اس بندے کی خوف الٰہی کی یہ کیفیت جس نے اس کی آنکھوں کو بہنے پر مجبور کر دیا اور اس سے جاری آنسوؤں کی بارش قیامت کے دن عرش الٰہی کے سایہ عاطفت میں جگہ فراہم کرنے کا ذریعہ بنے گی۔

قیامت کے دن کی خوفناکی سے نجات:

سیّدنا ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث قدسی بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا:

(1) صحیح بخاری، کتاب الأذان، باب من جلس فی المسجد: ٦٦٠۔ صحیح مسلم: ١٠٣١.

"میری عزت و کبریائی کی قسم! میں اپنے بندے کے اوپر دو خوف اور دو قسم کے امن کو جمع نہیں کروں گا۔ اگر وہ دنیا میں مجھ سے خوف کھاتا اور ڈرتا رہا تو میں قیامت کے دن اس کو امن و امان دے کر چین اور سکون کی سعادت سے بہرہ ور کروں گا اور اگر دنیا میں اس نے میرے خوف اور ڈر کی پرواہ نہ کی اور مجھ سے دنیاوی امن اور سکون مانگ کر محظوظ ہوتا رہا تو قیامت کے دن میں اسے خوف سے دوچار کروں گا۔"❶

جہنم کی آگ سے نجات:

سیدنا ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"وہ شخص جہنم میں داخل نہیں ہوسکتا جو اللہ کی خشیت اور اس کے ڈر کے مارے رو پڑا ہو یہاں تک دودھ اپنے تھن میں واپس لوٹ جائے۔"❷

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے:

"دو آنکھیں ایسی ہیں جن کو جہنم کی آگ چھو نہیں سکتی ایک تو وہ آنکھ جس سے اللہ کی خشیت میں آنسو جاری ہوگئے ہوں اور دوسری وہ آنکھ جس نے اللہ کے راستہ میں پہرہ داری کرتے ہوئے شب بیداری کی ہے۔"❸

اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کا حصول:

سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں:

"گزشتہ زمانے میں ایک شخص تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو مال و دولت سے نوازا تھا

---

❶ صحیح ابن حبان: ٦٤٠ وحسنه شعيب الأرنووط.

❷ ترمذی، كتاب فضائل الجهاد، باب ما جاء في فضل الخيار في سبيل الله: ١٦٣٣ وقال: حسن صحيح.

❸ ترمذی، كتاب فضل الجهاد، باب ما جاء في فضل الحرس في سبيل الله: ١٦٣٩ وصححه الألباني

چنانچہ جب اس کی موت کا وقت قریب آیا تو اس نے اپنے بیٹوں کو وصیت کرتے ہوئے کہا کہ مجھے بتلاؤ بطور باپ میرا تم لوگوں سے کیسا سلوک تھا؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ آپ نے ایک اچھے باپ ہونے کا حق ادا کر دیا۔ اس شخص نے جواب دیا کہ میں نے زندگی میں کوئی بھلائی کا کام نہیں کیا اس لیے جب میں مر جاؤں تو تم لوگ میری لاش کو جلا دینا اور اسے راکھ بنا دینا پھر تیز ہوا میں اسے اڑا دینا۔ اس شخص کے بیٹوں نے باپ کی وصیت کے مطابق اس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے ذرّہ ذرّہ کو جمع کیا اور اس سے پوچھا کہ تم کو اس حرکت کی انجام دہی کے لیے کس چیز نے آمادہ کیا؟ اس شخص نے جواب دیا: محض تیرے خوف کی وجہ سے میں نے ایسا کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ رحم وکرم کا معاملہ فرمایا۔'' ❶

اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا حصول:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۝ ﴾

(البينة : ٨)

''اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا اور یہ لوگ اس سے راضی ہو گئے یہ (رتبہ بلند) اس شخص کے لیے ہے جو اپنے پروردگار سے ڈرے اور خوف کھائے۔''

آیت کریمہ اس بات کی غمازی کر رہی ہے کہ اللہ کی رضامندی اور خوشنودی انہی لوگوں کو حاصل ہوگی جن کا تذکرہ سورئہ بینة میں گزر چکا ہے یہ محض رب کریم سے ان کے خوف کھانے اور ڈرتے رہنے کی وجہ ان کو حاصل ہوگی۔

جنت میں داخلہ:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

❶ صحيح بخاری ، كتاب احاديث الأنبياء : ٣٤٧٨.

﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّتٰنِ ﴿۴۶﴾﴾ (الرحمن: ٤٦)

''جو شخص اپنے رب کریم کے سامنے کھڑے (ہوکر رتی رتی حساب) دینے سے ڈرا (اس کے لیے) دو جنتیں ہیں۔''

امام ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ہر چیز کی سعادت مندی کے حصول کی طلب اور جستجو اس بارے میں اعانت کرنے میں پنہاں ہے۔ جتنی زیادہ جستجو اور طلب ہوگی اسی کے بقدر سعادت مندی ملتی چلی جائے گی اور وہ سعادت مندی اللہ تعالیٰ سے ملاقات اور اس سے قربت ہے۔ لہٰذا وہ چیز جو اس راہ میں مدد و معاون ثابت ہو وہ باعث فضیلت اور باعث شرف ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

''جو شخص اپنے رب کریم کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرے، اس کے لیے دو جنتیں ہیں۔'' [1]

آنکھوں کی ٹھنڈک اور سامانِ آسائش جنت نعیم میں موجود ہے:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ۫ وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۱۶﴾ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۷﴾﴾ (السجدة: ١٦، ١٧)

''ان کی کروٹیں اپنے بستروں سے الگ رہتی ہیں۔ وہ اپنے رب کو خوف اور اُمید کے ساتھ پکارتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں دے رکھا ہے وہ اس میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ بھی کرتے ہیں۔ اور کوئی نفس نہیں جانتا جو کچھ ہم نے ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک ان کے لیے پوشیدہ کر رکھی ہے ان اعمال خیر کے بدلہ جو وہ کیا کرتے تھے۔''

---

[1] مختصر منهاج القاصدين: ٤/٦٥.

مومن میں خوف کا داعیہ پیدا کرنے والے اسباب

کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ بلاشبہ ہم نے گزشتہ صفحات میں شریعت اسلامیہ کی رُو سے خوف الٰہی کی قدر و منزلت سے آشنائی حاصل کرنے کے لیے اس کتابچہ کے ذریعے اس شخص کے لیے جسے خوف الٰہی کا استحضار نصیب ہو جائے دنیوی اور اُخروی ثمرات و فوائد سے متعارف ہونے کی سعادت حاصل کی ہے، لیکن ایک خلا باقی رہ گیا ہے وہ یہ کہ ابھی ہم اس نسخۂ کیمیا سے متعارف نہیں ہو سکے ہیں جس کے ذریعے ہم خوف وخشیت سے سرشار لوگوں کے قافلہ کی ہم رکابی کر سکیں۔ ہمارے اندر بھی خوف خدا اور خشیت الٰہی کا فیضان ہونے لگے جس کی وجہ سے ہم بھی اللہ سے حقیقی خشیت کی چاشنی حاصل کرنے لگیں اور اس میں لذت و سرور محسوس کرنے کا گر مل جائے۔

اس غرض کے پیش نظر ہم آپ کو یہ بھی بتلا دیں کہ خوف کا ملکہ پیدا کرنے کے لیے چند اسباب کا وجود ناگزیر ہے۔ اگر وہ اسباب انسان کو میسر ہو جائیں جو کہ خوف خداوندی کے حصول کی راہ میں مدد و معاون ہیں تو اس کا شمار بھی خائفین میں ہونے لگے۔ ہم یہاں پر انھیں اسباب و وسائل کا تذکرہ کرنے کی سعادت حاصل کریں گے، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

اللہ کی عظمت اور جلالت شان کی یاد دہانی:

خوف الٰہی کے حصول کی راہ میں مہمیز کا کام کرنے والے اسباب میں سے اہم ترین اللہ کی عظمت اور جلالت شان اور اس کی کبریائی کی یاد دہانی ہے۔ جب بندہ یہ بات سمجھنے لگے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات (عزیز) زبردست دباؤ والی، نگہبان (جبار) صاحب عظمت، غالب، زور آور (متکبر) شان کبریائی سے متصف بڑائی والی (قاھر) برتر اور غالب ہے۔ آسمانوں اور زمینوں یا بالفاظ دیگر پوری کائنات میں کوئی ایسی ہستی نہیں جو اس کو بے بس اور مجبور کر سکے یا اس کے حق تصرف میں رخنہ اندازی کی جرأت کرے۔ یہ رب کریم کی شان کریمی ہے کہ اس نے آسمانوں کو زمین پر گرنے سے روک رکھا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا

فضل وکرم شامل حال نہ ہوتو آسمان کو گرنے سے کون روک سکتا ہے؟ یہ ہمارے رب کریم کی شان کبریائی ہے کہ آسمان بغیر ستون کے ہمارے سروں پر کھڑا ہے۔ گر اللہ چاہے تو پل جھپکتے ہی آسمان وزمین بلکہ پوری کائنات کو ملیامیٹ اور برباد کردے۔

جو شخص اللہ کی عظمت شان کا اس زاویہ سے تدبر وتفکر کرے لامحالہ اس کے دل میں خشیت الٰہی اور خوف خداوندی کا جذبہ کروٹیں لینے لگے گا، کیونکہ اس پہلو سے تدبر وفکر مومن کو اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی عظمت اور کبریائی کی معرفت اور اس میں غور وخوض کے مقام تک پہنچا دے گا، اور جس شخص کے دل میں اللہ کی عظمت وکبریائی بس جائے تو اس کو خوف الٰہی اور خشیت الٰہی کا گر مل جاتا ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ﴾ (آل عمران : ٢٨)

''اور اللہ تعالیٰ بذات خود تمہیں اپنی ذات کا خوف دلا رہا اور ڈرا رہا ہے۔''

اللہ تعالیٰ اپنی عظمت شان کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَ الْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ السَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ﴾ (الزمر: ٦٧)

''اور جیسی قدر اللہ تعالیٰ کی کرنی چاہیے تھے ویسی قدر ان لوگوں نے نہیں کی۔ ساری زمین قیامت کے دن اس کی مٹھی میں ہوگی اور تمام آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے۔''

سیّدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ منبر پر کھڑے ہوکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت مذکورہ تلاوت فرمائی اور فرمایا:

''رب کریم اپنی ذات کی بنفس نفیس توصیف بیانی کررہا ہے اور فرما رہا ہے (أنا الجبار) مراد یہ کہ میں غالب اور زور آور اور صاحب عظمت ہوں (أنا المتکبر) میں بڑائی والا اور شان کبریائی سے متصف ہوں (أنا الملك) بادشاہت میری ہی ہے (أنا العزیز) میں غالب اور زبردست دباؤ والا

ہوں (أنا الکریم) میں سخی داتا ہوں، میری ذات معزز ومکرم ہے۔ اتنا سننا تھا کہ منبر نبوی پر رعشہ طاری ہوگیا اور زور زور سے ہلنے لگا یہاں تک کہ ہم لوگوں کو خدشہ ہوگیا کہ منبر نبوی رسول اللہ ﷺ کو لے کر، مارے خوف وخشیت کے زمین پر آ گرے گا۔'' [1]

سیّدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے ہوئے سنا اس حال میں کہ وہ منبر پر کھڑے تھے، فرما رہے تھے:

''قیامت کے دن رب کریم جس کی صفت جبار ہے آسمانوں اور زمینوں کو اپنی مٹھی میں لے لے گا، نبی کریم ﷺ نے مٹھی بند کر کے دکھلائی اور مٹھی کھولتے بند کرتے رہے، تاکہ لوگوں کو سمجھ آجائے کہ اللہ تعالیٰ کس طرح اپنی مٹھی میں آسمانوں اور زمینوں کو پکڑے گا اور کہے گا: میں جبار ہوں، میں زورآور اور صاحب عظمت ہوں، زمین پر بسنے والے جابر، قاہر، متکبر اور مغرور کہاں ہیں؟ ذرا سامنے آئیں، (اور نبی کریم ﷺ اثنائے خطبہ دائیں بائیں مخاطب ہو رہے تھے) راوی کہتے ہیں کہ'' میں نے منبر کی طرف دیکھا تو اس کا نچلا حصہ زور زور سے ہل رہا تھا حتی کہ مجھے خطرہ ہوا کہ منبر رسول اللہ ﷺ کو لے کر زمین پر ڈھیر ہوجائے گا۔'' [2]

سیّدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''ساتوں آسمانوں کی کرسی کے ساتھ ایسی ہی مثال ہے جیسے کہ دروازے کا کنڈا سنسان بیابان اور چٹیل میدان میں پڑا ہو اور عرش کو کرسی پر ٹھیک اس طرح فوقیت حاصل ہے جیسے کہ وسیع وعریض چٹیل میدان کو دروازے کے کنڈے پر حاصل ہے۔'' [3]

---

[1] احمد: ٥٤١٤ قال شعیب الأرناؤوط: أسناده صحیح علی شرط مسلم
[2] ابن ماجة، کتاب المقدمه، باب فیما أنکرت الجهمیة: ١٩٨ وصححه الألبانی رحمه اللّٰه.
[3] صحیح ابن حبان: ٣٦١ وصححه الألبانی رحمه اللّٰه.

مقربین فرشتے جو مخلوقات میں سب سے زیادہ معرفت الٰہی تک رسائی رکھتے ہیں وہ بھی اللہ کی ذات سے حد سے زیادہ ڈرتے اور خوف کھاتے ہیں کیونکہ ان پر اللہ کی جلالت شان اور اس کی عظمت وکبریائی کا ہر وقت فیضان رہتا ہے۔ اسی لیے ان کانوں میں اللہ کی آواز پڑتی ہے تو وہ مارے خوف اور خشیت کے سہم جاتے ہیں اور ان پر جتنا خوف طاری ہونا چاہیے اتنا خوف طاری ہو جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿حَتّٰۤی اِذَا فُزِّعَ عَنۡ قُلُوۡبِہِمۡ قَالُوۡا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّکُمۡ ؕ قَالُوا الۡحَقَّ ۚ﴾

(سبا: ۲۳)

''یہاں تک جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور کر دی جاتی ہے تو پوچھتے ہیں تمہارے پروردگار نے کیا فرمایا؟ جواب دیتے ہیں کہ حق فرمایا۔''

جب انسان خوف الٰہی اور خشیت خداوندی کے اس مرتبہ تک رسائی پا جاتا ہے تو اس کی بھی اس بلند وبالا مقام تک رسائی ہو جاتی ہے جو خائفین اور خاشعین کا طرۂ امتیاز ہے اور مقربین فرشتوں کا شعار ہے۔

کلام اللہ میں تدبر و تفکر خشیت الٰہی کا ذریعہ ہے:

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''بندے کے لیے دنیاوی اور اُخروی زندگی کی خاطر سودمند اور کامیابی وکامرانی سے قریب تر کرنے والی قرآن کریم میں تدبر و تفکر کرنے کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی اور کلام الٰہی کی آیات کے معانی ومقاصد کی طرف توجہ مرکوز کرنے سے زیادہ نفع بخش کوئی چیز نہیں، کیونکہ اس کے معانی ومفاہیم اپنے حسین وجمیل وعدوں کے آئینہ میں رب کریم تک رسائی کے بلند وبالا مقام کی طرف رواں رکھنے کے لیے بندے کو ابھارتے اور آمادہ کرتے رہتے ہیں اور اپنے ڈراؤنے انداز بیان کے ذریعہ وعید سنا کر بندے کو عذاب سے خوف دلاتے رہتے ہیں اور اس کو قیامت کے دن کی ملاقات کے لیے تیاری اور سفر آخرت کے لیے جی جان

سے لگے رہنے کی ترغیب دیتے ہیں۔“ ❶

امام ابن جوزی رحمہ اللہ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

”اللہ کی قسم اگر عقل ودانش سے بہرہ ور مومن بندہ سورۂ حدید، اور سورۂ حشر کی آخری آیات، اور آیت الکرسی اور وسورۂ اخلاص کی تلاوت کرے اور اس میں تدبر وتفکر سے کام لے اور اس کے معانی ومفاہیم پر غور وفکر کر کے اس کے اصل مقصد تک رسائی پا جائے تو خشیت الٰہی اور خوف خداوندی کے مارے اس کا دل پھٹ کر ریزہ ریزہ ہوجائے اور اس کی عقل اللہ کی عظمت شان کے تصور سے حیران اور دنگ ہو جائے۔“ ❷

کلام مصطفیٰ ﷺ اور سیرت طیبہ میں غور وخوض خشیت الٰہی کا وسیلہ ہے:

کیونکہ نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی سید المتقین ہے، اور ڈرنے والے لوگوں کے سردار ہیں۔ بلاشبہ آپ ﷺ دنیا کے تمام لوگوں میں سب سے زیادہ رب العالمین کے لیے خشوع وخضوع اختیار کرنے والے تھے۔ آپ خشیت الٰہی اور خوف خداوندی میں بے مثال تھے۔

واجبات کی ادائیگی میں کوتاہی سے کنارہ کشی خوف الٰہی کا ذریعہ ہے:

جیسے کہ نماز، روزہ، حج اور زکوۃ وغیرہ۔ یہ اور اس طرح کے فرائض وواجبات کی ادائیگی بندے کو اللہ تعالیٰ سے قربت کا ذریعہ ہے اور اللہ تعالیٰ سے قربت بلاشبہ بندے کی خوف الٰہی سے سرشاری کا وسیلہ ہے اور بندے کا اللہ تعالیٰ سے قریب ہونا اس کے عذاب کی یاددہانی کا ذریعہ ہے۔

عمل کے قبول نہ ہونے کا خدشہ بھی خوف الٰہی کا سبب ہے:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ ﴿٢٧﴾﴾ (المائدة: ٢٧)

❶ مدارج السالکین: ١/٤٥٢، ٤٥٣۔ ❷ التذکرة في الوعظ: ٧٣-٧٤۔

''اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ تقوی والوں کا ہی عمل قبول کرتا ہے۔''

ذرا ہم اپنے اردگرد کی دنیا پر نظر دوڑا کر دیکھیں کہ ہم میں سے کتنے لوگ متقی اور پرہیز گار ہیں؟ کہ ان کا عمل مقبول بارگاہ الٰہی ہو۔

گناہوں کو یاد کر کے توبہ کرنا بھی خوف الٰہی کا ذریعہ ہے:

انسان کے وہ گناہ جو اس سے گزشتہ عمر میں سرزد ہو چکے ہوں ان کو یاد کر کے ان پر پشیمانی کے آنسو بہانا اللہ کے خوف اور خشیت سے سرشاری کی راہ میں مدد ومعاون کی حیثیت رکھتے ہیں، کیونکہ بندے کو اس بات کا پکا علم ہے کہ اس نے زندگی کے گزشتہ ایام میں گناہوں کا ارتکاب کیا ہے۔ اب اس کو پتہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ ماضی کے گناہوں سے درگزر فرمائے گا یا نہیں؟ یا اس کو اس کے بدلے سزا دے گا۔ یہی وہ لمحہ فکریہ ہے جو بندے کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کے لیے آمادہ کرتا ہے۔

انجام کار کے بارے میں تدبر و تفکر بھی خوف الٰہی کا ذریعہ اور وسیلہ ہے:

میرے عزیز مسلمان بھائیو! ہم میں سے ہر ایک کی روح قبض کیے جانے کا وقت کبھی بھی اور کسی دن بھی آ کر رہے گا۔ ایک نہ ایک دن ہماری روح قبض ہونا ہے اور ہمیں بہرحال موت کی آغوش میں جانا ہے۔ اس کے بعد ہمارا ٹھکانہ قبر کا تاریک گڑھا ہے۔ ہمیں اس میں دفن کر کے تنہائی کے عالم میں اکیلا چھوڑ دیا جائے گا۔ وہاں ہمارے ساتھ نہ کوئی غم خوار ہوگا اور نہ ساتھی، جس سے ہم دل لگی کر سکیں یا اسے اپنے غموں کا دکھڑا سنا سکیں۔ اس کے بعد سوال وجواب کا مرحلہ آئے گا۔ اس دنیا میں جو اعمال ہم نے کیے ہیں ان کے بارے میں سوالات کا مرحلہ آئے گا۔ سوال وجواب ہونے کے بعد یا تو قبر ہمارے لیے جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا بن جائے گی۔ نعوذ باللہ من الخذلان ۔ یا جنت کے باغوں میں سے ایک باغ بن جائے گی۔ نسأل اللہ من فضلہ

پھر ایک مدت کے بعد قبر سے نکلنے اور حشر کے میدان میں جمع ہونے کا مرحلہ آئے گا۔ محشر کے دن کھلے میدان میں سخت گرمی کے عالم میں بھیڑ اور ازدحام کا سماں ہوگا۔ اسی

پوزیشن میں ہم لوگ کھڑے ہوں گے اور حساب وکتاب ہو رہا ہوگا۔ اس کے بعد پل صراط عبور کرنے کا مرحلہ آئے گا اور ہم کو اس پر سے گزرنے کا حکم دیا جائے گا۔ اس پر گزرتے ہوئے یا تو ہمارا ٹھکانا جنت ہوگا یا ہم جہنم میں کٹ کر گر پڑیں گے۔ انسان کو اس انجام کے بارے میں غور وفکر کرنے کے بعد رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس پہلو سے سوچنا اور فکر آخرت کے بارے میں غور وخوض کرنا اللہ کے عذاب سے خوف کھانے اور ڈرنے کا اہم ترین وسیلہ اور ذریعہ ہے۔

موت کے بارے میں غور وفکر خوف الٰہی کا ذریعہ ہے:

خوف خدا اور خشیت الٰہیہ کے حصول کے اسباب میں سے موت اور سکرات الموت کی شدت کے بارے میں غور وفکر ہے، اور اس بات کی یاد دہانی کہ موت سے کسی کو مفر نہیں۔ موت کا ایک وقت معین ہے جو بلاشبہ آ کر رہے گا۔ اس میں شک کی ذرہ برابر گنجائش نہیں۔ اس کے لیے رات اور دن کی کوئی قید نہیں۔ موسم سرما اور گرما جب چاہے وہ وقت موعود پر آ کر رہے گی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِي تَفِرُّونَ مِنْهُ فَإِنَّهُ مُلَاقِيكُمْ﴾ (الجمعة : ۸)

''آپ کہہ دیجئے! کہ جس موت سے تم جان چھڑا کر بھاگتے پھرتے ہو وہ تمہیں پہنچ کر رہے گی۔''

یہ بات طے ہے کہ انسان جب کسی چیز سے جان چھڑا کر بھاگتا ہے تو جس چیز سے وہ فرار ہونے کی کوشش کرتا ہے وہ اس کے پیچھے ہوتی ہے لیکن موت جس سے وہ راہ فرار اختیار کرنے کی کوشش کر رہا ہے وہ اس کے آگے آگے ہے، کہاں بھاگ کر جائے گا اور کیسے اس سے جان چھڑا سکتا ہے؟

لہٰذا موت کو یاد کرنا موجب خوف الٰہی ہے۔ اس سے انسان کے اندر اللہ کا ڈر اور خوف پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''لوگو! موت کو کثرت سے یاد کیا کرو، موت لذت پرستی کو ختم کر دینے والی ہے،

کیونکہ کوئی بندہ ایسا نہ ہوگا جس نے اس کو زندگی کی تنگ سامانیوں سے دوچار ہوکر یاد کیا ہو اور اسے کشادگی نہ ملی ہو اور جس کسی نے وسعت وفراخی کے عالم میں اسے یاد کیا تو اس نے اس پر شکنجہ کس لیا۔'' ❶

عربی زبان کے مشہور شاعر ابو العتاهیه کا قول ہے:

''سنو! موت کی گھنٹی بج چکی ہے موت کا فرستادہ حاضر ہو چکا ہے، لیکن تمہاری تمنائیں حد سے زیادہ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے تمہیں خوف اور ڈر سے برائے نام واسطہ رہ گیا ہے۔ اگر تم دیکھو کہ کوئی شخص غرور وتکبر میں مبتلا ہوکر مٹک مٹک کر چل رہا ہے تو اس کے شانوں کی جنبش سے پتہ چل جائے گا کہ وہ اتراہٹ کا شکار ہے اور اس کی ہوس کا یہ عالم ہے کہ اپنی عمر سے زیادہ زندہ رہنے کی لو لگائے ہوئے ہے مگر اس کا حال یہ ہے کہ روز بروز اس کے غرور واکڑ میں اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔''

قبر کی وحشت اور ہولناکی کے بارے میں غور وفکر خوف الٰہی کا ذریعہ ہے:

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''میں نے تم کو قبر کی زیارت کرنے سے منع کیا تھا، لیکن اب اعلان کرتا ہوں کہ قبر کی زیارت کیا کرو کیونکہ قبروں کی زیارت دل میں رقت اور نرمی پیدا کرتی ہے اور آنکھوں میں نمی لاکر ڈبڈبانے پر مجبور کرتی ہے اور آخرت کی یاد تازہ کرنے کا وسیلہ بنتی ہے اور بدگوئی سے بچو نامناسب بات زبان سے مت نکالو۔'' ❷

سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں:

''ہم ایک جنازے میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ شریک تھے۔ نبی کریم ﷺ قبر کی کگار پر بیٹھ گئے اور اتنا روئے کہ مٹی نم ہوگئی پھر فرمایا: میرے

---

❶ مجمع الزوائد : ١٠/٥٥٤ رواه الطبراني والبزار واسنادهما حسن .

❷ مستدرك حاكم : ١٣٩٣ وصححه الألباني رحمه الله .

بھائیو! اس مرحلہ سے نپٹنے کے لیے تیاری کرو۔“[1]

قیامت کے بارے میں غور وفکر بھی خوف الٰہی کا ذریعہ ہے:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱتَّقُوا۟ رَبَّكُمْ وَٱخْشَوْا۟ يَوْمًا لَّا يَجْزِى وَالِدٌ عَن وَلَدِهِۦ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَازٍ عَن وَالِدِهِۦ شَيْـًٔا ۚ إِنَّ وَعْدَ ٱللَّهِ حَقٌّ ۖ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ ٱلْحَيَوٰةُ ٱلدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِٱللَّهِ ٱلْغَرُورُ ﴿٣٣﴾﴾ (لقمان : ٣٣)

”لوگو! اپنے رب سے ڈرو اور اس دن کا خوف کھاؤ جس دن باپ اپنے بیٹے کو کوئی نفع نہ پہنچا سکے گا اور نہ بیٹا اپنے باپ کا ذرا سا بھی کام آئے گا (یاد رکھو!) اللہ کا وعدہ سچا ہے تمہیں دنیا کی زندگی بہکاوے میں نہ ڈالے اور نہ دغا باز شیطان تمہیں دھوکے میں ڈال دے۔“

جہنم کے بارے میں غور وخوض خوف الٰہی کا ذریعہ ہے:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّهَا لَإِحْدَى ٱلْكُبَرِ ﴿٣٥﴾﴾ (المدثر : ٣٥)

”(یقیناً وہ جہنم) بڑی چیزوں میں سے ایک ہے۔“

مراد یہ ہے کہ جو بڑی بڑی ہولناک چیزیں ظاہر ہونے والی ہیں جہنم ان میں سے ایک ہے گویا کہ جہنم کی ہولناکی اور اس کی بڑائی کو بیان کیا جارہا ہے بلاشبہ یہ بہت بڑا الٹی میٹم دیا جا رہا ہے کہ جس چیز سے ڈارایا جارہا ہے وہ بلاشبہ بہت بڑی مصیبت ہے۔

سیدنا ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”میں نے جہنم سے بڑھ کر نیندوں کو اڑا دینے والی کوئی چیز نہیں دیکھی۔“[2]

حسن رحمہ اللہ کا قول ہے:

---

[1] ابن ماجة ، كتاب الزهد، باب الحزن والبكاء: ٤١٩٥ وحسنه الألبانی رحمه الله.

[2] ترمذی ، كتاب صفة جهنم، باب منه قصة آخر اهل النار خروجا: ٢٦٠١ وحسنه الألبانی رحمہ اللہ.

''تمام مخلوقات کو جہنم اور اس کے عذاب سے بڑھ کر کسی اور چیز سے نہیں ڈرایا گیا۔''

لہٰذا بندے کو اس بات پر غور وخوض کرنا چاہیے کہ جب جہنمیوں کو جہنم میں داخل کر دیا جائے گا تو اس کے اندر کی ہولناکی اور اس کی دہشت وہیبت نیز اس کے عذاب کی شدت اور اس خطرناک گھبراہٹ اور خوف کا تصور انسان کو اللہ کے خوف کی طرف متوجہ کرتا ہے اور جہنم میں اللہ تعالیٰ نے نافرمانوں اور گناہ گاروں نیز مشرکین وکفار کے لیے جو دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے اس کا خیال آتے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور بندہ خوف الٰہی کی جناب میں پناہ لینے کے لیے بھرپور متوجہ ہو جاتا ہے۔

لہٰذا میرے بھائیو! ذرا جہنم اور اس کی ہولناکی اور ہیبت ناکی کا تصور تو کرو اور بار بار اس کا تصور ذہن اور دماغ میں لاؤ اور دل ودماغ کے دریچے کھول کر اس کی دہشت اور ہیبت ناکی کو یاد کرو۔ یہ اس بات کی ضمانت ہے کہ خوف الٰہی تمہارے دل کی رگ رگ میں رچ بس جائے گا اور اپنے دل کو خوف الٰہی سے سرشار پاؤ گے۔

اس سلسلے میں عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

''ہمیں تعجب ہے کہ اہل علم کی آنکھیں نیند کی چسکیاں لے کر کیوں کر آرام اور راحت محسوس کرتی ہیں اور ان کی آنکھیں نیند کی مٹھاس سے کیوں کر ٹھنڈی پڑتی ہیں جبکہ موت علی الاعلان سر بازاران کو دعوت مبارزت دے رہی ہے اور دھمکی دینے پر تلی ہوئی ہے۔ اگر لوگوں کے پاس حقیقی سماعتیں ہوتیں تو وہ اس کو اپنے کانوں سے سن لیتے۔ وہ کہہ رہی ہے کہ یا تو اس جنت میں تیرا ٹھکانا متعین ہے جس کے حصول کے بعد اس سے کبھی نہیں نکلنا ہے یا جہنم ہے جہاں نہ تو رحم وکرم کا معاملہ کیا جائے گا اور نہ ہی کوئی کسی کی سنے گا اور نہ ہی رونا دھونا کام آئے گا اس لیے موت سے قبل اس کے علم سے عالم کو فائدہ پہنچنا چاہیے کہ موت کے بعد لوگوں نے دنیا میں واپسی کی درخواست کی تاکہ اعمال صالحہ کرلیں مگر موت کے

بعد کہاں واپسی؟''[1]

کامیاب ہونے والوں کی صفات میں غور وفکر بھی خوف الٰہی کی کنجی ہے:

اگر انسان کو انجام کار کی معرفت نصیب ہو جائے اور وہ اپنے خاتمہ پر موت کے آغوش میں جانے کو برحق سمجھتا ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ نجات اور کامیابی کے ساحل سے ہم کنار ہونے والوں کی صفات اور خوبیوں کی چھان بین کرے اور اپنے اعمال و کردار کو ان کے اعمال و کردار کی کسوٹی پر رکھ کر پرکھنے کی کوشش کرے اور اپنی صفات اور خوبیوں کو ان کی صفات اور خوبیوں سے موازنہ کر کے دیکھے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں جو فرمایا ہے:

﴿وَ اِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴾

(طٰهٰ: ۸۲)

''اور ہاں، بلاشبہ میں انھیں بخشش سے نوازنے کے لیے تیار ہوں جو توبہ کریں اور ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں اور راہ راست پر بھی رہیں۔''

اس میں اس بات کی صراحت ہے کہ مغفرت الٰہی کا مستحق بننے کے لیے چار چیزیں ضروری ہیں لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ اللہ کی مغفرت کے حصول کے لیے چار شرطوں کا پایا جانا لازم ہے:

(۱) توبہ (۲) ایمان (۳) عمل صالح

(۴) راہ راست پر گامزن رہنا اور اسی راہ مستقیم پر موت تک جمے رہنا

یہی وہ چار شرطیں جن پر مغفرت الٰہی کا دارومدار ہے اور سورۂ عصر میں اللہ تعالیٰ نے قسم کھا کر کہا ہے کہ: انسان گھاٹے اور خسارے میں ہے مگر ان میں سے ایک صنف کو مستثنیٰ کر کے نجات پانے کی وصف بیانی کرتے ہوئے یہ انداز بیان اختیار کیا ہے ''سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے (یعنی جو عمل صالح کے جامع ہیں وہ اس خسارے سے

[1] المدهش: ۲٦٦.

محفوظ ہیں) اور جنہوں نے آپس میں حق کی وصیت کی (مراد اللہ کی شریعت کی پابندی اور محرمات ومعاصی سے اجتناب کی تلقین ہے) اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی (اس سے تمام قسم کے صبر کی تلقین مقصود ہے چاہے وہ مصائب پر صبر ہو یا احکام وفرائض شریعت پر عمل کرنے اور گناہوں سے اجتناب پر صبر ہو یا لذات اور خواہشات کی قربانی پر صبر ہو۔ یہ سارے کے سارے انواع واقسام کے صبر اس میں شامل ہیں)[العصر : ۳] اس سورۂ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے خسارے سے نجات کے لیے چار شرطوں کا ذکر کیا ہے:

۱۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان (ایمان خالص)

۲۔ عمل صالح، مراد یہ ہے کہ اس کی عملی زندگی اس کے ایمان قلبی کی آئینہ دار ہو۔

۳۔ حق بات کی آپس میں تلقین اور وصیت کرنا (مراد یہ ہے کہ اجتماعی مفاد کو پیش نظر رکھا جائے اور اپنے قول وعمل سے سچائی اختیار کرنے کی تلقین کی جائے۔

۴۔ اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کرنا یہ شق اگرچہ تواصی بالحق کے ضمن میں آتی ہے مگر اس کو خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے جو اس کے شرف وفضل کی واضح دلیل ہے۔

انسان جب بھی نجات پانے والے اولیاء اللہ اور متقین کے اوصاف حمیدہ میں غور وفکر کرنا شروع کردے گا اور اپنے اعمال کو ان کے اعمال وافعال کی کسوٹی پر رکھ کر تولنے کا فریضہ انجام دینے لگے گا تو اس کے دل میں رقت اور نرمی کی کیفیت پیدا ہونا شروع ہو جائے گی اور نجات کے قافلہ تک رسائی نہ ملنے کے تصور سے اس کے دل میں خوف وخشیت کا جذبہ خود بخود کروٹیں لینے لگے گا۔

اس بات کا شعور کہ جہنم انسانوں اور جنوں سے بھری جائے گی خوف الٰہی کی طرف میلان کا ذریعہ ہے:

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لَوْ شِئْنَا لَاٰتَیْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَ لٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّیْ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ۝۱۳﴾ (السجدة: ۱۳)

''اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو ہدایت نصیب فرما دیتے (مراد دنیا میں ہدایت ہے لیکن یہ ہدایت جبری ہوتی جس میں امتحان کی گنجائش نہ ہوتی) لیکن میری بات بالکل حق ہوچکی ہے کہ میں ضرور ضرور جہنم کو انسانوں سے پر کروں گا۔''

تو میرے عزیزو! ذرا غور و فکر سے کام لو اور عقل کے گھوڑے دوڑا کر دیکھو کہ ہم نجات پانے والوں میں ہیں یا ہمارا شمار ان لوگوں میں سے ہے جن پر عذاب الٰہی ضروری قرار دیا جا چکا ہے اور ان پر رب العالمین کے قول کی پاداش میں عذاب برحق ثابت ہو چکا ہے؟ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قسم کھا کر ارشاد فرمایا ہے کہ وہ جہنم کے پیٹ کو ضرور بھرے گا ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴿٧١﴾﴾

(مریم: ۷۱)

''تم میں سے ہر ایک وہاں سے ضرور وارد ہونے والا ہے، یہ تیرے پروردگار کے ذمہ قطعی فیصل شدہ امر ہے۔''

مراد یہ ہے کہ ہر نیک و بد اور مومن و کافر کے لیے حق تعالیٰ قسم کھا چکا ہے اور فیصلہ کر چکا ہے کہ ضرور بالضرور دوزخ پر اس کا گزر ہوگا کیونکہ جنت میں جانے کا راستہ ہی دوزخ کے اوپر سے ہو کر گیا ہے جسے عام محاورات میں پل صراط کہتے ہیں۔ اس پر لامحالہ سب کا گزر ہوگا۔ اس آیت کریمہ پر غور و فکر کی وجہ سے کلیجہ منہ کو آ جانا چاہیے اور مارے خوف کے دل کے دروازے کھل جانے چاہیے اور خوف الٰہی کے مارے دل سہم جانے چاہیے اور خوف کے لیے دل کے دریچے کھل جانا چاہیے۔

ابو میسرہ رحمہ اللہ جب اپنے بستر پر جاتے تو سونے سے پہلے کہا کرتے تھے: ''کاش کہ میری ماں نے مجھے پیدا ہی نہ کیا ہوتا'' پھر آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے تھے اور رونا شروع کر دیتے تھے تو ان سے پوچھا گیا: اے ابو میسرہ! وہ کون سی چیز ہے جو تمہیں رُلاتی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ''ہمیں یہ بات بتلا دی گئی ہے کہ ہم کو جہنم کے اوپر سے ضرور بالضرور

گزرنا ہے اور ہم میں سے ہر ایک کا اس پر پہنچنے کا ذکر کیا گیا ہے لیکن اس سے نکلنے کا کوئی تذکرہ نہیں ہے تو پتہ نہیں اس پر وقت ورود ہمارا کیا حال ہو؟'' [1]

حقیر و معمولی گناہوں کے انجام کے متعلق بھی غور و فکر، لوگ جن کی پرواہ نہیں کرتے، خوف الٰہی تک رسائی کا سبب ہے:

سیّدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''چھوٹے اور معمولی گناہوں سے ہوشیار رہو، اس کی مثال ان لوگوں کی طرح ہے جو کسی وادی میں پڑاؤ ڈالیں اور کھانا پکانے کی غرض سے ان میں سے ہر ایک لکڑی کا ایک ایک ٹکڑا چن کر لائے حتی کہ وہ اس لکڑی کے ایک ایک ٹکڑے کو جمع کرے اور آگ جلا کر کھانا تیار کرے اور معمولی قسم کے گناہوں کی پاداش میں اگر اس کے انجام دینے والے کی گرفت ہوگئی تو ہلاکت کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔'' [2]

مراد یہ ہے کہ پھر سمجھو ان کی شامت آگئی اور اگر صحیح معنوں میں حدیث میں وارد لکڑیوں اور آگ جلانے اور گناہوں کے درمیان کے وجہ ارتباط کا پتہ لگایا جائے اور نافرمانوں اور گناہ گاروں کی کھالوں کے آگ میں پکنے اور جلنے بھننے کا جو چیز سبب بنے گی تو وہ ان کے معمولی گناہوں اور نافرمانیوں کی طرف سے بے توجہی اور بے رخی ہوگی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ۭ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُھُمْ بَدَّلْنٰھُمْ جُلُوْدًا غَيْرَھَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ۭ﴾

(النساء: ٥٦)

''جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلا کر کفر کا ارتکاب کیا، ہم یقیناً ان کو آگ میں ڈال دیں گے جب ان کی کھالیں پک جائیں گی تو ہم ان کے سوا اور کھالیں بدل دیں (مراد یہ ہے کہ ہم ان کے بدن کے اوپر نئی کھال چڑھا دیں گے)

[1] تفسیر الطبری: ۳۶۴/۸.
[2] احمد: ۲۲۸۶۰ وصححه الألبانی.

تاکہ وہ عذاب کا مزہ چکھتے رہیں یقیناً اللہ تعالیٰ زبردست حکمت والا ہے۔''

توبہ کی توفیق ختم ہونے اور توبہ کے بند ہونے کا شعور خوفِ الٰہی کا سبب ہے:

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دنیا سے داغ مفارقت دیتے وقت جب ملک الموت حاضر ہوتے ہیں اور بندے کی روح قبض کرنا چاہتے ہیں تو حالت نزع میں مبتلا شخص تمنا کرتا ہے کہ کاش اسے اور بھی زندہ رہنے کی مہلت مل جاتی تاکہ وہ نیکیاں کر کے اسے آباد کر لیتا اور شہوات نفسانی ومحرمات سے کنارہ کشی کر کے نجات سے ہم کنار ہو جاتا لیکن افسوس ہائے افسوس! ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿٩٩﴾ لَعَلِّیْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ وَ مِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿١٠٠﴾﴾ (المومنون: ۹۹، ۱۰۰)

''یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے پاس موت آتی ہے تو کہتا ہے اے میرے رب! مجھے واپس بھیجو۔ تاکہ میں جو کچھ چھوڑ آیا ہوں اس میں کوئی نیک عمل کرلوں۔ ہرگز نہیں، یہ تو ایک بات ہے جسے وہ کہنے والا ہے اور ان کے پیچھے اس دن تک جب وہ اٹھائے جائیں گے، ایک پردہ ہے۔''

جس طرح بندے اور توبہ کے درمیان موت حائل ہو کر کھڑی ہو جاتی ہے ٹھیک اسی طرح بندے اور توبہ کے درمیان اور بھی بہت چیزیں ہیں جو رکاوٹ بن کر بندے کو توبہ نہیں کرنے دیتیں مثال کے طور گمراہ کن فتنے اور آفتیں جو کہ اپنے اردگرد کے لوگوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیں اور توبہ کرنے میں ٹال مٹول کرنا (مراد یہ ہے کہ آج کا کام کل پر ٹالتے رہنا) شکوک وشبہات کا شکار ہو جانا، گناہوں پر اصرار اور شہوات نفسانی کی غلامی وغیرہ۔ چنانچہ جب موت سر پر منڈلانے لگتی ہے تو حسرت وندامت کے آنسوؤں کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ ایسے موقع پر کف افسوس ملنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اَنْذِرْهُمْ یَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِیَ الْاَمْرُ ۘ وَ هُمْ فِیْ غَفْلَةٍ وَّ هُمْ لَا

یُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۹﴾ (مریم : ۳۹)

''اور انھیں اس رنج وغم کے دن کا الٹی میٹم دیدیں جبکہ کام انجام کو پہنچا دیا جائے گا (یعنی حساب وکتاب کر کے صحیفے لپیٹ دیے جائیں گے) اور یہ لوگ غفلت اور بے ایمانی ہی میں رہ جائیں گے۔''

بُرے اختتام کے بارے میں غور وفکر بھی خوف الٰہی سے آشنائی کا ذریعہ ہے:

سلف صالحین رحمہم اللہ بُرے خاتمہ سے ڈرتے اور خوف کھاتے تھے۔ ان میں کوئی شخص تقوی کے بلند سے بلند ترین مقام پر پہنچ جاتا مگر اسے اس بات کا ہمیشہ خوف اور اندیشہ لاحق رہتا کہ زندگی کے آخری لمحات میں پتہ نہیں کیا صورتِ حال پیدا ہو جائے اور زندگی کی ڈگر پر چلنے والی گاڑی کہیں راہ راست سے بھٹک کر شر وفساد، فسق وفجور اور کفر وشرک کی پگ ڈنڈیوں میں ٹامک ٹوئیاں نہ مارنے لگے اور خاتمہ بالخیر ہونے کے بجائے سوئے خاتمہ کی مہر لگ جائے اور ''نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم...... نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے'' کے مصداق قرار پا جائیں۔ (اعاذنا اللّٰہ من سوء الخاتمة)

ذرا اسلاف کے امام ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کیجیے تو بخوبی پتہ چل جائے گا کہ نبی کریم ﷺ اپنی عظمت شان اور بلندئ مقام کے باوجود اکثر وبیشتر یہ دعا کیا کرتے تھے:

((یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلَی دِیْنِكَ .)) [1]

''اے دلوں کو پھیرنے اور اس پر تصرف کی طاقت رکھنے والے میرے دل کو اپنے دین پر ثابت قدم رکھ یا اسے دین اسلام پر جما دے۔''

اگر ہم ان لوگوں کے احوال کا جائزہ لیں جو بُرے خاتمہ کی حالت میں اس دنیا سے رخصت ہوئے تو ہم کو عجیب وغریب اور خوفناک وہولناک صورتِ حال کا سامنا ہوتا ہے اور مارے خوف وخشیت کے دل دہل جاتے ہیں اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

[1] ترمذی، کتاب القدر، باب ما جاء أن القلوب بين اصبعي الرحمن: ۲۱٤۰ وصححه الحاكم ووافقه الذهبي.

﴿وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ یَتَوَفَّى الَّذِیْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓىِٕكَةُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ ۝۵۰﴾ (الانفال : ۵۰)

''کاش کہ تو دیکھتا جب فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں تو ان کے منہ اور سرینوں پر مارتے جاتے ہیں اور (کہتے ہیں) تم جہنم کا عذاب چکھو۔''

صالحین کرام وعلمائے عظام کی مصاحبت بھی خوف الٰہی سے آشنائی کا ذریعہ:

اس باب میں اہم ترین امور میں سے قابل توجہ امر یہ بھی ہے کہ جو شخص خوف الٰہی سے آشنائی کا ارادہ رکھتا ہو تو اس کو چاہیے کہ ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کرے جن کی مصاحبت اس کے لیے خوف خداوندی اور خشیت الٰہی تک رسائی کا ذریعہ ہو اور وہ صالحین کرام اور علماء واتقیاء لوگوں کی مصاحبت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾ (الكهف : ۲۸)

''اور اپنے آپ کو انھیں کے ساتھ رکھا کرو جو اپنے پروردگار کو صبح وشام پکارتے ہیں اور اسی کی رضامندی کے خواہاں رہتے ہیں۔''

اس سے مراد خشیت الٰہی سے سرشار لوگ ہیں جن کے دل نرم ہوتے ہیں رقیق القلب ہونے کی وجہ سے جب وہ قرآن کریم کی آیات کی سماعت کرتے ہیں تو ان کے جسم اور دل پر اللہ تعالیٰ کا ذکر سنتے ہی رقت طاری ہو جاتی ہے۔ بڑی مشکل سے ایسے لوگوں کا سراغ مل پاتا ہے ایسے لوگوں کو ڈھونڈھو اور ان کی مصاحبت اختیار کرو۔

اللہ سے ڈرنے والے اسلاف کی سیرت کا مطالعہ بھی خوف الٰہی کا ذریعہ ہے:

اگر اردگرد نظریں دوڑانے اور تلاش کے باوجود صالحین کرام کے وجود کا سراغ نہ مل پائے۔ اللہ تعالیٰ سے خوف کھانے والے نفوس قدسیہ کی سیرت کا مطالعہ کرو کیونکہ کتاب کو بھی بہترین مصاحب کہا گیا جس کی باتوں سے اس کی مصاحبت اختیار کرنے والا اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا اور صالحین سے مراد حدیث پاک کا شغف رکھنے والے اور اس کو اپنا اوڑھنا بچھونا

بنانے والے نفوس قدسیہ مراد ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے مصاحب ہیں اگرچہ انھیں نبی کریم ﷺ کی صحبت کا بظاہر شرف حاصل نہ ہوا ہو لیکن ان کے نفوس قدسیہ معنوی طور پر نبی کریم ﷺ کی صحبت سے سرشار ہیں اس لیے وہ بھی اصحاب رسول ﷺ کے زمرے میں شامل ہیں۔

سیّدنا علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''میں نے رسول اللہ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کی یادگار جن کی حیثیت باقیات الصالحات کی تھی انھیں دیکھا۔ میں نے ان جیسا اللہ والا کسی کو نہیں پایا جو ان کے ہم مثل ہو۔ اللہ کی قسم! ان کی صبح پراگندہ حال و پراگندہ بال اس حال میں ہوتی تھی کہ بکری کی مینگنی کے مثل نشان ان کی پیشانی پر ہوتا تھا اور مارے خوف کے ان کا رنگ زرد پڑ چکا ہوتا تھا۔ انہوں نے رات کتاب اللہ کی تلاوت میں کھڑے ہوکر یا سجدے کی حالت میں اللہ کی بارگاہ میں جبین نیاز ٹیک کر گزاری ہوتی تھی۔ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر آتا ہے تو وہ مارے خوف کے جھک جاتے ٹھیک اس طرح جس طرح آندھی کے جھونکے سے درخت جھکنے لگتا ہے اور ان کی آنکھوں سے عرق انفعال رواں ہونے لگتا ہے حتی کہ بخدا ان کے آنسوؤں سے ان کے کپڑے تر ہو جاتے ہیں اور ان کے سامنے دیگر لوگ گویا کہ اللہ کی یاد سے یکسر غافل محسوس ہوتے، ایسا لگتا کہ ان کے علاوہ دیگر لوگوں کی راتیں غفلت اور لاپرواہی میں کٹتی ہیں۔'' [1]

سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی زبان کو پکڑتے تھے اور کہتے تھے کہ ''گوشت کا یہی وہ لوتھڑا ہے جس نے ہمیں ہلاکت کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔'' [2]

سیّدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''کاش کہ میں گھاس پھوس کا تنکا ہوتا، کاش کہ میرا اس کائنات میں وجود ہی نہ

---

[1] حلیة الأولیاء: ۱/۷٦. [2] البزار: ۸٤.

ہوتا، کاش کہ میری ماں نے مجھے پیدا ہی نہ کیا ہوتا، کاش کہ سرے سے میرا وجود ہی نہ ہوتا، کاش کہ میں بھولا بسرا ہو جاتا۔'' ❶

اور فرماتے ہیں:

''اگر بلاوجہ حیران وسرگرداں ہو کر کوئی اونٹ دریائے فرات کے کنارے مر جائے تو مجھے خطرہ ہے کہ کل روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کہیں مجھ سے اس کے بارے میں سوال نہ کر لے؟'' ❷

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہی قول ہے:

''اگر آسمان سے کوئی منادی ندا لگائے کہ اے لوگو! تم سب کے سب جنت میں داخل ہونے والے ہو سوائے ایک شخص کے تو مجھے خوف لاحق ہوگا کہ کہیں وہ شخص میں تو نہیں ہوں جو جنت میں داخلہ سے محرومی کا شکار ہوگا۔'' ❸

سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں:

''میری خواہش ہے کہ جب میں مر جاؤں تو پھر حساب وکتاب کی غرض سے دوبارہ اُٹھایا نہ جاؤں۔'' ❹

جبکہ سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا حال یہ تھا کہ ان کی راتیں اللہ کی تسبیح وتہلیل اور تلاوت قرآن کریم میں گزرتی تھیں۔ ان کے مصحف کا وہ نسخہ جس سے وہ تلاوت کیا کرتے تھے کثرت تلاوت کی وجہ سے گھس کر پھٹ گیا تھا اور آپ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا تو شہادت کا خون آپ کے مصحف پر پڑا ہوا پایا گیا۔

سیّدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا حال یہ تھا کہ خوف الٰہی میں روتے روتے آنکھوں کے نیچے گالوں پر جوتے کی تسمہ کی مانند لکیریں بن گئی تھیں جس سے آنسو بہا کرتے تھے۔ ❺

---

❶ طبقات ابن سعد: ۳/۳٦۰. ❷ طبقات ابن سعد: ۳/۳۰۵.
❸ حلیة الأولیاء: ۱/۵۳. ❹ رواه ابن أبي شيبة: ۲۳۵۳۹ المصدر السابق نفسه.
❺ المدهش: ٤۳۵.

سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نماز کی حالت میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول تلاوت فرماتیں: ﴿فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ﴿٢٧﴾﴾ (الطور: ٢٧) اور زاروقطار رونے لگتیں۔ روتے روتے بے حال ہو جاتیں اور فرماتی جاتیں کاش کہ میں بھولی بسری ہو جاتی، میرا وجود تک نہ ہوتا۔ ❶

سیّدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ مارے خوف الٰہی کے کہا کرتے تھے:

''میری تمنا ہے کہ میں مینڈھا یا دنبہ ہوتا اور میرے گھر والے مجھے ذبح کر کے میرا گوشت کھا جاتے اور اس کا شوربہ بنا کر پی جاتے۔'' ❷

سیّدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

''کاش! میں راکھ کا ڈھیر ہوتا جسے ہوا اڑاتی پھرتی۔'' ❸

سیّدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ ارشاد فرمایا کرتے تھے:

''میری خواہش ہے کہ مجھے کوئی ایسا شخص مل جائے جو میرے مال ودولت کی دیکھ بھال کرے اور میں کمرے کی کنڈی بند کر کے اندر تن تنہا بیٹھ جاؤں، پھر میرے پاس کوئی پہنچ نہ سکے اور اسی تخلیہ کے عالم میں میں رفیق اعلیٰ سے جا ملوں۔'' ❹

سیّدنا ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ پر ایک ہی نشست میں، اس وقت جبکہ وہ حدیث بیان کر رہے تھے جس میں ان تین آدمیوں کے بارے میں بیان کیا گیا ہے جنہیں سب سے پہلے جہنم کا ایندھن بنایا جائے گا، تین مرتبہ غشی طاری ہوئی۔ ❺

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے بارے میں آتا ہے کہ ان کی زوجہ محترمہ جب ان سے کچھ پوچھتیں تو وہ بڑی حزین اور غمگین آواز میں انھیں جواب دیتے ہوئے یہ آیت تلاوت فرماتے:

''اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ اور خوف ہے''

---

❶ مصنف عبدالرزاق: ٢٠٦١٦.

❷ رواه ابن المبارك في الزهد: ٢٤١ وابن سعد في الطبقات: ٣/٤١٣.

❸ رواه ابن المبارك في الزهد: ٢٤١. ❹ مصنف ابن أبي شيبة: ٧/١٣٩.

❺ ترمذي، كتاب الزهد، باب ما جاء في الرياء والسمعة: ٢٣٨٢.

چنانچہ ان کی بیوی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر کا جب یہ جواب سنا تو زار و قطار رونے لگیں اور فرمانے لگیں: اے اللہ! ان کو (یعنی میرے شوہر کو) جہنم کے عذاب سے پناہ عطا فرما کر اور اپنے سایۂ عاطفت میں لے لے۔'' ❶

اس لیے مسلمان کو موقع غنیمت جاننا چاہیے اور اللہ والوں کے قصوں سے اپنی ذہین سماعتوں کو محروم نہیں رکھنا چاہیے۔ خوف اور خشیت سے سرشار صالحین کرام جن کی سیرتیں جذب و شوق اور خوف الٰہی میں ڈوبے ہوئے درد و محبت سے ماضی میں معمور رہ چکی ہیں۔ لوگوں کو ان کی سیرت کے مطالعہ سے محرومیت کا شکار نہ ہونا چاہیے تاکہ انھیں قلب کی حرارت اور خوف و خشیت کی دولت سے آشنائی مل سکے کیونکہ اسلاف کی سیرتیں اس کلیہ کے سراسر خلاف ہیں کہ دنیا ایک قمار خانہ اور زندگی مکر و فن کا نام ہے اس میں وہی کامیاب ہے جو اس فن میں طاق ہو۔

من کی دنیا من کی دنیا، سوز مستی جذب و شوق
تن کی دنیا تن کی دنیا، سود و سودا مکر و فن

نہیں، ایسا ہرگز نہیں، بلکہ اس زندگی کی آبرو اور اس باغ ہستی کی ساری بہار اور سارا وقار اور اس دنیا کا سارا ہنگامہ وجود خوف و خشیت الٰہی کے دم سے قائم ہے۔ اس کے بغیر یہ محفل سونی ہے اور یہ گھر بے چراغ ہے۔ خرمن کائنات میں یہی ایک کام کا دانہ ہے۔ اگر یہ نہیں تو پھر سب خس و خاشاک ہے۔

اسی لیے نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ''اولیاء اللہ تو وہ ہیں جن کے دیدار سے اللہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہو۔'' ❷

وعظ و نصیحت کی مجلسوں میں حاضری خوف الٰہی تک رسائی کا سبب ہے:

اللہ تعالیٰ نے بعض داعیوں کو لوگوں کے دلوں پر اثر انداز ہونے کا خاص ملکہ عطا فرمایا ہے، ان کے اسلوب بیان کی چاشنی لوگوں کے دلوں کو موہ لیتی ہے اور وہ اپنے سہل انداز بیان اور زبان کی سلاست و روانی کی وجہ سے سامعین کے دلوں میں جگہ بنا کر ان کے دل تک رسائی

❶ تاریخ دمشق : ۷۰/۳۲.   ❷ ابن ابی شیبة : ۲٦٤/۸ وصححه الألبانی رحمه الله.

پانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ان کے کلام کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے اور اس کا اثر نمایاں طور پر نظر آنے لگتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ واعظوں اور خطیبوں کے کلام کی سماعت اس شخص کے لیے سودمند ہے جو رقت قلبی کا خواہاں ہو اور اللہ کے خوف سے دل کو معمور کرنے کا ارداہ رکھتا ہو۔ اسے چاہیے کہ اس طرح کے جید علماء کرام کی گاہے بگاہے زیارت کرنا، ان کی مجالست اختیار کرنا اور ان کی صحبت میں رہنا اپنا شعار بنالے تو اس کے لیے خوف الٰہی تک رسائی آسان ہو جائے گی۔

دعا اور مناجات بھی خوف الٰہی کے حصول کی کنجی ہے:

دعا اور اللہ کی جناب میں الحاح وزاری خوف الٰہی اور خشیت خداوندی کے حصول کے اسباب میں سے اہم ترین سبب ہے لہٰذا ایک مسلمان بندے کو بحیثیت مسلمان اللہ کی جناب میں دست سوال دراز کر کے خوف وخشیت کے حصول کی دعا کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس کو خوف وخشیت کی سعادت مندی نصیب فرمائے۔ سیّدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کلمات کے ساتھ بارگاہ الٰہی میں دُعا کیا کرتے تھے:

”اے میرے رب! میری اعانت اور مدد فرما اور میرے خلاف میرے دشمن کی دست گیری نہ کر اور میری پشت پناہی فرما میرے خلاف کسی کی پشت پناہی کا ذریعہ نہ بن، میرے لیے اچھی چارہ جوئی کی تدبیر فرما اور میرے خلاف کسی کے لیے اس بارے میں کوئی بندوبست نہ فرما اور مجھے رشد وہدایت سے نواز دے اور ہدایت کا راستہ میرے لیے سازگار فرمادے اور جو شخص میرے خلاف بغاوت اور غداری پر آمادہ ہو اس کے خلاف میری نصرت اور چارہ جوئی فرما، اے میرے رب! مجھے تو اپنی ذات کی شکرگزاری واحسان مندی کا امین، وپاسبان بنادے اور ہر وقت اپنے ذکر میں رطب اللسان رہنے والا بندہ بنادے اور تیری قہاری کے رعب میں ہر وقت ڈرتے رہنا میری عادت بن جائے، تو مجھے اپنی پناہ گاہ کا سہارا لینے والا بنالے اور اپنی ذات کی طرف رجوع کرنے والا بنادے، کریم! میری توبہ قبول فرمالے،

میرے گناہوں کو دھوڈال ، میری دعا ومناجات کو شرف قبولیت عطا فرما اور میری حجت محکم کردے اور میرے دل کو ہدایت و استقامت کی راہ پر گامزن فرمادے۔ میری زبان کی اصلاح اور درستگی کا بندوبست فرمادے اور میرے دل سے کینہ کدورت اور بغض وعداوت کے فاسد مادے کو کھرچ کر نکال دے۔“ ❶

نبی کریم ﷺ کا بارگاہ الٰہی میں دعا مانگنے کا معمول تھا۔ آپ ﷺ خشیت الٰہی اور خوف خداوندی کے حصول کی غرض سے ان کلمات کا سہارا لے کر دعا مانگا کرتے تھے:

”اے میرے اللہ! ہمارے لیے اپنی خشیت کا فیضان فرمادے، ایسی خشیت جو تیرے اور تیری معصیتوں ونافرمانیوں کے درمیان آڑ بن کر کھڑی ہوجائے۔“ ❷

آپ ﷺ دعا کرتے ہوئے یہ فرمایا کرتے تھے:

”اے اللہ: میں تجھ سے خلوت اور جلوت دونوں حالتوں میں خوف وخشیت کا طلب گار ہوں۔“ ❸

خوف کے موانع سے دوری بھی خوف الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے:

خوف الٰہی کے حصول کی راہ میں چند رکاوٹوں سے مومن کو سابقہ پڑتا رہتا ہے مثال کے طور پر گناہوں کا ارتکاب، دنیا اور اس کی زیب وزینت اور اس کی طمطراقی کی محبت اور برے دوستوں کی مجالست ،غفلت ولاپرواہی نیز بے حسی و بے شرمی وغیرہ خوف الٰہی کے حصول کی رکاوٹیں ہیں ان سے کنارہ کشی اور دوری حصول خوف الٰہی کا ذریعہ اور اہم ترین سبب ہے۔

---

❶ ترمذی ، کتاب الدعوات، باب: رَبِّ اَوْزِعْنِیْ وَلَا تَعِنْ علی......: ۳۵۵۱ وصححه الحاکم.

❷ ترمذی ، کتاب الدعوات، باب : دعاء: اللهم اقسم لنا......: ۳۵۰۲ وحسنه الألبانی رحمه الله.

❸ نسائی ، کتاب السهو، باب نوع آخر من الدعا : ۱۳۰۵ وصححه الألبانی رحمه الله.

خاتمہ

خوف الٰہی اگر بندے کے دل میں جگہ بنالے تو بندے کے اعضاء وجوارح پر اس کی اثر پذیری کا فیضان شروع ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی منع کردہ چیزوں سے دوری اور اللہ کے اوامر سے وابستگی اس کی زندگی کا طرۂ امتیاز بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ خوف الٰہی کا دعوی کرنا برائے دعوی ہے حقیقت سے اس کا کوئی سروکار نہیں، مومن کو چاہیے کہ مذکورہ صورت حال میں اپنے نفس کا محاسبہ کرے تاکہ اس کا نفس اللہ کے حکم کے لیے راہ استقامت پر چلنے والا بن جائے۔ امام ابن شبرمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"مجھے ان لوگوں پر تعجب ہوتا ہے جو مرض لاحق ہونے کے خطرہ سے کھانے پینے کی چیزوں سے پرہیز کرنے میں ذرہ برابر کوتاہی نہیں کرتے مگر جہنم کے خوف سے گناہوں کے ارتکاب سے پرہیز کی انھیں پرواہ نہیں ہوتی۔" [1]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور معصیت کرنے والا شخص جاہل محض ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات سے خوف کھانے والا شخص عالم باعمل ہے۔" [2]

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ان لوگوں کے زمرے میں شمار فرمالے جو خلوت اور جلوت دونوں حالتوں میں اللہ سے ڈرتے ہیں۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ.

---

1. تهذيب الكمال: ١٥/ ٨٠.
2. مجموع الفتاوى: ٧/ ٢٢-٢٣.

اپنے فہم وادراک کا امتحان لیں!

ذیل میں اس موضوع سے متعلق سوالات کو دو مرحلوں کو مدنظر رکھتے ہوئے وضع کیا گیا ہے:

سوالوں کی ایک قسم تو وہ ہے جن کا جواب فوراً دینا ہے، اس قسم کے سوالات کو پہلے مرحلہ میں رکھا گیا ہے۔

سوالوں کی دوسری قسم وہ ہے جو بحث ونظر اور غور وفکر کی متقاضی ہے۔ اس قسم کے سوالات کو دوسرے مرحلہ میں رکھا گیا ہے۔

پہلے مرحلہ کے سوالات جن کا جواب فوراً دینا ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ کے قول ﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ ﴾ سے مراد کون لوگ ہیں؟

۲۔ ہم اللہ تعالیٰ سے کیوں ڈرتے اور خوف کھاتے ہیں؟ (خوف قلوب کی کیا حکمت ہے؟)

۳۔ اللہ تعالیٰ کے قول ﴿ وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ﴾ کے معنی مراد کیا ہیں؟

۴۔ خوف اور خشیت کے درمیان فرق کیا ہے؟

۵۔ نبی کریم ﷺ کے قول ((انی أنا النذير العريان.)) کا مطلب کیا ہے؟

۶۔ مقامات خوف کیا کیا ہے؟

۷۔ دو متضاد مثالیں بیان کر کے خوف کی توضیح کریں (ایک میں صحابہ کرام کا اللہ سے خوف کا تذکرہ ہو اور دوسری مثال میں یہودیوں کے خوف کی مثال بیان کر کے) دونوں کے خوف میں فرق کی نشاندہی فرمائیں۔

۸۔ مقربین کا خوف عوام الناس کے خوف سے (اپنی نوعیت کے اعتبار سے) شدید کیوں ہوتا ہے؟

۹۔ ملائکہ کا خوف (علی وجہ العموم) اس دنیائے رنگ و بو میں بسنے والے انسانوں کے خوف سے شدید کیوں ہوتا ہے؟

۱۰۔ اگر تمہارا نفس تم کو معصیت کے ارتکاب پر آمادہ کرے تو تم کو چاہیے کہ تم نفس کے سامنے اس معصیت کا حلیہ بگاڑ کر اس کا ستیاناس کر ڈالو گناہوں کا حلیہ کیوں کر بگاڑا جا سکتا ہے۔اس کی کیا کیفیت ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

دوسرے مرحلہ کے سوالات جو استنباطی انداز کے ہیں:

۱۔ جس شخص نے آج خوف وخشیت کی راہ اختیار کر لی کل اس کو خوف کا سامنا نہ ہوگا اور جو شخص آج خوف وخشیت سے کنارہ کر کے بے فکری کی زندگی گزارے تو کل اسے خوف کا سامنا کرے پڑے گا، اس عبارت کے معنی کیا ہیں؟

۲۔ خوف الٰہی دنیا پر غلبہ اور سربلندی تک رسائی کا ذریعہ کیوں کر ہو سکتا ہے؟

۳۔ ان اسباب کا ذکر فرمائیں جو خوف الٰہی تک رسائی کی راہ میں مدد ومعاون بنتے ہیں؟ کتاب کے اندر ذکر کیے ہوئے اسباب ووسائل سے صرف نظر کرتے ہوئے اپنے فہم وادراک کی بنیاد پر مثال دے کر وضاحت فرمائیں۔

۴۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ﴾ اس آیت کو سن کر بعض سلف نے تمنا کی تھی کہ اللہ تعالیٰ صرف ان کی دو رکعت نمازیں قبول فرمالے اور اس کے بعد ان کو موت آجائے۔ اس آیت قرآنی کے واضح ترین معنی مراد ان کے پیش نظر تھے انہوں نے کون سے معنی مراد کو بطور استدلال اختیار کیا؟ وضاحت فرمائیں اور کس کا قول ہے جس کے پیش نظر انہوں نے یہ موقف اختیار کیا؟

۵۔ اعمال قلوب کی اصلاح اصل اور بنیاد ہے اور اعمال جوارح اعمال قلوب کے تابع ہوا کرتے ہیں اس عبارت کی توضیح وتشریح فرمائیں۔

۶۔ کیا ہی موزوں ہوتا کہ عصر حاضر میں پائے جانے والے بعض صالحین اور اللہ والوں کے خوف الٰہی کے بعض قصوں کا بطور نمونہ تذکرہ کیا جاتا؟

۷۔ صالحین کی مصاحبت اور مجالست اختیار کرنے کو خوف الٰہی کے حصول کا ذریعہ کیوں کہا گیا ہے؟

۸۔ خوف قاصر سے متصف شخص اپنی اس کیفیت کا کیسے علاج کرے گا؟

۹۔ ((خوف يشوبه تعظيم .)) اس عبارت کی تشریح کریں۔

۱۰۔ چیتے، شیر، بھیڑیے اور ان جیسے خوں خوار جانوروں سے ڈرنے اور خوف کھانے کا کیا حکم ہے؟

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ .

أعمال
القلوب
امید کی حقیقت
خوف
محاسبہ
شکر
غور و فکر
حیا
ورع
تقویٰ

مقدمہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ ، نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ . اما بعد !

امید وبیم ہی کی سہارے اللہ تعالیٰ تک پہنچنے والی شاہراہ پر چل کر سالک منازل سفر طے کرتا ہے اور اللہ کے نیک بندے عبادت وریاضت کی راہ نوردی میں اسی طریق کار کا سہارا لیتے ہیں۔ اگر ایک سیکنڈ کے لیے امید وبیم کے دامن کا سرا ان کے ہاتھ سے چھوٹ جائے تو وہ ہلاک ہوجائیں یا ہلاکت کے دہانے پر جالگیں کیونکہ مسلمان یا تو گناہوں اور معصیتوں کے نرغے میں پھنس کر مغفرت اور بخشش کا خواہاں ہوتا ہے یا عیوب ونقائص کا شکار ہوکر اس کی اصلاح کے لیے کوشاں نظر آتا ہے یا اعمال صالحہ کی انجام دہی کے بعد اس کی قبولیت کی امید لگائے رہتا ہے یا استقامت وہدایت کی راہ پر گامزن ہوکر منزل مقصود کے حصول کا خواہاں اور اس پر ثبات واستقامت سے جمے رہنے کی خواہش رکھتا ہے اور اللہ کا قرب حاصل کرکے اس کے سامنے حاضری کی تمنا رکھتا ہے۔

اسی لیے کہا گیا ہے کہ امید کی یہی وہ کیفیت ہے جو بندے کو رب کریم تک پہنچنے کے لیے مددگار کی حیثیت رکھتی ہے اور دین وایمان پر استقامت کے ساتھ عمل کی انجام دہی کے اسباب ووسائل میں سے اہم ترین وسیلہ ہے۔ خصوصاً اس مادی دور میں جس کو پرفتن دور سے تعبیر کیا جاتا ہے جس میں شہوت پرستی، مصائب شبہات ومنکرات کا بازار گرم ہے۔ یہی وہ قوی ترین وسیلہ ہے جو رب کریم کی طرف لے جانے والی صراط مستقیم پر گامزن کرنے کا ذریعہ ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ امید وبیم کے معانی ومفہوم پر غور وخوض کرکے اسے صحیح طرح سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تاکہ ہمارا شمار اہل امید میں ہونے لگے اور اگر ہم نے اس کے

معانی ومفاہیم کو صحیح طریقہ سے نہ سمجھا تو ہمارا شمار صرف اٹکل لگانے والوں اور خیالی پلاؤ پکانے والوں میں ہوگا۔

اعمال قلوب سے متعلق لکھے گئے مقالات میں یہ پانچواں مقالہ ہے۔ اللہ کی توفیق سے جنہیں آپ کے سامنے فائدہ کی غرض سے پیش کرنے کی مجھے سعادت نصیب ہوئی، اس کے ترجمہ وتیاری میں الفرقان ٹرسٹ نے تعاون کیا اور آج یہی مکتبہ والے اس کتابچہ کو چھاپ کر اس کی نشر واشاعت میں حصہ لے رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے توفیق اور ثابت قدمی اور ہدایت وراستی کی درخواست کرتا ہوں۔ بلاشبہ وہ سننے والا اور قبول کرنے والا ہے۔

محمد صالح المنجد

امید کے معانی ومفاہیم کی توضیح وتشریح

الرجاء کی لغوی تعریف:

(رجی) عربی زبان میں جب راء جیم اور حرف علت کے ساتھ، اس کلمہ کا ورود ہوتا ہے تو اس سے دو مختلف معنی مراد ہوتے ہیں اور دونوں کلمات کے معنی ایک دوسرے کے مخالف ہوتے ہیں۔ ان میں پہلے کلمہ سے مراد امید وآس ہوا کرتی ہے اور دوسرے کلمہ سے کسی چیز کا کنارہ مراد لیا جاتا ہے۔

چنانچہ پہلا کلمہ بول کر (امید) مراد لیتے ہیں کہا جاتا ہے: رجوت الامر، ارجوہ، رجاء پھر اس کے معانی ومفاہیم کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔ کبھی رجاء بول کر خوف مراد لیا جاتا ہے، جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا ﴿١٣﴾﴾ (نوح: ۱۳)

''تمھیں کیا ہے کہ تم اللہ کی عظمت سے نہیں ڈرتے۔''

اس آیت میں رجاء بول کر خوف مراد لیا گیا ہے اور بعض لوگ کہتے ہیں: (ما ارجوہ) اور اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ (لا ابالی) مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے انہوں نے آیت کریمہ کی تفسیر اس معنی کو سامنے رکھتے ہوئے کی ہے۔

دوسرے معنی کے اعتبار سے الرجاء بول کر کنویں کا گوشہ یا کسی چیز کا آخری کنارہ مراد لیا جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَّالْمَلَكُ عَلَىٰ أَرْجَائِهَا ۚ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَانِيَةٌ﴾

(الحاقة: ۱۷)

''اور فرشتے اس کے کناروں پر ہوں گے اور تیرے رب کا عرش اس دن آٹھ

فرشتے اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔‘‘

اگر ہمزہ کے ساتھ کلمہ رجاء کا ورود ہو تو اس کے معنی تاخیر کے ہوتے ہیں۔ عربی زبان میں کہا جاتا ہے (ارجـات الشـئـی): یعنی میں نے اس کو مؤخر کر کے ٹال دیا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿تُرْجِي مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُؤْوِيٓ مَنْ تَشَآءُ﴾ (الاحزاب: ٥١)

’’ان میں سے جسے تو چاہے مؤخر کر دے اور جسے چاہے اپنے پاس جگہ دے دے۔‘‘

اسی سے مرجئہ کا اشتقاق ہوا ہے۔

الرجاء کی اصطلاحی تعریف:

اس محبوب سے دل لگانا جو فوراً دستیاب ہونے والا نہ ہو۔ ❶

اس کی تعریف میں نقل کیا گیا ہے کہ محبوب کے انتظار میں ملنے والی متوقع راحت کا احساس رجاء کہلاتا ہے لیکن اس کے سبب کا وجود ضروری ہے۔ ❷

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: رجاء قلب کا محبوب کی طرف مائل ہونا اس حال میں کہ اس راستہ میں حائل رکاوٹ سے صرف نظر کرتے ہوئے محبوب کی محبت میں اس کی طرف لو لگانا، اُمید کہلاتا ہے۔ ❸

اس کی تعریفوں میں سے ایک تعریف یہ بھی ہے کہ رجـاء اس حدی خواں کو کہتے ہیں جو دلوں کو محبوب کے دیار حرم تک پہنچانے کی خاطر حدی خوانی کا فریضہ انجام دے اور محبوب کے دیر و حرم سے مراد باری تعالیٰ کی ذات اقدس اور دار آخرت ہے اور جو چیز اس سفر کو خوشگوار بنانے کا کام کرے وہ رجاء ہے۔ ❹

رجـــاء کی تعریف میں کہا گیا ہے کہ اس سے مراد اللہ تبارک وتعالیٰ کے جود وکرم کی بشارت سے سرشاری ہے اور اس کے انعام واکرام کے دیدار کی خواہش اور تمنا ہے۔

---

❶ معجم مقاييس اللغة (لابن فارس) ٤١١/٢.

❷ فيض القدير: ٦٧/٥. ❸ فيض القدير: ٤٠٨/٥. ❹ الروح: ٢٤٦.

اس کی تعریف یوں بھی کی گئی ہے کہ رجاء رب کریم کے انعام پر بھروسا اور اعتماد کرنا امید کہلاتا ہے۔ [1]

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ رجاء سے مراد قلب انسانی کا اللہ تعالیٰ سے تعلق استوار کرنا اور اس کے انعام واکرام، جود وسخا، اور اس کے فضل وکرم سے فرحت وانبساط محسوس کرنا نیز اس کو پیشگی بشارت سمجھنا اور اللہ کے فضل وکرم اور نعمت وانعام کا مشاہدہ کر کے راحت اور سکون کی سانس لینا رجاء کہلاتا ہے۔

رجاء کے برعکس یاس وقنوط ہے۔ ناامیدی سے مراد اللہ کی رحمت کے فوت ہو جانے کا تذکرہ اور احساس ہوا کرتا ہے پھر دل کا اس کی دستیابی کے لیے کوشش کرنے کے لیے قطعی راغب نہ ہونا اس طرح کا اعتقاد سراسر معصیت اور اللہ کی نافرمانی ہے۔ ذرا سیّدنا یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹوں کو مخاطب کرتے ہوئے انداز بیان کو بغور ملاحظہ فرمائیں اور ناامیدی کی بلاخیزی کا اندازہ لگائیں:

﴿ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ (یوسف: ۸۷)

''اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بے شک حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہوتے مگر وہی لوگ جو کافر ہیں۔''

مراد یہ ہے کہ اہل ایمان سخت سے سخت حالات میں بھی صبر ورضا اور اللہ کی وسیع رحمت کی امید کا دامن نہیں چھوڑتے۔

امید، تمنا اور ارمان کے درمیان فرق

امید اور ارمان، یا تمنا اور آسرا دونوں الگ الگ معانی ومفاہیم پر مشتمل ہیں۔ ان دونوں کے درمیان فرق کی وضاحت ضروری امر ہے کیونکہ بہت سے لوگ اس وہم وگمان میں

[1] مدارج السالکین: ۲/ ۳۵.

رہتے ہیں کہ ان کو رب کریم کی رحمت سے امید ہے اگر حقیقت میں اس کا شرعی طور پر جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے اس کیفیت کا امید سے دُور دُور کا تعلق نہیں ہوتا بلکہ یہ تو صرف ان کے ارمانوں اور خیالات کا بخار ہوتا ہے ورنہ حقیقت میں اس کا امید وبیم سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔

امید اور تمنا دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ تمنا یا ارمان وہی شخص لگاتا ہے جو کاہلی اور سستی کا شکار ہو، تمنا کرنے والا کوشش اور کاوش کرنے کا عادی نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ اس راہ کی راہ نوردی کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے لیے اسباب اختیار کرنا گوارا کرتا ہے بلکہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتا ہے۔

خیرات وبرکات کے حصول کی امید رکھنے والا شخص اسباب ووسائل کا سہارا لے کر اپنے ہدف تک رسائی کی کوشش اور جدوجہد کرتا ہے جب تک کہ اس کی اپنے ہدف تک رسائی نہ ہو جائے۔امام مناوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”تمنا کرنا قابل مذمت چیز ہے اور امید قابل تعریف امر ہے کیونکہ صرف تمنا اور آرزو کر کے بیٹھ رہنا متمنی شخص کو کاہلی اور سستی کے نرغے میں مبتلا کر دیتی ہے پھر نکما اور بیکار بنا کر اسے کہیں کا نہیں چھوڑتی برخلاف امید کے، اور جہاں تک امید کا تعلق ہے تو اس صورت میں دل کا محبوب کی محبت کی بنیاد پر کسی چیز کے فوراً حصول کی امید میں رشتہ استوار کرنا امید کہلاتا ہے۔“

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”امید کی کوئی بنیاد ہوتی ہے اسی لیے کسی اصل اور ثابت حقیقت کی بنیاد پر ہی امید لگائی جاتی ہے اور تمنا بغیر کسی بنیاد کے کی جاتی ہے۔اس کا نہ کوئی سر ہوتا ہے اور نہ پیر، مثال کے طور پر بندہ جب اطاعت وفرماں برداری کے اعمال انجام دے چکتا ہے تو اس کی انجام دہی کے بعد کہتا ہے کہ میں امید کرتا ہوں اللہ تعالیٰ میری اس تھوڑی سی جدو جہد کو قبول فرما لے اور اس میں کوتاہی کا ازالہ فرما دے اور عفوودرگزر کا معاملہ فرمائے اس حال میں کہ میں ذات باری تعالیٰ سے حسن

ظن رکھتا ہوں تو بندے کا یہ فعل رجاء کہلاتا ہے اور اگر بندہ غفلت اور کوتاہی کا شکار ہو جائے اور اللہ کی اطاعت وفرماں برداری کرنا چھوڑ دے اور گناہوں کا ارتکاب شروع کر دے اور اللہ کی وعید کی ذرہ برابر پرواہ نہ کرے اور یہ کہتا پھرے کہ مجھے اللہ کی ذات سے حصول جنت کی امید ہے اور جہنم کے عذاب سے نجات کا آسرا ہے تو یہ محض تمنا اور آرزو ہے۔ پس پردہ اس کے کچھ بھی نہیں اس کو امید وآسرا اور حسن ظن کہنا غلط ہے بلکہ یہ تو بندے کی کج فہمی اور کھلم کھلا بے راہ روی ہے۔"❶

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کی امیدوں وآرزوں کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اس لیے کہ وہ صرف آرزو اور تمنا ہی نہیں کرتے بلکہ اللہ کی ذات سے انہیں امید وآسرا بھی ہوتا ہے مگر ان کا آسرا عمل کے ساتھ مربوط ہوتا ہے۔ اسی کیفیت کو قرآن کریم میں ان کی امید کے ساتھ ضم کر کے بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢١٨﴾﴾ (البقرة: ٢١٨)

"بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں جہاد کیا وہی اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔"

آیت کریمہ میں صراحت کے ساتھ یہ بات بتلائی گئی ہے کہ مومنین کی صفت یہ ہے کہ وہ پہلے ایمان لائے پھر اس کے بعد گھربار چھوڑا پھر اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر جنگ میں شریک ہوئے۔ ان اعمال کی انجام دہی کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی وصف بیانی کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت کی امید اور توقع رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ تو غفور رحیم ہے۔

❶ فیض القدیر: ٥/٦٧.

اللہ تعالیٰ نے تمنا اور آرزو کی مذمت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَآ أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتٰبِ ۗ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴾ (النساء: ۱۲۳)

''نہ تمھاری آرزوؤں پر (موقوف ہے) اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر، جو بھی کوئی برائی کرے گا اسے اس کی جزا دی جائے گی اور وہ اپنے لیے اللہ کے سوا نہ کوئی دوست پائے گا اور نہ کوئی مددگار۔''

یعنی قیامت کے دن اللہ کے روبرو اس کی مدد اور حمایت کے لیے کوئی تیار نہ ہوگا۔ [1]

امام حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''صرف چکنی چپڑی باتیں بنانے اور تمناؤں اور آرزوؤں کے پلندے باندھنے کا نام ایمان نہیں بلکہ دل میں جاگزیں اس کیفیت کا نام ایمان ہے جو پختگی کے ساتھ دل پر چسپاں ہو جائے اور اعضاء وجوارح اس کی جیتی جاگتی تصویر بن جائیں۔'' [2]

انہی سیدنا حسن رحمہ اللہ کا ہی قول ہے:

''کچھ ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جو آرزوؤں اور امنگوں کے چنگل میں ایسے پھنسے کہ انہیں دنیا سے اس حال میں رخصت ہونا پڑا کہ ان کی جھولی میں ایک نیکی تک نہ تھی مگر ان میں سے بعض کا کہنا یہ تھا کہ میں اپنے رب کریم سے حسن ظن رکھتا ہوں صحیح معنوں میں وہ جھوٹے اور دروغ گو لوگ تھے اگر وہ اپنے دعوے میں سچے ہوتے اور وہ اللہ کی ذات سے حسن ظن رکھتے تو اعمال کی انجام دہی میں سستی اور کاہلی نہ برتتے بلکہ بحسن وخوبی اعمال انجام دے کر اپنے دعوے کا پاس اور لحاظ رکھتے۔''

---

[1] مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۰۳۵۱۔ شعب الایمان للبیهقی: ٦٦، صححه ابن القیم

[2] فیض القدیر: ٦٧/٥۔

ارباب قلوب کے نزدیک یہ بات جانی پہچانی تھی کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے اور دل کی حیثیت کاشتکاری والی زمین کی طرح ہے۔ کاشتکاری کے لیے بیج کی فراہمی ضروری ہے، اسی طرح ان کے علم میں یہ بات جاگزیں تھی کہ دل کے لیے اللہ کی اطاعت وفرماں برداری کے کاموں کی انجام دہی ضروری ہے اور جہاں تک کاشتکاری والی زمین کا معاملہ ہے تو کاشتکاری کی غرض سے اس کی دیکھ بھال اور اس کی سینچائی، اس کے لیے نہروں کی فراہمی اور نہروں سے نالی بنا کر کھیتوں تک پانی کی رسائی وغیرہ کا معاملہ ضروری امر ہے۔ اسی طرح قلب کا معاملہ ہے کہ اس کی دیکھ بھال اور اس کی اللہ کی اطاعت وفرماں برداری کے پانی سے سینچائی ضروری ہے۔ اس کے بعد کھیت میں بوائی کے بعد سلیے نکل آنے کے بعد گوڈائی کی ضرورت ہوتی تاکہ ضرر رساں چیزوں سے فصل کے لہلہاتے پودوں کی حفاظت کی جائے تو آپ کے مشاہدہ میں یہ بات ہوگی کہ کاشتکار فصل کی گوڈائی کرتا ہے اور بے کار قسم کی خودرو گھاس پھوس کو گوڈائی کے دوران اکھاڑ کر پھینک دیتا ہے اور پورے کھیت کی گوڈائی کر کے فصل کے لیے مضر عناصر سے اسے پاک اور صاف کرتا ہے تاکہ مٹی میں پایا جانے والا غذائی مادہ بے کار اور ضائع نہ ہو جائے اور فصل کی بڑھوتری رک نہ جائے اور لہلہاتی کھیتی مضر عناصر کے نظر نہ ہو جائے۔ اس لیے وہ بڑی محنت سے گوڈائی کرتا ہے تاکہ اس کے کھیت میں اچھی فصل تیار ہو۔ اسی طرح مومن کا حال ہے وہ اپنے قلب کی ہر طرح کے شبہات وشہوات سے گوڈائی کرتا رہتا ہے تاکہ اطاعت وفرماں برداری کی کھیتی کو جس کی اس نے کاشت کی ہے اور جسے عبودیت وبندگی کے پانی سے سینچا ہے نقصان نہ پہنچ جائے اور اس کی لہلہاتی فصل خراب نہ ہو جائے۔

قلب کی خباثت کا ایمان پر بڑا برا اثر مرتب ہوتا ہے جیسے کہ بنجر زمین میں بوائی اور گوڈائی کرنے سے کاشتکاری کامیاب نہیں ہوتی اور نہ ہی فصل مل پاتی ہے اسی طریقہ سے خبیث اور ناپاک دل میں ایمان کا پنپنا دشوار ترین امر ہے۔

اس لیے بندے کی امید وبیم کی کیفیت کو کاشتکار کی امید وبیم کی کیفیت سے موازنہ کیا جانا چاہیے چنانچہ ہر وہ کاشتکار جو کاشتکاری اور کھیتی کرنے کے لیے مناسب زمین کا انتخاب

کرے اور اس کی جتائی کر کے اس کی بوائی کرے پھر پودے نکل آنے کے بعد بوقت ضرورت اس کی سینچائی بھی کرے اور اس کی دیکھ بھال کرتا رہے پھر وقت آنے پر اس کی گوڈائی بھی کرے تا کہ فصل ٹھیک آئے، پودوں کے درمیان خود رو گھاس پھوس کھرپی سے اکھاڑنے کا فریضہ انجام دے، اس کے بعد اللہ کے فضل وکرم سے امیدیں وابستہ کر کے اولے، بارش، بجلی اور آفات سماویہ سے حفاظت کی دعا کرتا رہے یہاں تک کہ فصل تیار ہو جائے اور کٹائی کا مرحلہ آ جائے کاشتکاری کا ابتدائی مرحلہ سے لے کر انتہائی مرحلہ تک یہ انتظار رجاء کہلاتا ہے یہی رجاء کی اصل حقیقت ہے۔

اگر کوئی شخص بنجر یا پتھریلی سخت زمین میں جتائی اور بوائی کرتا ہے تو وہ احمق ہے، اس کو ماہر کاشتکار نہیں کہا جا سکتا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص اچھی زمین میں جتائی اور بوائی کرتا ہے لیکن اس کھیت کا محل وقوع ایسا ہو کہ وہاں سینچائی کرنے کا بندوبست نہ ہو اور وہ کاشتکار جس نے اس کھیت میں سینچائی اور بوائی کی ہے یہ کہے کہ ہم بارش کا انتظار کریں گے تو اس کا یہ انتظار تمنا اور ارمان کہلائے گا اسے رجاء نہیں کہا جا سکتا۔

لہٰذا اس محبوب ومرغوب چیز کے انتظار کو امید یا رجاء کہا جاتا ہے جس کے داخلی اسباب جو کہ بندے کے اختیار اور تصرف اور اس کے ارادے کے تحت ہیں وہ مہیا ہوں بس وہ چیز باقی رہ جائے جو بندے کے اختیار اور تصرف اور اس کے ارادے کی دست رس سے باہر ہو مراد یہ ہے کہ وہ اسباب ووسائل جو بندے کی دست رس سے باہر ہوں بندہ کی ان اسباب ووسائل میں اللہ کی ذات سے لو لگانا امید (ورجاء) کہلاتا ہے۔

اسی طریقہ سے مومن اطاعات وبندگی اور عبادات وریاضات کی راہ میں اسباب ووسائل اختیار کرنے میں پوری توانائی صرف کرتا ہے، اس کے بعد اللہ کے فضل وکرم سے امید کرتا ہے کہ اسے اس روش پر ثابت قدم رکھے اور اسے اس راہ سے ہٹا کر بے راہ روی یا گمراہی وبے دینی کی راہ پر گامزن نہ کرے اور اس کو لادینی کے ماحول سے دوچار کر کے

گمراہوں کی روش اختیار کرنے کی طرف مائل نہ کرے یہاں تک رب کریم سے ملاقات ہو اور اس حال میں ہو کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو۔ یہی وہ کیفیت اور صورت حال ہے جو تمنا اور رجاء کہلاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سابقہ قوموں میں سے ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو تمناؤں میں الجھے ہوئے تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَخَلَفَ مِنۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَرِثُوا الْكِتٰبَ يَأْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا﴾ (الاعراف : ۱۶۹)

''پھر ان کے بعد ان کی جگہ نالائق جانشین آئے، جو کتاب کے وارث بنے، وہ اس حقیر دنیا کا سامان لیتے ہیں اور کہتے ہیں ہمیں ضرور بخش دیا جائے گا۔''

باغ والے کافر کا قصہ قرآن نے یوں بیان کیا ہے:

﴿وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿۳۶﴾﴾ (الکھف : ۳۶)

''اور نہ میں قیامت کو گمان کرتا ہوں کہ قائم ہونے والی ہے اور واقعی اگر مجھے میرے رب کی طرف لوٹایا گیا تو یقیناً میں ضرور اس سے بہتر لوٹنے کی جگہ پاؤں گا۔''

اس شخص کے لیے رب کریم کے پاس انعام واکرام، بھلائی کے حصول کا تصور کیوں کر کیا جاسکتا ہے؟ جس کے کھاتے میں عمل صالح کا دور دور تک کوئی وجود نہ ہو بلکہ ایسے شخص کو جھوٹی تمناؤں پر تکیہ کرنے والا کہا جائے گا۔

اس لیے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم جھوٹی تمناؤں پر تکیہ نہ کریں بلکہ اس سے بھرپور کنارہ کشی اختیار کرنا اپنا شیوۂ زندگی بنالیں اور سنت نبویہ کی پیروی کرتے ہوئے جدوجہد اور جانفشانی کے ساتھ عمل کرنے کی بھرپور کوشش اور سعی پیہم کرنا اپنی عادت بنالیں۔ اس کے بعد اللہ کی ذات سے امید لگائیں کہ وہ ہمیں خیرات وبرکات اور انعام واکرام سے نواز دے اور دنیا وآخرت میں اپنے فضل وکرم کی نعمت سے مالا مال ہونے کی سعادت نصیب فرمائے۔ آمین

امید کے شرمندۂ تعبیر ہونے کے عوامل واسباب

قلب مومن میں امید ورجاء کے تحقق کی غرض سے اسباب وعوامل کی انجام دہی ضروری ہے جوکہ مومن کی امیدوں کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں مدد ومعاون ہوں۔ علمائے کرام نے امیدوں کے سرسبز باغ تک رسائی کے بارے میں چار قسم کے اسباب وعوامل کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کا سہارا لے کر امیدوں کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کیا جاسکتا ہے وہ چار اسباب وعوامل مندرجہ ذیل ہے:

ا۔ بندے کی اپنے اوپر اللہ کے فضل وکرم کی سابقہ نعمتوں کی یاددہانی:

بندے کو یہ بات سوچنی چاہیے اور اس کو یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر گزشتہ نعمتوں کے ذریعے کتنا فضل وکرم کیا ہے۔ خصوصاً اس کو جس وقت عدم سے وجود بخشا اور اس کو سماعت وبصارت کی نعمت سے نوازا اور اس کائنات ارضی کو اس کے لیے جائے قرار بنایا اور اس پر اپنی آسمانی کتابوں کو نازل کیا اور اس کی ہدایت کی غرض سے رسولوں کو مبعوث فرمایا اور اس کے لیے اس دین اور اس شریعت عظمیٰ میں داخلہ آسان فرمایا۔ یہ سارے کے سارے انعامات وہ ہیں جوکہ اللہ کی طرف سے اس پر گزشتہ زمانے میں ہوچکے ہیں۔ اب اس کو اس پر غور وفکر کرنا ہے اور اس کی یاددہانی کرنی ہے۔ یہی وہ نسخہ کیمیا ہے جو اس کی امیدیں برلانے کا ذریعہ ہے۔

۲۔ اللہ کے اجر وثواب جود وسخا کے عہد کی یاددہانی بھی امیدوں کا ملجاوماوی ہے:

بایں طور کہ بندہ مذکورہ ذیل اجر وثواب کا قطعاً مستحق نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ بندے کو اس کے استحقاق سے بڑھ کر بطور مکافات عمل نوازتا ہے اور اجر وثواب عطا فرماتا ہے۔ بندے کی قلت عبادت اور معمولی اطاعت کے باوجود رب کریم اس پر اپنی جود وسخا کے خزانے لٹاتا چلا جاتا ہے اور اس پر اپنی نوازشات کی بارش کرتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ بندہ اگر اس بات کو سوچ لے تو اللہ کے اجر وثواب اور اس کے فضل وکرم کے حصول کی لالچ میں اس کے اندر

اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور اسے اس بات کی امید پیدا ہو جائے گی کہ اس کا بھی ان لوگوں میں شمار ہو جائے جو اس جود وسخا اور فضل وکرم سے بہرہ ور ہیں اور اللہ کے اجر وثواب کی نعمت کبریٰ سے مالا مال ہیں۔

۳۔ اللہ کی نعمتوں اور نوازشوں کی عمومی طور پر یاد دہانی:

اللہ کی ذات تو وہ ذات بابرکات ہے جو ہم پر نعمتوں اور نوازشوں کی بارش کیے ہوئے ہے، ان نعمتوں کا سلسلہ دین و دنیا دونوں پر محیط ہے۔ اس نے ہم کو ہمارے دل و سماعت وبصارت جیسی نعمت سے محظوظ ہونے کا موقع عنایت فرمایا ہے اور ہم کو مال ومتاع، آل واولاد، بیوی وخادمات جیسی ثروت ودولت سے نوازا ہے۔ یہ سارے کے سارے عیش وآرام کے ساز وسامان اللہ تعالیٰ نے جس سے انسان کو سرتا پیر ڈھانپ رکھا ہے بندے کو اللہ سے امید کرنے اور اس کی طرف راغب ہونے میں مہمیز کا کام کرتے ہیں۔

۴۔ اللہ کی وسعت رحمت کی یاد دہانی:

مراد یہ ہے کہ اللہ کی رحمت اس کے غیظ وغضب پر حاوی ہے اور کیوں نہ ہو؟ اللہ کی ذات والا شان رحمٰن ورحیم، غنی وکریم مومن پر بڑی مہربان ہے۔ مراد یہ ہے کہ اللہ کی ذات تو وہ عظیم الشان ذات ہے جو بڑی مہربان، نہایت رحم کرنے والی، بے نیازی کی صفت سے متصف، نہایت کریم [سخی وداتا، فیاضی کی صفت سے مالا ہے] اسی لیے امید ورجاء کا تحقق اسماء اللہ اور اس کی صفات کی معرفت پر منحصر ہے جتنی زیادہ اسمائے حسنیٰ اور اس کی صفات کی معرفت مومن کے قلب میں جاگزیں ہوتی جائے گی اتنی ہی اللہ کی ذات سے امید میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

بندہ کی امید ورجاء کی صحت اور اس کے تحقق کی علامت وپہچان بھی یہی ہے۔ اسی لیے جب احمد بن عاصم رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ ''بندے کی امید ورجاء کی علامت کیا ہے؟'' تو انہوں نے جواب دیا:

''جب بندے پر انعام واکرام کی بارش ہو اور اللہ کے احسان سے بندہ پورے

طور پر ڈھکا ہوا ہو تو اس وقت اس کو الہامی طور پر اللہ کے شکر کی توفیق نصیب ہو جائے۔ دنیا میں باری تعالیٰ کی ذات سے اس کی نعمتوں کے اتمام کی امید کرتے ہوئے اور آخرت میں اس کے عفو ودرگزر کی اُمید کرتے ہوئے (یہ ہے امید ورجاء کے تحقق کی علامت ونشانی)۔‘‘ [1]

اللہ کی ذات سے امید کے فوائد وثمرات

اللہ کی ذات سے امیدیں وابستہ کرنے کے بڑے ثمرات اور عظیم ترین فوائد ہیں۔ ان میں چند کا ذکر آئندہ سطروں میں پیش خدمت ہے۔

۱۔ عبادات میں انہماک اور پابندی بھی رجاء کے فوائد کا اہم ترین مظہر ہے:

امام ابن قیم رحمہ اللہ اللہ کی طرف رجوع کرنے والوں کے بارے میں تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

’’ان میں سے انابت کرنے والا وہ شخص بھی ہے جو مختلف قسم کی عبادات میں مشغول اور انواع واقسام کی طاعات کی پابندی کر کے اللہ کی طرف رجوع کا مظاہرہ کرتا ہے اور عبادات میں پوری توانائی کے ساتھ کوشاں رہتا ہے گویا کہ طاعات وعبادات اس کی محبت وچاہت کا محور بن جاتے ہیں۔ بندے کی یہی وہ کیفیت ہے جس کو رجوع الی اللہ اور انابت الی اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کا مصدر رجاء اور امید ہے اور اللہ کے وعدہ وعید اور اس کے اجر وثواب کا گہرائی سے مطالعہ ہے دراصل اللہ کی طرف سے اعزاز وکرامت کے حصول کی امید وچاہت ہی بندے کو اس کام کی انجام دہی کے لیے آمادہ کرتی ہے۔‘‘ [2]

۲۔ عبادات میں لذت محسوس ہونا بھی امید ورجاء کے فوائد کا مظہر ہے:

امام ابن قیم رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں:

[1] مختصر تاریخ دمشق: ۳۵۷۔ [2] طریق الھجرتین: ۲۷۲۔

"امید ورجاء وہ حدی خواں ہے جو امید کے دوش پر سوار بندے کو اللہ تک پہنچنے کے راستہ کی رہنمائی کا فریضہ انجام دینے والا رہبر ہے۔ یہی وہ قائد ہے جو بندے کو تیز رفتاری سے راستہ طے کرنے کی ترغیب دینے والا ہے اور اپنی حدی خوانی سے اس کو سفر طے کرنے پر آمادہ کرنے والا حدی خواں ہے۔ یہ امید ہی ہے جو بندے کو اللہ تعالیٰ کی جناب سے نہ ہٹنے کی ترغیب دینے کا ذریعہ اور آلہ کار ہے تاکہ بندہ اللہ کی ذات کو مضبوطی سے پکڑے رہے اور اسی سے امیدیں وابستہ رکھے۔ اگر امید نہ ہو تو بندہ اپنا سفر جاری نہ رکھ سکے اور ایک جگہ جم کر بیٹھ جائے کیونکہ صرف خوف وخشیت بندے کے اندر حرکت ونشاط پیدا نہیں کرسکتی جو چیز بندے کے اندر نشاط پیدا کرتی ہے وہ حب الٰہی کا داعیہ ہے اور خوف اس کے اندر ہیجانی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ اس کے بعد رجاء اس کے لیے حدی خوانی کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔" [1]

۳۔ اللہ تعالیٰ کے لیے عبودیت کا اظہار بھی رجاء کے فوائد کا مظہر ہے:

بندے کی جانب سے عبودیت کا اظہار صفت رجاء سے متصف ہونے میں پنہاں ہے امید ہی وہ نسخہ کیمیا ہے جو فاقہ اور حاجت کے وقت اللہ سے لو لگانے کا ذریعہ ہے اور اس بات کا کھلم کھلا اظہار ہے کہ بندہ اللہ کے فضل وکرم، اس کی نوازشات اور احسانات سے ایک لحہ کے لیے مستغنی نہیں ہوسکتا۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"بندے کی اللہ کی ذات سے لو لگانے کی کیفیت اور اسی کی ذات امیدیں وابستہ کرنے کی صفت ہی وہ وسیلہ ہے جو بندے کو اللہ کی عبودیت کے لیے مجبور کرتا ہے اور اللہ کی ذات سے حاجت برآری کی طلب اور اس سے امیدیں وابستہ کرنے اور لو لگانے سے دل کا اعراض ہی بندے کے قلب کو اللہ کی عبودیت

[1] مدارج السالکین: ۲/ ۵۰۔

سے کنارہ کشی اور روگردانی پر آمادہ کرتا ہے۔“ ❶

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”جہاں تک بندے کا اپنے رب کے سامنے خود سپردگی کا قضیہ ہے اور اس کے سامنے عاجز ہو کر اپنے آپ کو سپرد کر دینے کا مسئلہ ہے اور اس کے احکامات (اوامر ونواہی) پر راضی برضا رہنے کا معاملہ ہے تو یہ سارا کا سارا اس کی رحمت کے حصول کی امید میں ہی تو ہے تاکہ رب کریم اس کی لغزشوں کو مٹا دے اور اس کے گناہوں کو معاف فرما دے اور اس کی نیکیوں کو عیوب کی آمیزش اور آفات وخرابیوں کی ملاوٹ کے باوجود قبول فرمالے اور اس کی نافرمانیوں کی پردہ پوشی فرما دے یہ اس کی رجاء وامید ہی ہے جس نے اس کو اللہ کی جناب میں اس طرح کی خود سپردگی اور فرماں برداری کے لیے آمادہ کیا ہے بغیر امید ورجاء کے اس اطاعت کا تصور محال ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے رجاء یعنی امید دعا اور مناجات کی زندگی ہے اور ارادہ یعنی عزم محکم اس کی روح ہے۔“ ❷

۴۔ دعا جیسی اہم ترین عبادت کا تحقق امید ورجاء کی دین ہے:

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”دعا کا ڈھانچہ امید ورجاء کے ملبہ پر کھڑا ہوا ہے۔ کیونکہ دائی دعا کرنے والے کا مطمع نظر جب تک اپنی مراد تک رسائی یا اپنے مطلوب کا حصول نہ ہو اس وقت تک اس کے نفس میں نشاط پیدا نہ ہوگی کیونکہ جس چیز کی چاہت ورغبت نہ ہو اس کا طلب کرنا یا مانگنا فضول اور بے کار ہے۔“ ❸

۵۔ اس کے فوائد میں سے ایک فائدہ اللہ کے غیظ وغضب سے نجات بھی ہے:

امید ورجاء کا یہ فائدہ دراصل سابقہ فائدہ اور ثمرہ پر مبنی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں

❶ الفتاوی الکبری: ۵/۱۸۲.
❷ مدارج السالکین: ۲/۴۵.
❸ بدائع الفوائد: ۳/۵۲۳.

سے یہی چاہتا ہے کہ وہ اسی سے مانگیں اور اسی سے لو لگائیں اور اسی سے امیدیں وابستہ کریں اور اسی کے سامنے آہ وزاری کریں اور تضرع والحاح کے ساتھ ہاتھ پھیلا کر اس کی جناب میں دعا مانگیں کیونکہ اس کی ذات جواد اور کریم ہے۔ سخاوت وکرم اس کی ذاتی صفت ہے، جن سے سوال کیا جائے ان میں اس کی ذات سخاوت کی بلندی پر فائز ہے اور عطا کرنے والوں میں اس کی ذات وسعت وہمہ گیری کے اعتبار سے بام عروج پر فائز ہے اور اس جود وسخا کے پیکر جس کی صفت کرم ہی کرم ہے کے نزدیک محبوب ترین بات یہ ہے کہ لوگ اسی کے سامنے دست سوال دراز کریں اور اسی سے مانگیں اور حاجت برآری کا سوال کریں اور جو شخص اللہ سے نہیں مانگتا اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوتا ہے۔

سیّدنا ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ سے نہیں مانگتا اللہ تعالیٰ اس سے خفا ہوتا ہے۔'' [1]

چنانچہ رجاء وامید کے فوائد میں سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ رجاء یا امید اللہ کے غیظ وغضب سے نجات کا ذریعہ ہے۔

٦۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی معرفت بھی ایک فائدہ ہے:

کیونکہ امید کرنے والے کا دل اور دماغ اللہ کے اسماء وصفات سے وابستہ رہتا ہے۔ اسی کی بنیاد پر بندے کا براہ راست اللہ سے تعلق قائم ہو جاتا ہے دراصل امید کا تعلق اللہ کے اسم گرامی کریم سے جا کر جڑ جاتا ہے کیونکہ بندہ اللہ کی ذات سے کرم وعنایت کا خواستگار رہتا ہے۔ اسی طرح بندے کا تعلق اللہ کے اسم گرامی رحیم سے رہتا ہے کیونکہ بندے کو اس کی ذات رحیمی سے رحم وکرم کی امید ہوتی ہے۔ اسی طرح بندے کا تعلق اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی تواب سے ہوتا ہے اس لیے کہ بندہ اس کی ذات سے توبہ کی قبولیت کی امید رکھتا ہے۔ اسی

---

[1] ترمذی، کتاب الدعوات، باب منه (من لم یسال اللّٰہ یغضب علیه) : ٣٣٧٣ وصححه الالبانی رحمه اللّٰه.

طرح اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی غفور سے ہوتا ہے کیونکہ بندہ اللہ کی ذات سے عفوودرگزر کی آس لگائے رہتا ہے۔

یہ دلیل ہے اس بات کی کہ امید ورجاء اللہ کے اسمائے حسنیٰ اور صفات کی معرفت میں بڑھوتری اور نموکا باعث ہوا کرتے ہیں۔ اس سے علم اسماء اللہ الحسنی وصفاتہ العلیٰ کا فیضان ہوتا ہے جو بندہ کو اس کے مطالعہ اور اس کے فہم وادراک میں گہرائی کے لیے آمادہ کرتے رہنے میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔

۷۔ ایک اہم فائدہ اپنے مقصود ومطلوب تک رسائی بھی ہے:

کیونکہ بندہ کا دل اور دماغ جب رب کریم کی ذات سے وابستہ ہوجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو وہ کچھ عطا فرمادیتا ہے جس کی وہ اس سے امید لگائے ہوتا ہے اور پھر اس کو مقصود ومطلوب تک رسائی حاصل ہوجاتی ہے۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جب کبھی بندے کا اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ حسن ظن کا رشتہ استوار ہوجاتا ہے اور اللہ کی ذات اقدس سے حقیقت میں وہ آس لگانے والا بن جاتا ہے اور رب کریم کی ذات پر سچا اور پکا توکل کرنے لگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے مایوس نہیں کرتا اور اس کی امیدوں پر پانی پھیرتا اور سرے سے مایوسی اور قنوطیت سے اسے دوچار ہونے نہیں دیتا کیونکہ اللہ کی ذات بڑی رحیم وکریم اور مہربان ومشفق ہے وہ کسی امید اور آس لگانے والے کی امید اور آس پر پانی نہیں پھیرتا اور اسے مایوس نہیں کرتا اور کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع اور رائیگاں نہیں کرتا۔'' [1]

جب بندے کو اس کے مقصد میں کامیابی مل جاتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی توجہ مبذول ہوتی چلی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات سے اس کا تعلق استوار ہوتا چلا جاتا ہے پھر اللہ کی ذات پر اس کا توکل مستحکم اور مضبوط ہوجاتا ہے اور اس کی طبیعت کا رجحان اللہ سے

---

[1] مدارج السالکین: ۱/۴۷۱.

دعا اور مناجات اور اس سے حاجت برآری کی طرف مبذول ہوتا چلا جاتا ہے پھر خیر و بھلائی اور احسان وسلوک کی راہ میں اس کی رسائی ہوتی چلی جاتی ہے اور روز افزوں اس میں نکھار آتا رہتا ہے۔

بندہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے جس چیز کے حصول کا طلب گار رہتا ہے اور اسے جس چیز کے حاصل کرنے کی تمنا ہوتی ہے ان میں نفیس ترین اور عمدہ چیز اللہ کی رضا مندی اور خوشنودی کے حصول اور جنت میں داخلہ اور اس میں دیدار الٰہی کی تمنا وخواہش ہے۔

لہٰذا تم کو اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ تم مذکورہ امور میں رب کریم کی ذات سے امیدیں وابستہ رکھو تا کہ تم بھی اپنے مطلوب ومقصود تک رسائی حاصل کر کے ان کے حصول سے مشرف ہوسکو۔

۸۔ اس کے فوائد میں سے اللہ تعالیٰ کی محبت بھی ہے:

یہ فائدہ سابقہ فائدے کے تتمہ اور تکملہ کے طور پر بطور نتیجہ رونما ہو کر سامنے آتا ہے کیونکہ بندے کو جب اپنا مطلوب ومقصود حاصل ہو جاتا ہے، خاص طور پر اس کی وہ دلی امید بر آتی ہے جس کی وہ رب کریم کی ذات سے اُمید لگائے بیٹھا ہوا تھا تو اس کا اللہ تعالیٰ سے تعلق گہرا ہوتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ ذات باری تعالیٰ سے محبت کرنے لگتا ہے اور راضی برضا رہنا اس کا شیوۂ زندگی بن جاتا ہے اور بندے کا اللہ تعالیٰ سے جتنا تعلق بڑھتا ہے اس کی اللہ کی ذات سے امید لگانے کی کیفیت میں اتنا ہی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

۹۔ امید کی ہی اثر پذیری ہے جو اللہ کا شکر بجالانے کے لیے ابھارتی ہے:

چنانچہ مومن کو جب اپنی امیدوں کے حصول میں کامیابی نظر آنے لگتی ہے اور جوں جوں اس کی امیدیں بر آتی دکھائی دیتی ہیں تو اس کے لیے یہ کیفیت اللہ کا شکر بجالانے کا باعث اور سبب بن جاتی ہے۔ اسی لیے تو اللہ کے شکر کی بجا آوری عبودیت کی معراج ہے دراصل عبودیت اور بندگی کے سلسلہ میں یہ بڑا بلند و بالا مقام ہے۔

۱۰۔اس کے فوائد میں سے اللہ کے ذکر پر مداومت بھی ہے:

کیونکہ اللہ کے فضل وکرم سے مشرف ہونے کی خاطر امید لگانے میں انتظار کرنا پڑتا ہے اورآسرکرنا پڑتا ہے۔توقع اور بھروسا کرنا پڑتا ہے امید وآس کے بارے میں یہی وہ کارگر پہلو ہے جوخالق کریم سے تعلق میں اضافہ کرنے کا باعث بنتا ہے اور دائمی طور پر اس کی طرف توجہ مرکوز رکھنے کا ذریعہ وسبب ثابت ہوتا ہے۔

انسان کے متعدد مقاصد اور ارادے ہوا کرتے ہیں اور وہ طرح طرح کی مرادیں اور تمنائیں اپنے دل میں بسائے رہتا ہے چنانچہ کبھی اس کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو تعلیم کی راہ میں کامیابی عطا فرمائے اور جب پڑھ لکھ کر تیار ہوجاتا ہے تو پھر تمنا کرتا ہے کہ کاش کہ کوئی خاطرخواہ نوکری مل جائے اور جب نوکری مل جاتی ہے تو اس بات کی تمنا کروٹیں لینے لگتی ہے کہ کوئی مناسب شریک حیات کا سہارا نصیب ہوجائے اور شادی ہوجانے کے بعد اولاد کی امید لگائے سرگرداں نظر آتا ہے اور جب اولاد مل جاتی ہے تو ان کی تعلیم وتربیت، ان کی پرورش، ان کی اصلاح اور ساخت وپرداخت کی فکر دامن گیر ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ انسان پوری عمر اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے امید وآس لگائے رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی سے اپنا تعلق استوار رکھتا ہے۔اسی طرح رفتہ رفتہ اس کی زندگی آرزوؤں اور تمناؤں میں گزر جاتی ہے۔

مومن اپنی زندگی کے شب وروز اُمید میں گزارتا ہے

امام عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”اگر مومن کو اللہ کی رحمت کاملہ کی وسعت اور ہمہ گیری کا یقین ہوجائے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے مومنین کے لیے اپنے دامن رحمت میں چھپا رکھا ہے اس کی شناسائی ہوجائے تو سرے سے وہ ناامیدی کا شکار ہی نہ ہو اور اللہ کی رحمت سے اسے کبھی مایوسی نہ ہو اور اگر اسے اللہ تعالیٰ کے عذاب کا صحیح اندازہ ہوجائے اور

اللہ تعالیٰ نے جس عذاب کو تیار کر رکھا ہے مومن کو اس کا صحیح یقین ہو جائے تو بندہ کبھی بھی خوف کے دامن کا سرا ہاتھ سے نہ جانے دے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مومن اپنی زندگی کے شب و روز امید کی حالت میں گزارے اور امید پر تکیہ کرنے نیز اللہ سے لو لگانے میں مرجئہ کی طرح نہ بن جائے۔ جن کا کہنا ہے کہ ایمان کے ساتھ کوئی چیز مضرت رساں نہیں ہو سکتی اگر دل میں ایمان ہے تو بندے کے لیے یہی کافی ہے اب کوئی چیز اس میں نقص و زیادتی کا باعث نہیں بن سکتی اور نہ ہی بندہ خوف کے معاملہ میں خوارج و معتزلہ کی صف میں جا کر شامل ہو جائے جو کہ کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کو اگر وہ توبہ کیے بغیر مر جائیں دائمی طور پر واصل جہنم ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں تو مومن ان دونوں صورتوں کی درمیانی کیفیت پر عمل پیرا ہو کر زندگی کی راہ پر چلنا اپنا شیوہ بناتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَ یَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ﴾ (الاسراء: ٥٧)

''اور اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔''[1]

امید و بیم کی درمیانی کیفیت کے بارے میں اہم ترین اصول اور قاعدہ ہے ہر مومن کے دل میں جسے جاگزیں رہنا چاہیے وہ یہ ہے کہ مومن کی زندگی امید و بیم کی حالت میں گزرتی ہے۔ اس کی صبح و شام کے سنہرے لمحات اسی مدار کے اردگرد چکر کاٹتے رہتے ہیں اس کے دل میں اگر ایک طرف اللہ کی رحمت سے امید و آس ہوتی ہے تو دوسری طرف اسے ہر وقت اللہ کے عذاب کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ یہی وہ بندہ ہے جو سچا مومن کہلانے کا مستحق ہے امید و بیم کی درمیانی کیفیت پر عمل کرنا مومن کامل کی علامت ہے۔ اس کے بغیر صحیح مومن ہونا محال ہے۔

امام ابوعلی روذباری رحمہ اللہ کا قول ہے:

''امید و بیم کی مثال پرندے کے دو پروں کی طرح ہے۔ اگر اس کے دونوں پر صحیح

[1] عمدة القاری: ٢٣/٦٦-٦٧.

سلامت اور متوازن ہیں تو اس کی اڑان بھی موزوں اور درست ہوگی اور اگر دونوں پروں میں سے کسی ایک پر میں ذرہ برابر خلل یا نقص ہے تو اس پرندے کی اڑان موزوں اور درست نہیں ہوسکتی اور اگر پرندے کے دونوں پر جاتے رہیں تو اس پرندے کا ستیاناس ہوگیا گویا کہ وہ مرگیا۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ اگر مومن کے خوف وامید کے پہلوؤں کو ترازو کے دو پلڑوں پر رکھ کر تولا جائے تو دونوں پلڑے برابر برابر نکلیں گے۔“ [1]

خوف وامید کی درمیانی کیفیت میں توازن برقرار رکھنا اور دونوں پر بیک وقت عمل پیرا ہونا قرآن کریم کا منہج ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”قرآن کریم کی اکثر وبیشتر آیات میں خوف وامید میں سے دونوں پہلوؤں کا ایک ساتھ ذکر ہوا ہے۔“ [2]

ارشاد باری تعالیٰ ہے

﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوهٌ﴾ (آل عمران : ١٠٦)

”جس دن کچھ چہرے سفید ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے۔“

مذکورہ آیت کریمہ کے اندر ایک ہی سیاق میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بعض بندوں کو خوبروئی کی امید دلائی ہے اور بعض بندوں کو بطور عذاب بدروئی وبدنمائی کی دھمکی دی ہے کہ یوم محشر ان کے چہرے اللہ کے روبرو حاضری کے وقت سیاہ ہوں گے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيعُ الْعِقَابِ ۖ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٦٧﴾﴾ (الاعراف : ١٦٧)

”بے شک تیرا رب یقیناً بہت جلد سزا دینے والا ہے اور بے شک وہ یقیناً بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔“

آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے دنیا ہی میں مجرموں کو جلد از جلد عذاب کی دھمکی دے کر

[1] شعب الایمان : ١٠٢٧۔ [2] شرح مسلم : ٧٣/١٧۔

اور اپنی مغفرت ورحمت عفو ودرگزر کی ترغیب دے کر امید وبیم کے دونوں پہلوؤں کو باہم شیر وشکر کر دیا ہے۔

اسی سیاق میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ﴿١٣﴾ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ ﴿١٤﴾﴾

(الانفطار: ١٣، ١٤)

''بے شک نیک لوگ یقیناً بڑی نعمت میں ہوں گے اور بے شک نافرمان لوگ یقیناً بھڑکتی آگ میں ہوں گے۔''

ارشاد ربانی ہے:

﴿فَأَمَّا مَن ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ ﴿٦﴾ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ ﴿٧﴾ وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ ﴿٨﴾ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ ﴿٩﴾﴾ (القارعة: ٦، ٩)

''تو لیکن وہ شخص جس کے پلڑے بھاری ہو گئے تو وہ خوشی کی زندگی میں ہوگا۔ اور لیکن وہ شخص جس کے پلڑے ہلکے ہو گئے تو اس کی ماں ہاویہ ہے۔''

امید وبیم کی کیفیت پر دلالت کرنے والی آیات بہت زیادہ ہیں جن میں سے ہر آیت میں خوف اور اُمید کا سنگم ہوتا ہوا نظر آتا ہے یا کم از کم دو متواتر آیات یا چند آیات میں تسلسل کے ساتھ اس موضوع کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ اس طرح کا اسلوب بیان قرآن کریم کی خاصیت ہے۔ قرآن کریم میں جابجا اس طرح کا سیاق وسباق موجود ہے۔

اگر ذرا غور وفکر سے کام لیا جائے تو ہمیں بخوبی اس بات کا پتہ چل جائے گا کہ خوف اور امید دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے، جس طرح خوف امید سے جدا نہیں ہوسکتا اسی طرح امید بھی خوف سے جدا نہیں ہوسکتی۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ ہر خائف کے دل کے اندر سراسیمگی کے عالم میں امید کی کرن ضرور کروٹیں لے رہی ہوتی ہے اور ہر امید کرنے والے کو خوف کا کھٹکا ضرور لگا رہتا ہے۔ اسی لیے کہا جاسکتا ہے کہ جس جگہ خوف اور ڈر کا وقوع مستحسن ہو وہاں امید اور آس کا وقوع بدرجہ اولیٰ مستحسن امر ہوگا

کیونکہ امید وبیم دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا﴾ (نوح : ١٣)

''تمھیں کیا ہے کہ تم اللہ کی عظمت سے نہیں ڈرتے۔''

مراد یہ ہے کہ تم اللہ کی عظمت وجلالت شان سے ڈرتے کیوں نہیں؟ بہت سے مفسرین نے آیت کریمہ کے اسی معنی کو ترجیح دی ہے۔[1]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''خشیت معنی کے اعتبار سے امید ورجاء کی متقاضی ہوا کرتی ہے۔ اگر خشیت میں امید وبیم کا پہلو نہ پایا جائے تو وہ خشیت کہاں رہی؟ بلکہ وہ تو مایوسی کہلائے گی جیسے کہ رجاء یا امید کے لیے خوف کا ہونا لازم ہے۔ اگر امید کے ساتھ خوف کا تقاضا نہ پایا جائے تو وہ امید کہاں رہی؟ بلکہ وہ تو امن وامان کہلائے گی۔ اسی لیے اللہ کی ذات سے خوف کھانے والے اور اس کی ذات سے امید رکھنے والے ہی اصلاً اہل علم ومعرفت ہیں، جن کی اللہ تعالیٰ نے بذات خود مدح سرائی فرمائی ہے۔''[2]

یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ایک گروہ جادۂ حق سے بھٹک گیا ہے، جیسا کہ امام عینی رحمہ اللہ نے توضیح فرمائی ہے کہ اس سلسلہ میں دو فرقے موجود ہیں۔ ایک فرقہ تو وہ ہے جو امید ہی امید کرتا ہوا نظر آتا ہے اس نے امید کو اپنی سواری بنا کر اسی پر تکیہ کر لیا ہے اور دوسرا فرقہ وہ ہے جو خوف کے دوش پر سوار ہو کر اسی کا ہو کر رہ گیا ہے۔ اس نے خوف کے سامنے امید کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا ہے۔ مگر اہل سنت والجماعت میں سے اہل حق امید وبیم دونوں کے دوش پر سوار ہو کر زندگی کی پر پیچ راہوں کا سفر طے کرتے ہیں۔ وہ امید وبیم میں سے ایک پہلو پر تکیہ نہیں کرتے بلکہ ان کے نزدیک دونوں کا پلڑا برابر رہنا ضروری امر ہے۔

جو لوگ اہل علم کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے خوگر ہیں، ان کی نگاہوں سے اس سلسلہ

---

[1] تفسیر طبری: ٢٤٩/١٢۔ تفسیر جامع لاحکام القرآن: ٢٦١/١٨۔

[2] مجموع الفتاوی: ٢١/٧۔

میں بعض اہل علم کے اقوال گزرے ہوں گے جن میں بعض اہل علم نے خوف کے پہلو کو امید ورجاء کے پہلو پر فائق قرار دیا ہے اور ان میں بعض علماء وہ ہیں جنہوں نے امید ورجاء کے پہلو کو خوف کے پہلو پر غالب قرار دیا ہے۔ درحقیقت یہ معمولی اور نسبی ترجیح ہے جسے درخور اعتناء نہیں سمجھا گیا ہے۔ یہ اس قسم کی ترجیح نہیں ہے جیسا کہ گمراہ اور بدعتی فرقوں کا شعار ہے۔ یہ دونوں قول جن کا ذکر ہوا، ان میں بحث ونظر کی وسعت موجود ہے کیونکہ علمائے کرام میں بعض علماء موجود ہیں جو ان دونوں اقوال کی تائید کرتے ہیں اور بعض اسلاف کا ان دونوں اقوال کے بموجب عمل بھی رہا ہے۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اسلاف میں سے صالحین کا اس سلسلہ میں موقف دوچند ہو جاتا ہے جب ایک دوسرے پر سبقت کا موقع آتا ہے تو اس مسئلہ میں وہ مختلف اقسام میں بٹ جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگوں کو قلق اور اضطراب لاحق ہو جاتا ہے۔ اسی لیے وہ اضطرابی کیفیت کا شکار ہو کر کہنے لگتے ہیں کہ میرے لیے ہلاکت و بربادی ہے اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے بخشش اور عفوودرگزر سے نہ نوازا جس کی پاداش میں یا تو جہنم رسید ہوں گا، الا یہ کہ مجھے اللہ تعالیٰ بخش دے تو اور بات ہے۔

اور ان میں سے بعض لوگ وہ ہوتے ہیں جن کو امید کا سہارا ہوتا ہے جیسے کہ سیّدنا بلال حبشی رضی اللہ عنہ کا قصہ مشہور ہے کہ ان کی بیوی ان کی وفات کے موقع پر جب کہتی ہیں کہ ہائے افسوس، ہائے میرا رنج وغم اور میری مصیبت تو سیّدنا بلال حبشی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میرے کیف وسرور کا کیا کہنا؟ کل میں اپنے دوست احباب سے ملوں گا یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین سے اس دار فانی سے کوچ کرنے کے بعد کل میری ملاقات ہوگی۔"[1]

اس مسئلہ میں تیسرا قول یہ ہے کہ نہ تو خوف کا پہلو امید کے پہلو پر غالب ہو اور نہ ہی

[1] بدائع الفوائد: ۳/۷۲۵.

امید کا پہلو خوف پر غالب قرار پائے باستثنا چند ناگزیر حالات جن کا ذکر مندرجہ ذیل ہے مذکورہ نے تینوں طریقے درست ہیں اور معنی کے اعتبار سے قریب المعنی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جہاں ہم سے خوف اور امید کی حالت میں تیار رہتے ہوئے زندگی گزارنے کا مطالبہ کیا ہے وہیں اس کے لیے چند اسباب اور وسائل بھی مہیا کر دیے ہیں جو کہ اس راہ میں مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ انہیں اسباب و وسائل میں سے اہم ترین سبب امید و بیم کی کیفیت یا اس کی حالت کا مخفی ہونا بھی ہے تاکہ لوگوں کو یہ پتہ نہ چل سکے کہ اس کے اعمال کا خاتمہ کس بنیاد پر ہوا ہے جس کی بنیاد پر لوگ پوری زندگی امید و بیم کی حالت میں صرف کر دیں۔ یہی وہ راز ہے جو امید و بیم کی کیفیت میں اسرار پنہانی کی شکل میں موجود ہے۔

امام ابن بطال رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"بندے سے عمل کے خاتمہ کے معاملہ کی پوشیدگی میں بڑی حکمت بالغہ پنہاں ہیں اور بڑی لطیف اور باریک تدبیر الٰہی کا راز پوشیدہ ہے کیونکہ اگر بندے کو اس بات کا علم ہو جائے کہ اس کو کامیابی اور نجات کی گارنٹی مل چکی ہے تو غرور اور تکبر میں مبتلا ہو کر سستی و کاہلی کا شکار ہو جائے اور اگر اسے پیشگی یہ پتہ چل جائے کہ وہ ناکام و نامراد ہے۔ ہلاکت و بربادی اس کا مقدر بن چکی ہے تو اس کی سرکشی اور طغیانی بڑھتی چلی جائے۔ اسی لیے اس مسئلہ کو اس کے فہم و ادراک اور علم کی دسترس سے بالا رکھا گیا ہے تاکہ مومن امید اور خوف کے عالم میں زندگی گزارنا اپنا طرۂ امتیاز بنا لے۔" ❷

بعض علمائے کرام نے یہاں پر ایک لطیفہ بیان فرمایا ہے کہ سورج گرہن ہونے میں بھی اس بات کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ بندے کو چاہیے کہ وہ امید و بیم کو اپنی زندگی کا لازمہ بنائے رہے اسی لیے امام ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"سورج گرہن کے وقوع کی متنوع حکمتوں میں سے ایک حکمت لوگوں کو امید

---

❶ فتح الباری: ١١/ ٣٣٠.

کا راستہ اختیار کرنے کی طرف رہنمائی کے فریضہ کی انجام دہی بھی ہے۔ بایں طور کہ سورج گرہن مدار میں چکر کاٹنے والے سیارے کے متاثر ہونے کی وجہ سے ہوا کرتا ہے۔ پھر خود بخود یہ اثر زائل ہو جاتا ہے تاکہ مومن کے دل میں اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید وبیم کی کیفیت پیدا ہو جائے اور اس کو سورج کی وجہ سے اس راہ پر گامزن رہنے کی تلقین ہو جائے۔‘‘ [1]

کیونکہ جب مدار میں چکر کاٹنے والے سیارچوں پر گرہن پڑتا ہے تو مومن پر رب کریم کا خوف خود بخود طاری ہو جاتا ہے کیونکہ سورج گرہن کی کیفیت میں اللہ کی عظمت وکبریائی اور اس کی قدرت کی شان کا اسرار پنہاں ہیں اور اس بات کی غمازی ہے کہ اللہ کی ذات کائنات کی تمام نشانیوں کو بے فیض وبیکار کر دینے پر قادر ہیں نیز وہ زمین اور زمین پر آباد ہر ذی نفس کو جب چاہے نیست ونابود کر سکتا ہے اور جب چاہے آسمان وزمین کو تہہ وبالا کر دینا اس کے دست تصرف میں ہے۔ اسی لیے مومن اللہ کی ذات سے ہر وقت اور ہر آن خائف رہتا ہے لیکن اسی کے ساتھ امید کا دامن اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ اس کو اس بات کی امید ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جس نے سورج کو گرہن میں مبتلا کیا ہے، اس بات پر قادر ہے کہ وہ اس کیفیت کو سورج کے اوپر سے چشم زدن میں ٹال دے اور جب چاہے وہ اس کی روشنی بحال کر سکتا ہے اور ہمیں اس کی روشنی سے مستفید ہونے کے اسباب مہیا کر سکتا ہے۔ اس موقع پر مومن کے دل میں بیک وقت خوف اور امید کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اسی کو امید وبیم کی کیفیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس بارے میں امام مناوی رحمہ اللہ نے کیا خوب بات کہی ہے:

’’سلامتی اور نجات کا راستہ دوشاہراہوں کے درمیان سے گزر کر نکلتا ہے (۱) امن وآتشی کا راستہ (۲) مایوسی اور نا اُمیدی کی شاہراہ اور امید وبیم کی شاہراہ مذکورہ دونوں راستوں کے درمیان توازن برقرار رکھنے والی حیثیت رکھتی ہے۔

[1] فتح الباری: ۵۳۲/۲۔

چنانچہ جب امید اور رجاء کا پہلو معدوم ہو جائے تو سلامتی و نجات کی گاڑی خوف کی ڈگر پر چل پڑتی ہے اور اگر خوف و خشیت کا فقدان ہو جائے تو یہ گاڑی امن واماں کا راستہ پکڑ لیتی ہے اور استقامت وراست کرداری کا راستہ ان دونوں راستوں کا سنگم ہے۔ اگر سلامتی کی گاڑی ان دونوں راستوں کے درمیان عدم توازن کا شکار ہوئی یا راستہ کے دائیں بائیں سروں میں کسی طرف مائل ہوئی تو ہلاکت و بربادی کے علاوہ اس کا کوئی چارۂ کار نہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ دونوں راستوں کے درمیان توازن برقرار رکھتے ہوئے اپنا سفر طے کرے اور دونوں کے درمیان فاصلہ کو مدنظر رکھے نیز دونوں راستوں کا لحاظ کرتے ہوئے مزید برآں ان کے درمیان توازن کا خیال کرتے ہوئے سفر طے کرے ورنہ ہلاکت و بربادی کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں۔''[1]

یہاں پر علمائے کرام نے بعض ان حالات کا بھی تذکرہ کیا ہے جن میں امید کا پہلو خوف کے پہلو پر غالب ہوا کرتا ہے اور بعض ان کیفیات کا بھی تذکرہ کیا ہے جن میں خوف وخشیت کا پہلو امید کے پہلو پر غالب ہوا کرتا ہے۔ اس کی حیثیت اس زہر کے تریاق کی ہوتی ہے جو بطور علاج مریض کے مرض کی شدت کے اعتبار سے تشخیص کیا جاتا ہے۔

امام ماوردی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''امید و بیم میں سے دونوں پہلو مرض کے لیے اکسیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان دونوں چیزوں کو دوا کی طور پر تشخیص کیا گیا ہے لیکن دونوں کو دو متضاد علت والے مریضوں کے لیے بطور کسوٹی جانا پہچانا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ بات ڈاکٹر کی مہارت پر منحصر ہے کہ وہ اس دوا کی تشخیص میں حسن تصرف سے کام لے۔ اگر طبیب جاہل یا خائن ہے تو اس کی تشخیص کا کوئی بھروسا نہیں ہوسکتا ہے۔ وہ دوا کا نسخہ بنانے میں خیانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے من مانی کر ڈالے۔''[2]

---

[1] فیض القدیر: ۲/۸۷۔ [2] فیض القدیر: ۶/۳۶۹۔

یہاں پر تصویر کے دونوں رخ میں سے کسی ایک رخ کی طرف توجہ مرکوز کر کے دوسرے رخ سے اعراض اور روگردانی مقصود نہیں ہے اور نہ ہی ایک پہلو کو اختیار کر کے دوسرے پہلو سے پہلو تہی کا کوئی ارادہ ہے جیسا کہ بدعتیوں نے کیا ہے اور اس کی وجہ سے وہ راہ راست سے ہٹ کر دور نکل گئے ہیں بلکہ موقع ومقام کو مدنظر رکھتے ہوئے دونوں پہلوؤں میں توازن برقرار رکھتے ہوئے تصرف کیا جائے۔

چنانچہ یہاں ان حالات کا تذکرہ کیا جارہا ہے جن میں مومن رجاء وامید کے پہلو کو خوف وخشیت کے پہلو پر ترجیح دینے کا اہل ہے۔

۱:......موت یا دنیا سے رخصت ہوتے وقت

سیّدنا ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث قدسی بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

''میں اپنے بندے کے حسن ظن کے مطابق پورا اترتا ہوں۔ وہ جو مجھ سے حسن ظن رکھتا ہے میں اس پر کھرا اترتا ہوں۔''❶

سیّدنا واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حدیث قدسی بیان کرتے ہوئے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

''میں اپنے بندے کے حسن ظن پر کھرا اترتا ہوں۔ اب یہ اس کی مرضی ہے وہ جو چاہے میرے ساتھ گمان رکھے۔''❷

مذکورہ دونوں حدیثوں سے مقام امید ورجاء کو مقام خوف پر ترجیح دینے کا جواز فراہم ہوتا ہے۔ امام کرمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اس نص کی رو سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کی امید ورجاء کے پہلو کو خوف وخشیت کے پہلو پر اس موقع پر ترجیح دی جاسکتی ہے۔''❸

❶ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قوله تعالی: یریدون أن......: ۷۵۰۵۔ صحیح مسلم: ۲٦۷۵.
❷ احمد: ۱٦۰۵۹ وصححه الحاکم ووافقه الذهبی۔ ❸ عمدة القاری: ۲۵/۱۰۱.

علمائے کرام نے اس ترجیح کو موت کی حالت کے ساتھ مقید کیا ہے اور اس بارے میں سیّدنا جابر رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وفات سے تین دن قبل فرماتے ہوئے سنا ہے۔ آپ فرما رہے تھے:

''تم میں کسی شخص کو اس وقت تک موت نہ آئے جب تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے حسن ظن نہ کرنے لگے۔''[1]

اسی لیے امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یہ بات امر مستحب کی حیثیت رکھتی ہے کہ جانکنی کے عالم میں مبتلا شخص کو اللہ تعالیٰ سے حسن ظن رکھنے کی تلقین کی جائے اور اس کے اعمال حسنہ کا اس موقع پر اس کے سامنے تذکرہ کیا جائے تاکہ اسے اللہ کی ذات کے ساتھ حسن ظن کی یاد دہانی ہو جائے اور اسی حال میں وہ دنیا سے رخصت ہو۔ اس بات کا ان آداب واحکام میں شمار ہوتا ہے جو مستحب اور مستحسن ہیں۔''[2]

لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ اللہ کی ذات کے ساتھ ہمیشہ حسن ظن رکھنا مطلوب ومقصود ہے لیکن رجاء وامید کے پہلو کو جانکنی کے عالم میں مبتلا اور اللہ کے روبرو حاضری کے لیے رخت سفر باندھنے والے شخص کے لیے ترجیح دینے کا استحباب وارد ہوا ہے لہٰذا موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا شخص کو چاہیے کہ وہ خوف وخشیت کے پہلو پر اللہ تعالیٰ کی ذات سے رجاء وامید کے پہلو کو غالب رکھے۔

اسی لیے بعض اسلاف سے وارد ہے کہ'' انہوں نے وفات کے وقت اپنے بیٹوں سے قرآن کریم کی آیات رحمت کی تلاوت کرنے کی فرمائش کی تاکہ ان کی روح جسد خاکی سے اس حال میں پرواز کرے کہ وہ اللہ کے ساتھ حسن ظن رکھنے والے ہوں اور وہ اس بات کا عقیدہ لے کر اس دنیا سے رخصت ہوں کہ ان کے ساتھ عفو ودرگزر کا معاملہ کیا جائے گا

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الجنة و نعیمها، باب الامر بحسن الظن باللہ تعالیٰ: ۲۸۷۷.

[2] ملاحظہ ہو: شرح صحیح مسلم: ۱۳۸/۲.

اور اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت کے سایہ تلے ڈھانپ لے گا اور ان کے اعمال کو شرف قبولیت سے نواز دے گا اور انعام واکرام کے ساتھ ان کا استقبال کرے گا۔" ❶

امام شافعی رحمہ اللہ سے ان کے مرض موت کے عالم میں دریافت کیا گیا کہ "اے ابوعبداللہ! آپ کا کیا حال ہے؟

تو جواباً ارشاد فرمایا: "میں نے اس حال میں صبح کی کہ پربہار فضا میں آنکھیں کھولی ہیں کہ میں دنیا سے رخت سفر باندھ رہوں اور اپنے بھائی بندوں کو داغ مفارقت دینے کے لیے پرتول رہا ہوں، اور موت کا جام پینے کے لیے تیار بیٹھا ہوں اور اپنے برے اعمال کی بلاخیزی سے دوچار ہونے والا ہوں، اور اللہ کی جناب میں حاضری دینے جارہوں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں کہ میری روح جنت میں جانے والی ہے جو میں اسے پیشگی مبارکباد دے دوں یا جہنم رسید ہونے والی ہے جو میں ابھی سے اس کی تعزیت کرنا شروع کردوں، پھر آپ کی چشم فیض سے آنسو جاری ہوگئے اور آپ رحمہ اللہ نے یہ اشعار پڑھنا شروع کردیئے:

"جب میرا قلب سخت ہوگیا اور اس میں پتھر جیسی سختی پیدا ہوگئی اور چاروں طرف سے میرے راستے تنگ پڑ گئے تو اے اللہ! میں نے رجا اور امید کو تیرے عفو ودرگزر تک رسائی کا سہارا بنالیا۔ اے میرے رب! جب میں نے اپنے گناہوں کو تیری بے پایاں بخشش کے ترازو پر رکھ کر تولا تو میرے گناہ بھاری بھرکم پہاڑ بن کر سامنے کھڑے ہوگئے مگر میں نے تیرے عفو ودرگزر کو اس سے کہیں زیادہ عظیم الشان وجلیل القدر پایا۔" ❷

کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ رجاء وامید کو جانکنی کے عالم میں خوف وخشیت کے پہلو پر کیوں ترجیح دی گئی ہے؟

اس شبہ کا جواب دیتے ہوئے امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "جب موت کی علامات

---

❶ شعب الایمان: ۱۰۰۸۔ حلیة الاولیاء: ۱۳/۳.

❷ تاریخ دمشق: ۳۳۱/۵۰.

ظاہر ہو جائیں تو رجاء وامید کا پہلو خود بخود غالب ہو جاتا ہے یا بنفس نفیس یہ پہلو پیدا ہو جانا طبعی امر ہے، کیونکہ خوف وخشیت کا مقصود گناہوں اور قبیح چیزوں سے اجتناب ہے اور اس کا ہدف بندگی وطاعات، اور اعمال صالحہ کی بحسن وخوبی انجام دہی ہے اور حالت احتضار میں ان تمام کی تمام چیزوں کی انجام دہی کا دروازہ بند ہو چکا ہوتا ہے اور اب اس آخری وقت میں ان کا انجام دینا ناممکن ہو چکا ہوتا ہے، اس لیے جانکنی کے وقت اللہ کی ذات کے ساتھ حسن ظن کی ضرورت درپیش ہوتی ہے اور اس موقع پر بندے کے لیے ذات باری تعالیٰ کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا ہی موزوں ہوتا ہے۔ اس لیے اس وقت اللہ کی ذات کے ساتھ حسن ظن کو مستحب سمجھا گیا ہے۔ بایں طور کہ اس کیفیت میں اللہ کی ذات کے سامنے عاجزی ومسکنت اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے کا جذبہ موجزن ہو۔'' [1]

ب: ...... گناہوں کی بہتات پر نا اُمیدوں کو اُمید دلانا چاہیے

بعض لوگ اپنے گناہوں کی وجہ سے اللہ کی رحمت سے مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں تو ان کے حق میں رجاء اور امید کے پہلو کو ترجیح دینا موزوں اور بہتر ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ کے عفو ودرگزر اور اس کی مغفرت وبخشش کی یاددہانی کرائی جائے اور توبہ کی فضیلت اور اس کی اہمیت وافادیت سے انہیں آگاہ کیا جائے اور ان کے سامنے اس بات کی توضیح کی جائے کہ توبہ سابقہ گناہوں پر پردہ ڈال دیتی ہے اور اس کے علاوہ ان کے لیے ترغیب وتشویق کا فریضہ سرانجام دیا جائے۔

امام مناوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''امید وبیم دونوں ساتھی کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی دونوں لازم وملزوم ہیں۔ اگر مایوسی کا پہلو غالب نہ ہو تو رجاء کی طرف توجہ مرکوز کرنا اولیٰ اور افضل ہے۔'' [2]

یہاں پر ان حالات کا بیان آ رہا ہے جن میں امید اور رجاء کے پہلو پر خوف وخشیت

---

[1] شرح صحیح مسلم: ۱۷/۲۱۰.

[2] فیض القدیر: ۲/۴۴۶.

کے پہلو کو غالب رہنا چاہیے۔

۱۔خوشحالی میں خوف وخشیت کا پہلو امید پر غالب رکھنا چاہیے:

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''علماء کا قول ہے کہ واعظ اور ناصح کے لیے مستحب یہ ہے کہ اپنے پند ونصائح، مواعظ ودروس میں امید وبیم میں سے دونوں پہلوؤں میں توازن برقرار رکھتے ہوئے اس فریضہ کی انجام دہی کی کوشش کرے تاکہ عوام الناس میں کوئی شخص ناامیدی اور مایوسی کا شکار نہ ہونے پائے اور نہ ہی کوئی شخص ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر امید پر تکیہ کرکے بیٹھ رہے، لیکن پند ونصائح میں ڈرانے کا پہلو نمایاں ہونا چاہیے کیونکہ نفوس بشر کو ڈرانے کی زیادہ سے زیادہ ضرورت درپیش ہوا کرتی ہے۔اس لیے کہ نفس انسانی کا امید ورجاء، راحت وآرام اور ایک دوسرے پر تکیہ کرنے اور بعض اعمال شرعیہ کی طرف سے سستی اور بے توجہی کی طرف میلان ورجحان ہوتا ہے۔''[1]

۲۔ گناہ سرزد ہوتے وقت خوف الٰہی پیش نظر رہنا چاہیے:

اگر انسان کسی معصیت میں مبتلا ہے تو اس کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے غیظ وغضب، اس کی جزا اور سزا، اس کے عذاب کو یاد رکھے اور جہنم کی ہولناکی، عذاب کے فرشتوں کی ترش روئی وبے رحمی اور اللہ کے عذاب کی سختی کو پیش نظر رکھے تاکہ جلد ہی توبہ کی طرف نفس کا میلان اور رجحان ہو جائے، اس کے بعد طبیعت اپنے کرتوتوں اور اعمال قبیحہ سے کنارہ کشی کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے اور بُرے اعمال سے دوری کی سعادت نصیب ہو جائے۔

لیکن عصر حاضر کا یہ عجیب وغریب المیہ ہے کہ اس دور میں بہت سے لوگ ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو گناہوں پر گناہ کرتے رہتے ہیں اس کے باوجود امید اور رجاء پر تکیہ کیے بیٹھے رہتے ہیں۔محض اپنی حماقت کا ثبوت پیش کرتے ہوئے اور اللہ کی عظمت وکبریائی سے

[1] شرح النووی: ۱۷/۷۳.

تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ اس بات کے خوگر ہو گئے ہیں۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "لوگوں میں سے ایک قسم کے لوگ وہ بھی ہیں جو رجاء اور امید کے دلائل سے چپک کے رہ گئے ہیں اور انہوں نے اسی پر تکیہ کر لیا ہے اور دونوں ہاتھ سے اس کو مضبوطی سے پکڑ کر اس سے جی جان کے ساتھ چمٹ کر اسی میں ضم ہو گئے ہیں اور اگر ان کو ان کی نافرمانیوں اور خطاؤں اور ان میں ملوث ہونے کی وجہ سے عتاب کیا جاتا ہے تو وہ اس کو رجاء اور امید کے ان دلائل پر پیش کرتے ہیں جو اللہ کی وسعت رحمت اور اس کی بے پایاں مغفرت کے بارے میں وارد ہوئے ہیں۔ یہ وہ نصوص شرعی ہیں جو ان کی دماغ کی یادداشت میں محفوظ ہیں۔

اس قسم کے لوگوں میں سے بعض ان پڑھ اور جاہلوں کے عجیب وغریب لطائف تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں جیسے کہ بعض لوگوں کا کہنا ہے:

"تم زیادہ سے زیادہ جتنی نافرمانیاں کر سکتے ہو کر ڈالو اگر تم کو رب کریم کے روبرو حاضر ہونا ہے۔"

انہیں میں سے بعض کا کہنا ہے:

"گناہوں سے بچنا اور پرہیز کرنا اللہ کی بے پایا عفو ودرگزر رکھنے والی شان سے ناوانی ونادانستگی ہے۔"

اسی صنف کے ایک شخص کا کہنا ہے:

"گناہوں سے اجتناب اللہ کی مغفرت اور بخشش کے خلاف جرأت مندانہ اقدام ہے اور اللہ کی عفو ودرگزر والی صفت کی عظمت شان کی تنقیص اور ناقدری ہے۔"

امام محمد بن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"میں نے مذکورہ صفت سے متصف لوگوں میں سے بعض لوگوں کا مشاہدہ کیا ہے وہ دعا کرتے ہوئے کہا کرتے تھے: اے اللہ! میں عصمت وپارسائی اور پرہیزگاری وبے گناہی سے تیری پناہ چاہتا ہوں)۔"

اس قسم کی کیفیت کو نفوس کی فریب دہی اور دلوں کی دغا بازی نیز امنگوں کی دھوکہ بازی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ سبحان اللہ! کیا بندے کو غرور نفس نے اس حد تک پہنچا دیا ہے!!

حسن ظن تو اس شخص کے لیے نفع بخش اور سود مند ہوا کرتا ہے جو توبہ کرے اور ندامت کے آنسو بہائے اور برائیوں سے باز آ جائے اور نیکیاں کر کے اپنی نافرمانیوں کا ازالہ کر لے اور عمر عزیز کے باقی ایام اعمال خیر اور اطاعات و عبادات کے کاموں میں گزارنے کا عزم کر چکا ہو اس کے بعد اللہ کی ذات سے حسن ظن رکھنے کا مرحلہ آتا ہے اور اسی کو حقیقی حسن ظن کہا جاتا ہے، دراصل یہی حسن ظن ہے اور اول الذکر کیفیت غرور اور نفس کی دغا بازی ہے۔

میری نصیحت ہے کہ اس فضل و کرم کے موقع کو نفس کی فریب دہی میں پڑ کر ضائع مت ہونے دو، کیونکہ اس کائنات کے ہر فرد کو اس کرم الٰہی کی ضرورت درپیش ہوا کرتی ہے لہٰذا اللہ کی ذات سے حسن ظن اور غرور و نفس کی دغا بازی کی کیفیت میں فرق ملحوظ رکھنا اپنا شیوہ بنا لو کیونکہ علم و عمل سے بہرہ ور شخص رجاء اور امید کو اس کے شایان مقام عطا کر کے اس کی قدر کرتا ہے اور غرور نفس کا فریب خوردہ شخص اس کو اس کے شایان شان مقام عطا نہ کر کے اس کی ناقدری کرتا ہے۔ [1]

ج:...... اللہ کے عذاب سے محفوظ ہونے کی حالت میں خوف الٰہی کی یاد دہانی کا بیان

اللہ کی اطاعت و فرماں برداری کی پابندی کرنے والا مومن اور اللہ کی پسندیدہ چیزوں پر عمل درآمد کر کے حکم خداوندی کی پابندی کے ساتھ انجام دہی کرنے والا مسلم اپنے اعمال صالحہ کے بل بوتے پر اپنے آپ کو اللہ کے مکر سے محفوظ و مامون سمجھنے لگتا ہے اور اللہ کے عذاب سے سلامتی کی پوزیشن میں اپنے آپ کو وقوع پذیر سمجھنے لگتا ہے محض نیکی اور بھلائی اور اطاعت و فرماں برداری کے کاموں پر مداومت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس پر تکبر اور غرور طاری ہو جاتا

---

[1] الجواب الکافی : ۱۱/۱۵۔

ہے چنانچہ جب دل اس پوزیشن پر پہنچ جائے کہ اسے اللہ کے مکر و فریب سے امن وامان محسوس ہونے لگے تو انسان کو چاہیے کہ خوف وخشیت کے پہلو کو یاد رکھنا اپنی عادت بنا لے اور اللہ کی جزا اور سزا کے تصور سے اپنے دل ودماغ کو آباد کرنا نہ بھولے نیز اللہ تعالیٰ نے جو ڈھیل دی ہے اس سے دھوکہ نہ کھائے کیونکہ دنیا میں بعض لوگ ایسے بھی گزرے ہیں کہ انہوں نے نیکی اور بھلائی کے کاموں میں پوری زندگی گزار دی مگر خاتمہ بالخیر سے (نعوذ باللہ) محروم رہے سوئے خاتمہ ان کا مقدر بنا اس لیے مومن کے لیے ضروری ہے کہ امید وبیم کو یاد رکھتے ہوئے اپنے دل پر چھائے ہوئے زنگ کو اس دھوکہ اور فریب کی آلودگی سے منزہ ومبرا کر لے تاکہ اس کے دل پر غفلت اور فریب کی جو دبیز چادر پڑی ہوئی ہے اس سے اس کو چھٹکارہ مل جائے۔

امام مناوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"امید وبیم دونوں ساتھی کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی دونوں لازم وملزوم ہیں اگر یاس کا پہلو غالب نہ ہو تو رجاء کی طرف توجہ مرکوز کرنا اولیٰ اور افضل ہے۔" [1]

امید ورجاء کی انواع واقسام

گزشتہ وضاحت کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ رجاء یا امید کی تین قسمیں ہیں۔ ان میں سے دو قسم کی رجاء تو قابل تعریف ہیں اور اس کی تیسری قسم مذموم ہے۔

جہاں تک اس کی ان دو قسموں کا تعلق ہے جو قابل تعریف ہیں۔ وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اس شخص کی رجاء اور امید جس نے اللہ کے عطا کردہ نور بصیرت کی روشنی میں اس کی اطاعت وفرماں برداری کی ٹھان لی ہو یقیناً ایسا شخص اللہ کے اجر وثواب کی امید رکھنے والا ہے۔ یہ رجاء قابل تعریف ہے۔

۲۔ اس شخص کی رجاء جس نے گناہ کا ارتکاب کر لیا ہو پھر توبہ کی توفیق مل گئی ہو، توبہ کے بعد اسے اللہ کی مغفرت کی امید اور آس لگی ہوئی ہو اور وہ اللہ سے اس بات کا خواہاں ہو کہ

---

[1] فيض القدير: ٢/٤٤٦.

اس کے گناہوں کو اس کے کھاتے سے محو کردیا جائے اوراس سے درگزر کا معاملہ کیا جائے اوراس کے ساتھ عفو ودرگزر کا معاملہ کر کے اس کی ستر پوشی کردی جائے تو یہ رجاء قابل تعریف ہے۔

اس کے بعد رجاء مذموم کا نمبرآ تا ہے۔

رجاء مذموم سے مراد:...... وہ عاصی ونافرماں شخص جوگناہوں، نافرمانیوں اور خطاؤں میں حد سے بڑھ گیا ہو اوراس میں انتہا تک پہنچا ہوا ہو، اس بدترین حال میں مبتلا ہوتے ہوئے بھی وہ رب کریم کی بے پایاں رحمت کے صدقہ بغیر عمل کے مغفرت کی امید رکھے) اور یہ آس لگائے بیٹھا رہے کہ اسے اللہ کی وسعت رحمت سے امید ہے تو یہ محض دھوکا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی کوئی حیثیت نہیں!

ابوعثمان الحیری رحمہ اللہ نے اس موقع پر کیا خوب کہا ہے:

> ''سعادت مندی اور نیک بختی کی علامات میں سے ایک علامت یہ بھی ہے کہ تم اللہ کی اطاعت وفرماں برداری کے کام کرواور تمہیں اس بات کا خدشہ لگا رہے کہ آیا یہ قبول ہوں گے یا نہیں اور شقاوت وحرماں نصیبی کی علامات میں سے یہ ایک علامت یہ بھی ہے کہ تم نافرمانیوں پر نافرمانیاں کرتے رہو اور امید یہ لگائے رہو کہ نجات مل جائے گی یا کامیابی سے ہم کنار ہو جاؤ گے۔''[1]

قابل تعریف رجاء کی دونوں قسموں میں سے کون سی رجاء افضل ہے؟

علمائے قلوب اس معاملہ میں اختلاف کا شکار ہوگئے ہیں کہ ان دونوں قسموں کی رجاء میں سے کس رجاء کو بلند مرتبہ پر فائز کیا جائے؟

آیا محسن اور فرماں بردار شخص کی رجاء وامید جس نے اجر وثواب کی امید میں اطاعت وفرماں برداری کے کام کیے ہوں؟ یا اس نافرمان اور گناہ گار شخص کی امید اور رجاء جس نے گناہوں سے توبہ کرلی ہو؟

---

[1] فتح الباری: ۱۱/۳۰۱.

علماء کے ایک گروہ نے محسن وفرماں بردار شخص کی رجاء کو افضل قرار دیا ہے، طاعات وفرماں برداری کے اعمال کی انجام دہی کی وجہ سے اور رجاء کے اسباب ووسائل کے قوی ہونے کے پیش نظر انہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کیونکہ شخص مذکور کے نزدیک اسباب ووسائل قوی ہیں جس کی وجہ سے اس کو رجاء کا حق حاصل ہے۔

مگر علماء کے ایک گروہ نے نافرمان اور گناہ گار شخص کی رجاء کو راجح قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس بندۂ عاصی کی رجاء وامید میں عاجزی وفروتنی، انکساری وخاکساری اور محتاجی ولاچاری کے ساتھ گناہوں کی ذلت وخواری کا احساس اور معصیت ونافرمانی کے احساس کے ساتھ شرمندگی کا جذبہ موجزن پایا جاتا ہے۔ اس لیے اس کی امید اور رجاء ریاکاری، خود پسندی، عمل کے تکبر پر نازاں ہونے کے فریب سے منزہ ومبرا ہے، لہٰذا اس بندۂ عاصی کی رجاء افضل اور برتر ہے۔

مذکورہ بالا دونوں اقوال محل نظر اور قابل غور وفکر ہیں۔ دونوں اپنی اہمیت کے اعتبار سے بحث ونظر کے قابل ہیں۔

لیکن ایک سچا اور پکا مومن دونوں قسم کی رجاء پر عمل پیرا ہونے کو اپنا طرۂ امتیاز بناتا ہے چنانچہ جب اس پر اللہ تعالیٰ کا انعام واکرام ہوتا ہے اور اسے اعمال صالحہ کی انجام دہی کی توفیق ملتی ہے تو اللہ کے اجر وثواب کی امید کرتا ہے اور اس کی جنت کے حصول کی آس لگاتا ہے اور جب بھی اس سے معصیت اور نافرمانی سرزد ہو جاتی ہے اور کون شخص ہے جس سے معصیت کا صدور نہ ہوتا ہو تو مومن اس موقع پر اپنے رب سے عفو ودرگزر کا خواستگار ہوتا ہے اور اپنے گناہوں کی مغفرت اور بخشش کی اللہ کی ذات سے امید لگاتا ہے۔

امید اور رجاء کے درجات

امید اور رجاء کے درجات ومراتب ہیں اور ان میں سے ہر ایک یکے بعد دیگرے مراتب میں متفاوت ہیں اور ہر ایک کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں مرتبہ کے اعتبار سے امتیاز

حاصل ہے۔

ا۔ امید ورجاء کا پہلا درجہ:

امید مومن کے اندرون میں عبادت میں جد وجہد صرف کرنے اور کوشش کرنے کا داعیہ پیدا کرتی ہے، امید ہی وہ بنیادی عامل ہے جو بندے کو عبادت کی لذت سے آشنائی کا فریضہ انجام دیتا ہے اگر چہ عبادت کتنی ہی سخت کیوں نہ ہو؟ جس شخص کے پیش نظر وہ عظیم الشان اجر وثواب ہو جو وہ عبادت کی انجام دہی پر حاصل کرے گا، اس کے لیے مذکورہ اجر وثواب کے حصول کی خاطر جد وجہد کرنا اور اس کی دستیابی کے لیے محنت کرنا آسان اور سہل ہو جاتا ہے، چنانچہ جس شخص کو اپنے سفر میں حد سے زیادہ فوائد کے حصول کی امید ہو اس کے لیے سفر کی مشقتیں اور صعوبتیں برداشت کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ دنیا کا دستور ہے جو ہمارے لیے معروف اور مشہور ہے اور آپ نے خود اس کا مشاہدہ کیا ہوگا کہ تاجر حضرات دن رات محنت ومشقت کرتے ہیں۔ راتوں کی نیندیں حرام کرتے ہیں، دُور دراز کے سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہیں اور گھر بار چھوڑ کر گھر سے بے گھر ہوتے ہیں، محض اس دنیاوی فائدہ کے پیش نظر جس کی ان کو توقع ہوتی ہے۔ وہ اجنبیت اختیار کرنا گوارہ کرتے ہیں اور گھر بار چھوڑ کر انجان جگہ جا کر رہنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں، محض دنیاوی فائدہ کے پیش نظر جس کے حصول اور دستیابی کی ان کو توقع ہوتی ہے۔

اسی طریقہ سے سچا اور پکا محبّ جس کے پیش نظر اللہ کی خوشنودی ورضا مندی ہو اس کے نفس پر نیند سے اٹھ کر نماز فجر کی ادائیگی کی مشقت اور سخت سردی کے عالم میں وضو اور طہارت حاصل کرنے کی صعوبت اور اللہ کی راہ میں جان قربان کرنے نیز حج وعمرہ کی ادائیگی اور علم دین کے حصول اور قیام اللیل کے لیے اٹھ کر کھڑے ہونے اور روزے کے عالم میں بھوک اور پیاس برداشت کرنے میں پائی جانے والی جان لیوا پریشانی اور سختی لذت آشنائی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

اسی لیے اللہ کے لیے عبادت کے بارے میں مراتب ودرجات کا جہاں تک معاملہ ہے

تو اس میں پہلے مشقت سے نبرد آزمائی کا مرحلہ آتا ہے۔ اس کو برداشت کر کے اس راہ کی راہ نوردی کرتے رہنے کی وجہ سے انسان خود بخود ایک کیف وسرور اور جذب ومستی کے مقام تک رسائی پا جاتا ہے اور لذت وکیف اور سرور وانبساط کے مرتبہ پر فائز ہو جاتا ہے، اس سلسلے میں کسی عالم کا قول ہے: ''میں نے بیس سال تک قیام اللیل کے سلسلہ میں محنت ومشقت صرف کی جس کے نتیجہ میں بیس سال تک اس کے سایہ میں ناز واندام کی کیفیت محسوس کرتا رہا۔'' [1] اس لیے بندہ عبادت کی لذت اور چاشنی اس وقت تک محسوس نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کی ادائیگی میں محنت ومشقت کی تلخی برداشت نہ کر لے۔

اگر اللہ کی طرف سے ملنے والے عوض یا اجر وثواب کی اس کے دل میں امید پیدا ہو جائے تو اس کا اندرون خود بخود بری عادات اور راحت وآرام کو اس کی خاطر ترک کر دینے کے لیے تیار ہو جائے۔

اگر نفس انسانی کو صدقہ وخیرات کی حقیقی معرفت نصیب ہو جائے تو اس کے لیے مال ودولت سے دستبرداری سہل اور آسان ہو جائے اور نفس انسانی مال ودولت کی ہوس کرنے سے علیحدگی اختیار کر لے۔

اگر نفس انسانی کو روزے پر اللہ کی طرف سے ملنے والے اجر وثواب کی سچی معرفت نصیب ہو جائے تو اس کے لیے روزے کی خاطر دن میں کھانے پینے سے علیحدگی اور عورتوں سے صحبت کی عادت سے دوری اور کنارہ کشی آسان اور ہو جائے۔

اگر تم کو قضا وقدر پر راضی برضا رہنے کے اجر وثواب کا صحیح معنوں میں علم ہو جائے تو تمہارے سامنے مصائب وآلام پر صبر کرنا کوئی معنی نہ رکھے حتی کہ اجر وثواب کے حصول کے لیے کڑوا بھی تم کو میٹھا لگنے لگے اور اس راہ میں تمہارے لیے زہر ہلاہل قند بن جائے۔

بلاشبہ انسان کی فطرت اور شرست میں یہ بات داخل ہے کہ وہ اپنی محبوب ترین چیز سے اسی وقت دستبرداری کے لیے تیار ہوتا ہے جب کہ اس کو اس محبوب ترین چیز کو ترک کر دینے

---

[1] لطائف المعارف: ٤٣.

کی بنیاد پر اس سے عظیم ترین محبوبیت کے مقام پر فائز ہونے کا یقین ہو اور وہ مقام عظمت وسربلندی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رضامندی وخوشنودی اور اس کی جنت نیز اجر وثواب اور نیکیوں اور بھلائیوں کا حصول ہے۔

۲۔ امید ورجاء کا دوسرا درجہ اور مرتبہ:

یہ مرتبہ والے وہ لوگ ہیں جو اپنی پسندیدہ چیزوں اور مرغوبات کو ترک کرکے اس کے بدلے میں اس سے کہیں بہتر وبرتر چیز کو اختیار کرنے میں مجاہدۂ نفس کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد اپنے مقصود تک رسائی کی غرض سے ہمت سے کام لیتے ہوئے امید وآس کا سہارا لیتے ہیں۔ یہ وہ بلند ترین مرتبہ ہے جہاں تک رسائی کے لیے احکام دینیہ سے واقفیت کی ضرورت درپیش ہوتی ہے کیونکہ اس طرح کی پسندیدہ چیزوں اور مرغوبات کے حصول کا تعلق امید وآس سے وابستہ ہوا کرتا ہے اور اس کے لیے احکامات دینیہ واصول شرعیہ سے واقفیت کا ہونا ضروری ہے۔

۳۔ امید ورجاء کا تیسرا مرتبہ:

یہ اُمید ان لوگوں کے لیے خاص ہے جو ارباب قلوب ہوا کرتے ہیں ان کو ہمیشہ خالق کائنات سے ملاقات کی فکر دامن گیر رہتی ہے اور ان کے رات اور دن رب کائنات کے حضور حاضری کے اشتیاق میں گزرتے ہیں جس کی بنیاد پر دنیا کی ان کی نظروں میں کوئی وقعت نہیں رہتی اور زاہدانہ زندگی گزارنا ان کا طرۂ امتیاز بن جاتا ہے اسی لیے اس کو امید وآس کی قسموں میں سے اعلیٰ ترین قسم گردانا جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿١١٠﴾ ﴾ (الكهف : ١١٠)

''پس جو شخص اپنے رب کی ملاقات کی امید رکھتا ہو تو لازم ہے کہ وہ عمل کرے نیک عمل اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔''

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۵﴾ (العنکبوت: ۵)

''جو شخص اللہ سے ملنے کی امید رکھتا ہو تو بے شک اللہ کا مقرر وقت ضرور آنے والا ہے اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔''

اس امید کو رجاء لقیا کہتے ہیں، یہی ایمان کی اصل بنیاد ہے اور یہی اس کا خلاصہ اور نچوڑ ہے۔ اسی لیے ہر زمانے میں عابدوں اور زاہدوں اور عبادت و ریاضت کے میدان میں کوشاں رہنے والے اللہ کے برگزیدہ بندوں کی نگاہیں اسی امید کی طرف ٹکی رہتی ہیں اسی امید کے سایہ عاطفت میں ان کی تسکین کا سامان مہیا ہوا کرتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان سے ملاقات کا ایک وقت متعین کر دیا ہے۔ جس کے تصور سے ارباب قلوب کے دلوں کو چین و سکون نصیب ہوتا ہے۔

رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

اس مرتبہ پر فائز بندگان اہل دل کے قلوب ہر وقت اضطراب اور بے چینی کا شکار رہتے ہیں یہاں تک وہ اللہ سے ملاقات کے لیے دنیا سے رخصت نہ ہو جائیں۔ اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ سے ملاقات کے شوق میں گزرتا ہے، ہر وقت اسی کی امید لگائے بیٹھے اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ اس کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں پھر کیا ہے۔ اس کے لیے جی جان سے کوشاں رہنا ان کی روزمرہ زندگی کا وطیرہ بن جاتا ہے اور وہ زبان حال سے یہ کہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ کب دنیا اپنے اختتام کو پہنچے گی؟ تاکہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات میسر آسکے اور جنت کی آرام و آسائش اور اس کی نعمتوں سے کہیں بڑھ کر ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی ملاقات اور اس کے دیدار کی نعمت ہوگی جس سے جنتی محظوظ ہوں گے۔

ذرا سیّدنا عمیر بن الحمام انصاری رضی اللہ عنہ کے قصہ پر طائرانہ نظر ڈالیں اور غور و فکر کریں۔ یہ وہ صحابی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا از حد اشتیاق دامن گیر تھا۔ اسی لیے ان پر کھجور

چبا کر کھانے کا وقت بھی ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ملاقات کی خاطر انہیں طویل محسوس ہو رہا تھا۔ اسی لیے انہوں نے اللہ سے ملاقات کو ترجیح دیتے ہوئے کھجور کھانے میں وقت صرف کرنا بھی گوارا نہ کیا۔ چنانچہ سیّدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے غزوۂ بدر کے بارے میں مروی ہے کہ جب مشرکین مکہ قریب آ گئے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ترغیب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''چلو اٹھ کھڑے ہو اور اس جنت کی طرف اٹھ کر چل پڑو جس کا طول و عرض آسمانوں اور زمینوں کے برابر ہے۔ راوی کا کہنا ہے یہ سن کر سیّدنا عمیر بن حمام انصاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے اللہ کے رسول! کیا ایسی جنت بھی ہے جس کا طول و عرض آسمانوں اور زمینوں کے برابر ہے؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جواب دیا: ''ہاں'' ایسا ہے تو صحابی نے عرض کیا: آفریں صد آفریں۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: '' تم نے کس بنیاد پر آفریں آفریں کے کلمات کہے ہیں'' سیّدنا عمیر بن حمام انصاری رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: نہیں، کوئی بات نہیں بس میں نے تو اس امید میں یہ خوشخبری کے کلمات کہے تھے کہ میں بھی ان نیک بختوں میں شامل ہو جاؤں جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوشخبری سنائی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا: ''جاؤ! تم بھی انہیں خوش نصیبوں میں سے ایک ہو۔''

چنانچہ صحابی نے ترکش یا زمبیل میں رکھی کھجوروں میں سے کھجوریں نکالیں اور کھانا شروع کر دیں پھر ایک دم یہ خیال آیا اور کہنے لگے کہ اگر زندگی نے وفا کی تو یہ کھجوریں کھانے کے لیے بہت وقت پڑا ہوا ہے بلکہ پوری زندگی باقی ہے اور ان کے پاس جو کھجوریں تھیں انہیں انہوں نے پھینک دیا اور دشمنوں کی صفوں پر پل پڑے اور لڑتے لڑتے جام شہادت نوش فرمایا۔ [1]

اپنے بندوں میں سے خاص قسم کے ارباب قلوب کے اس گروہ کا جب اللہ تعالیٰ کو علم ہو گیا۔ دراصل ان کی تعداد بہت کم ہے اور رب کریم نے جان لیا کہ ان لوگوں کے دل ہمیشہ

[1] صحیح مسلم، کتاب الامرة، باب ثوب الجنة للشهيد: ۱۹۰۱.

مضطرب اور بے چین رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات ہو جائے۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کے شوق میں ان کو چین اور قرار نہیں ملتا تو اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے بندوں سے ملاقات کے لیے ایک وقت متعین کر دیا ہے تاکہ ارباب قلوب کے دلوں کو سکون نصیب ہو جائے اور وہ نیک اعمال کی انجام دہی میں مصروف ہو جائیں یہاں تک اللہ کے حضور حاضری کے سفر کا وقت آ جائے اس حال میں کہ وہ زادراہ تیار کر چکے ہوں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴾ (العنکبوت : ۵)

''جو شخص اللہ سے ملنے کی امید رکھتا ہو تو بے شک اللہ کا مقرر وقت ضرور آنے والا ہے اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔''

اس معاملہ میں ہمارے اسلاف اور عصر حاضر کے لوگوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ ہمارا مشاہدہ اور روز مرہ کا تجربہ ہے کہ اس زمانے کے لوگوں کو زندگی کی دوڑ اور روز مرہ کی مصروف عمل حیات دنیوی میں ان مذکورہ معانی ومفاہیم کی طرف نظر التفات ڈالنے کی فرصت ہی نہیں، دراصل ان کی جولانئ فکر کی پرواز کی رسائی اس قسم کے افکار ونظریات کی طرف ہو ہی نہیں پاتی کیونکہ ان کی ذہنیت خالص مادی بن چکی ہے۔ انہیں آخرت کی ذرہ برابر فکر ہی نہیں رہی جبکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دلوں میں یہ فکر راسخ تھی۔ کتاب وسنت میں جس کا جابجا تذکرہ موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں ان لوگوں میں بنا دے جن کی ہمتیں بلندی کی چوٹی پر فائز تھیں۔ جو عزم محکم کے اوج کمال پر کمندیں ڈال کر ہی چین وسکون کا سانس لیتے تھے، تاکہ ہم بھی امید اور رجاء عبادت وریاضت کے بام عروج تک رسائی حاصل کر سکیں۔

امید اور گناہوں کا بیان

گناہ چاہے کتنا ہی بڑا ہو اور اس کی نوعیت چاہے جو بھی ہو، اس کا دائرہ چاہے جتنا وسیع

وعریض ہو، اس کی بلا خیزی پہاڑ کی چوٹیوں سے باتیں کیوں نہ کرنے لگے پھر بھی گناہ گار شخص کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ اگر وہ توبہ کرنا چاہے تو اس کو دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں یا اس کو اس وہم وگمان میں رہ کر مایوسی کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں کہ اب ہلاکت وبربادی سے دوچار ہونا ہی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں نہیں ایسا ہرگز نہیں بلکہ ایسے شخص کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے، اسے چاہیے کہ وہ اپنے جرم سے توبہ کرنے کی راہ اختیار کرنے کی طرف توجہ مرکوز کرے اور اپنے رب کی وسیع وعریض رحمت سے امید لگائے رکھے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندۂ عاجز کے لیے امید اور رجاء کا دروازہ کھول رکھا ہے چاہے اس سے کوئی گناہ سرزد ہو اس کو اللہ کی ذات سے مایوسی کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾ (۵۳)

(الزمر: ۵۳)

"کہہ دے اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی، اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ، بے شک اللہ سب کے سب گناہ بخش دیتا ہے۔ بے شک وہی تو بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔"

اس آیت کریمہ میں خطاب اس شخص کے لیے نہیں ہے جس سے معمولی گناہ سرزد ہو جائے بلکہ یہاں پر انداز تخاطب بتلا رہا ہے کہ یہاں پر خطاب ان لوگوں کے لیے ہے جو گناہوں اور نافرمانیوں کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہوں جنھوں نے گناہوں کا ارتکاب کرتے رہنا اپنی زندگی کا وطیرہ بنا لیا ہو۔ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت ومغفرت کا اعلان ہو رہا ہے کہ ان کے لیے بھی توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے شرط یہ ہے وہ توبہ کرنا چاہتا ہو (اس لیے یہاں پر یہ جملہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس شخص کے لیے رحمت ومغفرت کا دروازہ کھلا ہوا ہے جو

اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرنے کا خواہاں ہو)۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِذَا جَآءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِـَٔايَٰتِنَا فَقُلْ سَلَٰمٌ عَلَيْكُمْ ۖ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۖ أَنَّهُ مَنْ عَمِلَ مِنكُمْ سُوٓءًۢا بِجَهَٰلَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنۢ بَعْدِهِۦ وَأَصْلَحَ فَأَنَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴾ (الانعام: ٥٤)

''اور جب تیرے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں تو کہہ سلام ہے تم پر، تمھارے رب نے رحم کرنا اپنے آپ پر لازم کر لیا ہے کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ تم میں سے جو شخص جہالت سے کوئی برائی کرے، پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کر لے تو یقیناً وہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔''

امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''اس کلام الٰہی کی تاویل وتفسیر یہ ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اگر تمہارے پاس وہ لوگ آئیں جو ہمارے نازل شدہ کلام اور ہمارے دلائل وبراہین اور ہماری حجتوں اور قوی سندوں کی تصدیق کرتے ہیں، اور قولاً وعملاً اس کو عملی جامہ پہناتے ہیں، وہ محض اس غرض سے حاضری دیں کہ تم کو اپنے ان گناہوں کے بارے میں مطلع کریں جو ان سے دور جاہلیت میں سرزد ہوئے ہیں جس کو میرے اور ان کے علاوہ کوئی نہیں جانتا اور آکر تم سے پوچھیں کہ کیا میرے لیے توبہ کی گنجائش ہے؟ تو تم توبہ کے بارے میں انہیں نفی میں جواب دے کر ناامیدی کا شکار مت کرنا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی آمد پر ان کی ڈھارس بندھوائیں اور ان کو مخاطب کر کے ان سے کہیں کہ تم پر اللہ کی طرف سے سلامتی اترے اور تم کو گناہوں سے خلاصی نصیب ہو نیز اس بات سے تم کو اللہ کی طرف سے امان کا پروانہ مل گیا ہے کہ وہ تم کو تمہارے گناہوں کی پاداش میں سرزنش نہیں کرے گا (مراد یہ ہے کہ اب چین وسکون کی سانس لو اللہ تعالیٰ تم کو عذاب وعقاب سے دوچار نہیں کرے گا) یہ بات طے شدہ ہے خصوصاً اب جبکہ تم نے رب کریم کے حضور سچی و پکی توبہ کر لی ہے کیونکہ رب کریم نے کا ارشاد ہے: '' تمہارے رب نے مہربانی فرمانا اپنے ذمے

فرض کرلیا ہے۔''مراد یہ ہے کہ تمہارے رب نے اپنی مخلوق پر رحم وکرم، عفو و درگزر سے کام لینے کا تہیہ کرلیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا مخلوق کے حق میں یہ طے شدہ اٹل فیصلہ ہے۔''[1]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٠٢﴾ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿١٠٣﴾﴾ (التوبة: ١٠٢، ١٠٣)

''اور کچھ دوسرے ہیں جنھوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا، انھوں نے کچھ عمل نیک اور کچھ دوسرے برے ملا دیے، قریب ہے کہ اللہ ان پر پھر مہربان ہو جائے۔ یقیناً اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔ ان کے مالوں سے صدقہ لے، اس کے ساتھ تو انھیں پاک کرے گا اور انھیں صاف کرے گا اور ان کے لیے دعا کر، بے شک تیری دعا ان کے لیے باعث سکون ہے اور اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔''

امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کی اس عمل صالح، جس کو برے اعمال سے خلط ملط کر دیا گیا ہے سے مراد ان کا اپنے گناہوں اور معاصی کے بارے میں اعتراف اور اس سے توبہ کا اظہار ہے اور دوسرے اعمال بد سے مراد نبی کریم ﷺ نے جب غزوۂ تبوک کے موقعہ پر عام اعلان فرمایا تھا، اس موقع پر بعض لوگوں نے مسلمانوں کے ساتھ اللہ کے راستہ میں نہ نکل کر اس پکار کی خلاف ورزی کی اسی لیے کہا گیا ہے کہ اس غیر حاضری پر پشیمانی اور تاسف اور توبہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کی توبہ ضرور قبول فرمائے گا جب لفظ عسـی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو یہ

[1] تفسیر طبری: ٥/٢٠٥.

''شائد'' کے معنی میں نہیں لیا جاتا بلکہ اس سے مراد وجوب ہوتا ہے یعنی اللہ کے حق میں عسی وجوب کے معنی لیے ہوئے ہوتا ہے لہٰذا اس کے معنی ہوئے کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ ضرور بالضرور قبول فرمائے گا۔'' [1]

سیّدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حدیث قدسی بیان کرتے ہوئے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے:

''اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اے ابن آدم! تو نے جب بھی مجھ سے دعا کی اور مجھ سے لو لگا کر امید باندھی تو میں نے تجھے بخش دیا۔ تیرے عمل سے صرف نظر کرتے ہوئے میں نے اس کی ذرہ برابر پرواہ نہ کی اے ابن آدم!۔ اگر تیرے گناہ آسمان کی چوٹی کو چھونے لگیں اور تو مجھ سے توبہ واستغفار کر لے تو میں تیری خاطر اسے بھی بخش دیتا ہوں اور اس کی ذرہ برابر پرواہ نہیں کرتا، اے ابن آدم! اگر تو زمین کے حجم کے برابر گناہوں کا پلندہ لاد کر مجھ سے ملے بشرطیکہ تو نے میرے ساتھ شرک نہ کیا ہو تو میں بھی تجھ سے اسی کے بقدر مغفرت و بخشش لے کر ملوں گا۔'' [2]

مراد یہ ہے کہ اللہ عزوجل امید اور رجاء کا دروازہ اپنے بندوں کے لیے ہر وقت پاٹ کھولے رکھتا ہے۔

سیّدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے اپنے کانوں سے سنا کہ آپ فرما رہے تھے:

''اللہ تعالیٰ مومن کو اپنے قریب بلائے گا اور اس کو اپنی حمایت وعنایت میں لے کر اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔ اس موقع پر بندے کو مخاطب کر کے صیغہ راز میں

---

[1] تفسیر ابن جریر: ٤٥٩/٦۔

[2] ترمذی، کتاب الدعوات، باب الحدیث القدسی: یا ابن آدم إنك...... : ٣٥٤٠ وصححه الالبانی رحمه الله.

یہ بات کہے گا کہ کیا تجھ کو فلاں گناہ یاد ہے؟ کیا تیرے گوشہ دماغ میں یہ گناہ محفوظ ہے یا نہیں؟ تو بندہ اعتراف کرے گا اور کہے گا: جی ہاں، بجا اور درست ہے۔ یہاں تک کہ بندہ جب اپنے گناہوں کا اقرار کر لے گا اور اس کو اپنے بارے میں یقین ہو جائے گا کہ اب وہ ہلاک اور برباد ہو گیا تو اللہ تعالیٰ بندے سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمائے گا: میں نے دنیا میں تیرے ان گناہوں کی پردہ پوشی کی ہے اور آج محض تیری خاطر انہیں معاف کیے دیتا ہوں اور اسے اس کی نیکیوں کا اعمال نامہ پکڑا دیا جائے گا اور جہاں تک کافر اور منافق کا معاملہ ہے تو اس دن اس کے بارے میں گواہی دینے والے گواہ یہی کہیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے پروردگار پر جھوٹ باندھا تو کان کھول کر سن لو! ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔''[1]

میرے مسلمان بھائیو! یہ ساری کی ساری بخشش اور مغفرت اس صورت میں ہوگی جب تم اپنے گناہوں پر نادم ہو اور رب کریم کی جناب میں حقیقی توبہ کرو اور اللہ کے سامنے اس کی جناب میں ٹوٹے دل والوں کی طرح جا کر ڈیرا ڈال دو، اور اس کی جناب میں گریہ زاری کرو، بلکہ آہ وزاری کرنا اپنا شیوۂ زندگی بنالو۔ اس کی مغفرت اور بخشش کے حصول کی خاطر اسباب ووسائل اختیار کرو، نافرمانیوں اور گناہوں سے کنارہ کشی اختیار کرو اور نئی زندگی کا آغاز کرو اور غفلت اور لاپرواہی کے عالم میں زندگی کا جو حصہ گزرا ہے اس پر ندامت وپشیمانی کے آنسو بہاؤ اور عزم مصمم کر لو کہ مستقبل میں اب ان کی طرف تم نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھو گے اور نہ ہی ان کے چکر میں پڑو گے۔

اب اعمال صالحہ کی انجام دہی کرنا اپنی عادت اور خصلت بنالو اور اللہ تعالیٰ نے تم کو یہ جو موقع دیا ہے اسے غنیمت جانتے ہوئے اسے اپنے مصرف میں لاؤ اور یاد رکھو! اگر موت نے

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المظالم، باب قول اللّٰہ تعالیٰ: ألا لعنة اللّٰہ علی الظالمین: ۲٤٤١۔ صحیح مسلم: ۲۷٦۸۔

اچانک حملہ کر دیا اور اس نے تم کو اپنے دام میں لے کر موت کی نیند سلا دیا تو اس سنہرے موقع کے ہاتھ سے نکل جانے پر تم کو ندامت اور پشیمانی ہوگی اور تم دوبارہ دنیا میں واپسی کی تمنا کرو گے لیکن ہائے افسوس صد افسوس موقع ہاتھ سے نکل جانے کے بعد دوبارہ واپس نہیں آتا کیونکہ اس وقت عمل کا موقع ہاتھ سے نکل چکا ہوگا اور حساب و کتاب کی گھڑی سامنے ہوگی۔ (واللہ المستعان)۔

امید و بیم کی کیفیت قلوب کے لیے نسخہ کیمیا

رجاء اور امید دو قسم کے لوگوں کے لیے اکسیر کی حیثیت رکھتی ہے۔

۱۔ وہ شخص جو مایوسی اور ناامیدی کے نرغے میں پھنس گیا ہو اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہو کہ اس نے ناامیدی کی بنیاد پر عبادت و ریاضت کرنا ترک کر دیا ہو مزید برآں اس کے دل میں یہ بات پختہ ہوگئی ہو کہ اب عبادت و ریاضت کا کوئی فائدہ نہیں، اسے جہنم رسید ہونا ہی ہونا ہے۔

۲۔ دوسرا شخص وہ ہے جس پر خوف کی وحشت ناکی ایسی چھا جائے جس کی بنیاد پر وہ اپنے اہل و عیال اور خود اپنے نفس کے لیے مضرت رساں بن جائے اور شریعت نے خوف کی جو حدود متعین کی ہیں وہ ان سے بھی تجاوز کر جائے۔ اس موقع پر اللہ کی امید کا سہارا اختیار کرنا اس کے لیے ضروری ہو جاتا ہے تاکہ اس کے نزدیک امید و بیم کی کیفیت میں توازن پیدا ہو جائے۔

جہاں تک اس مغرور قسم کے نافرمان شخص کا معاملہ ہے جو عبادت الٰہی سے اعراض کے باوجود تمناؤں کے دوش پر سوار ہو اور اللہ کی رحمت سے آس لگائے بیٹھا ہو تو اس کے حق میں امید کا نسخہ کبھی بھی اکسیر ثابت نہیں ہو سکتا۔ اگر اس کے لیے بطور دوا یا علاج کے طور پر امید کو استعمال کیا جائے تو اس کی گمراہی اور کجروی کے دلدل میں مزید الجھ جانے کا خطرہ ہے ایسے شخص کے لیے امید کی دوا دینا کارگر ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے خوف کو بطور دوا و علاج

استعمال کرنا سود مند ثابت ہوتا ہے، لہٰذا ایسے شخص کو خوف کے چابک سے ہانکا جائے گا اور تمناؤں اور امیدوں کا سہارا دلا کر اس کے ذہن اور دماغ کو غفلت سے بیدار کیا جائے گا۔ یہ بڑی اہم بات ہے جس کی طرف واعظ اور خطیب حضرات کو توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔

کہا جاتا ہے بعض ناسمجھ اور نامعقول قسم کے داعیوں کو گناہ کبیرہ کے مرتکبین سے سابقہ پڑ گیا اور ان کو ان کے سامنے وعظ ونصیحت کا فریضہ انجام دینے کے لیے حاضری دینا پڑی تو انہوں نے ان کے سامنے امید اور مایوسی کا موضوع چھیڑ دیا اور انہیں خیر وبھلائی کی بشارت دے کر ان کی نافرمانی ومعصیت کی عادت کو گویا کہ شہ دینے کا عمل سرانجام دے ڈالا مگر ان کو پتہ نہیں کہ ایسے لوگوں کے سامنے اس قسم کا موقف اختیار کرنا بہت بڑی جہالت ہے۔

جیسے کہ واعظ اور ناصح کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ امید دلا کر انہیں سستی اور کاہلی کا شکار بنائے، اسی طرح اس کے لیے یہ بات بھی غیر مناسب ہے کہ لوگوں کو حد سے زیادہ خوف دلا کر انہیں ناامیدی کی کیفیت سے دوچار ہونے پر مجبور کرے بلکہ ایک ماہر قسم کا داعی تو وہ ہے جو موقع اور محل کے تقاضہ کا خیال رکھے اور مصلحت اندیشی سے کام لے اور امید وبیم دونوں کا خیال رکھتے ہوئے اپنے معتدل موقف کو لوگوں کے سامنے پیش کرے۔

بعض علمائے کرام کا کہنا ہے کہ لوگوں کو وعظ ونصیحت کرنے والے شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ سامعین پر لطف وکرم کا مظاہرہ کرے، ان کے اندر پائی جانے والی بیماریوں اور علتوں پر نظر رکھے اور معاشرے میں پائے جانے والی خامیوں کا مناسب انداز میں جو کہ ماحول کے عین مطابق ہو علاج ومعالجہ کرنے کی کوشش کرے۔

سیّدنا علی رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے:

”حقیقی عالم تو وہ شخص ہے جو بندوں کو اللہ کی رحمت سے مایوسی کا شکار نہ بنائے اور نہ ہی بندوں کو گناہ اختیار کرنے کی کھلم کھلا چھوٹ دے، اور نہ ہی ان کو اللہ کے عذاب کی طرف سے سلامتی وحفاظت کی ضمانت فراہم کرے اور نہ ہی قرآن

کریم کو کسی اور کتاب کی وجہ سے نظر انداز کرنے کی کوشش کرے۔“ ❶

سیّدنا سفیان بن عیینہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ”جو شخص لوگوں کو اللہ کی رحمت سے مایوس کرنے کے لیے کمربستہ ہو جائے یا خود ناامیدی کی طرف گامزن ہونے کی کوشش کرے وہ سراسر غلطی پر ہے۔“ ❷

سیّدنا زید بن اسلم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ ”سابقہ امتوں میں ایک شخص ایسا گزرا ہے جو عبادت وریاضت میں بہت کوشش کرتا تھا، بلکہ اس سلسلہ میں وہ خود اپنے نفس پر تشدد کا معاملہ روا رکھتا تھا اور لوگوں کو اللہ کی رحمت سے ناامیدی کا شکار بنایا کرتا تھا۔ اتفاق سے اس کی موت ہوگئی تو اس نے رب کریم کی بارگاہ میں عرض کیا: میرے لیے بطور جزا تیرے پاس کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو جواب دیا: جہنم بندے نے عرض کیا کہ میری عبادت وریاضت کا کیا ہوا؟ تو جواباً اس سے کہا جائے گا کہ تو لوگوں کو میری رحمت سے مایوسی کا شکار بنایا کرتا تھا اور آج میں تجھ کو اپنی رحمت سے مایوسی اور ناامیدی کا شکار بنا رہا ہوں۔“ ❸

اس لیے لوگوں کے احوال کے پیش نظر امید وبیم کی کیفیت میں توازن برقرار رکھنا چاہیے۔ اگر لوگ تفریط یا گناہ یا تساہل اور سستی وکاہلی کی طرف مائل نظر آئیں تو تخویف کا پہلو غالب رہنا چاہیے اور اگر بندے حد سے زیادہ ڈرے اور سہمے ہوئے ہوں اور اللہ کی رحمت سے مایوسی کا شکار ہوں تو امید وآس کا پہلو غالب ہونا چاہیے وغیرہ وغیرہ......

امید وبیم کے بارے میں چند متفرق مسائل

امید وآس کا تعلق حالات حاضرہ سے متعلق مسائل واعمال سے تو ہے ہی، اسی کے ساتھ اس کا تعلق گزرے ہوئے واقعات اور اعمال سے بھی ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ماضی اور حاضر دونوں طرح کے اعمال سے امید کا تعلق ہوا کرتا ہے۔

---

❶ سنن دارمی: ۳۰۴۔ ❷ تفسیر ابن ابی حاتم: ۶۵/۹۔

❸ تفسیر عبدالرزاق: ۲۳۶/۳۔

مومن کی شان تو یہ ہے کہ جب وہ کوئی عمل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے امید کرتا ہے یا رب کریم کی ذات سے لو لگاتا ہے کہ وہ اس کے اس عمل کو قبول فرمالے اور اس پر اس کو اجر و ثواب عطا فرمائے، لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی امید و آس کو صرف اس عمل سے وابستہ رکھتے ہیں جسے وہ فی الحال انجام دے رہے ہوتے ہیں۔اور جب وہ اس عمل کو ادا کر لیتے ہیں تو اللہ کی ذات سے لو لگانا بھول جاتے ہیں۔

لیکن اس طرح کی حرکت مومن کی شان کے خلاف ہے کیونکہ بندے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے سرزدشدہ اعمال کی جانب سے بھی اللہ کی ذات سے خیر کی امید رکھیں جیسا کہ ان پر یہ بات بطور فریضہ عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے سرزدشدہ گناہوں کی طرف سے خوف وخشیت کا پہلو اختیار کیا کریں۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”امید ورجاء اور خوف وخشیت کا تعلق ماضی اور حاضر دونوں زمانوں سے ہوا کرتا ہے کیونکہ اس کے مطلوب شدہ انجام کار کا تعلق آئندہ سے ہوتا ہے چاہے وہ خوش آئند ہو یا ناپسندیدہ بہرحال مستقبل میں اسے اس سے سابقہ پڑنے والا ہوتا ہے، اسی لیے بندہ امید کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے عمل کو قبول فرمالے اور اس پر اس کو اجر وثواب سے نواز کر مستقبل میں اس پر رحم وکرم کا معاملہ فرمائے۔ اسی کے ساتھ بندے کو اس بات کا خوف لاحق رہتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اس کا عمل شرف قبولیت کے مقام تک رسائی نہ پاسکے اور اس کو اجر وثواب سے محرومی کا سامنا کرنا پڑے۔ مراد یہ ہے کہ بندہ امید وبیم کی کیفیت میں زندگی کے ایام گزارتا ہوا اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔“ [1]

[1] مجموع الفتاوی : ۷/۴۵۲.

دنیوی امور میں اللہ کی ذات سے امید وآس لگانا

امید وآس کا تعلق صرف اخروی امور پر منحصر نہیں بلکہ رجاء وامید کا تعلق جس طرح اُخروی امور سے ہے اسی طرح اس کا تعلق دنیوی معاملات سے بھی ہے۔ کیونکہ انسان کی سرشت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ کبھی تو اللہ تعالیٰ کی ذات سے حصول مال کی امید کرتا ہے اور کبھی اولاد سے سرخروئی کی تمنا کرتا ہے تو کبھی شادی بیاہ کے بارے میں اللہ کی ذات سے لو لگاتا ہے تو کبھی بیماریوں سے چھٹکارے کی آس لگائے زندگی کے ایام گزارتا رہتا ہے اور کبھی اسے کھوئی چیز کی بازیابی مطلوب ہوا کرتی ہے۔ جس طرح کا معاملہ اللہ کے نبی سیّدنا یعقوب علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا:

﴿ يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾ ﴾

(یوسف : ۸۷)

''اے میرے بیٹو! جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کا سراغ لگاؤ اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بے شک حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہوتے مگر وہی لوگ جو کافر ہیں۔''

سیّدنا یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو امید وآس سے کام لینے کا حکم دیا اور سیّدنا یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائی کے وجود سے ناامید نہ ہونے کے لیے کہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دنیوی معاملہ ہے۔

امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''سیّدنا یعقوب علیہ السلام کو جب اپنے بیٹوں کے بارے میں امید پیدا ہوئی تو انہوں نے اپنے بیٹوں سے فرمایا: اے میرے بیٹو ٹھیک اسی جگہ دوبارہ واپس جاؤ جہاں تم لوگ گئے تھے اور جہاں تم نے اپنے بھائیوں کو چھوڑا ہے اور اس بات

سے نا امید نہ ہو کہ یوسف اور اس کے بھائی کی جدائی کی وجہ سے ہم لوگ جس غم واندوہ سے دوچار ہیں اللہ تعالیٰ اس کے ازالہ کی صورت نکال دے اور اپنی طرف سے غیبی مدد بھیج کر ہمارے اوپر سے غم واندوہ کے بادل ٹال دے اور ان دونوں گم شدہ بھائیوں کے دیدار سے ہماری آنکھیں ٹھنڈی کردے کیونکہ اللہ کی رحمت سے کافر لوگ ہی مایوس ہوا کرتے ہیں اور بلاشبہ اللہ کی رحمت اور اس کی مدد سے ناامیدی اور اس کی ذات سے آس توڑنے کا کام کافروں کا ہی ہے، مومن کا یہ شیوہ نہیں۔'' ❶

جہاں تک دنیوی امور میں اللہ کی ذات سے امیدیں وابستہ کرنے کا معاملہ ہے تو یہ بڑا ہی اہم ترین معاملہ ہے کیونکہ مومن کے دل سے جب بھی دنیاوی معاملات میں اللہ کی ذات سے امید لگانے کے معاملے میں نقص پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے تو وہ شرک خفی کی راہ پر کھنچتا چلا جاتا ہے اور پھر شرک کی آلودگی سے اس کا وجود آلودہ ہو جاتا ہے۔

چنانچہ جب انسان کا تعلق رجاء وامید کے میدان میں اللہ تعالیٰ کی ذات سے پایۂ تکمیل تک پہنچ جاتا ہے تو خود بخود اس کے دل ودماغ کا تعلق رب کریم سے جڑ جاتا ہے اور مخلوق خدا کی طرف سے اس کا دل اچاٹ ہو جاتا ہے، پھر اللہ کے علاوہ مخلوق کی قدر وقیمت اس کی نگاہوں میں کوڑی کے برابر نہیں رہتی اور جب رجاء وامید کے پہلو میں نقص وکمی رہ جاتی ہے تو بندے کا تعلق مخلوق سے جڑتا چلا جاتا ہے اور وہ دنیوی معاملات میں بندوں سے امیدیں وابستہ کرنے لگتا ہے اسی کو شرک خفی کہا جاتا ہے مخلوق خدا میں شاذ ونادر ہی کوئی شخص اس بیماری سے بچا ہو، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ جس کو بچانا چاہے اور جس کی عصمت وآبرو کی رب کریم رکھوالی کرے۔ ❷

---

❶ تفسیر طبری: ۷/۲۸٤.

❷ مجموع الفتاوی: ۱/۹٤.

موت کے بعد بھی رجاء وامید کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا

جب بندہ خالق کائنات سے جا ملتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے لیے دار فانی سے کوچ کر جاتا ہے تو اس کی امید و آس میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اگر وہ نیکوکار لوگوں میں سے ہے کیونکہ مزدور کی مزدوری وصول کرنے کا وقت جب آتا ہے تو اس کی امیدیں اس بات سے وابستہ ہو جاتی ہیں کہ اب دیکھیں بطور مزدوری کیا حاصل ہونے والا ہے۔ چنانچہ جب اللہ کے نیکوکار بندے اللہ سے ملاقات کے لیے اس دار فانی سے کوچ کر کے اللہ کے حضور پہنچ جاتے ہیں تو ان کی لو اس بات کی طرف لگی رہتی ہے کہ دیکھیں بطور اجر و ثواب اللہ کی بارگاہ سے کیا نصیب ہونے والا ہے؟

اسی لیے سنت مطہرہ میں اس بات کی وضاحت وارد ہوئی ہے کہ بندہ قبر میں رب کریم کی ذات سے لو لگاتے ہوئے ذات باری تعالیٰ کو پکارتا ہے اور کہتا ہے: ''میرے رب قیامت قائم کر دے'' ❶ تاکہ میں اپنے اہل وعیال اور اپنے جنت میں مہیا مال و دولت سے مل کر سکون محسوس کر سکوں کیونکہ نیکوکار بندوں کے لیے جنت کی کھڑکی کھول دی جاتی ہے جس سے جنت کے مشک بار ہوا کے جھونکے اس کے لیے آنا شروع ہو جاتے ہیں اور نعیم جنت کی باد بہاراں چھن چھن کر آنے لگتی ہے، جو اس کے مشام جاں کو معطر کرنا شروع کر دیتی ہے تو اس موقع پر بندہ کو مخاطب کرتے ہوئے بارگاہ الٰہی سے ندا آتی ہے: ''جاؤ نئی نویلی دلہن کی طرح سو جاؤ، پھر اس کو اس کی نیند سے اس کے اہل وعیال میں سے محبوب ترین شخصیت ہی اٹھائے گی۔'' ❷

جہاں تک کفار کا معاملہ ہے تو وہ اپنی قبروں میں مارے خوف کے سہمے اور ڈرے ہوئے ہوں گے اور اس امید و آس میں ہوں گے کہ قیامت قائم نہ ہو۔ عذاب قبر کا مشاہدہ کر لینے کے بعد وہ یہ تمنا کریں گے، خصوصاً جب ان کو اس عذاب کی شدت اور سختی کا اندازہ ہو جائے

---

❶ احمد: ١٨٥٥٧ وصححه الالبانی رحمه الله.

❷ ترمذی، کتاب الجنائز، باب ما جاء فی عذاب القبر: ١٠٧١ وحسنه الالبانی رحمه الله.

گا، جس سے انہیں دوچار ہونا ہے اور جس کے وہ منتظر ہیں۔

ذرا آل فرعون اور اس کے لاؤ لشکر کا قصہ پڑھو جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں صراحتاً فرمادیا:

﴿ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِيًّا ۚ وَ يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۫ اَدْخِلُوْۤا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿۴۶﴾ ﴾ (المومن: ٤٦)

''جو آگ ہے، وہ اس پر صبح و شام پیش کیے جاتے ہیں اور جس دن قیامت قائم ہوگی، آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں داخل کرو۔''

بلاشبہ آل فرعون اور ان کا لاؤ لشکر اپنی اپنی قبروں میں ہی ہیں اور ان کے خوف میں روز افزوں کئی گنا اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے!! کیونکہ وہ روزانہ جہنم کی آگ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں اور ان کو اس بات کا بخوبی علم ہوچکا ہے کہ ان کا آخری انجام کار کیا ہے اور انہیں آخرکار کہاں جانا ہے؟ اور ان کا ٹھکانہ کیا ہے؟ اس لیے ذرا تصور تو کرو کہ اس وقت قبروں میں ان کی خوف اور دہشت کا کیا عالم ہوگا؟ اور وہ کیسے سہمے ہوئے قبروں میں وقت گزار رہے ہوں گے؟ اور فی الحال ان کی سراسیمگی کا کیا عالم ہوگا؟ (نسال اللہ السلامة والعافية)

مخلوق خدا کی امید اور آس کو کب شرک اکبر شمار کیا جاتا ہے؟

رجاء اور امید کا بلند ترین درجہ اللہ وحدہ لاشریک سے امید و آس لگانے اور مخلوق خدا سے امیدیں توڑ لینا ہے، لیکن کبھی انسان کے دل میں لوگوں سے امیدوں کی وابستگی کا داعیہ پیدا ہوجاتا ہے کبھی تو وہ اس کی شخصیت کے رعب و دبدبہ اور بارسوخ ہونے کی وجہ سے اور کبھی اس کی مالداری اور تونگری کی وجہ سے یا اس کے اثر و رسوخ اور اوپر تک پہنچ کی وجہ سے اس کی ذات سے امید لگا بیٹھتا ہے اور اس کو مذکورہ قسم کے شخص کی شخصی اثر و رسوخ کی وجہ اس کی ذات سے آس لگ جاتی ہے یہ وہ خرابی یا بگاڑ ہے یا یہ وہ وبا اور مرض ہے جس کے دام میں آنے سے شائد ہی کوئی شخص بچ سکا ہو۔

لیکن یہاں پر اہم ترین سوال یہ ہے کہ مخلوق سے امیدیں وابستہ کرنے کو کب شرک اکبر کے زمرے میں شمار کیا جائے گا؟

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جو شخص خالق اور مخلوق کے درمیان محبت و چاہت، خوف وڈر اور جاء وامید میں برابری کا معاملہ روا رکھے وہ شخص مشرک ہے۔'' [1]

امید وبیم اور شرک اکبر کے درمیان یہی قاعدہ کلیہ فرق کرنے کی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ جب تم امید وآس لگانے کے بارے میں اللہ اور مخلوق کائنات کے درمیان برابری کا رویہ اختیار کرو گے تو شرک اکبر کے مرتکب کہلاؤ گے۔

لہٰذا میری نصیحت ہے کہ مومن اس راہ میں شرک اکبر کے ارتکاب سے دامن بچانے کی کوشش کرے اور راہ مستقیم پر گامزن ہو جائے جس کی بنیاد پر ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ اسے دردناک عذاب کی رسوائی سے نجات عطا فرمادے۔

[1] مجموع الفتاوی: ۳۳۹/۲۷.

خاتمہ

مومن کو چاہیے کہ وہ امید اور رجاء اور خوف وخشیت کے درمیان رہ کر اپنی عبودیت کا ثبوت پیش کرے تا کہ وہ اپنے ہدف تک رسائی میں کامیاب ہو سکے اور اپنی منزل مراد تک پہنچنے میں سرخروئی سے بہرہ ور ہو۔

امام مناوی رحمہ اللہ اس موضوع پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: ''خوف وخشیت اور امید وآس میں سے دونوں عبودیت کے بال وپر ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام اضطرار (بے قراری یا بے چینی) ہے اور دوسرے کا نام (افتقار) یعنی (محتاجی ومفلسی) ہے لہٰذا خوف وخشیت تو (اضطرار) ہے اور رجاء اور امید (افتقار) ہے اور اللہ کی عبادت (تقصیر) یعنی کوتاہی رہ جانے کے خدشہ اور عبادت کی توفیق ملنے کے شکر کے جذبہ سے نکھرتی ہے، لہٰذا کوتاہی اور تقصیر کا جذبہ خوف وخشیت الٰہی کا موجب ہوا کرتا ہے اور توفیق سے سرشاری کا جذبہ بندے کے اندر رجاء اور امید کی آس پیدا کرتا ہے۔ [1]

اس لیے ایک مومن کو اللہ کی رحمت سے مایوسی سے بچتے رہنے کی کوشش کرنا چاہیے اور اللہ کی ذات بابرکات سے حسن ظن رکھنا چاہیے کیونکہ اللہ کی ذات ہی وہ مقدس ذات ہے جو ہماری امنگوں اور آرزوؤں کا محور ہے۔

امام مناوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''قنوط: یعنی رحمت الٰہیہ اور افضال رحمانیہ کے خلیوں کو مسدود کرنے کا نام مایوسی اور ناامیدی ہے۔ اسی لیے اس کو قلبی گناہوں کے ضمن میں کبیرہ گناہوں میں شمار کیا جاتا ہے لہٰذا اللہ کی ذات سے حسن ظن اور اس کی جناب سے امید و

[1] فیض القدیر: ۳/۳۱۵.

آس ہی وہ بہترین زاد راہ ہے اور عظیم الشان توشہ مومن ہے جسے مومن رب کریم کی بارگاہ میں حاضری کی خاطر اختیار کرتا ہے اور اسے اپنے توشہ دان میں نمایاں مقام عطا کرتا ہے۔''[1]

اسی طرح مومن کو یہ بات زیب نہیں دیتی یا اس شخص کے لیے جو اپنے نفس کو نصیحت کا فریضہ انجام دے یہ بات مناسب نہیں کہ وہ اپنے نفس کی برائیوں سے چشم پوشی اختیار کرے اور اندھا بن کر گناہوں کا ارتکاب کرتا رہے اور یہ کہہ کر اپنے نفس کو تسلی دیتا رہے کہ اس کا تعلق اللہ کی ذات سے حسن ظن کی بنیاد پر قائم ہے یا حسن رجاء وامید کی وجہ سے وہ ایسا کر رہا ہے۔

امام ابوالوفاء ابن عقیل رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''محتاط رویہ اختیار کرو دھوکا اور مغالطہ کی زندگی گزارنے سے پرہیز کرو۔ تمہیں اس بات کا بخوبی علم ہوگا کہ صرف ۳/ درہم کی چوری پر قطع ید کی سزا تجویز کی گئی ہے اور صرف سوئی کے سرے کے برابر شراب نوشی پر حد سکر کے نفاذ میں کوڑے لگانے کی سزا شرعاً عائد ہوتی ہے اور صرف بلی کو تکلیف دینے کی وجہ سے ایک عورت جہنم کی مستحق قرار پائی اور صرف ایک جبہ چوری کرنے کی وجہ سے وہ شخص جہنم رسید ہوا جو کہ شہید ہو کر اس دنیا سے رخصت ہوا۔''[2]

ناامیدی اور مایوسی کی زندگی مت گزارو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو دنیا میں تمہاری حیثیت ایک مردار کی سی ہے۔ عربی کے مشہور شاعر ابن علاء کے اشعار کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

''جو شخص طبعی موت مر جائے تو موت کی وجہ سے اس کو اصل مردہ تصور نہیں کیا جاسکتا بلکہ مردہ تو وہ ہے جس کا شمار زندوں میں ہو مگر حقیقت میں وہ مردہ ہو لہٰذا مردوں میں بلاشبہ شمار تو اس شخص کا ہے جو ذلت وخواری کی زندگی گزارے برے حال سے دوچار ہو اور اس حال میں بھی اللہ کی ذات سے امید وآس کی

---

[1] فیض القدیر: ٦/٤٥٥.

[2] الجواب الکافی: ٢١.

توفیق نہ ہو۔'' ❶

میرے بھائی! تم کو اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ اعمال قلوب کا ایک دوسرے سے چولی دامن کا ساتھ ہے ان میں سے ہر ایک ایک دوسرے سے مربوط ہیں چنانچہ جب بھی ان اعمال میں سے کسی عمل کو تقویت پہنچے گی اس کی بنیاد پر دوسرے عمل کو خود بخود تقویت ملتی چلی جائے گی۔ اسی طرح اس کے عکس معاملہ ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جان لو اور یہ بات گرہ میں باندھ لو کہ اللہ کی طرف قلبی طور پر متوجہ کرنے کے محرک اعمال تین ہیں: (۱) محبت (۲) خوف (۳) رجاء یعنی امید ان میں قوی ترین محرک محبت ہے۔

خوف کا مقصد ڈرانا دھمکانا اور راہ راست سے کج روی اختیار کرنے سے روکنا اور منع کرنا ہے اور محبت کا ہدف بندے کو محبوب تک پہنچنے والے راستہ کی پہچان اور رہنمائی کا فریضہ انجام دے کر اسے محبوب تک رسائی کی راہ ہموار کرنا ہے۔ محبت میں جتنی قوت اور طاقت یا اس میں جتنا ضعف اور کمزوری ہوگی اسی کے بمقدار محبوب تک رسائی کی رفتار میں تیزی یا دھیما پن پایا جائے گا اور خوف کا خاصہ یہ ہے کہ وہ محبّ کو محبوب تک رسائی والے راستہ سے بھٹکنے یا راستہ چلتے چلتے راہ بھول جانے سے باز رکھنے کا ذریعہ اور آلہ کار ہے اور امید وآس محبّ کے لیے محبوب تک رسائی کی خاطر رہنمائی کا فریضہ انجام دیتی ہے۔

یہ وہ قاعدہ وکلیہ ہے جو مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کو حرز جاں بنا لے کیونکہ اس کے بغیر شان عبودیت کا حصول محال ہے۔ ہم میں سے ہر بندے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ کا فرماں بردار بندہ بن کر اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دے اور اللہ کے علاوہ کسی اور کا بندہ نہ بنے۔'' ❷

---

❶ معجم الشعراء: ۱/۲۷۔ ❷ مجموع الفتاوی: ۱/۹۵۔

خوب اچھی طرح اس بات کو ذہن نشین کرلو کہ عمل قلب کے بارے میں اہتمام کے سلسلہ میں کسی ایک جزپر عمل کرنا اور بقیہ اعمال قلبیہ کی طرف سے سستی برتنا گمراہی اور کج روی کا پیش خیمہ ہے۔ اس کی وجہ سے بندہ دھوکہ کھا کر راندۂ بارگاہ ہوسکتا ہے اور گناہوں و نافرمانیوں کی دلدل میں الجھ کر زندگی بیکار کرسکتا ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''بعض سلف کا قول ہے کہ جو شخص صرف محبت کی بنیاد پر اللہ کی عبادت وریاضت کرنے کا دعویٰ کرے ایسا شخص زندیق ہے اور جو شخص محض اللہ کے خوف اور اس کے ڈر کی وجہ اس کی عبادت کرے تو ایسا شخص حروری ہے اور جو شخص صرف امید کی بنیاد پر اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کرے تو سمجھ لو وہ مرجئی ہے اور جو شخص اللہ کی عبادت محبت وچاہت، خوف وخشیت اور امید وآس کی بنیاد پر کرے تو وہ شخص مومن موحد ہے۔'' [1]

اے اللہ! اپنی چشم بیدار کے ذریعہ میری حفاظت ونگہبانی اور میری نگرانی فرما اور اپنی اس خاص رحمت کے سایہ میں ہمیں لے لے جہاں تک رسائی کا تصور بندے کے بس کی بات نہیں اور اپنی قدرت وشان کے صدقہ مجھ پر رحم وکرم فرما تاکہ ہم ہلاکت وبربادی سے دوچار نہ ہوں۔ تیری ذات دعاؤں کو قبول کرنے والی ہے اور تیری ذات تو امید وآس کا محور ہے۔ تیری ذات سے امید وآسرا کا سہارا ٹوٹ نہیں سکتا۔ تیری ذات ہمارے لیے کافی وشافی ہے اور تو ہی ہمارے لیے بہترین کارساز ہے۔

''اے اللہ! کامیابی وکامرانی تیری ذات سے کتنی قریب تر ہے، تو ہی امیدوں وتمناؤں کی آماجگاہ ہے اور نجات وکامیابی کے لیے تجھ سے ہی لو لگائی جاتی ہے۔ تیری ہی ذات جائے پناہ ہے لہٰذا میرا معاملہ تیری ہی ذات کے سپرد ہے۔ تو ہی میری امیدوں کو برلانے والا ہے۔''

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ .

[1] مجموع الفتاوی: ۱۰/۸۱.

اپنے فہم وادراک کا امتحان لیں!

ذیل میں اس موضوع سے متعلق سوالات کو دو مرحلوں کو مدنظر رکھتے ہوئے وضع کیا گیا ہے:

سوالوں کی ایک قسم تو وہ ہے جن کا جواب فوراً دینا ہے، اس قسم کے سوالات کو پہلے مرحلہ میں رکھا گیا ہے۔

سوالوں کی دوسری قسم وہ ہے جو بحث ونظر اورغور وفکر کی متقاضی ہے۔اس قسم کے سوالات کو دوسرے مرحلہ میں رکھا کیا گیا ہے۔

<u>پہلے مرحلے کے سوالات جن کا جواب فوراً دینا ہے:</u>

۱۔ امید ورجا اور تمنا وآرزو میں کیا فرق ہے؟

۲۔ رجا وامید کے چار ثمرات وفوائد کا ذکر فرمائیں؟

۳۔ ان اسباب وعوامل کا ذکر کریں جو رجا وامید تک رسائی کا ذریعہ ہیں۔

۴۔ قرآن کریم میں کوئی ایسی آیت وارد ہوئی ہے جو امید وبیم دونوں کی جامع ہے۔اس کا ذکر فرمائیں؟

۵۔ وہ کون سے حالات اور مواقع ہیں جہاں مومن پر امید وآس کے بجائے خوف وخشیت طاری ہونا چاہیے؟

۶۔ وہ کون سے حالات ومواقع ہیں جہاں بندۂ مومن پر خوف وخشیت کے مقابلہ میں امید کا پہلو غالب ہونا چاہیے؟

۷۔ رجا وامید کی انواع واقسام کا تذکرۃ فرمائیں ان میں سے مذموم ومحمود دونوں کی وضاحت فرمائیں۔

۸۔ رجاء وامید کے درجات ومراتب کا تذکرہ فرمائیں۔

۹۔ مومن کی رجا وامید کی صحت کی علامت کیا ہے؟

۱۰۔ محرکات قلوب کیا ہیں؟ ان میں سے قوی ترین محرک کون سا ہے؟

دوسرے مرحلے کے سوالات جو استنباطی انداز کے ہیں:

۱۔ مذکورۃ عبارت کی وضاحت فرمائیں (کل خائف راجی، وکل راج خائف)

۲۔ بعض ان اسباب وعوامل کا تذکرہ کریں جو رجا وامید بر لانے میں مدد ومعاون ہیں جن کا ذکر اس کتاب میں نہیں ہے؟

۳۔ کیا رجا وامید کی حیثیت دوا اور علاج کی ہے۔ اگر ہے تو کیوں؟ وضاحت فرمائیں۔

۴۔ اس قاعدہ کلیہ کا ذکر فرمائیں کہ خوف وخشیت یا امید وبیم کے پہلو سے قلب مومن میں جس کا تحقق ضروری اور لازمی ہے۔

۵۔ اللہ کے ذکر سے ہر وقت سرشاری کا شمار رجا وامید کے ثمرات وفوائد میں ہوتا ہے؟

۶۔ مایوسی کیا چیز ہے؟ اور ایک مسلمان اس سے کیسے دامن بچا سکتا ہے؟

۷۔ مخلوق سے امید وآس لگانا کب شرک اکبر کہلائے گا؟

۸۔ کیا رجا وامید کا تعلق صرف امور اخروی تک محدود ہے؟ اس کی وضاحت فرمائیں۔

۹۔ ہوا میں تیر چلانے اور صرف خیالی پلاؤ پکانے سے کس طرح پرہیز کیا جا سکتا ہے؟

۱۰۔ ان کتابوں میں سے چند کتابوں کا تذکرہ فرمائیں جو موضوع رجاء پر مرجع کی حیثیت رکھتی ہیں؟

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ.

أعمال
القلوب
تقویٰ کی حقیقت
اخلاص
خوف
محاسبہ
شکر
غور و فکر
ورع
تقویٰ
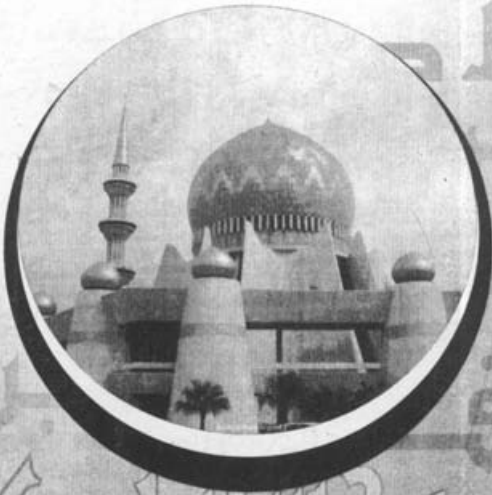
مقدمہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى اَشْرَفِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ ، نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ . اما بعد !

اعمال قلوب کے متعلق لکھے گئے کتابچوں میں یہ چھٹا ہے جس کو تقویٰ اور اس کی اہمیت وافادیت کے بارے میں ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کتابچہ کا بھی شمار میرے سلسلہ اعمال القلوب مقالات میں ہوتا ہے۔ آج اللہ کی توفیق سے آپ کے سامنے فائدہ کی غرض سے پیش کرنے کی مجھے سعادت نصیب ہوئی، اس کے ترجمہ وتیاری میں الفرقان ٹرسٹ نے تعاون کیا اور آج یہی مکتبہ والے اس کتابچہ کو چھاپ کر اس کی نشر واشاعت میں حصہ لے رہے ہیں۔

دراصل تقویٰ کی حیثیت انسان کے لیے زادراہ کی ہے بلاشبہ دار آخرت کے سفر کے لیے تقویٰ سے بہتر موزوں اور کوئی زادراہ نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۫ وَ اتَّقُوْنِ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿١٩٧﴾﴾

(البقرہ: ۱۹۷)

”اور زادراہ لے لو کہ بے شک زادراہ کی سب سے بہتر خوبی (سوال سے) بچنا ہے اور مجھ سے ڈرو اے عقلوں والو!“

یقیناً تقویٰ اور خوف خدا لوگوں کے درمیان عزت اور شرف میں فرق کرنے کا معیار اور کسوٹی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿١٣﴾﴾

(الحجرات: ۱۳)

”بے شک تم میں سب سے عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سب سے

زیادہ تقویٰ والا ہے۔''

تقویٰ فضائل وکمالات کا خزینہ ہے۔شمائل وخصوصیات کا گنجینہ ہے چنانچہ رحم وکرم، صدق ووفا، سچائی وراست گوئی، عدل وانصاف، جود وسخا جیسی مہتم بالشان صفات کا وجود تقویٰ وللّٰہیت ہی کا مرہون منت ہے۔تقویٰ وخشیت گھبراہٹ کے وقت قربت اور انس کا ذریعہ ہے اور ہلاکت وبربادی سے نجات دلانے کا مجرب نسخہ ہے۔

اس کے اسی مرتبہ اور قدر ومنزلت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کی بنیاد پر ایک دوسرے کا تعاون اور مدد کرنے کا حکم دیا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ﴾ (المائدة : ٢)

اور نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو۔''

''اور نیکی وپرہیزگاری کی بنیاد پر ایک دوسرے کی امداد اور تعاون کیا کرو۔''

کیونکہ تقویٰ رب کریم کی خوشنودی اور رضامندی تک رسائی کا زینہ ہے۔

تو تقویٰ کیا ہے؟ ہمارے دلوں میں تقویٰ کیسے جاگزیں ہوسکتا ہے؟ اس کے ثمرات اور نتائج کیا ہیں؟ اور اس کی قدر ومنزلت کیا ہے؟ اور اس کے کون کون سے درجات ہیں؟ اور تقویٰ کے حصول کے لیے مددگار اسباب ووسائل کیا ہیں؟ یہ اور اس قسم کے سوالات کے جوابات آپ کو اس کتابچہ میں ملیں گے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس کے بیان اور اس کی توضیح وتشریح کی توفیق عطا فرمائے۔(انه ولی ذلك والقادر علیه).

محمد صالح المنجد

تقویٰ کی لغوی و اصطلاحی تعریف

عربی زبان میں کم کلامی کو اصلاً تقویٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی لیے عربی زبان میں مثل مشہور ہے: ”التقی ملجم“ متقی شخص کے منہ میں گویا کہ لگام لگی ہوئی ہوتی ہے۔

یہاں پر جس تقویٰ کا بیان چل رہا ہے وہ ”الاتقاء“ سے مشتق ہے۔ اس سے مراد اللہ کا وہ خوف اور لحاظ ہے جو تمہارے درمیان اور جس چیز سے تمہارا دل کراہت کر رہا ہے اس کے درمیان دیوار بن کر حائل ہو جائے۔

تو پتہ یہ چلا کہ تقوی دراصل اتقی سے ماخوذ ہے۔ اس کا مصدر الاتقاء ہے۔

تقویٰ کی اصطلاحی تعریف:

علمائے کرام نے مختلف عبارات میں الگ الگ زاویوں سے اس کی تعریف کی ہے اسی لیے اس کی توضیح کے لیے علمائے کرام سے بہت سی عبارتیں نقل کی گئی ہیں ان میں سے حسب ترتیب چند عبارتوں کو نقل کیا جا رہا ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

”اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جس چیز کا حکم دیا ہے اس کے کرنے اور جس چیز سے منع کیا ہے اس کو ترک کر دینے کا نام تقویٰ ہے۔“ [1]

امام ابن قیم رحمہ اللہ نے تقویٰ کی تعریف کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

”جہاں تک تقویٰ کا معاملہ ہے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی اطاعت وفرماں برداری میں اجر وثواب کی نیت سے اس کے اوامر ونواہی کی انجام دہی تقویٰ کی حقیقت اور بنیاد ہے لہٰذا متقی وہ ہے جو حکم صادر کرنے والے (شارع حکیم) کے سامنے

[1] مجموع الفتاویٰ: ۳/۱۲۰.

سر تسلیم خم کرتے ہوئے اور اس کے وعدے اور وعید کی تصدیق کرتے ہوئے اور جس چیز کی انجام دہی سے اس نے منع کیا ہے بسر وچشم اس کو ترک کرتے ہوئے اور اس کی وعید سے ڈرتے اور خوف کھاتے ہوئے عمل درآمد کرتا ہے دراصل یہی تقویٰ کی حقیقت ہے اور بلاشبہ تقویٰ یہ ہے جیسا کہ طلق بن حبیب رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: ''اگر فتنہ وفساد کی آگ بھڑک اٹھے تو اسے تقویٰ کی ٹھنڈک سے ٹھنڈا کرو'' لوگوں نے ان سے پوچھا: آخر یہ تقویٰ ہے کیا؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ تم اللہ تعالیٰ کے نور کی روشنی میں اس کی اطاعت وفرماں برداری کرو اور اللہ سے اجر وثواب کی امید رکھو اور اللہ تعالیٰ کے نور کی روشنی میں اس کی معصیت اور نافرمانی ترک کردو اس حال میں تم اللہ کے عتاب اور عقاب سے لرزہ براندام ہو۔'' [1]

تقویٰ کی تعریف کرتے ہوئے یہ سب سے بہترین پیرایہ بیان استعمال کیا گیا ہے۔ میرے خیال میں تقویٰ کی تعریف کے سلسلہ میں یہ سب سے خوبصورت انداز کی تعریف ہے۔ [2]

امام ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ نے تقویٰ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''دراصل تقویٰ یہ ہے کہ بندہ اپنے درمیان اور جس چیز سے اس کو خوف محسوس ہو رہا ہے یا جس چیز سے اس کو اندیشہ لاحق ہے اس کے درمیان ایک دیوار کھڑی کرلے جس کی پشت پناہی اس کے لیے بچاؤ کا ذریعہ بن جائے۔'' [3]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ تقویٰ کی تعریف میں رقم طراز ہیں:

''تقویٰ طاعات وبندگی کے کاموں کی انجام دہی اور منکرات سے متعلق اعمال سے اجتناب کا نام ہے یہ اور اس قسم کے تمام امور کے لیے یہ جامع اور مانع ہے۔'' [4]

امام ابوالسعود رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

[1] الزهد لابن المبارك: ١٣٤٣.
[2] زاد المهاجر: ١٠.
[3] جامع العلوم والحكم: ١٨٥.
[4] تفسير ابن كثير: ٢٨٤/١.

''آخرت میں مضرت رساں چیزوں سے بوجہ اتم احتیاط برتنے کا نام تقویٰ ہے۔'' ❶

علامہ مبارک پوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''متقی وہ ہے جو اس چیز پر عمل کرنا ترک کر دے جس کی انجام دہی میں کوئی حرج نہیں محض اس چیز کی انجام دہی میں ملوث ہونے کی خطرے سے جس کو انجام دینا باعث شکوک وشبہات ہو۔'' ❷

تقویٰ کی تعریف میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ سے خوف کھانے اور قرآن مجید پر عمل کرنے اور قلیل (روکھے سوکھے) پر اکتفا یا قناعت کرنے اور موت کی آغوش میں جانے والے دن کی تیاری میں لگے رہنے کو تقویٰ کہا جاتا ہے۔''

سیّدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سیّدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے تقویٰ کے بارے میں دریافت فرمایا تو انہوں نے جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''کیا کبھی تم خاردار راستہ پر پیدل چلے ہو؟ تو سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ہاں۔ تو سیّدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا کہ ''اس موقع پر تم نے کیا حکمت عملی اختیار کی؟ سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: اس کے لیے اہتمام کیا اور بڑے احتیاط سے کپڑے سمیٹ کر ڈر ڈر کر چلتے ہوئے راستہ طے کیا۔ سیّدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہی تو تقویٰ ہے۔'' ❸

عربی کے مشہور شاعر ابن معتز کے اشعار ملاحظہ فرمائیں:

''گناہ ترک کردو چاہے وہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ اور اس شخص کا طریقہ اختیار کرو جس کو خاردار راستہ پر پیدل چل کر سفر طے کرنا ہے ایسا شخص انتہائی محتاط انداز اختیار کرتا ہوا ڈرتا ڈراتا پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے کہ کہیں کانٹا نہ چبھ جائے اور صغیرہ گناہ کو حقیر نہ جانو کیونکہ پہاڑ کنکریوں اور پتھر کے ٹکڑوں سے ہی بنتا ہے۔''

---

❶ تفسیر ابی السعود: ۱/ ۲۷. ❷ تحفة الاحوذی: ۶/ ۲۰۱.
❸ تفسیر القرطبی: ۱/ ۲۰۳.

تقویٰ کی تعریف میں مزید یہ بھی کہا جاتا ہے:

''تم اس جگہ نظر نہ آؤ جہاں جانے سے تم کو منع کیا گیا ہے اور اس جگہ غائب نہ رہو جہاں حاضر رہنے کا تمہارے لیے فرمان جاری ہوا ہے۔''

اگر شارع حکیم نے تم کو اس مجلس میں بیٹھنے اور شریک ہونے سے منع کیا ہے جہاں اللہ کی آیات کا مذاق اڑایا جاتا ہو اور کتاب اللہ کی آیات کی ہنسی اڑائی جاتی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے شارع حکیم تمہارے وجود کو ایسی مجالس سے دور رکھنا چاہتے ہیں لہٰذا ایسی جگہ تم کو نہیں جانا چاہیے کیونکہ اس قسم کی مجلسوں میں حاضری تقویٰ کے خلاف عمل ہے اور کیونکہ تم کو مساجد میں پانچ نمازوں اور جمعہ کے دن حاضری کا حکم دیا گیا ہے تو وہاں تمہاری حاضری مطلوب ہے یہاں تمہاری غیر حاضری تقویٰ کے خلاف عمل ہے۔

قرآن کریم میں تقویٰ کا اطلاق متعدد امور پر ہوا ہے

۱۔ قرآن کریم میں لفظ تقویٰ کبھی تو خوف وخشیت اور ہیبت ورعب طاری ہونے کے معنی میں آتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ﴾ (البقرۃ : ٤١)

''اور صرف مجھی سے پس ڈرو۔''

مراد یہ ہے کہ میرا خوف کھاؤ اور تم پر میری ہیبت کا رعب طاری ہونا چاہیے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَ اتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ﴾ (البقرۃ : ٢٨١)

''اور اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

مراد یہ ہے کہ اس دن کی ہولناکی اور اس میں جو نفسا نفسی کا عالم ہوگا اس سے ڈرو اور ایک جگہ اور بھی ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ يَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا﴾ (الانسان : ٧)

''جو اپنی نذر پوری کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی مصیبت بہت زیادہ پھیلی ہوئی ہوگی۔''

مراد یہ ہے کہ یہ لوگ اس دن کے ڈر سے محرمات اور معاصی کا ارتکاب نہیں کرتے۔

امام ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ تقویٰ کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''جہاں تک تقویٰ کا معاملہ ہے تو کبھی تو لفظ تقویٰ اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ مضاف ہوکر آتا ہے، جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝﴾ (المائدة: ٩٦)

''اور اللہ سے ڈرو جس کی طرف تم اکٹھے کیے جاؤ گے۔''

جب لفظ تقویٰ کی اللہ تعالیٰ کی طرف اضافت کی جائے تو اس سے اللہ کے غیظ وغضب سے خوف کھانا مقصود ہوتا ہے (اور اللہ کے غیظ وغضب سے بچنا ہی انسان کے لیے اصل مقصود ہے) کیا اس سے بھی بڑھ کر کوئی اور چیز ہوگی جس سے ڈرا جائے۔ اسی خوف اور ڈر کی بنیاد پر دنیوی اور اخروی جزا وسزا مرتب ہوتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ﴾ (آل عمران: ٢٨)

''اور اللہ تمھیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ۝﴾ (المدثر: ٥٦)

''وہی لائق ہے کہ (اس سے) ڈرا جائے اور لائق ہے کہ بخش دے۔''

مراد یہ ہے کہ یہ اللہ ہی کی ذات اقدس ہے کہ اس سے ڈرا جائے اور اس کی ہیبت اور کبریائی کو یاد رکھا جائے اور اس کی تعظیم کی جائے اور اس کی عظمت وکبریائی کی قندیلیں بندوں کے دلوں میں ہر وقت فروزاں رہیں تاکہ اس کی عبادت وریاضت کی انجام وہی برقرار رہے اور بندے اس کی اطاعت وفرماں برداری میں مصروف عمل رہیں اور اللہ کی ذات کی طرف بندہ اس کی عظمت وکبریائی، اس کا اعزاز واکرام نیز اس کی صفت کبریائی اور عظمت

شان اور یہ کہ اس کی گرفت اور پکڑ کی قوت وسطوت اور اس کے عذاب وعقاب کی سختی کو مدنظر رکھتے ہوئے جس کا وہ مستحق ہے متوجہ ہو جائے۔

کبھی تقویٰ کی اضافت اللہ کے عقاب کی طرف کر کے اسے قرآن کریم میں استعمال کیا گیا ہے یا سزا وجزا کی جگہ کی طرف اضافت کر کے اسے لایا گیا ہے، جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴾ (آل عمران : ۱۳۱)

''اور اس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔''

کبھی تقویٰ کو عقاب کے زمان ومکان (جیسے کہ قیامت کے دن) کی طرف منسوب کر کے پیش کیا گیا ہے، جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ﴾ (البقرۃ : ۲۸۱)

''اور اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

مراد یہ ہے کہ اس دن کی ہولناکی اور اس میں جو نفسانفسی کا عالم ہوگا اس سے ڈرو۔ [1]

۲۔ تقویٰ کبھی اطاعت اور عبادت کے معنی میں آتا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ ﴾ (آل عمران : ۱۰۲)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو، جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے۔''

مراد یہ ہے کہ اس کی صحیح معنوں میں اطاعت وفرماں برداری بجالاؤ اور اس کی ایسی عبادت کرو جیسی کہ کرنی چاہیے یعنی اس کی عبادت کا پورا پورا حق ادا کرو۔ سیّدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

''اس کی اطاعت وفرماں برداری اس طریقہ پر کی جائے کہ اس کے بعد اس کی معصیت کی طرف توجہ مبذول نہ ہو اور اس کے ذکر کی ایسی عادت بن جائے کہ اس کی یاد فراموش نہ کی جا سکے اور اس کا شکر ایسے کیا جائے کہ ناشکری کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔'' [2]

[1] جامع العلوم والحکم : ۱۸۵۔ ۱۵۹۔

[2] تفسیر طبری : ۳/۳۷۵۔

۳۔ کبھی تقویٰ کا اطلاق گناہوں سے براءت پر ہوتا ہے اور اصطلاحاً دراصل تقویٰ کی تعریف ہی یہی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَخْشَ اللّٰهَ وَ يَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴾ (النور: ٥٢)

''اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اور اللہ سے ڈرے اور اس سے بچے تو یہی لوگ کامیاب ہیں۔''

مراد یہ ہے کہ فلاح اور کامیابی کے مستحق صرف وہ لوگ ہیں جو اپنے تمام معاملات میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فیصلے کو خوش دلی سے قبول کرتے ہیں اور اسی کی اطاعت وفرماں برداری کرتے ہیں اور خشیت الٰہی وتقویٰ سے متصف ہیں نہ کہ دوسرے لوگ جو ان صفات سے یکسر محروم ہیں۔

تقویٰ کے احکام وقوانین

تقویٰ واجبات میں اہم ترین واجب کی حیثیت سے شرعاً معروف ہے۔ قرآن کریم اور سنت مطہرہ سے وارد نصوص اور کلام سلف رحمہم اللہ سے جس کا صریح ثبوت بطور دلیل موجود ہے اور قرآن کریم کی اکثر وبیشتر آیات میں اس پر عمل کی وصیت وارد ہوئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ﴾ (النساء: ١٣١)

''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے ان لوگوں کو جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور تمھیں بھی تاکیدی حکم دیا ہے کہ اللہ سے ڈرو۔''

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''تقویٰ کا حکم تمام امتوں کے لیے عام ہے۔'' [1]

---

[1] تفسير القرطبي : ٣٨٩/٥.

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''تقویٰ مخلوق کائنات میں سے ہر شخص کے لیے واجب ہے اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر تقویٰ اور پرہیزگاری اپنانے کا حکم دیا ہے اور اس کو اختیار کرنے کی وصیت فرمائی ہے جس شخص کو تقویٰ اور پرہیزگاری کی کوئی پرواہ نہ ہو اس کی اللہ تعالیٰ نے مذمت فرمائی ہے اور جو شخص تقویٰ سے استغناء (بے نیازی) برتے اللہ تعالیٰ نے اس کو دھمکی دے کر اور شدید وعید سنا کر وارننگ دی ہے۔'' [1]

اور بعض اہل علم کا قول ہے: ''مذکورہ آیت قرآن کی تمام آیتوں کا محور ہے کیونکہ قرآن کی تمام آیات کسی نہ کسی زاویہ سے اس آیت کے اردگرد چکر کاٹتی ہوئی نظر آتی ہیں۔'' [2]

امام سعدی رحمہ اللہ اس آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں عمومی طور پر وسیع وعریض قبضہ تصرف اور عظیم الشان ملکیت وحکمرانی کا تذکرہ فرمایا ہے جو کہ اس بات کو التزامی طور پر ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام قسم کی تدابیر اور ہر طرح کے انتظام وانصرام اور انواع واقسام کے تصرفات واختیارات کا قدرتی اور شرعی طور پر ذمہ دار ہے تو اس کا تصرف شرعی تو یہ ہے کہ اس نے اولین وآخرین اور اہل کتب سابقہ میں سے ہر ایک کے لیے امر ونہی کے قالب میں احکامات شرعیہ کی قانون سازی کے سایہ تلے حکم صادر فرما دیا ہے کہ جو شخص اس وصیت پر عمل پیرا ہو اس کو اجر وثواب سے نوازنے کا وعدہ ہے اور جو شخص اس زاویہ سے شرعی احکامات سے عدم توجہ کا شکار ہو یا اس کو ضائع کرنے پر تلا ہوا ہو تو اسے دردناک عذاب کی وارننگ بھی دی ہے۔'' [3]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تقویٰ کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ سیّدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

---

1. شرح العمدة: ٦٢٧/٣.
2. تفسير القرطبي: ٣٨٩/٥.
3. تفسير السعدي: ٢٠٧.

فرماتے ہیں کہ مجھ کو حکم دیتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے یوں ارشاد فرمایا:

''جہاں کہیں رہو تقویٰ کا دامن ہاتھ میں تھامے رکھو۔'' ❶

کتاب وسنت کی نصوص تقویٰ کے واجب ہونے اور اس کی انجام دہی کا حکم دینے میں بالاجماع متفق ہیں۔

تقویٰ کی قدر ومنزلت

اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ شریعت اسلامیہ میں تقویٰ کی بڑی قدر ومنزلت ہے اسی لیے تو انبیاء علیہم السلام اور اسلاف میں سے صالحین اور متقین اپنی اپنی قوم کے لوگوں اور اپنے ماننے والوں اور برادری والوں کو تقویٰ وخشیت الٰہی کی وصیت کیا کرتے تھے۔

سیّدنا عرباض رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دن نبی کریم ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی اور نماز کی ادئیگی کے بعد ہماری طرف متوجہ ہوئے اور ہم لوگوں کو وعظ کرنا شروع کر دیا جس سے آنکھیں ڈبڈبا پڑیں اور دل دہل گئے کسی کہنے والے نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی رخصت ہونے والے کی نصیحت آمیز باتیں ہیں تو کیا آپ ہمیں وصیت کر کے رخصت ہونا چاہتے ہیں؟ نبی کریم ﷺ نے جواباً ارشاد فرمایا: ''میں تم کو اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں...... الحدیث'' ❷

تمام انبیاء ورسل علیہم السلام اپنی اپنی قوموں کو تقویٰ اور خشیت الٰہی کی وصیت کیا کرتے تھے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۝١٠٦﴾ (الشعراء: ١٠٦)

''جب ان سے ان کے بھائی نوح نے کہا کیا تم ڈرتے نہیں؟''

﴿إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ هُودٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۝١٢٤﴾ (الشعراء: ١٢٤)

''جب ان سے ان کے بھائی ہود نے کہا کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟''

---

❶ ترمذی، کتاب البر والصلة، باب ما جاء فی معاشرة الناس، : ١٩٨٧ وقال: حسن صحیح۔

❷ ابو داؤد، کتاب السنة، باب فی لزوم السنة: ٤٦٠٧۔ ترمذی: ٢٦٧٦ وقال: هذا حدیث صحیح

﴿إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ صَٰلِحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿١٤٢﴾﴾ (الشعراء: ١٤٢)

''جب ان سے ان کے بھائی صالح نے کہا کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟''

﴿إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿١٦١﴾﴾ (الشعراء: ١٦١)

''جب ان کے بھائی لوط نے ان سے کہا کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟''

سلف صالحین رحمہم اللہ نے اپنی وصیت کا محور ہمیشہ تقویٰ اور خشیت الٰہی ہی کو بنائے رکھا۔

سیّدنا عبداللہ بن عکیم رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بڑا عظیم الشان خطبہ دیا پہلے اللہ تعالیٰ کی ایسی حمد وثنا بیان کی جس کا وہ اہل ہے اس کے بعد فرمایا: ''میں تم کو اللہ کے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں۔'' ❶

سیّدنا سعید بن مسیّب رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب ملک شام پر لشکر کشی کے لیے فوج کو روانہ کیا اس لشکر میں یزید بن ابی سفیان، عمرو بن عاص، شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر جرنیل صحابہ کرام شامل تھے۔ یہ لوگ شام کی روانگی کے لیے سوار کوچ کرنے لگے تو اس موقع پر سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے اسلامی لشکر کے جرنیلوں کے ساتھ انہیں الوداع کہنے کی غرض سے ''ثنیہ الوداع'' نامی گھاٹ تک پیدل چل کر آئے تو لشکر کے سربراہوں نے عرض کیا: اے خلیفہ رسول! آپ پیدل چل رہے ہیں اور ہم سواری پر سوار ہیں تو سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: میں اپنے ان قدموں کو اللہ کی راہ میں کوچ کرنے کی نیت سے رکھ کر پیدل چل رہا ہوں پھر اس کے بعد سپہ سالاروں کو وصیت کرنا شروع کر دی اور فرمایا میں تم کو اللہ کے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں۔ ❷

اور سیّدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ جب بھی کوئی مہم سر کرنے کے لیے فوجی دستہ بھیجتے تو اس پر ایک شخص کو بطور سپہ سالار ذمہ دار مقرر فرماتے اور اس سے کہتے کہ ''میں تم کو اس ذات کے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں جس سے تم کو ہر حال میں جا کر ملنا ہی ملنا ہے۔ ❸

---

❶ رواه البيهقي في شعب الايمان: ١٠٥٩٣ وصححه ورواه الحاكم۔

❷ سنن البيهقي الكبرى: ١٧٩٠٤۔ ❸ السنة للخلال: ٥٩. قال محققه: اسناده صحيح۔

سیّدنا ابوعبید قاسم بن سلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''میں شہر بصرہ پہنچا تاکہ میں سیّدنا حماد بن زید رحمہ اللہ سے سماعت کا شرف حاصل کروں۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ تو وفات پا چکے ہیں، لہٰذا میں نے سیّدنا عبدالرحمٰن بن مہدی رحمہ اللہ سے اس بات کا شکوہ کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ''تم مرتبہ میں چاہے جتنا بھی ان سے آگے نکل جاؤ مگر تقویٰ میں تم ان سے کبھی سبقت حاصل نہیں کر سکتے۔'' [1]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیتوں میں اس شخص کے لیے جو عقل مند ہے اللہ اور اس کے رسول کی پیروی کے لیے کمربستہ رہے۔ سب سے نفع مند وصیت اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی جس کی اللہ تعالیٰ کے اس قول سے وضاحت ہوتی ہے:

﴿وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَإِيَّاكُمْ أَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ۭ﴾ (النساء: ١٣١)

''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے ان لوگوں کو جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور تمھیں بھی تاکیدی حکم دیا ہے کہ اللہ سے ڈرو۔'' [2]

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیّدنا معاذ رضی اللہ عنہ کو اس موقع پر جبکہ ان کو ملک یمن ایک مہم پر روانہ فرمایا تھا یہی وصیت کی تھی اور فرمایا تھا: ''اے معاذ! تم جہاں کہیں رہو تقویٰ کا دامن ہاتھ سے تھامے رکھنا اور برائی کی پشت پر نیکی کا غازہ لگا دیا کرنا نیکی برائی کو مٹا دے گی اور لوگوں سے اچھا برتاؤ کرنا ان سے اخلاق مندی کا سلوک روا رکھنا۔'' [3]

---

[1] الرحلة فی طلب الحدیث: ١٧٩.

[2] ترمذی، کتاب البر والصلة، باب ما جاء فی معاشرة الناس: ١٩٨٧ وقال: حسن صحیح۔

[3] ابوداؤد، کتاب المناسك، باب الرفعة من عرفة: ١٩٢٢ وصححه الحاکم، ووافقه الذهبي.

قارئین کرام! آپ کو پتہ ہونا چاہیے کہ سیّدنا معاذ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہوں میں ایک بلند مقام کے حامل تھے اسی لیے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیّدنا معاذ رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا: ''اے معاذ! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔''❹ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ وصیت کی تھی جس کا تذکرہ ابھی ابھی گذرا ہے تو پتہ یہ چلا کہ یہ وصیت انتہائی جامع اور مانع ہے۔ اسی لیے تو سیّدنا معاذ رضی اللہ عنہ کو اس سے مشرف فرمایا گیا ہے بلاشبہ یہ وصیت جامعیت کی آئینہ دار ہے اس شخص کے لیے جو سوجھ بوجھ رکھتا ہو اور اس پر غور وفکر کرے اور اسے سمجھے۔ دراصل یہ وصیت قرآنی آیت کی تفسیر ہے۔

اس کی جامعیت کی توضیح یہ ہے کہ بندے کے اوپر دو طرح کے حقوق عائد ہوتے ہیں ایک تو اللہ کا حق ہے اور دوسرا بندوں کا حق۔

جہاں تک بندے پر حقوق اللہ کا معاملہ ہے تو یہ بات یقینی ہے کہ کہیں نہ کہیں ان کی ادائیگی میں اس سے غلطی سرزد ہو ہی جاتی ہے کبھی اللہ کے اوامر کی بجا آوری میں کوتاہی یا عدم بجا آوری کی وجہ سے یا اس کے منع کردہ کاموں کے ارتکاب کی وجہ سے اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

''جہاں کہیں رہو اللہ سے ڈرتے رہو۔''

یہ ایک جامع و مانع اسلوب بیان ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''حیثما کنت'' کہہ کر خلوت اور جلوت دونوں مواقع پر تقویٰ اختیار کرنے کی ضرورت کی طرف اشارہ فرما دیا ہے۔

اس کے بعد فرمایا ہے کہ ''گناہ کے بعد نیکی کیا کرو، نیکی گناہوں کو مٹا دیتی ہے'' کیونکہ طبیب جب بھی مریض کو کوئی نقصان دہ دوا دیتا ہے تو اس کے لیے وہ (اینٹی بائیوٹک) دوا کی بھی تشخیص کرتا ہے۔ چنانچہ بندہ سے گناہ سرزد ہونا اس کی فطرت کا حتمی تقاضا ہے لہٰذا عقلمندی کا تقاضا یہی ہے کہ بندہ ہمیشہ نیکیاں کرتا رہے تاکہ اس کے گناہ خود بخود مٹتے چلے جائیں۔''❶

یہ ہے تقویٰ کی قدر ومنزلت اور اس کی قدر و قیمت جس کا تذکرہ کیا گیا جس سے ہمیں

❶ مجموع الفتاوی : ۱۰/۶۵۳ـ ۶۵۵.

بخوبی معلوم ہوگیا ہوگا کہ رسولوں اور سلف صالحین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی وصیتوں اور ان کے دھمکی آمیز اقوال کے آئینہ میں جو انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں یا اپنے ماننے والوں اور کنبہ وبرادری کے لوگوں سے دوٹوک الفاظ میں کہے ہیں، کا خلاصہ اور نچوڑ ہے۔

تقویٰ اور خشیت سے بہرہ ورلوگ ہی اولیاء اللہ ہیں

اہل تقویٰ ہی حقیقت میں اولیاء اللہ ہوا کرتے ہیں۔ اولیاء اللہ وہ لوگ نہیں ہیں جو سمندر کی سطح پر چلتے اور ہوا کے دوش پر اڑتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ أَلَآ إِنَّ أَوْلِيَآءَ ٱللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٢﴾ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَكَانُوا۟ يَتَّقُونَ ﴿٦٣﴾ ﴾ (یونس : ٦٢-٦٣)

''سن لو! بے شک اللہ کے دوست، ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ جو ایمان لائے اور بچا کرتے تھے۔''

اور ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَٱللَّهُ وَلِىُّ ٱلْمُتَّقِينَ ﴿١٩﴾ ﴾ (الجاثیه : ١٩)

''اور اللہ متقی لوگوں کا دوست ہے۔''

تو پتہ یہ چلا کہ متقی لوگ ہی اللہ کی ولایت کے اصلی حقدار ہیں۔ وہی اللہ کے حقیقی ولی ہوا کرتے ہیں کیونکہ وہ اللہ کی اطاعت وفرماں برداری اور نوافل وشکرانہ کی ادائیگی کا اہتمام کرتے ہیں۔ سیدنا ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

''جس شخص نے میرے ولی سے عداوت اور دشمنی رکھی میں نے اس سے جنگ کا اعلان کردیا ہے اور میرا بندہ فرائض پر عمل پیرا ہوکر مجھ سے قریب سے قریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ فرائض پر عمل سے بڑھ کر کوئی چیز بندہ کو مجھ سے قریب کرنے کا ذریعہ نہیں حتی کہ نوافل کے ذریعہ بندہ مجھ سے قربت حاصل کرتا چلا

جاتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔'' ❶

یہاں پر ان لوگوں کے ڈھونگ اور مکر وفریب کا پردہ فاش ہوکر سامنے آ جاتا ہے جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں یا جن کا کہنا ہے کہ وہ اولیاء اللہ ہیں۔ دراصل وہ منحرف افکار رکھنے والے صوفیوں کا گروہ ہے جو ناچتے اور گاتے ہیں اور ڈھول بجاتے ہیں اور محفل میلا دسجاتے ہیں اور جھومتے، ناچتے، گاتے اور بجاتے ہیں اور رقص و سرور کی محفل سجاتے ہیں اور مردوں و دوشیزاؤں سے خرمستیاں کرتے ہیں جیسا کہ بعض علماء نے ان کے بارے میں صراحت کے ساتھ نقل کیا ہے پھر دعویٰ کرتے ہیں کہ'' وہ اولیاء اللہ ہیں اور لوگوں کو ان سے استغاثہ یا فریاد کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے اولیاء الرحمٰن اور اولیاء الشیطان کے درمیان فرق کرنے کی کسوٹی عطا فرمائی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿٦٣﴾﴾ (یونس : ٦٢-٦٣)

''سن لو! بے شک اللہ کے دوست، ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ جو ایمان لائے اور بچا کرتے تھے۔''

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٤﴾﴾ (الانفال : ٣٤)

''اس کے متولی نہیں ہیں مگر جو متقی ہیں اور لیکن ان کے اکثر نہیں جانتے۔''

شیخ سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ہر وہ شخص جو سچا اور پکا مومن ہو وہ متقی اور پرہیز گار ہوتا ہے اور اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ جو متقی ہوتا ہے وہی اللہ تعالیٰ کا سچا ولی ہوتا ہے۔'' ❷

❶ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع : ٦٥٠٢.

❷ جامع العلوم والحکم : ١٥٨-١٥٩.

تقویٰ کے درجات ومراتب

تقویٰ کا پہلا درجہ:

اس عمل سے بچاؤ کی راہ اختیار کرنا جس کو انجام دینے والے کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ شرک اور کفر کا ارتکاب ہے۔ اس عمل سے احتراز کا مطلب یہ ہے کہ توحید خالص کی اتباع وپیروی کی جائے اور کلمہ توحید کے معنی ومفہوم سمجھ کر اس پر عمل کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول کا یہی مقصود ومطلوب ہے۔ جس میں اس نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَ اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى﴾ (الفتح : ٢٦)

''اور انھیں تقویٰ کی بات پر قائم رکھا۔''

لوگوں میں بعض لوگ وہ بھی ہیں جو اپنے آپ کو "مخلدین فی النار" کی فہرست میں شمار ہونے سے بچانے کے اسباب اور وسائل اختیار کرتے ہیں۔ یہی ان کا ٹارگٹ ہوتا ہے مگر گناہوں (جو کہ جہنم میں لے جانے کا پیش خیمہ ہیں چاہے وہ ایک معمولی مدت کے لیے ہی کیوں نہ ہو) سے اجتناب نہیں کرتے اور توحید کا اقرار کرتے ہیں، رسولوں کی تصدیق بھی کرتے ہیں اور ارکان اسلام وایمان کی انجام دہی کے عادی ہوتے ہیں لیکن انہیں اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟ گویا کہ جہنم کے عذاب سے پورے طور پر چھٹکارے کی حرص ان کے اندر نہیں پائی جاتی۔ یہی وجہ ہے وہ واجبات کی ادائیگی میں کوتاہی برتتے ہیں اور محرمات ومنہیات کے ارتکاب سے پرہیز نہیں کرتے۔ ایسے شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس بات کا احساس کرے کہ وہ تقویٰ کے کس مرتبہ پر فائز ہے کیونکہ جس شخص کا یہ عمل ہو ابھی جس کا تذکرہ کیا گیا ایسے شخص کو قطعاً متقی اور پرہیز گار نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے کہ ایسا شخص عذاب الٰہی کے نشانہ پر رہتا ہے اور اپنے عمل کی وجہ سے اللہ کے عقاب کا مستحق گردانا جاتا ہے الا یہ کہ اللہ کی رحمت اس کے شامل حال ہو جائے۔ اسی لیے نافرمان موحدین کا معاملہ مشیت الٰہی کے سپرد ہوگا۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہے گا تو انہیں معاف فرمادے گا

اور اگر چاہے گا تو ان کے اعمال کے پیش نظر جزا و سزا دے گا۔ پھر سزا بھگتنے کے بعد کسی نہ کسی دن انہیں جہنم کے عذاب سے چھٹکارا نصیب ہو جائے گا۔

تقویٰ کا دوسرا درجہ:

انسان عذاب الٰہی سے دوچار کر دینے کے اسباب میں سے ہر اس چیز سے پرہیز کرے جو جہنم میں لے جانے کا ذریعہ ہے چاہے وہ ایک معمولی وقفہ کے لیے ہی کیوں نہ جہنم تک رسائی کا سبب بنے اور تم ہر اس گناہ سے بچو جس کا انجام جہنم ہے چاہے وہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ۔

امام ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"تقویٰ کاملہ میں واجبات کی انجام دہی اور محرمات ومنہیات یہاں تک کہ مشتبہات سے کنارہ کشی داخل ہے اور کبھی اس کے اعداد وشمار میں مندوبات ومستحبات کی انجام دہی اور مکروہات سے اجتناب کو بھی شامل سمجھا جاتا ہے بلاشبہ یہی تقویٰ کا بلندترین مقام ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ الٓمّٓ ① ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ② الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ③ وَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ④ ﴾ (البقرة: ١-٤)

"الم۔ یہ کتاب، اس میں کوئی شک نہیں، بچنے والوں کے لیے سراسر ہدایت ہے۔ وہ لوگ جو غیب پر ایمان لاتے اور نماز قائم کرتے اور اس میں سے، جو ہم نے انھیں دیا ہے، خرچ کرتے ہیں۔ اور وہ جو اس پر ایمان لاتے ہیں جو تیری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا اور آخرت پر وہی یقین رکھتے ہیں۔"

لوگوں میں سے بعض لوگ وہ ہیں جو کفر وشرک اور کبیرہ گناہوں سے بچتے ہیں اور بظاہر عبادات اور اطاعات پر عمل کرتے ہیں اور واجبات کی انجام دہی بھی ان کی عادت ہوتی

ہے لیکن صغیر گناہوں سے اجتناب نہیں کرتے اور نہ ہی نوافل کی ادائیگی کے طرف ان کی توجہ ہوتی ہے۔ لوگوں کا یہ گروہ نجات اور کامیابی تک رسائی کے قریب ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ﴾ (النساء: ۳۱)

''اگر تم ان بڑے گناہوں سے بچو گے جن سے تمھیں منع کیا جاتا ہے تو ہم تم سے تمھاری چھوٹی برائیاں دور کر دیں گے۔''

سیّدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے:

''پانچوں نمازیں، ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ کے درمیان کا وقفہ اور ایک رمضان سے دوسرے رمضان کے درمیان کا وقفہ گناہوں سے کفارہ کا باعث ہے بشرطیکہ کبیرہ گناہوں کا ارتکاب نہ کیا جائے۔'' [1]

ذنوب ومعاصی کو معمولی نہ گرداننا بھی تقویٰ کا تقاضا ہے:

سیّدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''مؤمن کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے گناہوں سے اس طرح خائف رہتا ہے گویا کہ پہاڑ کی چوٹی کے نیچے (واقع کھائی) میں بیٹھا ہوا سے ہر وقت اس بات کا خطرہ لاحق ہو کہ کہیں پہاڑ اس کے اوپر نہ آ رہے اور فاسق وفاجر شخص اپنے گناہوں سے ایسا بے نیازی کا شکار ہوتا ہے کہ کوئی مکھی اس کی ناک پر سے گذری ہو اور اس نے اسے اڑا دیا ہو (راوی نے ناک پر ہاتھ پھیر کر اشارہ کر کے بتلایا۔'' [2]

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ (آل عمران: ۱۰۲)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو، جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے۔''

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب الصلوات الخمس والجمعة: ۲۳۳.

[2] صحیح بخاری، کتاب الدعوات، باب التوبة: ٦٣٠٨.

اس آیت کریمہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ سے صرف اتنی مقدار میں ڈرنا کافی نہیں کہ جہنم میں دائمی طور پر داخلہ سے چھٹکارا مل جائے یا صرف کبائر سے اجتناب کر کے اللہ سے خوف کا دعویٰ کرنے لگو بلکہ تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ صغیرہ گناہوں سے بھی احتراز کیا جائے اور ہر اس عمل کی انجام دہی سے بچا جائے جو جہنم میں لے جانے کا باعث ہے۔ تقویٰ تو یہ ہے کہ تم اپنے اور دوزخ کے درمیان اللہ کی اطاعت و بندگی کر کے مضبوط دیوار کھڑی کر لو اور طاقتور بند باندھ لو تا کہ ہر طرح کے خطرے سے محفوظ ہو جاؤ۔

معمولی قسم کے گناہ صغیرہ بھی خطروں سے خالی نہیں بلکہ (چھوٹے گناہ) بڑے خطرات کا پیش خیمہ ہیں۔ اسی لیے صغیرہ گناہوں کے ارتکاب سے سید المرسلین و امام المتقین ﷺ نے ڈرایا ہے اور اس کی نقصان دہی سے آگاہ کیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

''معمولی قسم کے گناہوں سے بچو، خبردار جو اس کے قریب بھی گئے کیونکہ وہ اس شخص کے کھاتے میں جمع ہوتے چلے جاتے ہیں جو اسے معمولی سمجھ کر اس کی انجام دہی اپنی عادت بنا لیتا ہے یہاں تک وہ اس کو ہلاک و برباد کر ڈالتے ہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ نے صغیرہ گناہوں کی مثال ان لوگوں سے دی ہے جو کسی چٹیل بیابان اور سنسان جگہ میں جا کر پڑاؤ ڈالیں اور کھانا پکانے کی ضرورت پیش آ جائے تو اس قافلہ میں شریک لوگ لکڑیوں کی تلاش میں نکل پڑیں اور ان میں سے ہر شخص ایک ایک لکڑی لے کر آئے یہاں تک کہ ایندھن کا انتظام ہو جائے پھر وہ لوگ آگ سلگائیں اور اس میں جو چیز پکنے کے لیے ڈالی ہے اسے پکا کر تیار کریں۔''[1]

کسی عربی شاعر نے اس سلسلہ میں کیا خوب کہا ہے:

''گناہوں کو حقیر یا معمولی مت سمجھو چاہے وہ صغیرہ گناہ ہی کیوں نہ ہوں کیونکہ کل یہی معمولی گناہ بڑا بن کر سامنے کھڑا ہو جائے گا۔ صغیرہ گناہ پر گردش ایام

[1] احمد : ٢٢٣٠٢ قال الهيثمي في مجمع الزوائد: رجاله رجال الصحيح.

اگر چہ دبیز پردہ ڈال دے مگر الہ العالمین کے نزدیک وہ کھاتے میں ثبت کیا ہوا ہے اسے کوئی مٹا نہیں سکتا۔ اپنی خواہش نفس کو لگام دو اور اس کے اوپر ڈانٹ ڈپٹ کا معاملہ روا رکھتے ہوئے مفاسد اور باطل کاموں کی انجام دہی پر اس کی سرزنش کرو اور کٹھن اور دشوار کن راستہ اختیار کرنے والے مت بنو بلکہ خواہش نفس کو لگام دینے کے لیے کمربستہ ہو جاؤ بلاشبہ جب بھی محب الٰہی اپنے معبود حقیقی سے محبت کرتا ہے تو اس کا دل و دماغ محبوب کی محبت میں سرشار ہو جاتا ہے اور اسی کی فکر اس کو ہر وقت دامن گیر رہتی ہے لہٰذا الہ العالمین سے سچی نیت کے ساتھ اپنی ہدایت کی دعا مانگو اور تمہارے لیے تمہارا رب ہدایت اور نصرت واعانت کی بازیابی کی خاطر کافی وشافی ہے۔“ [1]

تقویٰ کا تیسرا درجہ:

اس سے مراد تقویٰ کا وہ بلند وبالا مرتبہ ہے جس میں بندہ ان چیزوں سے احتراز کرتا ہے جو اس کے نفس کو اللہ کی یاد سے غافل کر دینے کا ذریعہ ہوتے ہیں چاہے وہ بذات خود مباح ہی کیوں نہ ہوں؟ مگر ان کی تاثیر یہ ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ تک رسائی کے راستہ میں رکاوٹ بن کر مؤمن کو صراط مستقیم پر چلنے میں مخل ثابت ہوتے ہیں یا اس کی چال ڈھال میں رخنہ اندازی پیدا کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ دراصل تقویٰ کا یہی بلند ترین مقام ہے اور یہ متقین کا شعار ہے۔ اس مرتبہ پر اللہ والے متقی بندے ہی فائز ہوتے ہیں کیونکہ مباحات کبھی کبھی بندے کے دل کو اللہ کی یاد سے غافل کرنے کا سبب بن جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ یہ غفلت دل کی سختی تک پہنچا دیتی ہے اس کے بعد مکروہات کی انجام دہی کی اسے لت لگ جاتی ہے اور مکروہات شاخسانہ ہیں محرمات کے چکر میں پھنس جانے کا۔ یہ وہ تسلسل ہے کہ بہت سے لوگوں کو گاہے بگاہے جس سے سابقہ پڑتا رہتا ہے اور وہ خود بخود اس سے متعارف ہوتے چلے جاتے ہیں۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر : ٤/٣٤١.

بندہ اس وقت تک متقین کے درجہ تک رسائی نہیں پا سکتا جب تک کہ وہ ان چیزوں سے احتراز نہ کرنے لگے جن کی انجام دہی میں کوئی حرج اور مضائقہ نہیں اس خوف سے کہ کہیں ان کی انجام دہی کی وجہ سے وہ ان چیزوں کا مرتکب قرار نہ پا جائے جن کی انجام دہی ایک متقی شخص کے شایان شان نہیں۔

سیّدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے:

''تقویٰ کے اتمام کا راز اس بات میں پنہاں ہے کہ مؤمن اللہ سے ڈرے حتی کہ ذرہ ذرہ میں بھی اللہ کے خوف کا پاس ولحاظ رکھے حتی کہ بعض ان چیزوں سے بھی اجتناب کرنا شروع کردے جو کہ اس کی نظر میں حلال ہیں اس خوف سے کہیں ان میں حرمت کا شائبہ تو نہیں۔'' ❶

اس سے یہ مقصود نہیں ہے کہ بندہ مباحات پر عمل کرنا ترک کردے لیکن احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ بعض ان مباح چیزوں کو ترک کردیا جائے جن کی انجام دہی حرام تک پہنچانے یا حرام کی حدود میں داخل کردینے کا ذریعہ ہیں اسی کو ورع کہا جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لیے واضح طور پر بیان فرما دیا ہے کہ جو شخص بھی ذرہ برابر نیکی کرے گا اسے اپنے سامنے دیکھ لے گا لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم برائیوں اور فتنوں کے انبار سے ایک ذرہ برابر لینے سے بھی احتراز کریں کیونکہ ''قطرہ قطرہ دریا می شود'' مراد یہ ہے کہ ذرہ کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ ہمالیہ پہاڑ بن جاتا ہے یہ بدیہی امر ہے کہ جو شخص کسی شخص کی چراگاہ کی فصیل کے قریب جانوروں کو چرائے گا تو اس بات کا خطرہ ہے کہ اس کے جانور چراگاہ کی فصیل توڑ کر اس میں داخل نہ ہو جائیں۔

سیّدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے:

''کان کھول کر سن لو! کہ ہر بادشاہ کی ایک شہر پناہ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی اس

❶ الزهد لابن المبارك : ١٩/١.

کی کائنات میں فصیل اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں۔''❶

اور ایک دوسری روایت میں یوں وارد ہوا ہے:

''معاصی اللہ کی شہر پناہ ہیں اور جو شخص شہر پناہ کے باڑر پر چوپائے چراتا ہے خطرہ ہے کہ وہ شہر پناہ کی حدود توڑ کر اللہ کی حرام کردہ شہر پناہ میں داخل ہو جائے۔''❷

امام حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''متقین ہمیشہ تقویٰ کا خیال رکھتے ہیں یہاں تک کہ ان میں سے بہت سے لوگوں نے تو بہت سی حلال چیزوں کو اس خوف سے ترک کر دیا کہ کہیں حرام کے مرتکب نہ ہو جائیں۔''❸

اور امام ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''متقیوں کو متقی اسی لیے کہا گیا ہے کہ جن چیزوں سے نہ ڈرا جائے وہ ازراہ تقویٰ ان سے بھی ڈرتے ہوں۔''❹

مراد یہ ہے کہ عادتاً جن چیزوں کی انجام دہی میں کسی حرام کے ارتکاب کا اندیشہ تک نہیں مارے خوف کے وہ اس کے قریب تک نہیں جاتے کہ کہیں ان کے تقویٰ اور پرہیز گاری پر آنچ نہ آ جائے یا اس سے مراد یہ ہے کہ اکثر و بیشتر لوگ عادتاً بے چوں چرا جس چیز کو بغیر کسی خوف اور اندیشہ کے عرف عام میں انجام دیا کرتے ہیں مگر متقی ازراہ تقویٰ اس سے بھی پرہیز کرتا ہے اس اندیشہ سے کہ کہیں کسی حرام کا ارتکاب سرزد نہ ہو جائے۔

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الإیمان، باب فضل من استبرأ لدینه: ٥٢.

❷ صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب الحلال بین والحرام بین: ٢٠٥١.

❸ رواہ ابن ابی الدنیا فی کتاب التقویٰ کمافی الدرالمنثور: ٦١/١.

❹ ابن ابی الدنیا فی کتاب التقویٰ کما فی الدرالمنثور: ٦١/١.

علم اور تقویٰ دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے

اس باب میں ایک اہم ترین مسئلہ کا ذکر ناگزیر ہے وہ تقویٰ کا علم سے تعلق کا معاملہ ہے جہالت اور ناخواندگی کے ساتھ تقویٰ صحیح معنوں میں برگ وبار نہیں لا سکتا اور نہ ہی علم کے بغیر اس کا وجود ممکن ہے۔

اس لیے انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے اس بات کی معرفت حاصل کرے کہ تقویٰ کیسے اختیار کرے؟ اور کس کا متقی بندہ بنا جائے؟ اس بات کی واقفیت کے لیے بندے کے لیے ضروری ہے کہ وہ دین کے احکامات کی تعلیم کی طرف متوجہ ہو اور علم شرعی کے حصول کی تگ ودو کرے اور حلال وحرام کی معرفت حاصل کرے پھر جب اسے محرمات کی پہچان ہو جائے تو اسے چاہیے کہ وہ اس سے دوری اختیار کر کے اسے ترک کر دے۔

تقویٰ کا دعوی کر کے بہت سے ان پڑھ اور جاہل لوگوں نے محض جہالت کی بنیاد پر بعض خالص مباحات اور حلال قسم کی چیزوں میں سے ان بعض چیزوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی جن میں حرام کا ذرہ برابر شائبہ تک نہیں پایا جاتا اسی کو (وضع الشئی فی غیر محلہ) کہا جاتا ہے، مراد یہ ہے کسی چیز کو اس کے مقام ومرتبہ سے ہٹا کر غیر مناسب جگہ پر لے جا کر رکھ دینا۔ بندے کا اپنے نفس پر ظلم کرنے کے مترادف ہے کیونکہ اس نے اپنے نفس پر مباح چیزوں کو حرام قرار دے کر خالصتاً ظلم کا ارتکاب کیا ہے۔ اس میں سرے سے عبودیت کا پہلو پایا ہی نہیں جاتا۔ اس کو تعبد کی فہرست میں گردانا غلط فہمی اور جہالت ہے۔

متقین اور اللہ والوں کی صفات

متقین اور اللہ والوں کی ذاتی پہچان اور ظاہری صفات ہوا کرتی ہیں۔ اس کے ذریعہ انہیں لوگوں کے مابین جانا پہچانا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کا تذکرہ کتاب قرآن کریم میں فرمادیا ہے۔ ان صفات میں سے چند صفات یہ ہیں:

۱۔ اللہ کے متقی بندے غیب پر پختہ ایمان رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں، غیبیات پر ان کا ایمان سچا اور پکا ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ۝ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ ﴾ (البقرۃ: ۲، ۳)

''سراسر ہدایت ہے۔ وہ لوگ جو غیب پر ایمان لاتے۔''

۲۔ متقین کا نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ عفو و درگذر اور معافی و بخشش کی صفت سے متصف ہوتے ہیں۔ ارشاد باری ہے:

﴿ وَأَن تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ﴾ (البقرۃ: ۲۳۷)

''اور یہ (بات) کہ تم معاف کر دو تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔''

۳۔ اللہ کے متقی و پرہیزگار بندے کبیرہ گناہوں کے ارتکاب کی جرأت نہیں کرتے اور صغیرہ گناہوں کے قریب بھٹکنے سے گریز کرتے ہیں۔ اگر بالفرض ان سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو فوراً توبہ کر لیا کرتے ہیں۔ اس میں ٹال مٹول سے کام نہیں لیتے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ ۝ ﴾ (الاعراف: ۲۰۱)

''یقیناً جو لوگ ڈر گئے، جب انھیں شیطان کی طرف سے کوئی (برا) خیال چھوتا ہے وہ ہشیار ہو جاتے ہیں، پھر اچانک وہ بصیرت والے ہوتے ہیں۔''

آیت کریمہ میں اہل تقویٰ کی بابت بتلایا گیا ہے کہ وہ شیطان سے چوکنا رہتے ہیں۔

۴۔ متقین کی صفات میں سے اہم ترین صفت یہ بھی ہے وہ افعال و اعمال اور قول و قرار میں سچائی اور راست گوئی سے کام لیتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ ۙ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۝ ﴾ (الزمر: ۳۳)

''اور وہ شخص جو سچ لے کر آیا اور جس نے اس کی تصدیق کی یہی لوگ بچنے

والے ہیں۔''

۵۔ پارسائی سے متصف متقی تو وہ لوگ ہوا کرتے ہیں جو اللہ کے شعائر (یعنی اللہ کی علامات اور نشانیاں) جن سے مسلمان کا امتیاز اور تشخص قائم ہوتا ہے اور اس کے مناسک (یعنی مقرر کردہ عبادتوں و احکامات) کی تعظیم بجالاتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ذٰلِكَ وَ مَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ۝۳۲﴾ (الحج: ۳۲)

''یہ اور جو اللہ کے نام کی چیزوں کی تعظیم کرتا ہے تو یقیناً یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔''

اللہ کے شعائر کی تعظیم کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کی حرام کردہ حدود کی تعظیم کرے، ان کی پامالی سے احتراز کرے اور اللہ کے احکامات کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے من وعن انہیں بجالائے۔

۶۔ متقی تو وہ لوگ ہیں جو عدل وانصاف سے کام لیتے ہیں اور اسی کے بموجب فتویٰ اور حکم صادر کرتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ﴾ (المائدۃ: ۸)

''اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں ہرگز اس بات کا مجرم نہ بنا دے کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کرو، یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو۔''

سیّدنا یزید تیمی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں: سیّدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اپنی کھوئی ہوئی، زرہ کسی یہودی کے ہاتھ میں دیکھی جو کہ اس نے پڑی ہوئی پائی تھی تو اس نے اس کو اٹھا لیا تھا اس کے ہاتھ میں زرہ دیکھ کر انہوں نے اسے پہچان لیا چنانچہ سیّدنا علی رضی اللہ عنہ نے یہودی کو مخاطب کرکے کہا کہ یہ میری زرہ ہے جو میرے اونٹ کے کوہان سے گرگئی تھی۔ یہودی نے جواب دیا زرہ تو اس کی ہے جس کے ہاتھ میں ہے چونکہ اس وقت یہ میرے ہاتھ میں ہے اس لیے یہ میری ہے تو علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: میرے اور تمہارے

درمیان قاضی فیصلہ کرے گا، چنانچہ دونوں فیصلہ کی غرض سے قاضی شریح رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سیّدنا شریح رحمہ اللہ نے سیّدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف مخاطب ہوکر دریافت فرمایا کہ امیر المؤمنین کیا معاملہ ہے؟ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میری ذرہ میرے اونٹ کے کوہان سے کہیں گر پڑی تھی اور اسے اس یہودی نے اٹھالیا ہے تو سیّدنا شریح رحمہ اللہ یہودی کی جانب مخاطب ہوئے اور اس سے پوچھا کہ اس دعویٰ کے بارے میں تو کیا کہتا ہے؟ تو اس نے کہا یہ میری ذِرہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرے ہاتھ میں ہے تو سیّدنا شریح رحمہ اللہ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم امیر المؤمنین! میں جانتا ہوں کہ آپ سچ بول رہے ہیں اور یہ آپ ہی کی ذِرہ ہے لیکن دعوی کے ثبوت کے لیے دوگواہوں کی موجودگی ضروری ہے تو سیّدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنے غلام قنبر اور اپنے بیٹے سیّدنا حسن رضی اللہ عنہما کو پیش کیا اور دونوں نے اس بات کی شہادت دی کہ یہ آپ رضی اللہ عنہ کی ذرہ ہے سیّدنا شریح رحمہ اللہ نے فرمایا کہ'' آپ کے غلام کی آپ کے حق میں گواہی تو مقبول ہے اور ہم نے اس کو مان لیا مگر آپ کے حق میں آپ کے بیٹے کی گواہی مقبول ہونے کا کوئی جواز نہیں۔ یہ غیر مقبول ہے'' تو سیّدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تمہارا ستیاناس ہو'' کیا تم نے سیّدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنا ہے. وہ کہا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ'' حسن اور حسین رضی اللہ عنہما اہل جنت میں سے نوجوانوں کے سردار ہیں۔'' یہ بات سن کر قاضی شریح رحمہ اللہ فرمایا: ''آپ نے بجا فرمایا، ہمیں تسلیم ہے'' تو سیّدنا علی رضی اللہ عنہ نے قاضی وقت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: تو پھر کس بنیاد پر اہل جنت کے نوجوانوں کے سردار کی شہادت قبول کرنے سے انکار کررہے ہو۔ تو قاضی شریح رحمہ اللہ نے جواب دیا کہ باپ کے حق میں بیٹے کی شہادت یا گواہی شرعاً جائز نہیں!

یہ فیصلہ سن کر سیّدنا علی رضی اللہ عنہ نے سر تسلیم خم کردیا۔ یہ دیکھ کر یہودی شخص کہنے لگا: بڑی عجیب وغریب بات ہے امیر المؤمنین میرے فریق بن کر فیصلہ کی غرض سے قاضی کے سامنے حاضر ہوئے اور قاضی نے ان کے حق پر ہونے کے باوجود ان کے خلاف فیصلہ دیا اور امیر المؤمنین نے بے چوں چرا قاضی کے فیصلہ کو مان لیا۔ میں کہتا ہوں امیر المؤمنین خدا کی قسم!

آپ نے سچ دعویٰ کیا۔ آپ اپنے دعویٰ میں حق بجانب ہیں۔ یہ آپ ہی کی ذِرہ ہے جو آپ کے اونٹ کے کوہان سے گر گئی تھی اور بطور لقطہ میں نے اسے اٹھا لیا تھا (اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ) اور وہ یہودی اسی وقت حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔ ❶

۷۔ متقیوں اور اللہ والوں میں سے پارساؤں کا شعار یہ ہے کہ وہ انبیاء ورسل علیہم السلام اور کمال ایمان اور کمال اطاعت سے سرشار مصلحین صادقین کی اتباع اور پیروی کرتے ہیں بلاشبہ انہیں کی صف میں ان کو اٹھایا جائے گا، یہ لوگ قیامت والے دن انہیں کے ساتھ ہوں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ۝۱۱۹﴾

(التوبة: ۱۱۹)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ۔''

تقویٰ کے بلند و بالا مقام تک پہنچانے والے ہائی وے کی نشاندہی

اکثر وبیشتر اللہ تعالیٰ کے تقویٰ تک رسائی میں اعمال ظاہرہ کا بنیادی کردار نمایاں نظر آتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ تقویٰ کا اتمام اعمال ظاہرہ کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ اعمال ظاہرہ ہی اس کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ تقویٰ دل کے اندر موجزن خشیت الٰہی اور اللہ کے مراقبہ اور محاسبہ، اس کی عظمت و کبریائی کے تصور سے عبارت ہوا کرتا ہے ❷ دراصل تقویٰ کی خشت اول دل کے اندر پایا جانے والا یہی جذبہ خشیت ہے۔ لہٰذا جو شخص متقی بننا چاہتا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے دل کی اصلاح اور درستگی کی طرف توجہ دے۔ اسی کے ساتھ ظاہری اعمال اس کے ضمن میں درست کرنے کی جدوجہد کرے۔ ہم یہاں پر ان امور کی نشاندہی کرنا چاہیں گے کہ مؤمن اگر ان اُمور کو صحیح طور پر انجام دینے لگے تو اس کا شمار متقیوں میں ہونے لگے۔

❶ حلیة الاولیاء: ۴/ ۱۴۰۔۱۴۱۔

❷ شرح السیوطی علی صحیح مسلم: ۵/ ۵۰۸۔

ا۔ اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کی توفیق کی دعا کرنا:

سیّدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا مانگا کرتے تھے: ''اے اللہ میں تجھ سے ہدایت واستقامت، تقویٰ وپرہیز گاری، عفاف وپاکیزگی اور بے نیازی واستغناء کا طلب گار ہوں۔''❶

سیّدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دعا مانگنے کا یہ معمول تھا کہ ''اے اللہ میرے نفس کو تقویٰ وپرہیز گاری کی دولت سے مالا مال کردے اور اس کو پاک و صاف بنا کر پارسائی عطا فرما، کیونکہ تو ہی بخوبی تزکیہ نفس کی انجام دہی کی اہلیت رکھتا ہے تو ہی اس کا مالک اور آقا ہے۔''❷

سفر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا مانگا کرتے تھے: ''اے اللہ! ہم اپنے سفر میں تجھ سے تقویٰ اور نیکی کے خواستگار ہیں اور اعمال میں سے اس عمل کے طلبگار ہیں جو تیری رضا کا باعث ہو۔''❸

سیّدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ان الفاظ کے ساتھ دعا مانگا کرتے تھے: ''اے اللہ! مجھے متقین کے ائمہ میں شمار کرلے۔''❹

۲۔ ہر وقت مراقبہ اور محاسبہ کے دل میں استحضار کی کیفیت کا موجزن رہنا:

کسی عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

''اس شخص میں کوئی خیر نہیں جو حضوریٔ قلب کے ساتھ مراقبہ نفس کا عادی نہ ہو اور خواہش نفس یا شہوانیت کے غلبہ کے وقت رب کریم کے محاسبہ کا تصور نہ کرے اور حالت ایمان میں اللہ کے خوف وخشیت کا خیال نہ رکھتا ہو۔

تقویٰ سے محرومی خواہش نفس کی غلامی نہیں تو اور کیا ہے؟ کیونکہ متقیوں کا یہ شیوہ

❶ صحيح مسلم كتاب الذكر والدعاء، باب في الأدعية : ۲۷۲۱۔

❷ صحيح مسلم ، كتاب الذكر والدعاء، باب في الأدعية : ۲۷۲۲۔

❸ صحيح مسلم ، كتاب الحج، باب استحباب الذكر إذا ركب : ۱۳۴۲۔

❹ مؤطا مالك : ۵۱۰۔

نہیں بلکہ اس کے برعکس اللہ والے خشیت الٰہی سے سرشار رہا کرتے ہیں اور جب رب کریم کے حضور حاضری کا بلاوا آتا ہے تو ان کے لیے باری تعالیٰ سے ملاقات آسان ہوا کرتی ہے۔ انہیں اس میں کسی قسم کی دشواری پیش نہیں آتی۔'' ❶

۳۔ نیت کی اصلاح ودرستگی بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے:

سیّدنا عون بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ ''تقویٰ کی خشت اول حسن نیت ہے۔'' ❷

۴۔ ایمان باللہ اور اس کی قضاء وقدر دونوں پہلوؤں پر راضی برضا رہنا:

سیّدنا عطاء بن ابی رباح رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں: ''میں نے ولید بن عبادۃ بن صامت رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا کہ جان کنی کے عالم میں تمہارے ابا جان کی وصیت کیا تھی؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ جب آپ رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت قریب آ گیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے مجھے بلایا اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ''اے میرے بیٹے! میں تم کو اللہ کے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں اور تم اس وقت تک متقی نہیں گردانے جا سکتے جب کہ تم اللہ کی ذات پر ایمان نہ رکھتے ہو اور کان کھول کر سن لو اور یہ بات پلے باندھ لو کہ تم اس وقت تک ہرگز ہرگز مؤمن نہیں ہوسکتے اور ایمان کی حقیقی چاشنی کی لذت محسوس نہیں کر سکتے اور علم کے بلند مرتبہ پر فائز نہیں ہوسکتے جب تک کہ تم اللہ کی قضاء وقدر کے دونوں پہلوؤں پر ایمان نہیں لے آتے۔'' ❸

قضاء وقدر کے دونوں پہلوؤں پر صبر کر کے ہی انسان تقویٰ کے بلند وبالا مرتبہ تک رسائی پا سکتا ہے۔ سیّدنا عون بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''تقویٰ کی بنیاد صبر اور قناعت ہے۔'' ❹

---

❶ ذم الھوی لابن الجوزی: ٢٣٦.
❷ حلیة الاولیاء: ٤/ ٢٥٠.
❸ الشریعة للآجری: ١/ ٢١٥ـ القدر للفریابی: ٤٢٥ وقال محققه: اسناده حسن ـ
❹ حلیة الاولیاء: ٤/ ٢٤٥.

۴۔ محاسبہ نفس بھی اس سلسلہ کی اہم ترین کڑی ہے:

سیّدنا میمون بن مہران رحمہ اللہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں:

''بندہ اس وقت تک متقی نہیں بن سکتا جب تک اپنے نفس کا محاسبہ نہ کرلے ٹھیک اس طرح بلکہ اس سے بھی اشد جو کہ وہ اپنے حصہ دار کا کیا کرتا ہے، تاکہ اس کو پتہ چل جائے کہ اس کا کھانا پینا کس نوعیت کا ہے؟ اور پہننا اوڑھنا کس مصرف کا ہے؟ اور پینے کی کیا کیفیت ہے؟ آیا یہ ساری چیزیں حلال ہیں یا حرام؟'' ❶

سیّدنا حارث بن اسد محاسبی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ فرمایا کرتے تھے: ''تقویٰ کی بنیاد محاسبہ نفس ہے۔'' ❷

۵۔ تعلیم و تعلّم بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے:

امام سندی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے: ''علم کا نتیجہ اور فائدہ تقویٰ ہے۔'' ❸

یہ علم ہی کی دین ہے کہ جس کی بنیاد پر حرام چیزوں کی خرابیوں اور اس میں پائی جانے والی برائیوں سے آگاہی ہوتی ہے اگر انسان گذشتہ اقوام کے انجام کار پر غور و فکر کرلے تو آنکھ بند کرکے وہ تقویٰ و پرہیز گاری کو اپنا شعار بنالے۔

کیا وجہ تھی جس نے بابا آدم اور اماں حوا کو جنت سے نکلوا دیا؟ جس کی بنیاد پر جنت کی نعمتوں سے نکل کر انہیں غموں اور دُکھوں کے گھر دنیا میں پناہ لینی پڑی؟

یہ دراصل معصیت اور نافرمانی اور تقویٰ الٰہی سے روگردانی کی نحوست تھی جس کی بنیاد پر انہیں یہ سزا بھگتنی پڑی۔

وہ کیا اسباب وعوامل تھے جن کی بنیاد پر ابلیس لعین کو سرزمین آسمان جو قدسیوں کی جگہ ہے، سے نکالا گیا اور اس کو وہاں سے دھتکارا گیا اور دھکے مار کر نکال دیا گیا نیز اس کو ملعون قرار دیا گیا یہی نہیں بلکہ اس کے ظاہر و باطن کو مسخ کردیا گیا حتی کہ اس کی شکل وصورت بدل

---

❶ حلیة الاولیاء : ٤/٨٩.   ❷ حلیة الاولیاء : ١٠/٧٦.

❸ حاشیة السندی علی النسائی : ٨/٣٣٦.

کر اسے بدشکل بنادیا گیا۔ کہاں تو اس کی حیثیت مقربین بارگاہ الٰہی میں تھی اور اب راندۂ بارگاہ الٰہی بنادیا گیا۔ کہاں رحمت الٰہی کے سایہ میں ہوا کرتا اور کہاں اب لعنت کا طوق اپنے گلے میں ڈالے پھرتا ہے۔ کہاں جنت کی باد بہاراں کا حق دار تھا اور کہاں اب جہنم کی دہکتی آگ اس کا ٹھکانہ ہے۔ اللہ کی نظروں سے گر کر کہیں کا نہ رہا۔ اب اس کا شمار فسق وفجور میں ڈوبے ان مجرموں میں ہوتا ہے جن کا کام بنی نوع انسانی کو شر اور فساد کے دام میں پھانسنا اور جادۂ حق سے ہٹا کر گمراہی و بے راہ روی کے راستہ پر گامزن کرنا ہے۔

یہ دراصل معصیت اور نافرمانی اور تقویٰ الٰہی سے روگردانی کا نتیجہ ہے۔

وہ کیا وجہ تھی جس کی بنیاد پر اس کائنات رنگ وبو میں بسنے والے ہر فرد کو غرق کر دیا گیا تھا حتیٰ کہ سیلاب کے پانی نے پہاڑوں کی چوٹیوں اور پربتوں کی آسمان سے باتیں کرتی ہوئی اونچائیوں کو بھی اپنی زد میں لے لیا۔

اور کس وجہ سے قوم عاد پر کالی آندھی آئی جو خیر وبرکت سے یکسر خالی تھی۔ اس نے مجرموں کی جڑ کاٹ ڈالی اور جس چیز پر سے گذری اس کا چورا کر کے رکھ دیا اور کشتوں کے پشتے لگادیے روئے زمین پر کسی کو نہیں بخشا، جو سامنے آیا اس کا کام تمام کر دیا۔

اور وہ کیا وجہ تھی جس کی بنیاد پر قوم ثمود پر تیز وتند کڑا کے کی آواز آسمانی چیخ بطور عذاب بھیجی گئی، جس کی وجہ سے سینوں میں ان کے دل پھٹ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے سب ٹھنڈے ہوگئے اور ان کے سارے طنطنے خاک میں مل گئے۔

اور وہ کیا وجہ تھی کہ سیّدنا لوط علیہ السلام کی بستی (سدوم نامی گاؤں) کو خلا میں اٹھا کر آسمان کے قریب لے جا کر نیچے پٹخ دیا گیا حتیٰ کہ ان کے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی سنی گئیں۔ مراد یہ ہے کہ ان کی بستی کو ملیا میٹ کر دیا گیا۔ اس کے اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا اوپر کر دیا گیا۔ پھر ان پر کنکریلے پتھروں کی بارش کردی گئی جو تہ بہ تہ لگتے چلے گئے پھر اس جگہ تعفن اور سڑاند بس گئی اور کسی ذی روح کا وہاں نام ونشان باقی نہ رہا۔

اور کیا وجہ تھی جس کی بنیاد پر قوم شعیب علیہ السلام پر سائبان والا عذاب بھیجا گیا۔ مراد یہ ہے

کہ جب بادل کا ٹکڑا ان کے سروں پر آ گیا اور لوگ اس کے سائے تلے جمع ہو گئے تو آسمان سے آگ کے شعلے برسنے لگے۔ زمین زلزلے سے لرز اٹھی اور ایک سخت چنگھاڑ نے انہیں ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلا دیا۔

اور کس وجہ سے فرعون اور اس کی قوم کو سمندر میں غرق کر دیا گیا، پھر ان کی روحوں کو جہنم میں منتقل کر دیا گیا جس پر صبح و شام انہیں پیش کیا جاتا ہے تاکہ نمونے کے طور پر وہ اس آنے والے عذاب کا مزہ چکھتے رہیں جس سے ان کو دوچار ہونا ہے۔ یہ دراصل معصیت اور نافرمانی اور تقویٰ الٰہی سے روگردانی کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا گناہوں کی پاداش میں مصائب و آلام سے دوچار ہونے کی ہلاکت کا تصور انسان کو تقویٰ اور پرہیز گاری کے دامن میں پناہ لینے کے لیے آمادہ کرنے کا سبب اور وسیلہ ہے۔

عربی شاعر مسعر ابن کدام کا قول ہے:

> ''جس شخص کو معرفت الٰہی کی لذت اور چاشنی مل جاتی ہے اس کے دل سے حرام کاری سے حاصل ہونے والی لذت اور اس کا کیف و سرور خود بخود بدمزہ ہو جاتا ہے اور دنیاوی کام ودہن کی لذت ختم ہو جاتی ہے بس عذاب اور برائی و عیب باقی رہ جاتا ہے اور برائی کا انجام برائی ہی ہے وہ اس کے اندر پنہاں رہتا ہے۔ اس لذت و سرور میں کوئی بھلائی نہیں جس کا انجام جہنم کی آگ ہو۔'' [1]

ایک شخص کا واقعہ ہے اس نے کسی عورت کے ساتھ زنا کیا، جس کی وجہ سے عورت کو حمل ہو گیا۔ اب زانی کو اس کے انجام کار کی فکر لاحق ہوئی جس کی وجہ سے وہ پریشانی میں مبتلا رہنے لگا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ آیا اس عورت سے شادی کر لے یا اپنے خاندان و برادری والوں کے سامنے منہ کالا کرے؟ یا اس بچے کو جو ماں کے پیٹ میں پل رہا ہے قتل کر ڈالے۔ اگر وہ اسے عورت کے پیٹ میں ہی مار ڈالتا ہے تو یہ ایک اور جرم ہے۔ اسے رحم مادر میں پلنے بڑھنے دے اور جب ولادت ہو جائے تو اسے کہیں جا کر ڈال

---

[1] حلیة الاولیاء: ٧/٢٢١.

آئے۔ یہ سارے کے سارے ایک گناہ سے پیدا ہونے والے مصائب و آلام ہیں!

اگر وہ گناہ کے ارتکاب سے قبل اس کے انجام کار پر غور کر لیتا تو اس کو تقویٰ الٰہی کا سہارا مل جاتا اور وہ ان مصائب و آلام کے دام میں پھنس کر پریشانی سے نجات پا جاتا۔ یہ ہے تقویٰ کا فائدہ اور ثمرہ۔

۶۔ حیا اور عفت بھی اس سلسلہ کی اہم ترین کڑی ہے:

سیّدنا سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ کا قول ہے:

''حیا تقویٰ کا سرپوش ہے اور بندے کے اندر اس وقت تک خوف و خشیت پیدا نہیں ہوتی جب تک کہ وہ شرم و حیا کی دولت سے سرشار نہ ہو اور حیا اور شرم ہی وہ نسخۂ کیمیا ہے جو اہل تقویٰ کو متقی بنانے کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ کیا حیا اور عفت کے علاوہ کوئی اور دروازہ ہے جو بندے کو تقویٰ کی حرم سرا میں داخل کر سکے؟'' [1]

عربی کے مشہور شاعر مبرد کا کہنا ہے:

''جب بھی میری خواہش نفس نے مجھے کسی فحش کاری کے ارتکاب کی دعوت دی تو حیا و عفت، اور کرم و فضل ہی نے مجھے اس بدفعلی سے روکا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے کسی بدکاری کا کبھی کوئی اقدام نہیں کیا اور نہ ہی میرے قدم کسی مشکوک کام کی انجام دہی کے لیے کبھی کہیں چل کر گئے۔'' [2]

۷۔ صحت و تندرستی میں صدقہ و خیرات کرنا جبکہ طبیعت خرچ پر آمادہ نہ ہو:

سیّدنا عطاء رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''دین و ایمان کا بلند ترین مرتبہ تم اس وقت تک ہرگز حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ تم صدقہ و خیرات کے عادی نہ بن جاؤ۔ اس حال میں تم تنومند اور چاق و چوبند ہو بخل تم کو خرچ کرنے نہ دے اور عیش و عشرت اور ناز و نعم سے محظوظ ہونے کا ارادہ رکھتے ہو اور تم کو فقر و فاقہ کا اندیشہ ہو۔ اس حال میں صدقہ و

---

[1] فیض القدیر: ۱/۴۸۷۔
[2] المستطرف: ۲/۳۵۱۔

خیرات کرنا تقویٰ کی علامت ہے۔'' ❶

۸۔روزہ بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے:

طاہر بن عشور رحمہ اللہ کا قول ہے: ''تقویٰ اور پرہیز گاری کے قدیم اصولوں میں سے اہم ترین اصول روزہ بھی ہے۔'' ❷

کیونکہ انسان جب روزہ رکھتا ہے تو اپنی شہوات نفسانیہ مار کر ہی وہ اس فریضہ کی ادائیگی کا کام انجام دے سکتا ہے۔ اس کی خاطر اسے خواہشات نفسانی کو دبانا اور کنٹرول کرنا پڑتا ہے یہی وہ عمل ہے جو روزے دار کو اللہ تعالیٰ کے تقویٰ تک پہنچا دیتا ہے۔ اسی کنٹرول اور دباؤ کی وجہ سے تقویٰ کی کیفیت رونما ہوتی ہے۔

۹۔حلال کمائی سے شکم سیری بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے:

علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''حلال کمائی سے شکم سیری تقویٰ کی بنیادی اینٹ ہے اور دراصل تقویٰ یہی ہے۔'' ❸

امام مناوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''کسب حلال ہی اصل پرہیز گاری ہے اور اسی پر تقویٰ کا دارومدار ہے یہی تقویٰ کی اساس اور بنیاد ہے۔'' ❹

تقویٰ کے محل وقوع کا بیان

ہر حال میں تقویٰ اختیار کرنے کا حکم ہے چاہے وہ خلوت میں ہو یا جلوت میں۔

سیّدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ دن تک ان کو مخاطب کرکے اس بات کی وصیت کی کہ اے ابو ذر! ذرا عقل و دانش سے کام لو اور جو کچھ میں تم کو بتلاؤں اس کو گرہ میں مضبوطی سے باندھ لو جب ساتواں دن آیا تو فرمایا: ''میں تم کو تمہاری خلوت اور جلوت دونوں حالتوں میں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔'' ❺

---

❶ تفسیر القرطبی: ۱۲۸/٤. ❷ التحریر والتنویر: ٥١٦.
❸ تحفة الاحوذی: ۱۲۰/٦. ❹ فیض القدیر: ۱۹/٦.
❺ رواہ الامام احمد: ۲۱۰٦۳ وحسنه الالبانی رحمه الله.

مذکورہ ساری چیزیں زبانی طور پر تو سہل ہیں مگر عملی میدان میں ان کی تطبیق دشوار کن معاملہ ہے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو غفلت کا شکار ہوکر بھول جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی نگرانی کررہا ہے۔ ان کے ذہن سے یہ بات محو ہوجاتی ہے کہ اللہ کی ذات حاضر وناظر ہے اور ہر وقت بندہ کو دیکھ رہی ہے۔ اس قسم کے لوگ سیّدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو بالائے طاق رکھ کر بھول جاتے ہیں، جس میں انہوں فرمایا کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے جسم کا کوئی حصہ اپنے ہاتھوں سے پکڑا اور فرمایا: اللہ کی عبادت اس حال میں کرو گویا کہ تم اس کا اپنے سامنے مشاہدہ کررہے ہو اور دنیا میں اس طرح رہو گویا کہ تم اجنبی یا راہ ہو [1] لہٰذا تم کو اللہ کے علاوہ کسی سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔

عربی کے مشہور شاعر ابونواس کے اشعار ہیں:

''اگر تم کو کسی دن خلوت کا موقعہ مل جائے تو یہ مت کہو کہ میں تن تنہا خلوت میں ہوں بلکہ تم کو کہنا چاہیے کہ ہمارے اوپر بھی ایک ذات موجود ہے جو نگرانی کا فریضہ سرانجام دے رہی ہے اور کبھی اس خام خیالی کا شکار مت ہونا کہ اللہ تعالیٰ ایک پل کے لیے بھی تم سے غافل ہے حتی کہ جو اس کے سامنے نہیں اسے اس کی بھی خبر ہے۔ اس کی نگاہوں سے کوئی غائب نہیں ہوسکتا۔'' [2]

سفر اور حضر دونوں حالت میں تقویٰ اختیار کرنا چاہیے:

سیّدنا ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ مروی ہے، ایک شخص آیا اور کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! میں سفر پر جانا چاہتا ہوں مجھے وصیت فرما دیجیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم کو چاہیے کہ اللہ کے تقویٰ کا سہارا پکڑو اور ہر بلندی پر تکبیر کہنا اپنا شعار بنالو'' چنانچہ جب وہ شخص چلا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا دیتے ہوئے فرمایا: ''اے اللہ! اس کے لیے سفر کی مسافت کو سکیڑ دے'' مراد یہ ہے کہ اس کے سفر کی دوری کو قربت میں بدل دے اور اس پر سفر آسان فرمادے۔ [3]

---

[1] رواہ الامام احمد: ٦١٢١ وصححہ الالبانی رحمہ اللہ۔

[2] تاریخ دمشق: ٤٥٥/١٣۔ [3] ترمذی، کتاب الدعوات، : ٣٤٤٥ وقال حدیث حسن

حالت سفر میں تقویٰ کا ایک خاص رنگ اور روپ ہوا کرتا ہے۔ اس حالت میں اس کی چاشنی اور مٹھاس ہی الگ ہوتی ہے کیونکہ مسافر شخص کو اثنائے سفر ایک نئی جگہ اور ایک نئے ماحول سے سابقہ پڑتا ہے اور کبھی تو اجنبی ملک میں اس کو اس پہلو سے خوف اور ڈر لاحق نہیں ہوتا جس پہلو سے اس کو اپنے ملک اور اپنے وطن میں لاحق ہوا کرتا ہے۔ وہ وہاں آزاد شتر بے مہار ہوتا ہے اور نہ کسی بدنامی و رسوائی کا اسے وہاں خطرہ درپیش ہوتا ہے لیکن اپنے ملک میں اسے اس پہلو سے فکر لاحق رہتی ہے۔ اسی لیے سفر کی حالت میں تقویٰ کو لازم پکڑنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مؤمن کے لیے سفر کی حالت میں تقویٰ کا لباس زیب تن کرنا بڑی اہمیت کا حامل کام ہے۔ ایک مسلمان کو بحیثیت مسلمان اس پہلو کی طرف سے ہرگز غفلت نہیں برتنی چاہیے۔

تقویٰ کے فوائد اور ثمرات

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات کا تقویٰ دنیا و آخرت میں سرخروئی کا ذریعہ ہے بلکہ تقویٰ ہی دراصل میں نفع رسانی کا باعث ہے، تقویٰ کی انجام دہی دنیا و آخرت میں رفعت و بلندی کی اساس اور بنیاد ہے، بلکہ اس سے ایک قدم آگے تقویٰ کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ تقویٰ دونوں جہانوں میں خیر و بھلائی تک رسائی کا ذریعہ ہے اور تقویٰ کا اہم ترین فائدہ یہ بتلایا گیا ہے کہ وہ دنیا و آخرت کے فتنوں کو رفع دفع کرنے کا وسیلہ اور سبب ہے۔

سیّدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ اے اللہ کے رسول! مجھے وصیت فرمائیے۔ تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور وصیت اس کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا: ''تم کو چاہیے کہ تقویٰ کے دامن کو مضبوطی سے تھام لو کیونکہ تقویٰ تمام قسم کی بھلائیوں کو اپنے جلو میں سمیٹے ہوئے ہے۔'' [1]

سیّدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ ایک شخص ان کے پاس آیا اور ان سے وصیت

[1] الطبرانی فی المعجم الصغیر: ۹۴۹ وقال الالبانی: صحیح لغیرہ۔

کرنے کی درخواست کی، تو انہوں نے جواب دیا کہ تم نے ٹھیک وہی بات پوچھی ہے جس کے بارے میں نے رسول اللہ ﷺ سے ایک عرصہ قبل پوچھا تھا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا:
''میں تم کو اللہ کے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ اللہ کا تقویٰ ہر چیز کی اساس اور بنیاد ہے۔'' ❶

سیّدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں: ''تم لوگوں میں سے وہ شخص ہمیشہ بھلائی سے محظوظ ہوتا رہتا ہے جب تک کہ تقویٰ اس کا شعار بنا رہے اور وہ اللہ سے ڈرتا رہے۔'' ❷

اسلاف میں سے کسی نے اپنے بھائی کو وصیت کے طور پر لکھ کر یہ کلمات بھیجے تھے کہ ''میں تم کو اور خود اپنے آپ کو تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ تقویٰ دنیا و آخرت دونوں کے لیے بہترین زادراہ کی حیثیت رکھتا ہے تو اس کو ہر بھلائی تک رسائی کے لیے رہبر بنالو اور ہر شر سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا آلہ کار بنالو اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل (توکل کرنے والوں کے لیے) اس چیز سے نجات کا ذریعہ ہے جس سے ان کو خدشہ ہو اور توکل اس جگہ سے حصول رزق کا سبب ہے جہاں سے انہیں اس کی دستیابی کی امید نہ ہو۔'' ❸

سیّدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اپنے لشکر کے بعض سربراہوں کو لکھ کر بھیجا تھا:

> ''اما بعد! میں نے تم کو اللہ کا تقویٰ اور اس کی اطاعت وفرماں برداری اور اس کے احکامات فرائض وواجبات کی پابندی اور تمہیں دین وایمان کی امانت کی پاسبانی کی ذمہ داری سونپی ہے۔ اس کا پاس ولحاظ رکھنے اور جس کتاب مقدس کا تم کو امین اور محافظ بنایا گیا ہے اس کی ہر طرح سے حفاظت کرتے رہنے کا طریقہ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں، کیونکہ اللہ کا تقویٰ بڑی مہتم بالشان چیز ہے اللہ کے اولیاء تقویٰ کے وجہ سے ہی اللہ کے غیظ وغضب سے محفوظ رہتے ہیں۔ اسی کی وجہ سے وہ نجات سے ہم کنار ہوتے ہیں۔ اسی کی بنیاد پر ان کی

---

❶ احمد : ۱۱۳٦٥ وصححه الالبانی رحمه اللّٰه ۔

❷ صحیح بخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب عنوم الإمام علی الناس : ۲۹٦٤.

❸ جامع العلوم والحکم : ۱٦۱.

ولایت قائم ودائم رہتی ہے اسی کی وجہ سے انہیں انبیاء کا وارث کہا گیا ہے اور اسی بنیاد پر انہیں انبیاء کی مرافقت نصیب ہوگا، تقویٰ کی وجہ سے ان کے چہروں پر شادابی چھائی رہتی ہے۔ یہ تقویٰ ہی ہے جو انہیں دیدار الٰہی سے مشرف ہونے کی سعادت سے بہرہ ور کرے گا۔ نیز تقویٰ دنیا میں فتنوں اور مصیبتوں سے بچاؤ کا ذریعہ ہے اور قیامت کے دن کی ہولناکی سے بچاؤ کا وسیلہ بھی۔'' [1]

ذرا قرآن وسنت کی نصوص اور اسلاف کے کلام میں تقویٰ کی اہمیت پر دیے گئے بیانات کا تدبرانہ مطالعہ کرو اور مذکورہ نصوص میں اس کے بیان کی اہمیت پر غور وخوض کرو تو تقویٰ کی قدر ومنزلت اجاگر ہوکر سامنے آجائے گی، کتنی خیرات وبرکات تقویٰ سے متعلق ہیں۔ تقویٰ اور خوف الٰہی اختیار کرنے والے کے لیے کتنا اجر وثواب رکھا گیا ہے اور تقویٰ کی بنیاد پر کتنی سعادت مندی اور نیک بختی کا وعدہ کیا گیا ہے؟ اور اس کی طرف تقویٰ کی نسبت کی گئی ہے؟ یہ اور ان جیسے سوالات پر اگر تم غور وخوض کرو گے تو یہ سوالات تمہیں تقویٰ اور پرہیز گاری کی زندگی اختیار کرنے اور اس پر پابندی کے ساتھ جمے رہنے اور اس پر عمل درآمد کرنے کا سبب اور ذریعہ ثابت ہوں گے۔

اس لیے ان ثمرات وفوائد میں سے چند فوائد کا ذکر مندرجہ ذیل آرہا ہے، جو تقویٰ سے سرشار لوگوں کو نصیب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کہ وہ ہمیں ان سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور تم لوگوں کے لیے وہ سود مند اور نفع بخش ثابت ہوں۔

تقویٰ اللہ کی رحمت کے حصول کا ذریعہ ہے:

سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے جب آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق فرمائی تو اس موقع پر رحمت کو سو حصوں میں وجود بخشا، اور رحمت کے ہر حصے کا حجم آسمان وزمین کے مابین پائے

[1] حلية الاولياء : ٥/٢٧٨۔ الرد على الجهميه للدارمي : ٢٠٢۔

جانے والے خلا کے برابر رکھا۔ اس میں سے کچھ حصہ کو اپنی مخلوق کے مابین تقسیم فرمادیا۔ یہ اسی کی اثر پذیری ہے جس کی بنیاد پر دنیا میں والدہ اپنے بچے پر رحم وکرم کا معاملہ روا رکھتی ہے۔ یہ اسی کی تاثیر ہے کہ وحشی جانور اور چرند و پرند ایک گھاٹ پر پانی پیتے نظر آتے ہیں۔ یہ اسی کی تاثیر ہے کہ مختلف قسم کی مخلوقات آپس میں رحم وکرم سے پیش آتی ہیں اور جب قیامت کا دن آئے گا تو وہ اپنی رحمت کو متقین کے لیے مخصوص کر دے گا بلکہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن متقیوں کے ساتھ اس دنیا کے رحم وکرم سے (۹۹) حصہ بڑھ کر رحم وکرم کا معاملہ کر دے گا۔ اس دن متقیوں کے لیے اس کی رحمت جوش میں ہوگی۔''[1]

تقویٰ عمل کی مقبولیت کا سبب ہے:

عمل کی مقبولیت تقویٰ کا اہم ترین فائدہ اور ثمرہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ ۝٢٧﴾ (المائدة : ٢٧)

''بے شک اللہ متقی لوگوں ہی سے قبول کرتا ہے۔''

ایک سائل سیّدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں مانگنے کی غرض سے آیا تو انہوں نے اپنے صاحبزادے کو حکم دیا: اسے ایک دینار دے دو، صاحبزادے نے حکم کی تعمیل کی اور سائل کو ایک دینار عطا فرمادیا۔ جب سائل چلا گیا تو سیّدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کے صاحبزادے سیّدنا عقیل نے فرمایا: ابا جان! آپ کی طرف سے اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمالے۔ یہ سن کر سیّدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے صاحبزادے کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر مجھے اس بات کا علم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے میرا ایک سجدہ تک قبول فرمالیا ہے یا میرے ایک درہم کا صدقہ اس کی بارگاہ میں شرف قبولیت کے مقام تک رسائی پا گیا ہے تو یہ مقبول بارگاہ الٰہی ہونے کی پوشیدہ کیفیت میرے نزدیک موت سے زیادہ مرغوب نہ ہوتی اور تم کو کچھ پتہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں شرف قبولیت

---

[1] اخرجه الحاكم : ٧٦٢٨ و قال : حديث صحيح على شرط مسلم ، واخرجه مسلم عن سلمان بدون لفظة (قصرها على المتقين).

کی منزل تک کس کو رسائی ملتی ہے؟ بلاشبہ شرف قبولیت کے مقام تک متقیوں اور پرہیز گاروں کو رسائی ملا کرتی ہے۔ ❶

سیّدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ایک شخص کو بطور وصیت لکھ کر ارسال فرمایا:

''میں تم کو اللہ عز وجل کے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں۔تقویٰ کے بغیر اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی چیز قابل قبول نہیں،اور اللہ تعالیٰ متقیوں اور پرہیز گاروں پر ہی رحم وکرم کا معاملہ فرماتا ہے،اور تقویٰ کی بنیاد پر ہی اجر وثواب مرتب فرماتا ہے، تقویٰ کی وعظ ونصیحت کرنے والے بے شمار ہیں مگر اس پر عمل کرنے والے خال خال ہی نظر آتے ہیں۔'' ❷

دنیا کے عذاب سے نجات کا سبب تقویٰ ہے:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ نَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿١٨﴾﴾ (حم السجدہ: ۱۸)

''اور ہم نے ان لوگوں کو بچالیا جو ایمان لائے اور بچا کرتے تھے۔''

مراد یہ ہے کہ ہم نے مؤمنین میں سے متقیوں اور پارساؤں کو دنیا کے عذاب سے اپنی پناہ دے کر محفوظ و مامون کر دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رضا گناہوں کا کفارہ،جہنم سے نجات اور جنت کے حصول کا وسیلہ:

تقویٰ ہی انسان کے مطلوب ومقصود کی منتہی ہے۔یہی انسان کی مرادوں اور تمناؤں کی معراج ہے۔بندہ یہی چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخلہ کا پروانہ عطا فرمادے اور جہنم سے نجات عطا فرمادے۔اللہ تعالیٰ تقویٰ کو متقیوں اور پارساؤں کے گناہوں کا کفارہ بنادیتا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿٦٥﴾﴾ (المائدۃ: ٦٥)

❶ تاریخ دمشق: ۱٤٦/۳۱۔ ❷ حلیۃ الاولیاء: ۲٦۷/۵۔

''اور اگر واقعی اہل کتاب ایمان لے آتے اور ڈرتے تو ہم ضرور ان سے ان کے گناہ دور کر دیتے اور انھیں ضرور نعمت کے باغوں میں داخل کرتے۔''

اور ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗۤ اَجْرًا ۝۵﴾

(الطلاق: ۵)

''اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا وہ اس سے اس کی برائیاں دور کر دے گا اور اسے بڑا اجر دے گا۔''

قیامت کے دن کی ہولناکی اور گھبراہٹ سے اللہ تعالیٰ انہیں محفوظ و مامون رکھے گا، اس دن جبکہ مخلوق کو سخت گھبراہٹ کا سامنا ہوگا متقین کو کوئی رنج و غم نہ ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝۱۰۳﴾ (الانبیاء: ۱۰۳)

''انھیں سب سے بڑی گھبراہٹ غمگین نہ کرے گی اور انھیں (آگے سے) لینے کے لیے فرشتے آئیں گے۔ یہ ہے تمھارا وہ دن جس کا تم وعدہ دیے جاتے تھے۔''

تقویٰ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ متقیوں کو جہنم سے نجات کا پروانہ عطا فرمادے گا ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۝۷۱ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ۝۷۲﴾

(مریم: ۷۱، ۷۲)

''اور تم میں سے جو بھی ہے اس پر وارد ہونے والا ہے۔ یہ ہمیشہ سے تیرے رب کے ذمے قطعی بات ہے، جس کا فیصلہ کیا ہوا ہے۔ پھر ہم ان لوگوں کو بچا لیں گے جو ڈر گئے اور ظالموں کو اس میں گھٹنوں کے بل گرے ہوئے چھوڑ دیں گے۔''

اس کے بعد اللہ تعالیٰ متقین کو تقویٰ کی بنیاد پر جنت کا وارث بنادے گا۔ ارشاد

باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۳۳﴾﴾

(آل عمران : ۱۳۳)

''اور اس جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین (کے برابر) ہے، ڈرنے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔''

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِیْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِیًّا ﴿۶۳﴾﴾ (مریم : ٦٣)

''یہ ہے وہ جنت جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے اسے بناتے ہیں جو متقی ہو۔''

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِیْنَ غَیْرَ بَعِیْدٍ ﴿۳۱﴾﴾ (ق : ٣١)

''اور جنت پرہیز گاروں کے لیے قریب کر دی جائے گی، جو کچھ دور نہ ہوگی۔''

﴿اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ مَفَازًا ﴿۳۱﴾﴾ (النبا : ٣١)

''یقیناً پرہیز گاروں کے لیے ایک بڑی کامیابی ہے۔''

﴿اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ ﴿۵۴﴾﴾ (القمر : ٥٤)

''بے شک بچ کر چلنے والے باغوں اور نہروں میں ہوں گے۔''

اور متقی لوگ گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جائے جائیں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَسِیْقَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ؕ﴾ (الزمر : ٧٣)

''اور وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈر گئے، گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جائے جائیں گے۔''

متقیوں کو پیدل جنت کی طرف نہیں دوڑایا جائے گا بلکہ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ان کو سواری پر سوار کر کے نہایت عزت و احترام کے ساتھ جنت کی طرف لے جایا جائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمَٰنِ وَفْدًا ﴿٨٥﴾﴾ (مریم: ٨٥)

''جس دن ہم متقی لوگوں کو رحمان کی طرف مہمان بنا کر اکٹھا کریں گے۔''

وہ جنت میں اپنے دوست واحباب کے ساتھ اکٹھے ہوں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الْأَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ ﴿٦٧﴾﴾

(الزخرف: ٦٧)

''سب دلی دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے مگر متقی لوگ۔''

اور ایک دوسرے آمنے سامنے دوبدو تختوں اور مسہریوں پر جلوہ افروز ہوں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿٤٥﴾ ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ آمِنِينَ ﴿٤٦﴾ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ ﴿٤٧﴾﴾

(الحجر: ٤٥ تا ٤٧)

''بے شک متقی لوگ باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔ اس میں سلامتی کے ساتھ بے خوف ہو کر داخل ہو جاؤ۔ اور ہم ان کے سینوں میں جو بھی کینہ ہے نکال دیں گے، بھائی بھائی بن کر تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔''

متقیوں کے بارے میں وارد ہوا ہے کہ وہ جنت میں جو چاہیں گے انہیں میسر ہوگا۔ ان کا دل جس چیز کی خواہش کرے گا، وہ ان کے لیے حاضر ہو جائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿جَنَّاتُ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ كَذَٰلِكَ يَجْزِي اللَّهُ الْمُتَّقِينَ ﴿٣١﴾﴾ (النحل: ٣١)

''ہمیشگی کے باغات، جن میں وہ داخل ہوں گے، ان کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی، ان کے لیے ان میں جو وہ چاہیں گے (موجود) ہوگا۔ اسی طرح اللہ ڈرنے والوں کو جزا دیتا ہے۔''

متقی اور پارسا لوگ جنت میں بالا خانوں میں ہوں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ ۙ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۬ وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ ۝﴾

(الزمر: ۲۰)

''لیکن وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈر گئے، ان کے لیے بالا خانے ہیں، جن کے اوپر خوب بنائے ہوئے بالا خانے ہیں، جن کے نیچے سے نہریں بہ رہی ہیں۔ اللہ کا وعدہ ہے، اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔''

اللہ تعالیٰ متقیوں کی وصف بیانی کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

﴿اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ۝ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْۗـــًٔـا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝﴾ (المرسلات: ٤١ تا ٤٣)

''یقیناً پرہیز گار لوگ اس دن سایوں اور چشموں میں ہوں گے اور پھلوں میں، جس قسم میں سے وہ چاہیں گے۔ مزے سے کھاؤ اور پیو، اس کے عوض جو تم کیا کرتے تھے۔''

آخرت کے گھر میں متقی اور پرہیز گار لوگ ہی اعزاز واکرام اور قدر ومنزلت سے نوازے جائیں گے۔ اُنہیں یہ قدر ومنزلت نصیب ہوگی جن کو یہ رتبہ مل گیا۔ ہر مدعی کے واسطے دار ورسن کہاں؟ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ﴾ (البقرۃ: ۲۱۲)

''ان لوگوں کے لیے جنھوں نے کفر کیا، دنیا کی زندگی خوش نما بنا دی گئی ہے اور وہ ان لوگوں سے مذاق کرتے ہیں جو ایمان لے آئے، حالانکہ جو لوگ ڈر گئے وہ قیامت کے دن ان سے اوپر ہوں گے۔''

سیّدنا ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس چیز کے بارے میں سوال کیا گیا جس کی بنیاد پر اکثر وبیشتر لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔ فرمایا:

''وہ اللہ کا تقویٰ، خوف اور حسن اخلاق ہے۔'' ❶

کسی عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

''جنت متقین کے تقویٰ اور پارسائی کا کیا خوب بدلہ ہے جنت تمناؤں اور آرزوؤں اور منت کشی واحسان مندی کی آماجگاہ ہے۔'' ❷

تقویٰ متقی اور دوسرے لوگوں کے گناہوں کی مغفرت اور بخشش کا ذریعہ ہے:

ابن عاشور کا قول ہے:

''تقویٰ متقیوں اور پارساؤں کے گناہوں کی مغفرت کا تو سبب ہے ہی اس کے ساتھ غیروں کے گناہ بھی اس کے طفیل میں بخش دیے جاتے ہیں کیونکہ تقویٰ کی وجہ سے متقی اور پرہیزگار شخص نافرمانوں اور گناہ گاروں کی مجالس ومحافل میں شریک ہونے سے کنارہ کشی کا سبب ہوا کرتا ہے۔ اس کی بنیاد پر ان گناہ گاروں کی قبیل سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں سے بہت سے لوگوں کو گناہوں کے ارتکاب سے متقیوں اور پرہیزگاروں کی اقتدا کرتے ہوئے باز رہنا پڑتا ہے جو اس کے مصاحب یا اس کے ہم نوا ہوتے ہیں۔ اس طرح بہت سی نافرمانیوں اور معصیتوں کا خود بخود قلع قمع ہو جاتا ہے۔ یہ بھی اللہ کی مغفرت اور بخشش کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہے۔'' ❸

تقویٰ اللہ کے نزدیک معزز ہونے کا معیار ہے:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ (الحجرات: ١٣)

''بے شک تم میں سب سے زیادہ عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔''

---

❶ ترمذی، کتاب البر والصلة، باب ما جاء في حسن الخلق: ٢٠٠٤ وصححه ابن حبان

❷ شرح شذور الذهب: ٢٧.

❸ التحرير والتنوير: ٣٤٠٣.

متقی کے لیے اللہ تعالیٰ، ملائکہ اور عام لوگوں کی محبت مسخر ہو جاتی ہے:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَ اتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝﴾

(آل وعمران : ٧٦)

''کیوں نہیں! جو شخص اپنا عہد پورا کرے اور ڈرے تو یقیناً اللہ ڈرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرنے لگتا ہے تو جبریل علیہ السلام کو بلا کر حکم صادر فرماتا ہے کہ وہ اس بندۂ محبوب سے محبت کریں اور جب جبریل علیہ السلام اس بندے سے محبت کرنے لگتے ہیں تو آسمان میں موجود فرشتے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں جس کا حتمی اثر زمین پر بسنے والی مخلوق پر پڑتا ہے اور اہل ارض کی نظروں میں وہ محبوب نظر بن جاتا ہے۔

چنانچہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، بیان کرتے ہیں:

''جو شخص رب کریم کا تقویٰ اختیار کرے اور صلہ رحمی کرنا اپنا شیوۂ زندگی بنا لے تو اس کی عمر دراز کردی جاتی ہے، اور اس کا مال واسباب روزافزوں ترقی کی راہ پر گامزن ہوتا چلا جاتا ہے اور وہ اپنے اہل وعیال اور برادری کے لوگوں کی نظروں میں محبوبیت کے مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔'' ❶

سیدنا زید بن اسلم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں: ''کہا جاتا ہے کہ جو شخص اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے والا بن جائے اس کے نتیجہ میں وہ خود بخود لوگوں کا محبوب نظر بن جاتا ہے چاہے بادل ناخواستہ ہی کیوں نہ ہو۔'' ❷

متقی و پرہیز گار شخص کے لیے اللہ کی نصرت اور تائید غیبی کا نزول اور ثابت قدمی کا فیضان ہوتا ہے:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

❶ رواہ البخاری فی الادب المفرد : ٥٨ وحسنہ الالبانی۔ ❷ حلیۃ الاولیاء : ٣/٢٢٢۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ (البقرۃ: ۱۹۴)

''اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بے شک اللہ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

آیت کریمہ میں جس معیت کا تذکرہ ہے یہ دراصل نصرت خداوندی، تائید الٰہی اور ثبات واستقامت کی معیت ہے۔ اس قسم کی معیت اللہ تعالیٰ نے اپنے متقی اور پرہیزگار نبیوں علیہم السلام کو عطا فرمائی تھی چنانچہ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

﴿قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ﴾ (طٰہٰ: ۴۶)

''فرمایا: ڈرو نہیں، بے شک میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، میں سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔''

ایک شخص سیدنا یونس بن عبید رحمہ اللہ کے پاس آیا اور عرض کرنے لگا: مجھے وصیت کیجیے۔ تو سیدنا یونس بن عبید رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ''میں تم کو اللہ کے تقویٰ اور مرتبہ احسان کے حاصل کرنے کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ متقیوں اور پرہیزگاروں کے ساتھ ہے اور نیکوکاروں کو اللہ کی معیت حاصل ہے۔'' [1]

انجام کار آخر میں متقیوں اور پارساؤں وپرہیزگاروں کے لیے ہی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾ (الاعراف: ۱۲۸)

''بے شک زمین اللہ کی ہے، وہ اس کا وارث اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے بناتا ہے اور اچھا انجام متقی لوگوں کے لیے ہے۔''

تقویٰ اعمال وافعال میں خیر وبرکت کا ذریعہ ہے:

لیث بن ابی سلیم رحمہ اللہ نے سلیمان بن طرخان رحمہ اللہ کو جو خط لکھا اس میں جن نصیحت آمیز کلمات کا تذکرہ فرمایا، وہ یہ ہیں:

[1] جامع العلوم والحکم: ۱۶۱.

''سلام علیك...... ''تم پر سلامتی ہو'' میں اس اللہ کی تعریف بیان کرتا ہوں جس کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں اس کی ذات (العلی) ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ صفت علو سے متصف ہے اور (عظیم) ہے۔ مراد یہ ہے کہ اس کی ذات بڑی عظیم الشان اور بلند وبالا ہے، اور اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔

اما بعد! میں تم کو اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ متقی اور پرہیز گار شخص کا عمل اس کے لیے سودمندی کا باعث ہوتا ہے چاہے وہ کم ہو یا زیادہ بہرحال مؤمن اس سے مستفید ہوکر رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اور آپ کو اپنی رحمت کے سہارے متقیوں اور پرہیز گاروں میں شمار فرمالے۔'' [1]

ایک خوشخبری اور بشارت کا بیان

یہ محض ایک خوشخبری اور بشارت کا ذکر ہے چاہے وہ بشارت مخلوق کی زبانی ہو یا ملائکہ کی زبانی موت کے وقت مردہ کے گوش گذار کی جاتی ہے بہرحال متقی و پرہیز گار شخص کے لیے پیشگی بشارت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ ﴾

(یونس : ٦٢، ٦٣)

''سن لو! بے شک اللہ کے دوست، ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ جو ایمان لائے اور بچا کرتے تھے۔ انھی کے لیے دنیا کی زندگی میں خوشخبری ہے اور آخرت میں بھی۔ اللہ کی باتوں کے لیے کوئی تبدیلی نہیں، یہی

[1] ذم الدنیا : ٤١٩.

بہت بڑی کامیابی ہے۔''

تقویٰ (ہدایت) کتاب الٰہی سے سرشاری کا ذریعہ ہے:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲﴾ (البقرۃ : ۲)

''یہ کتاب، اس میں کوئی شک نہیں، بچنے والوں کے لیے سراسر ہدایت ہے۔''

متقی و پرہیز گار کو تقویٰ کے بدلے بطور مکافات جو چیز من جانب اللہ عطا ہوتی ہے وہ علم نافع کی دولت سے سرشاری ہے:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۲۸۲﴾

(البقرۃ : ۲۸۲)

''اور اللہ سے ڈرو اور اللہ تمھیں سکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔''

اسی لیے علمائے کرام کے نزدیک علم کے حصول میں کوتاہی یا فہم وادراک کے زاویہ سے طالب علم کے اندر نقص کا شعور اور مسائل کے ادراک واستنباط میں کج فہمی کی بیماری اور حصول علم کے لیے طبیعت کا عدم میلان یا اس میں نشاط نہ پائے جانے کے اسباب میں سے اہم ترین سبب گناہوں کا ارتکاب ہے۔ نافرمانیوں اور معصیتوں کا ارتکاب طالب علم کے نفس اور حصول علم کے درمیان آڑ بن کر حائل ہو جاتا ہے۔

نور بصیرت کا حصول بھی عظیم الشان نعمت ہے جو متقی اور پرہیز گار شخص کو من جانب اللہ فراہم ہوتی ہے:

تقویٰ کی دولت سے سرشاری کی وجہ سے متقی اور پرہیز گار شخص کی قوت بصیرت کو جلا بہم پہنچتی ہے اور اس کو ایسا ملکہ عطا کیا جاتا ہے جو حق وباطل کے درمیان فرق کرنے کا فریضہ انجام دیتا ہے، پھر کیا ہے اس کو رب کریم کی طرف سے نور بصیرت سے سرشاری کی دولت عطا

ہو جاتی ہے۔ وہ اس کے لیے راہ حق کو روشن کرنے کا ذریعہ ثابت ہوتی ہے اور اسے فتنوں میں مبتلا ہونے سے روکتی ہے۔ اسی لیے ایسے بندے سے بھلائی کی امید کی جاتی ہے کیونکہ اس کو تائید الٰہی حاصل ہوتی ہے اور وہ موفق من اللہ بن جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ﴾ (الانفال: ۲۹)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم اللہ سے ڈرو گے تو وہ تمھارے لیے (حق و باطل میں) فرق کرنے کی بڑی قوت بنا دے گا اور تم سے تمھاری برائیاں دور کر دے گا اور تمھیں بخش دے گا۔''

تقویٰ ہر تنگی اور عسرت سے چھٹکارے کا راستہ ہے اور متقی و پرہیزگار شخص کے لیے اس جگہ سے روزی کی فراہمی کا ذریعہ ہے جہاں سے روزی کے فراہم ہونے کا اس کو وہم و گمان تک نہ ہو:

کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہو کر رہتا ہے اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ اس کا وعدہ کبھی چوکتا نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ﴾

(الطلاق: ۲، ۳)

''اور جو اللہ سے ڈرے گا وہ اس کے لیے نکلنے کا کوئی راستہ بنا دے گا۔ اور اسے رزق دے گا جہاں سے وہ گمان نہیں کرتا۔''

ایک تاجر نے اپنی آپ بیتی بیان کرتے ہوئے بتلایا کہ وہ الیکٹرانک سامان کی تجارت کیا کرتا تھا۔ خرید و فروخت کے سلسلہ میں اکثر و بیشتر اسے رشوت کا معاملہ کرنا پڑتا تھا۔ جب اسے اس بات کا علم ہوا کہ رشوت لینا اور دینا حرام ہے بلکہ اس کا شمار کبیرہ گناہوں میں ہوتا ہے تو محض اللہ کے ڈر سے اس نے رشوت لینا دینا بند کر دی (اس تاجر کا کہنا ہے) ابھی میں نے رشوت کا یہ دروازہ بند ہی کیا تھا کہ ہمارے لیے دوسرا حلال کمائی کا دروازہ کھل گیا۔ ہوا یہ

کہ ایک ہول سیل کا کاروبار کرنے والا بڑا تاجر مجھے مل گیا اور اس نے سامان خریدنے کا ایک بڑا آڈر بک کروالیا اور اللہ تعالیٰ نے اس طرح اس کی حاجت روائی کا راستہ نکال دیا اور اس نے جو حرام طریقہ سے خرید وفروخت سے توبہ کی تھی، اس کا نعم البدل عطا فرما دیا اور اپنے وعدے کو فوری طور پر پورا کر دکھایا کیونکہ اس شخص نے تقویٰ کے بارے میں اللہ کے ساتھ صدق ووفا کا معاملہ کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس تاجر کو اس کی خلوص نیت کی بنیاد پر اس کا نعم البدل عطا فرما دیا۔

تقویٰ کا معاملہ یہ ہے کہ اگر بندہ ایک پہلو کے اعتبار سے تقویٰ کا راستہ اختیار کرے اور دوسرے پہلو کی طرف سے سستی کا شکار ہو جائے یا کسی معاملہ میں تو تقویٰ کا مظاہرہ کرے اور کسی میں نہیں یا اللہ کے اوامر ونواہی میں سے کسی معاملہ میں تو اللہ کا حکم مانے اور کسی میں نہیں تو یہ تقویٰ کے منافی عمل ہے اسے تقویٰ نہیں کہتے لہٰذا اگر کسی بندے کو اللہ کے وعدے کے اعتبار سے فورا بدلہ مل جائے یا اس کا نعم البدل ملنے میں تاخیر ہو جائے تو بندے کو اس بارے میں خود اپنے نفس کا محاسبہ کرنا چاہیے کہ آیا اس نے تقویٰ کے شروط وارکان کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کا حق ادا کیا ہے یا نہیں، کیونکہ اس بات میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ اگر کوئی شخص تقویٰ کے بارے میں کچھ پابندیوں کی پرواہ کرتا ہے اور کچھ کی طرف سے نہیں اور اللہ کے منع کردہ امور میں سے بعض سے اجتناب کرتا ہے اور بعض کے بارے میں لاپرواہی کا شکار رہتا ہے تو ایسے شخص کو تقویٰ کی کمالیت تک رسائی کا مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ایسے شخص کا اللہ کی طرف سے اس پر مرتب ہونے والے اجر وثواب کے حصول کا پورے طور پر استحقاق رکھنے والوں میں شمار ہو گا۔

تقویٰ کی بنیاد پر معاملات میں آسانی کی صورت پیدا ہو جاتی ہے:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْرًا ۝٤﴾ (الطلاق : ٤)

"اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا وہ اس کے لیے اس کے کام میں آسانی پیدا کر

دے گا۔''

جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے ہر کام میں آسانی پیدا فرما دیتا ہے۔

متقی اور پرہیز گار شخص پر برکتوں کا نزول ہوتا چلا جاتا ہے:

قدرتی طور پر تھوڑی چیز بڑھ کر زیادہ ہو جانے کا نام برکت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ﴾ (الاعراف: ٩٦)

''اور اگر واقعی بستیوں والے ایمان لے آتے اور بچ کر چلتے تو ہم ضرور ان پر آسمان اور زمین سے بہت سی برکتیں کھول دیتے۔''

اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور پرہیز گاری اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتوں کے دہانے کھول دیتے۔

آیت کریمہ سے یہ معنی متبادر الی الذہن ہے کہ محض تقویٰ کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر خیر و برکات کی بارش کر دی تھی اور حصول خیر و برکت کو ان کے لیے آسان و سہل بنا دیا تھا۔

اسی طرح اگر تقویٰ کی پامالی ہو تو زمین میں فساد اور بگاڑ پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ ﴾ (الروم: ٤١)

''خشکی اور سمندر میں فساد ظاہر ہو گیا، اس کی وجہ سے جو لوگوں کے ہاتھوں نے کمایا، تاکہ وہ انھیں اس کا کچھ مزہ چکھائے جو انھوں نے کیا ہے، تاکہ وہ باز آ جائیں۔''

یہ فضا کی آلودگی مختلف قسم کے خطرناک اور بھیانک قسم کے امراض کینسر اور ایڈز جیسی وبائی آفتیں یہ اور ان جیسی بہت سے چیزیں ہیں جو زمین پر فساد و بگاڑ کا نتیجہ ہیں۔ تقویٰ اور خوف الٰہی سے رُوگردانی کا نتیجہ ہیں۔

دیہات میں رہنے والی بدو عورت کو جب تقویٰ کے فائدہ کا صحیح معنوں میں ادراک ہوگیا اور اس نے اس کی قدر ومنزلت سے شناسائی حاصل کرلی تو اس کی بنیاد پر اس کی زبان حق سے سفر پر جاتے ہوئے اپنے بیٹے کے لیے یہ کلمات صادر ہوئے۔ اس نے اپنے بیٹے کو رخت سفر باندھتے وقت مخاطب کرتے ہوئے بڑے والہانہ انداز میں کہا تھا:

''میں تم کو اللہ کے تقویٰ کی وصیت کرتی ہوں تقویٰ کا تھوڑا حصہ تمہارے لیے دنیا بھر کی عقل مندی ودانش مندی سے کہیں زیادہ سودمند اور نفع بخش ہے۔''❶

تقویٰ ڈھال ہے اور زندگی کے ہر موڑ پر حفظ وامان کا ضامن ہے:

انسانی زندگی کو اس دنیائے رنگ وبو میں دشمنوں اور حاسدوں سے مفر نہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمادیا:

﴿وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا﴾

(آل عمران: ۱۲۰)

''اور اگر تم صبر کرو اور ڈرتے رہو تو ان کی خفیہ تدبیر تمھیں کچھ نقصان نہیں پہنچائے گی۔''❷

اللہ تعالیٰ تقویٰ کی بنیاد پر متقی وپرہیزگار شخص سے شرپسندوں کی شرارت اور مکاروں کی مکاری اور فاجروں فاسقوں کی شرانگیزی رفع دفع کردیا کرتا ہے اور متقین کو حفظ وامان کی سعادت سے بہرہ ور کرکے سکون کی زندگی عطا فرماتا ہے۔

سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو نصیحت کرتے ہوئے لکھا تھا:

''میں تم کو اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتی ہوں۔ اگر تم نے اللہ کا تقویٰ اختیار کرنا اپنا شعار بنالیا تو اللہ تعالیٰ لوگوں کی طرف سے تمہارے لیے کافی وشافی ہوجائے گا اور اگر تم نے لوگوں کا تقویٰ اختیار کیا تو لوگوں کی معیت تمھیں اللہ کی طرف سے ذرہ برابر فائدہ نہیں پہنچاسکتی اور نہ ہی اللہ کے سامنے لوگ آپ

❶ صفة الصفوة: ۳۹۳/٤.
❷ مصنف ابن ابی شیبة: ۳۵۷۱۷.

تمہارے لیے کچھ کام آسکتے ہیں۔ اس لیے اللہ ہی کا تقویٰ اختیار کرو اور اس پر مضبوطی سے جم جاؤ۔'' ❶

دنیا میں انسان کو حد سے زیادہ آفتوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ دنیا میں بے شمار آفتیں اور مصیبتیں ہیں بلکہ دنیا میں نقصان دہ چیزیں بے حد وحساب ہیں۔ اسی لیے تقویٰ کا سہارا انسان کو رب کریم کی جناب سے حفظ وامان اور سلامتی وحفاظت فراہم کرنے کا ذریعہ ہے۔

سیّدنا اغر ابو مالک رحمہ اللہ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ جب سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ کو اپنا خلیفہ منتخب کرنا چاہا تو انہیں بلا بھیجا۔ آپ تشریف لائے تو سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ''میں تم کو ایک مشکل معاملہ کی زمام کار سنبھالنے کی دعوت دے رہا ہوں کیونکہ امارت کا بوجھ اٹھانا مکلّف کے لیے دشوار کن معاملہ ہوا کرتا ہے۔ اس لیے میری نصیحت ہے اے عمر! اللہ کی اطاعت وفرماں برداری کا سہارا پکڑتے ہوئے اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اللہ کے تقویٰ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی فرماں برداری کو اپنا شیوۂ زندگی بنالو۔ اس لیے کہ متقی وپرہیز گار شخص مامون ومحفوظ ہوتا ہے۔''

سیّدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ کو وصیت کرتے ہوئے لکھا تھا:

''امـا بعد! میں تم کو اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں، کیونکہ جو اللہ سے ڈرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت وبچاؤ کا بندوبست فرما دیتا ہے اور جو اللہ کو قرض دیتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اجر وثواب سے مالا مال کر دیتا ہے اور جو شخص صبر وشکر کا مظاہرہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر خیرات وبرکات کی بارش کرتا چلا جاتا ہے، اس لیے تقویٰ کو اپنا مقصود بناؤ اور تقویٰ کو اپنے دل کے لیے منارۂ نور بنالو۔'' ❷

جب عبدالملک بن مروان رحمہ اللہ کی وفات کا وقت قریب آ گیا تو انہوں نے شہزادوں کو اپنے پاس بلا کر ان سے بطور وصیت یہ کلمات کہے:

---

❶ السعجم الکبیر للطبرانی : ۳۷. ❷ حامع العلوم والحکم : ۱۶۱.

''میں تم کو اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں، کیونکہ تقویٰ ہی باقی رہنے والی نیک نامی ہے اورانسان کے بچاؤ کے لیے قدرتی ڈھال ہے۔ تقویٰ ہی مضبوط پناہ گاہ ہے اورزیب تن کرنے والا خوبصورت زیور ہے۔''❶

تقویٰ موت کے بعد اہل وعیال، مال ودولت اور مصالح دنیوی واخروی کی حفاظت کا ذریعہ ہے:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ ۖ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۝٩ ﴾ (النساء: ٩)

''اور لازم ہے کہ وہ لوگ ڈریں جو اپنے پیچھے اگر کمزور اولاد چھوڑتے تو ان کے متعلق ڈرتے، پس لازم ہے کہ وہ اللہ سے ڈریں اور سیدھی بات کہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت میں ان آباء امور کو مخاطب کیا ہے جو اپنے پیچھے ناتواں اولاد اور ذریت چھوڑ کر جانے سے ڈرتے اور تقویٰ کی بنیاد پر اپنی ذریت کے سارے معاملات کے بارے میں انہیں کھٹکا لگا رہتا ہے تاکہ ان کی اولاد ضائع نہ ہو اور ان کو سکیورٹی فراہم ہو سکے اور اللہ کی طرف سے قدرتی طور پر ان کی دیکھ بھال کا سامان مہیا ہوجائے۔ اس لیے وہ تقویٰ کا سہارا لیتے ہیں تو محض تقویٰ کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ انہیں حفاظت وسلامتی عطا فرماتا ہے۔

تقویٰ کی بنیاد پر عزت کا حصول اور مخلوق میں شخصیت کا بارعب بن جانا:

امام یحییٰ بن معاذ رحمہ اللہ کا فرمان ہے:

''جو شخص دنیا وآخرت کی سربلندی کا خواہاں ہے اسے تقویٰ کا دامن مضبوطی سے تھام لینا چاہیے۔''❷

عربی کے مشہور شاعر ابوالعتاھیہ کے عربی اشعار کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

''اعزاز واکرام یا عزت وشرف سے متصف ہونے کا نام دراصل تقویٰ ہے اور

❶ تاریخ دمشق: ۱۷۱/۶۳۔ ❷ صفة الصفوة: ۹۷/٤۔

دنیا کی محبت وچاہت ذلت وخواری، اور مرض و بیماری نہیں تو اور کیا ہے، اگر متقی وپرہیز گار شخص تقویٰ کو اپنی زندگی میں رچا بسا لے تو اس کو کسی قسم کی ذلت سے دوچار ہونا نہ پڑے اور نہ ہی اس کی ذات پر کوئی بٹہ آئے چاہے اس کے دل میں برائی کا خیال آئے یا نہ آئے۔'' ❶

اور سیّدنا سری بن حیان رحمہ اللہ کا شعر ہے:

''نسب وشرف کے اعتبار سے گم نامی کی تقویٰ پر کوئی زد نہیں پڑتی اور نہ ہی یہ چیز تقویٰ کے لیے مضرت رساں ہے انسان کم ذات ہونے کے باوجود تقویٰ کے اعتبار سے عز وشرف کے اوج کمال پر فائز ہوسکتا ہے، بلکہ تقویٰ غنی اور مالداری کے لیے باعث اضافہ ہوا کرتا ہے بشرطیکہ تقویٰ خالص ہو اور شرافت کی کرنیں اس سے چھن چھن کر نمودار ہو رہی ہوں۔'' ❷

اور بعض شعراء کا قول ہے:

''تقویٰ کے بغیر انسان کی کوئی قدر وقیمت نہیں بلکہ اس کی حیثیت دو کوڑی کے برابر بھی نہیں اور متقی وپرہیز گار کے لیے عزت اور شرف کی بلندی تک رسائی مقدر ہوا کرتی ہے۔'' ❸

تقویٰ کی بنیاد پر چیز کا ترک کرنا اور اللہ تعالیٰ کا اس کا نعم البدل عطا فرمانا:

سیّدنا ابوقتادہ اور ابو الدھماء رضی اللہ عنہما سے مروی ہے دونوں کا کہنا ہے کہ ہم دونوں نے اہل دیہات میں سے ایک شخص کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت حاصل کی تو اس بدوی نے یہ بات بیان کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے ان باتوں کی تعلیم دینا شروع کردی جن کی اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم دی تھی اور فرمایا: ''تم جب بھی اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کے تقویٰ کے پیش نظر کسی چیز کو ترک کرتے یا اس سے کنارہ کشی اختیار

---

❶ تاریخ بغداد: ٦/٢٥٩. ❷ حلیة الاولیاء: ٦/٣٧٥.

❸ فیض القدیر: ٢/١٤٤.

کرتے ہو تو اللہ تعالیٰ تم کو اس کا نعم البدل ضرور عطا فرماتا ہے۔"❶

تقویٰ ہر چیز کا عوض بن جاتا ہے:

جب سیّدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ مسند خلافت پر جلوہ افروز ہوئے تو آپ نے خطبہ دیتے ہوئے اللہ کی حمد وثنا بیان کی اور فرمایا کہ "میں تم کو اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں، بلاشبہ تقویٰ ہر فوت شدہ چیز کا نعم البدل ہے لیکن تقویٰ کا کوئی عوض اور بدلہ نہیں❷ اس کی وجہ یہ ہے کہ تقویٰ ہر فوت شدہ چیز کا عوض بن سکتا ہے لیکن اگر تقویٰ جاتا رہا تو اس کا کوئی عوض نہیں۔ کوئی چیز اس کے قائم مقام نہیں بن سکتی کیونکہ اس کے ہم پلہ کسی چیز کا دنیا میں وجود ہی نہیں۔

جب سوار بن عبداللہ رحمہ اللہ کو منصب قضاء پر فائز کیا گیا تو ایک طالب علم نے ان کو ان کلمات کے ذریعہ نصیحت کی:

> "اے سوار! میں تم کو اللہ کے تقویٰ کی نصیحت کرتا ہوں اللہ کی ذات تو وہ ہے جس نے تقویٰ کو دنیا کی تمام فوت ہو جانے والی چیزوں کا نعم البدل بنایا ہے اور دنیا میں اس نے کسی ایسی چیز کو وجود نہیں بخشا جو تقویٰ کا عوض بن سکے، لہٰذا تقویٰ ہر عقل مند شخص کے لیے عقل گتھی یا عقدہ ہے اسی سے تسلی اور سکون ملتا ہے اور اسی سے راہ راست پر چلنے کا سلیقہ سیکھا جاتا ہے اور اسی کے ذریعہ راہ حق پر برقراری اور وارستگی و ہدایت طلب کی جاتی ہے۔"❸

تقویٰ اطمینان قلب کا ذریعہ ہے:

امام سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "تقویٰ رزق میں برکت اور زیادتی کا وسیلہ ہے اور اطمینان قلب کا باعث ہے۔"❹

---

❶ رواه الامام احمد: ٢٠٢١٥ قال الهيثمي: رجاله رجال الصحيح: ٢٠٧/١١.

❷ صفة الصفوة: ١١٤/٢ ـ تاريخ دمشق: ٣٥٧/٤٥.

❸ القناعة والعفاف: ١٣٣. ❹ شرح سنن ابن ماجه: ٣١١.

خاتمہ

اللہ کا تقویٰ وہ افضل ترین دولت ہے کہ اس دنیاوی زندگی میں انسان کے لیے جس کا حصول بڑی عظیم ترین سعادت مندی ہے کیونکہ تقویٰ ہر طرح کی بھلائی اور ہر قسم کی فلاح کا وسیلہ ہے اور دونوں جہانوں میں سعادت مندی کا سبب ہے۔ عربی شاعر ابو درداء کے عربی اشعار کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

> ''انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی تمنائیں برآئیں اور اس کے خواب شرمندۂ تعبیر ہو جائیں لیکن اللہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے کسی کے چاہنے اور نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ انسان کہتا ہے: ہائے میرا مال اور میرا فائدہ! حالانکہ اللہ کا تقویٰ وہ عظیم ترین دولت ہے جو نفع مندی اور استفادہ کے اعتبار سے افضل ترین مقام کی حامل ہے۔'' [1]

تقویٰ لامتناہی کنار سمندر کی مانند ہے انسان کے لیے جس کے ساحل سے ہم کنار ہونا ناممکن ہے، لہٰذا میری نصیحت ہے کہ تقویٰ کی دولت کو حفاظت کے ساتھ گرہ بند کر لو اور ہر چیز کو تقویٰ کی عینک لگا کر دیکھو اور ہر شے کو تقویٰ کی کسوٹی پر رکھ کر پرکھ لو اور ہر وقت اور ہر لمحہ تقویٰ اختیار کرو چاہے دنیا میں لوگوں کے درمیان تمہیں اجنبی نظر سے دیکھا جائے۔

کسی عربی شاعر کا قول ہے کہ ''دین حق پر چلنے والا متقی و پرہیزگار شخص اس دور میں اجنبی سمجھا جانے لگا ہے اگر تقویٰ اختیار کرنے والے کا یہی شعار بن چکا ہے تو تقویٰ اختیار کر کے غریب الدیار بن جاؤ اور امن و سلامتی کی راہ اختیار کرنا اپنا شیوۂ زندگی بنا لو۔'' [2]

اس لیے میرے عزیز بھائیو! قبل اس کے کہ بام و در دوست واحباب سے رخصت

---

[1] حلیة الاولیاء: ١/٢٢٥۔
[2] فضل حملة العلم الشریف للحبیشی: ٨٦۔

ہونے کا وقت آ پہنچے تقویٰ کے دامن عاطفت میں پناہ لے کر اپنے آپ کو محفوظ و مامون کر لو
ابو العتاھیہ عربی کے مشہور شاعر کے اشعار کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں :

''جب تک جان میں جان ہے صحیح سالم زندگی گذارتے رہو چاہے وہ بلند ترین محلات کے زیر سایہ ہو جہاں صبح و شام عیش و عشرت کا سامان مہیا کیا جاتا ہے اور ہر وہ چیز جس کی تم کو خواہش ہوتی ہے وہاں مہیا ہوتی ہے۔ بندہ اسی خواب غفلت میں گرفتار ہوتا ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے دم گھٹنے لگتا ہے اور اضطرابی کیفیت کے عالم میں اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ جاتی ہے اور جان کنی کے عالم میں سانس کی غرغراہٹ کی وجہ سے دم گھٹنے لگتا ہے۔ اس وقت یقینی طور پر تم کو پتہ چل جائے گا کہ اب تک تم محض دھوکہ میں پڑے ہوئے تھے۔''

اے اللہ تو ہمیں کلمہ تقویٰ پر اس دنیا سے رخصت ہونے کی توفیق عطا فرما اور جب تک جان میں جان ہے اس پر مر مٹنے والا بنا دے اور اہل تقویٰ میں سے استقامت سے سرشار لوگوں میں مجھے بنا دے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ .

اپنے فہم وادراک کا امتحان لیں!

ذیل میں اس موضوع سے متعلق سوالات کو دو مرحلوں کو مدنظر رکھتے ہوئے وضع کیا گیا ہے:

سوالوں کی ایک قسم تو وہ ہے جن کا جواب فوراً دینا ہے۔ اس قسم کے سوالات کو پہلے مرحلہ میں رکھا گیا ہے۔

سوالوں کی دوسری قسم وہ ہے جو بحث ونظر اور غور وفکر کی متقاضی ہے۔ اس قسم کے سوالات کو دوسرے مرحلہ میں رکھا گیا ہے۔

پہلے مرحلہ کے سوالات جن کا جواب فوراً دینا ہے:

۱۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے تقویٰ کی کیا تعریف کی ہے؟

۲۔ تقویٰ کا حکم کیا ہے؟ دلیل کے ساتھ وضاحت فرمائیں۔

۳۔ قرآن کریم میں تقویٰ کا کئی امور پر اطلاق ہوا ہے، اس کی وضاحت فرمائیں؟

۴۔ تقویٰ کے مراتب کیا ہیں؟

۵۔ متقین کی خاص صفات اور علامتیں ہیں، ان کا ذکر فرمائیں؟

۶۔ متقی اور پرہیز گار بننے کے لیے بندے کو کن امور کی انجام دہی کی ضرورت پڑتی ہے؟

۷۔ تقویٰ کے دنیوی اور اخروی فوائد وثمرات کا تذکرہ فرمائیں؟

۸۔ کن کن جگہوں پر تقویٰ اختیار کرنا چاہیے، اس کا اجمالا تذکرہ فرمائیں؟

دوسرے مرحلہ کے سوالات جو استنباطی انداز کے ہیں:

۱۔ تقویٰ اور علم کے درمیان کیا کوئی وجہ مشترک ہے یا دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں؟ اس کی وضاحت فرمائیں۔

۲۔ نام نہاد صوفیوں کا دعوی ہے کہ وہ اللہ کے ولیوں میں سے ایک ہیں۔ اس کا کس طرح

جواب دیا جا سکتا ہے؟

۳۔ دعوت الی اللہ کی راہ میں تقویٰ کا وجود ضروری ہے اور اس کا تحقق امر واقعی ہے۔ کیا ہی موزوں ہوتا کہ اس سلسلہ میں کوئی ایسا قصہ بیان کیا جائے جو اس حقیقت کی نشاندہی میں مدد ومعاون ثابت ہوتا؟

۴۔ متقی اور غیر متقی کے گناہوں کی مغفرت اور بخشش کا سبب تقویٰ کیوں کر بن سکتا ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

۵۔ دو ایسی کتابوں کے نام بتلائیں جو تقویٰ کے موضوع سے متعلق ہوں۔

۶۔ حصول تقویٰ کے لیے حیا کیسے سبب ثابت ہو سکتی ہے؟ وضاحت کریں۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ .

أعمال
القلوب
تسلیم و رضا
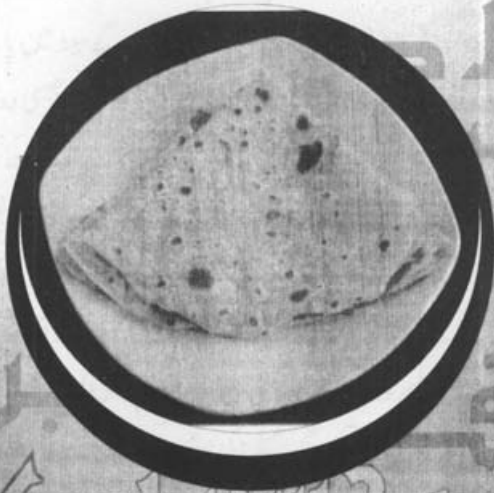
مقدمہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ، وَالصَّلاۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ ، نَبِیِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی آلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ . اما بعد !

رضامندی دل و دماغ کو اللہ کے لیے یکسوئی اور آزادی عطا کرنے کا ذریعہ ہے دراصل رضامندی بندے کے دل کو خوشحالی و آسودگی اور بے فکری سے مالا مال کر دیتی ہے جس شخص کو رضائے الٰہی جیسی دولت مل جائے اللہ تعالیٰ اس کے بدلہ اس کے سینہ میں پائے جانے والے خون کے لوتھڑے کو غنٰی و بے نیازی ، امن وامان اور قناعت و تونگری جیسی دولت سے مالا مال کر دیتا ہے اور اس کے دل کو اپنی محبت کے لیے یکسو بنا دیتا ہے اور اسے رجوع الی اللہ کی توفیق سے بہرہ ور فرمادیتا ہے اور توکل کے بلند و بالا مقام تک رسائی کی غرض سے اس کی رہنمائی فرماتا ہے۔

ہم آپ کو یہ بات بھی بتلادیں کہ رضائے الٰہی کو محبت الٰہی کے فوائد وثمرات میں ہی شمار کیا جاتا ہے۔ دراصل تسلیم ورضا ءمحبت الٰہی کا ہی پرتو ہے اس کو مقربین بارگاہ لوگوں کے بلندترین مراتب کی نشاندہی کے لیے سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ بلاشبہ یہ اللہ تعالیٰ تک رسائی کے لیے صدر دروازہ ہے اور متقین و پرہیز گاروں کے لیے چین وسکون کا سامان ہے۔ بالفاظ دیگر یہ دنیا کی جنت ہے۔ بندے کے لیے رضائے الٰہی کی حیثیت جنت اور بہشت میں موجود تمام چیزوں سے بھی کہیں زیادہ عزیز ہے، کیونکہ ''رضا'' اللہ کی صفت خاصہ ہے اور جنت تو اس کی مخلوق ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکْبَرُ﴾ (التوبة : ۷۲)

''اور اللہ کی طرف سے تھوڑی سی خوشنودی سب سے بڑی چیز ہے۔''

جنت میں مؤمنین کو داخل کرنے کے وعدے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس بات کا تذکرہ خود اپنی زبانی کیا ہے۔

لہٰذا رضا کے معانی ومفاہیم کیا ہیں؟ اس کے درجات ومراتب کیا ہیں؟ اور رضائے الٰہی تک کیوں کر رسائی ہوسکتی ہے؟ اس کے فوائد وثمرات کیا ہیں؟ نیز رضا اور صبر کے درمیان فرق کیا ہے؟ یہ اور ان جیسی چیزوں کے بارے میں اس کتابچہ میں بحث کی جائے گی۔ مذکورہ سارے کے سارے مباحث آپ کو اس کتابچہ کے اندر ان شاء اللہ موجود ملیں گے۔

اعمال قلوب سے متعلق لکھے گئے مقالات میں یہ ساتواں ہے، اللہ کی توفیق سے جنہیں آپ کے سامنے فائدہ کی غرض سے پیش کرنے کی مجھے سعادت نصیب ہوئی، اس کے ترجمہ وتیاری میں الفرقان ٹرسٹ نے تعاون کیا اور آج یہی مکتبہ والے اس کتابچہ کو چھاپ کر اس کی نشر واشاعت میں حصہ لے رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں رضائے الٰہی اور مقبولیت کی سعادت سے نواز دے۔

محمد صالح المنجد

موضوع کی اہمیت وافادیت

سیدنا ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں:

''ایمان میں چار چیزیں چوٹی کی حیثیت رکھتی ہیں (یعنی ایمان میں ان کا مقام اعلیٰ درجہ کا ہے) حکم الٰہی کی بجا آوری پر صبر وتحمل کا مظاہرہ کرنا، قضاوقدر پر راضی برضا رہنا، توکل کے بارے میں اخلاص سے کام لینا اور رب کریم کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا۔'' ❶

سیدنا داؤد طائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اعمال میں افضل ترین عمل اللہ تعالیٰ سے راضی برضا رہنا ہے۔'' ❷

سیدنا عبدالواحد بن زید رحمہ اللہ کا قول ہے:

''صبر وتحمل پر اگر کسی عمل کو میرے خیال کے مطابق فوقیت حاصل ہے تو وہ رضا و خوشنودی کا عمل ہے اور میرے علم کے اعتبار سے رضا سے زیادہ اشرف وبرتر نیز بلند وبالا مرتبہ کسی اور چیز کا نہیں اور رضاء ہی محبت کی معراج ہے۔ اسی کو محبت کی خشت اول قرار دیا جاتا ہے۔'' ❸

وہ سنت نبویہ جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لیے بطور وراثت چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہوئے ہیں۔ اس میں اہم ترین چیز تسلیم ورضاء کا پہلو ہے، اسی لیے امام احمد رحمہ اللہ نے اس موقع پر جبکہ آپ آزمائش سے دوچار تھے۔ فرمایا تھا:

''تابعین عظام اور ائمہ سلف اور فقہائے امصار میں سے ۹۰ آدمیوں کا اس بات

---

❶ اعتقاد اهل السنة: ٦٧٦/٤.
❷ احكام القرآن للجصاص: ١١٧/١.
❸ شعب الايمان: ٤٧٥.

پر اجماع اور اتفاق ہے کہ اس سنت میں سے سب سے اول درجہ کی سنت جس کی انجام دہی کا فریضہ انجام دیتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے وفات پائی وہ اللہ کی قضا وقدر پر رضامندی وخوشنودی ہے اور اللہ کے اوامر کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے کا پہلو ہے اور اس کے حکم کی اتباع وپیروی میں صبر وتحمل کا معاملہ ہے۔'' [1]

اللہ سے راضی رہنے والے اور اس کے سامنے تسلیم ورضا کا رویہ اختیار کرنے والے ہی اللہ کے گروہ میں شامل ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ۭ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَ اَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ۭ وَ يُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿٢٢﴾﴾ (المجادلة : ٢٢)

''تو ان لوگوں کو جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نہیں پائے گا کہ وہ ان لوگوں سے دوستی رکھتے ہوں جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی، خواہ وہ ان کے باپ ہوں، یا ان کے بیٹے، یا ان کے بھائی، یا ان کا خاندان۔ یہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اس نے ایمان لکھ دیا ہے اور انھیں اپنی طرف سے ایک روح کے ساتھ قوت بخشی ہے اور انھیں ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے۔ یہ لوگ اللہ کا گروہ ہیں، یاد رکھو! یقیناً اللہ کا گروہ ہی وہ لوگ ہیں جو کامیاب ہونے والے ہیں۔''

---

[1] العقیدة للامام احمد : ٧٢.

سیّدنا بشر بن حارث رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”جس شخص کو تسلیم ورضا کی دولت سے سرشاری نصیب ہوگئی وہ بلند و بالا مقامات تک رسائی میں کامیاب ہوگیا۔“ ❶

جس شخص کو اس مرتبہ تک رسائی نہ مل سکے اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس بلند و بالا مرتبہ تک پہنچنے کی سعادت نصیب فرمائے۔ اسی لیے سیّدنا ربیع بن ابی راشد رحمہ اللہ کا قول ہے:

”جس شخص نے تسلیم ورضا کے حصول کی دعا مانگی اس نے بلاشبہ عظیم الشان چیز کے حصول کی دعا کی ہے۔“ ❷

تسلیم ورضا کی تعریف

رضا کی لغوی تعریف:

رضی :...... یہ کلمہ راء ، ضاد اور حرف علت پر مشتمل ہے جو اصل کے اعتبار سے منفرد ہے، ناراضگی کے خلاف مفہوم پر اس کے معنی مدلول کا اطلاق ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے:

رضی ، یرضی ، رضی ، وھو راض ، اس کا اسم مفعول مرضی عنہ آتا ہے۔ ❸

حدیث شریف میں وارد ہوا ہے جسے سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے مرفوعاً نقل کیا ہے:

”اے اللہ میں تیری رضا مندی وخوشنودی کا وسیلہ پکڑ کر تیری ناراضگی و خفگی سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔“ ❹

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ﴾ (القارعة: ٧ والحاقة: ٢١)

یعنی وہ تو دل پسند آرام میں ہوگا مراد یہ ہے کہ جنت میں ایسی آرام دہ زندگی ہے جس کو وہ خود پسند کرے گا اور جس پر دل و جان سے وہ رضا مند ہوگا۔

---

❶ حلیة الاولیاء: ٨/٣٥٠. ❷ حلیة الاولیاء: ٥/١١٢.

❸ مقاییس اللغة: ٢/٣٣٠.

❹ صحیح مسلم، کتاب الصلاة، باب ما یقال فی الرکوع والسجود: ٤٨٦.

رضا سے مراد کسی چیز کے حصول پر دلی سکون پہنچنا اور راحت دل کا سامان مہیا ہونا اور اس کو پا کر چین وقرار مل جانا۔ ❶

رضوان: حد سے زیادہ رضا مندی اور خوشنودی کو رضوان کہا جاتا ہے چنانچہ عظیم ترین رضا اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی کا حصول ہے۔ اس لیے لفظ رضوان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہونے والی رضامندی اور خوشنودی کے ساتھ مخصوص کر دیا گیا لہٰذا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا﴾ (الفتح: ۲۹)

''اپنے رب کا فضل اور (اس کی) رضا ڈھونڈتے ہیں۔''

اور ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ﴾ (التوبة: ۲۱)

''ان کا رب انھیں اپنی طرف سے بڑی رحمت اور عظیم رضامندی کی۔''

کہا جاتا ہے ارضاہ یعنی اس نے اس کو اتنا دیا کہ وہ اس کی بنیاد پر اس سے راضی ہو جائے مراد یہ ہے کہ اس کو دے دلا کر خوش کر دیا اور کہا جاتا ہے۔ ترضاہ یعنی اس نے اس کی خوشنودی حاصل کرنا چاہی۔ اسی معنیٰ میں عربی کے شاعر رؤبہ بن عجاج کا قول ہے:

''اگر بڑھیا غصے ہو جائے تو اسے طلاق دے دو۔ اسے راضی کرنے کی کوشش مت کرو اور نہ ہی اس کی چمچہ گیری کی کوشش کرو۔'' ❷

تسلیم و رضا کی اصطلاحی تعریف:

اس بارے میں حارث محاسبی رحمہ اللہ کا قول ہے: ''حکم کے نفاذ کی خاطر دل کا قرار پکڑنا تسلیم و رضا کہلاتا ہے۔'' ❸

اور بعض حکماء کا قول ہے: ''اللہ تعالیٰ نے اس کے نصیب میں جو لکھ دیا ہے اس کے

---

❶ ایضاح الدلیل: ۱۴۳.
❷ شرح الرضي على الكافية: ۲۵/۴.
❸ التعرف: ۱۰۲.

سامنے قلب کا سکون وقرار محسوس کرنا۔“ ❶

امام ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”قضاء وقدر کے پیش نظر قلب میں ٹھہراؤ کی کیفیت رضا کہلاتی ہے۔“ ❷

بعض لوگوں نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے:

”قضا وقدر کی بنیاد پر گردش ایام کی بلاخیزی کی وجہ سے پیدا ہونے والے معاملہ میں اختلاف کے پہلو کو اللہ کی ذات پر چھوڑ دینا تسلیم ورضا کہلاتا ہے۔“ ❸

بعض لوگوں نے اس کی تعریف یوں کی ہے:

”دنیاوی اعتبار سے آپ بیتی پر ندامت سے گریز کرنا اور اس کے ہاتھ نہ آنے پر کف افسوس نہ ملنے کو بھی تسلیم ورضا کہا جاتا ہے۔“ ❹

سیّدنا عبداللہ بن عبدالعزیز العمری رحمہ اللہ کا قول ہے:

”زہد یا دنیا سے کنارہ کشی کو بھی تسلیم ورضا کہا جاتا ہے۔“ ❺

لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ بندے کی طرف سے رضا یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کے سامنے سر تسلیم خم کردے اور راضی برضا رہے گویا کہ بندہ مرضی مولیٰ ہمہ تن اولیٰ کی جیتی جاگتی تصویر ہو، اور قضا وقدر کی وجہ سے جو مصائب وآلام آئیں اس پر بے صبری کا مظاہرہ نہ کرے بلکہ اس بارے میں اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دے اور اس دنیا سے لو نہ لگائے بلکہ اس سے دامن بچا کر نکل جائے، یہ ہے تسلیم ورضا کی اصل حقیقت جس کا مفصل بیان پیش کیا گیا۔ (واللہ اعلم)

---

❶ التوکل علی اللہ : ٤٦.

❷ فتح الباری : ١١/١٨٧.

❸ شعب الایمان : ٢٢٦.

❹ شعب الایمان : ٢٣٥.

❺ ذم الدنیا : ٣٦٤.

تسلیم و رضا کے درجات اور اس کے احکامات

بندے کے ایمان کی قوت وضعف کے بقدر اور اس کے ذاتی عمل کی بہ نسبت جس کی بنیاد پر تسلیم و رضا کا پہلو اس کے دل میں پیدا ہوا ہے، قلبی رضا جوئی کے درجات مختلف ہوتے ہیں۔

یہ تمام کے تمام درجات اپنے حکم کے اعتبار سے تین قسموں میں تقسیم ہو جاتے ہیں:

پہلی قسم:...... رضائے واجب

دوسری قسم:...... رضائے مستحب

تیسری قسم:...... رضائے محرم

جہاں تک رضائے واجب کا معاملہ ہے یہی دراصل حقیقی رضا ہے اور یہ چار چیزوں میں پنہاں ہے:

۱۔ اللہ کے ساتھ بحیثیت رب کے رضا مندی کا اظہار کرنا۔

۲۔ اور دین اسلام کے ساتھ بحیثیت دین کے راضی ہونا۔

۳۔ اور محمد ﷺ کے ساتھ بحیثیت نبی اور رسول کے تسلیم و رضا کا ثبوت پیش کرنا۔

سیّدنا عباس بن مطلب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں رسول اللہ ﷺ کو کہتے ہوئے سنا، آپ ﷺ فرما رہے تھے: ''اس شخص نے ایمان کی حلاوت کا مزہ چکھ لیا جس نے اللہ تعالیٰ سے بحیثیت رب اور دین اسلام سے بحیثیت دین، اور محمد ﷺ سے بحیثیت رسول رضا مندی کا مظاہرہ کیا۔'' [1]

۴۔ مصائب وآلام سے دوچار ہونے پر تسلیم و رضا کا مظاہرہ کرنا اور جزع فزع نہ کرنا بھی رضائے واجب کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہے۔ یہ رضائے واجب کی چوتھی قسم ہے۔

جہاں تک رضائے مستحب کا معاملہ ہے تو دراصل یہ تسلیم و رضا کے سابقہ چاروں مراتب میں اعلیٰ ترین مرتبہ ہے۔

[1] صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب الدلیل علی أن من رضی باللہ: ۳٤.

رضائے محرم گناہوں پر رضامندی کا نام ہے کہ گناہوں کا ارتکاب ہو رہا ہو اور لوگ تماشا دیکھ رہے ہوں۔

ان تمام قسموں کے بارے میں ہم ان شاء اللہ تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

پہلی قسم:......رضائے واجب

رضائے واجب دراصل اس قضیہ کو کہتے ہیں جس کی بنیاد اللہ تعالیٰ سے بحیثیت رب ہونے اور دین اسلام سے بحیثیت دین ہونے اور محمد ﷺ سے بحیثیت نبی ہونے اور قضاو قدر پر تسلیم ورضا جیسے اہم اصولوں پر استوار ہو، تسلیم ورضا کی یہ قسم رضائے واجب کہلاتی ہے اس میں رضائے الٰہی کے اعلیٰ مراتب کی موجودگی شرط نہیں ہے۔

تسلیم ورضا کی یہی وہ قسم ہے جس کے بغیر بندے کا ایمان پایہ تکمیل کو نہیں پہنچتا گویا کہ یہی ایمان کا تتمہ اور تکملہ ہے جو شخص تسلیم ورضا کی مذکورہ چاروں قسموں یا ان میں سے کسی ایک پر رضامند ہونے پر آمادہ نہ ہو وہ دین اسلام کے دائرہ سے خارج ہو جائے گا اور اللہ کی ذات کے ساتھ کفر کا مرتکب قرار پائے گا۔

مذکورہ تمام انواع واقسام کے ساتھ تسلیم ورضا کا دعویٰ آسان بلکہ سہل ترین کام ہے لیکن عملی طور پر اس کو جامہ پہنانا مجاہدۂ نفس اور بڑے ہی صبر وعزم کا متقاضی ہے اور دل جمعی کا خواہاں ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ تسلیم ورضا:

تسلیم ورضا کے عظیم ترین مظاہر میں سے انتہائی اہم اہمیت کا حامل مظہر اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ رضامندی کا پہلو ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کو عبودیت والوہیت اور توحید اسماء وصفات میں یکتا ویگانہ اور منفرد قرار دینا ہے۔

لہٰذا بندہ اللہ وحدہ لاشریک سے بحیثیت رب واحد ہونے کے رضامندی کا اظہار کرے اس کی بنیاد پر اسی کی عبادت، اسی کی محبت، اسی کے سامنے عاجزی وانکساری، تذلل وخضوع،

اسی کی ذات سے رغبت وچاہت اور اسی سے امید وبیم پر تسلیم ورضا کا مظاہرہ کرے اوران تمام چیزوں میں اللہ کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔

اللہ کی تدبیر وچارہ جوئی یا اس کے انتظام وانصرام پر تسلیم ورضا کا مظاہرہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے لہٰذا اسی کی ذات سے اپنی حاجت برآری کی لولگاؤ اور اسی سے اپنے دین ودنیا کی اصلاح حال کا مطالبہ کرو۔

اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ بحیثیت رب تسلیم ورضا مندی:

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی اور کی عبادت تم کو ناگوار ہو یہی دین اسلام کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اس لیے مؤمن نصرانیوں یا مسیحیوں کی صلیب یا عیسیٰ مسیح علیہ السلام کی عبادت کرنے اور یہودیوں کی سیّدنا عزیر علیہ السلام کی عبادت کرنے ، اور بت پرستوں یا مجوسیوں کی بت پرستی یا بتوں اور مورتیوں کی عبادت پر چاہے وہ کسی صورت میں بھی ہو اور کسی شخص کی طرف سے ہو رضا مندی کا کسی حالت میں اظہار نہیں کرسکتا۔

تسلیم ورضا کا یہی وہ پہلو ہے جس سے غالی اور کٹر قسم کے نام نہاد صوفیاء (قبروں کے پجاری) محروم اور عاری ہیں کیونکہ وہ اپنے عمل کے اعتبار سے درحقیقت اللہ تعالیٰ سے بحیثیت رب کے راضی اور خوش نظر نہیں آتے۔ اسی لیے تو اپنی حاجت برآری کے لیے اولیاء اللہ اور مجددوں کی دہائی لگاتے ہیں اور ان سے استغاثہ کرتے ہیں۔ ان کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں اور اپنی حاجات وضروریات ان کے سامنے رکھتے ہیں اور انہیں پر توکل وبھروسا کرتے ہیں اور ان سے وہ امیدیں وابستہ کرتے ہیں جن کو اللہ کے علاوہ اور کوئی شخص پورا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا بلکہ جنہیں اللہ کے علاوہ اور کوئی پورا نہیں کرسکتا۔

یہی وہ لوگ ہیں جو مردوں سے امیدیں وابستہ رکھتے ہیں اگر یہ لوگ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات سے بحیثیت رب راضی ہوتے تو اللہ ہی کی ذات سے مدد طلب کرتے اور اللہ کی ذات کے علاوہ کسی اور پر توکل اور بھروسا واعتماد نہ کرتے اور نہ ہی اس ذات وحدہ لاشریک کے علاوہ کسی اور سے لولگاتے اور استغاثہ کرتے۔

اس کے باوجود قبر پرستوں کا عجیب وغریب دعویٰ ہے کہ وہی لوگ ارباب قلوب ہیں اورانہیں کو طب قلوب میں مہارت حاصل ہے اور وہی دلوں کے علاج ومعالجہ کے اہل ہیں انہیں کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ وہ دلوں کی اصلاح یا اس کا علاج ومعالجہ کریں اور کسی کو یہ حق حاصل نہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ وہ شخص کیسے دلوں کا علاج ومعالجہ کرسکتا ہے؟ جس نے شرک کو گلے لگا کر اورتوحید ورسالت سے روگردانی کر کے اپنے دل کا ستیاناس کرڈالا ہو۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ﴾ (الانعام: ١٦٤)

''کہہ! کیا میں اللہ کے سوا کوئی رب تلاش کروں، حالانکہ وہ ہر چیز کا رب ہے۔''

سیّدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

''اس سے مراد سیّد اور الٰہ ہے مراد یہ ہے کہ جب ہمارا آقا ومولیٰ اور معبود ومسجود باری تعالیٰ ہےتو ہم کس بنیاد پر اس کے علاوہ کسی اور کو رب بنانے کے لیے تلاش کریں حالانکہ اس کی ذات ہر چیز کی مالک ہے۔'' [1]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾

(الانعام: ١٤)

''کہہ دے کیا میں اللہ کے سوا کوئی دوست بناؤں جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے۔''

مراد یہ ہے کہ کیا میں اللہ کے علاوہ کسی اور کو اپنا معبود ومسجود، معین ومددگار، حمایتی ومعاون اور ملجا وماویٰ قرار دوں؟!

اللہ کی ذات سے بحیثیت رب رضامندی کے مظاہر میں سے محض اللہ کی خاطر محبت اور

[1] مدارج السالکین: ٢/ ١٨١.

اللہ ہی کی خاطر دشمنی مول لینا بھی ہے۔لہٰذا علمائے دین سے محبت اللہ تعالیٰ سے بحیثیت رب رضامندی کی علامت ہے۔

زاہدوں ، عابدوں اور صالحین ومتقین سے محبت اللہ تعالیٰ سے بحیثیت رب رضامندی شمار ہوتی ہے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے والوں سے محبت بھی اللہ تعالیٰ سے بحیثیت رب رضامندی کا مظہر ہے۔

فاسق و فاجر لوگوں سے بغض اللہ تعالیٰ کی ذات سے بحیثیت رب راضی ہونے کی علامت ہے۔

فلمی ایکٹرز اور فلمی ہیروئینوں اور ناچنے گانے والوں سے بغض وعداوت اللہ تعالیٰ سے بحیثیت رب راضی ہونے کی دلیل ہے۔

مخرب اخلاق ٹی وی چینلز اور ملحد افکار پھیلانے والے ٹی وی چینلوں سے نفرت وبغض بھی اللہ تعالیٰ کی ذات سے بحیثیت رب رضامندی کا ثبوت ہے۔

اسلام سے بحیثیت دین اسلام رضامندی:

دین اسلام سے رضامندی یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے ان احکامات کو بجالانے میں جن کو اس نے مشروع قرار دیا ہے بے چوں چرا تسلیم ورضا کا مظاہرہ کرو اور جو کچھ شارع حکیم نے حرام قرار دیا ہے اس کو حرام سمجھنے میں رضامندی کا اظہار کرو اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے اس کو بسروچشم حلال سمجھو اور جس کو اس نے واجب قرار دیا ہے اس کے وجوب کا اقرار کرو۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا﴾

(الانعام: ۱۱۴)

”تو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور منصف تلاش کروں، حالانکہ اسی نے تمھاری طرف یہ کتاب مفصل نازل کی ہے۔“

مراد یہ ہے کہ کیا میں دین اسلام کے علاوہ کسی اور دین کو اپنے اور تمہارے درمیان حکم بنانے پر رضامندی کا اظہار کروں جو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے حالانکہ ہمارے اور تمہارے درمیان کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی صورت میں حاکم عدل موجود ہے۔ لہٰذا تم کو والدین کے ساتھ حسن سلوک کے وجوب اور زکوٰۃ کے وجوب یہ اور ان جیسی چیزوں کے وجوب کو بسر وچشم تسلیم کر لینا چاہیے اور زنا اور سود خوری اور اس قبیل کی حرام چیزوں کی حرمت کو برضا ورغبت قبول کر لینا چاہیے۔

دین اسلام سے عدم رضامندی کا اظہار کفر ہے، جس کی بنیاد پر انسان ملت اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَاۤ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَ كَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ۝۲۸ ﴾ (محمد: ۲۸)

”یہ اس لیے کہ بے شک انھوں نے اس چیز کی پیروی کی جس نے اللہ کو ناراض کر دیا اور اس کی خوشنودی کو برا جانا تو اس نے ان کے اعمال ضائع کر دیے۔“

مراد یہ ہے کہ ان لوگوں نے اس راہ پر گامزن ہونے پر عدم رضامندی کا اظہار کیا جس سے اللہ تعالیٰ راضی اور خوش ہوتا ہے اور وہ اس راہ پر چل پڑے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے اور وہ ان اعمال صالحہ اور واجبات شرعیہ اور احکامات دینیہ کی انجام دہی کو برا جانتے ہوئے روگرداں ہو گئے جو اللہ کو راضی اور خوش کرنے کا ذریعہ ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال کو ناکارہ اور بے فائدہ بنا دیا۔

ان لوگوں کا یہ کتنے پرلے درجے کا جھوٹ ہے جو کہ اپنی مذکورہ حرکت کے باوجود یہ کہتے ہیں کہ ہم تو دین اسلام سے بحیثیت دین راضی ہیں پھر اس کے بعد ان کا عمل یہ ہے کہ وہ خود ساختہ قوانین واحکامات اور جھوٹے وبیکار گھسے پٹے اصول ومبادی پر عمل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے کوئی تو فرانسیسی قانون کا پابند ہے اور کوئی انگریزوں کے خود ساختہ قانون کا خوگر ہے تو کوئی اٹالین قانون کا دست نگر ہے اس صورت میں دین اسلام

سے اس کا کہاں کا ربط وضبط رہا؟ اور اللہ کے اس قول پر عمل کا عہد و پیمان کہاں چلا گیا کہ ﴿اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ (الانعام : ۵۷) ''حکم کسی کا نہیں بجز اللہ تعالیٰ کے۔''

شرعی احکامات وقوانین کی قانون سازی اور اس کے نفاذ کا حق اللہ وحدہ لاشریک کے علاوہ کسی اور کو حاصل نہیں اور نہ ہی کسی کو اس میں دخل اندازی کا حق پہنچتا ہے۔

دین اسلام سے رضامندی کے مظاہر میں سے مسلمانوں سے دوستی اور کافروں سے دشمنی بھی ہے۔

ایک مسلمان کے لیے دین اسلام سے رضامندی کے مظاہر میں سے اہم ترین مظہر یہ بھی ہے کہ وہ اسلام کی بنیاد پر رضامندی اور خوشی کا اظہار کرے۔ اسی کی بنیاد پر تعلق روا رکھنے پر رضامندی روا رکھے۔ اس بنیاد پر جو شخص بھی ملت اسلامیہ سے تعلق رکھنے والا ہو وہ اس سے تعلق جوڑے اور شرک وکفر کو نفرت کی نگاہ سے دیکھے اور جو شخص بھی شرک وکفر سے تعلق کا اظہار کرے وہ اس سے عداوت ودشمنی کا مظاہرہ کرے۔

دین اسلام سے پرلے درجے کی دوری کے مظاہر میں سے اہم ترین مظہر یہ بھی ہے کہ اہل کفر کے احوال اور ان کے باطل معتقدات ونظریات اور ان کی فاسد عادات و تقالید پر رضامندی کا اظہار کیا جائے اور ان کے باطل معتقدات ونظریات کو اسلامی ممالک تک لے کر آنے کی کوشش کی جائے تاکہ اسلامی ممالک میں اس کا رواج ہو۔ مثال کے طور پر بے پردگی اور مرد وزن کے درمیان اختلاط نیز موسیقی اور اس کے اسباب وغیرہ جیسی چیزوں کو بلاد اسلامیہ میں امپورٹ کرنے کی تگ ودو کا دین اسلام سے دور کردینے والے مظاہر میں سے شمار ہوتا ہے۔

دین اسلام سے عدم رضامندی کے مظاہر کی صورتحال میں کمیونسٹ یا مارکسی نظام کے نفاذ کی دعوت کا بھی شمار ہوتا ہے کیونکہ اس باطل نظریہ سے تعلق رکھنے والے لوگ دین کا سیاست وحکومت سے کوئی تعلق نہ ہونے کا نعرہ لگاتے ہیں اور یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

محمد ﷺ سے بحیثیت نبی ورسول رضامندی:

نبی کریم ﷺ سے رضامندی کے مظاہر متعدد امور پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے چند کا تذکرہ مندرجہ ذیل ہے:

ان مظاہر میں سے اللہ کے نبی ﷺ سے محبت اہم ترین مظہر ہے بلکہ صرف نبی کریم ﷺ سے محبت پر اکتفا کر لینا کافی نہیں ہے بلکہ آپ ﷺ سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ ﷺ کی ذات تم کو اپنے نفس، اپنی بیوی بچوں، اولاد، کنبہ برادری، ماں باپ، دوست و ساتھی، خویش و اقارب سے بھی زیادہ محبوب ہو جائے۔

محمد ﷺ سے بحیثیت نبی رضامندی کے مظاہر میں سے آپ ﷺ کی جسمانی اور روحانی طور پر اقتدا بھی ہے، جیسا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کر کے دکھلایا ہے اسی لیے تو ان میں بعض صحابہ ایسے بھی تھے جنہوں نے بے خوف وخطر سانپ کے بل میں اپنے پیر کا انگوٹھا ڈال کر بل کو بند کرنے کی خدمت انجام دی اور ایک دوسرے صحابی کا واقعہ ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کے دفاع میں تن تنہا پورے لشکر سے دلیری اور بے جگری کے ساتھ مقابلہ کیا اور ڈٹے رہے اور تیسرے صحابی کا وہ موقف بھی قابل ذکر ہے کہ انہوں نے اس بات کو ترجیح دی کہ ان کے جسم کی تکا بوٹی کر دی جائے انہیں یہ گوارا ہے مگر نبی کریم ﷺ کو ادنیٰ سا کانٹا چبھنا گوارا نہیں ہے۔

نبی کریم ﷺ سے بحیثیت نبی رضامندی یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ کے بعد کسی اور نبی کی آمد کی توقع اور امید نہ کی جائے جیسا کہ آپ ﷺ کے عہد کے طاغوتوں اور سرکشوں نے کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا اللہ تعالیٰ نے ان کے اس راز کا پردہ فاش کرتے ہوئے باخبر فرمایا ہے:

﴿لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝۳۱﴾

(الزخرف : ۳۱)

”اور انھوں نے کہا یہ قرآن ان دو بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہ کیا گیا؟“

گویا کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی نبوت سے عدم رضامندی کا اظہار کیا اور اس ارادے کا مظاہرہ کیا کہ نبوت اس کو ملنی چاہیے جسے وہ اس کام کے لیے منتخب کریں اور جس سے وہ بذات خود رضامندی کا اظہار کریں۔

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی زبان اطہر سے جس شریعت کی قانون سازی کی ہے اس پر رضامندی کا اظہار کرنا ہی نبی کریم ﷺ سے بحیثیت نبی رضامندی کی دلیل ہے چنانچہ حرام کو حرام سمجھنا اور حلال کو حلال قرار دینا اور مباح کو مباح سمجھنا آپ ﷺ سے رضامندی کے مظاہر کا واضح ثبوت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿٦٥﴾﴾

(النساء: ٦٥)

''پس نہیں! تیرے رب کی قسم ہے! وہ مومن نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ تجھے اس میں فیصلہ کرنے والا مان لیں جو ان کے درمیان جھگڑا پڑ جائے، پھر اپنے دلوں میں اس سے کوئی تنگی محسوس نہ کریں جو تو فیصلہ کرے اور تسلیم کرلیں، پوری طرح تسلیم کرنا۔''

تو پتہ یہ چلا کہ صرف شریعت کا نفاذ ہی نبی کریم ﷺ سے رضامندی کا ثبوت پیش کرنے کے لیے کافی نہیں بلکہ نبی کریم ﷺ سے رضامندی کا تقاضا یہ ہے کہ آپ ﷺ کی زبان اطہر سے صادر شدہ قوانین واحکام شرعیہ کو ماننے میں آپ اپنے دل میں ذرہ برابر تنگی محسوس نہ کریں۔ اس کے بعد آپ ﷺ کے حکم کے سامنے تسلیم ورضا کا مظاہرہ کریں۔

نبی کریم ﷺ سے بحیثیت نبی رضامندی میں اموال کی تقسیم کے بارے میں خوش دلی کا مظاہرہ کرنا بھی داخل ہے، مثال کے طور پر زکوۃ وصدقات، یا مال غنیمت یا مال فے کے طور پر ہاتھ آئے مال یہ اور ان جیسے اموال خیر میں تقسیم کی کیفیت پر رضامندی بھی اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ۵۹﴾

(التوبة: ۵۹)

''اور کاش کہ واقعی وہ اس پر راضی ہو جاتے جو انھیں اللہ اور اس کے رسول نے دیا اور کہتے ہمیں اللہ کافی ہے، جلد ہی اللہ ہمیں اپنے فضل سے دے گا اور اس کا رسول بھی۔ بے شک ہم اللہ ہی کی طرف رغبت رکھنے والے ہیں۔''

سیّدنا ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''دینار و درہم کی غلامی کرنے والے کا ستیاناس ہو اور پیٹ کا پجاری ہلاک و برباد ہو اگر اسے کچھ دے دیا گیا تو راضی ہوگیا اور اگر کچھ نہ ملے تو برہمی اور ناراضگی کا اظہار کرتا ہوا نظر آئے۔''[1]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بحیثیت نبی رضامندی کے مظاہر میں سے دین اسلام میں نئی چیزوں کی ایجاد سے کنارہ کشی بھی ہے، اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدود پر رک جانا بھی ہے اور دین اسلام میں ایسے نئے امور کی ایجاد سے رکنا بھی شامل ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل نہیں اتاری ہے یعنی بدعت سے اجتناب بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بحیثیت رضامندی کا مظہر ہے۔

چنانچہ محفل میلاد کا انعقاد اور طرح طرح کے من گھڑت اذکار کا رواج اور قسم قسم کی بے بنیاد عبادات کی انجام دہی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بحیثیت نبی رضامندی نہیں کہا جاسکتا۔

لہٰذا اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر مضبوطی سے جم جاؤ اور اسے گرہ بند کرلو اور کسی کے قول یا اس کے عمل کی بنیاد پر سنت سے گریزاں مت ہو۔ سنت نبویہ کے علاوہ کسی اور راستہ سے ہدایت تلاش مت کرو۔ باطل کا ڈھونگ رچانے والوں کی چابک دستی سے دھوکہ مت کھاؤ اور نہ ہی ان کے داؤ پیچ کا شکار بنو اور نہ ہی متکلمین اور فلاسفہ کی موشگافیوں اور تاویلوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر حیران وششدر رہو۔ بلاشبہ رشد وہدایت، سچائی وبالغ نظری، کامیابی و

[1] صحیح بخاری: ۲۸۸۷.

کامرانی اور رضامندی و خوش حالی اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے صادر شدہ احکامات اور اصول وقواعد میں ہی پنہاں ہے نہ کہ اس میں جس کو بدعت کی داغ بیل ڈالنے والوں نے گڑھا ہے یا غلو کرنے والے اسلام دشمن ٹولہ نے اپنی رکیک قسم کی کٹ حجتیوں کا سہارا لے کر وجود بخشا ہے۔ لہٰذا کسی کے قول پر بھروسا کرنے کے بجائے اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت پر تسلیم ورضا کا مظاہرہ کرو اسی میں خیر اور بھلائی کامیابی اور کامرانی کا راز مضمر ہے۔

قضا وقدر پر راضی برضا ہو کر تسلیم ورضا کا معاملہ روا رکھنا:

قضا وقدر پر رضامندی ہو بہو صبر وتحمل کی طرح ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے برابر اور ہم قیمت وہم پلہ ہیں۔

مصائب وآلام پر جزع فزع اور بے صبری و واویلا نہ کرنا قضا وقدر پر رضامندی کی علامت ہے۔ اس موقع پر دلی اطمینان وسکون کا مظاہرہ کرنا نیز ہر حال میں اللہ کی حمد اور شکر بجالانا راضی برضا ہونے کا مظہر ہے اور اس بات کی معرفت کہ اللہ تعالیٰ نے جو بروئے قضا وقدر ہونا لکھ دیا ہے اس کا فیصلہ کسی حکمت کے تحت ہی عمل میں آیا ہے، جس کا علم اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی کو حاصل ہے۔ اس کے علاوہ اس کی تہہ تک کسی کی رسائی نہیں۔

لہٰذا بندے کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جو بیماری یا جو فقر وتنگ دستی، یا بدحالی وبدبختی، یا مفلسی وناداری، محتاجی وبیکسی، بے روزگاری وبے کاری، جیسی چیزیں مقدر کر دی ہیں اگر اسے ان سے سابقہ پڑتا ہے تو اس پر راضی برضا رہ کر قضا وقدر پر تسلیم ورضا کا مظاہرہ کرے۔

بندے کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے مقدر میں جو (بیوی) اس کے لیے بطور شریک حیات ہونا لکھ دی ہے چاہے وہ زیادہ حسین وجمیل نہ ہو پھر بھی وہ اس پر رضامندی کا اظہار کرے اور اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جو اولاد مقدر کر دی ہے چاہے وہ تعداد میں تھوڑی ہی کیوں نہ ہو یا صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں کیوں نہ ہوں یا صرف لڑکے ہی لڑکے کیوں نہ ہوں؟ ان پر قناعت اور تسلیم ورضا کا مظاہرہ کرے۔

تم کو چاہیے کہ تم اپنے قبیلہ اور کنبہ برادری اور اس ذات پات جس سے تمہارا تعلق ہے اور خلقی اعتبار سے تم جس کے ایک فرد ہو اس پر رضامندی اور قناعت کا اظہار کرو چاہے اگرچہ نیکی وشرافت کے اعتبار سے تمہاری برادری اور ذات کم تر ہی کیوں نہ ہو؟ مگر پھر بھی تم کو تسلیم ورضا کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

قضا وقدر پر رضامندی کے منافی اعمال میں سے نوحہ وماتم، گریبان چاک کرنا، گالوں پر طمانچے مارنا اور میت پر مرثیہ خوانی وتبرہ بازی کرنا ہے۔

اسی طرح قضا وقدر پر رضامندی کے منافی اعمال میں سے خودکشی اور دہشت گردی کے طور پر خودکش حملے ہیں جو کہ اس دور میں بعض مسلمانوں کے درمیان آفت بن کر عام طور پر جاری ہیں۔ روزانہ سننے میں آتا ہے کہ کتنے نوجوانوں نے کسی مصیبت سے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کر لی اور کتنی ہی دوشیزاؤں نے کسی ناگہانی آفت کی وجہ سے خودکشی کر لی۔

اسی طرح قضا وقدر پر رضامندی کے منافی اعمال میں سے گلہ وشکوہ کرنا ہے اور لوگوں کے سامنے ناراضگی وبرہمی کا اظہار ہے۔

اسی طرح قضا وقدر پر رضامندی کے منافی اعمال میں سے اس بات کا اعتقاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (نعوذ باللہ) اس پر ظلم روا رکھا ہے حالانکہ وہ اس نعمت اور عیش وعشرت کا حق دار تھا جس سے رب کریم نے فلاں فلاں کو نوازا ہے اور فلاں فلاں پر جس کی بارش کر دی ہے بلاشبہ یہ کام تسلیم ورضا کے خلاف ہے۔

قضا وقدر پر تسلیم ورضا کی کیفیت کو بعض علماء نے اللہ سے رضامندی کے نام سے موسوم کیا ہے۔

اللہ کی ذات کے ساتھ رضامندی اور اللہ کی خاطر تسلیم ورضا کا معاملہ:

اللہ کی ذات کے ساتھ رضامندی کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی ربوبیت اور اس کی الوہیت اور اس کی وحدانیت پر رضامندی کا اظہار کیا جائے اور عبادت کے ساتھ اس کی انفرادیت کو تسلیم کرنے پر رضامندی ظاہر کی جائے اور یہ کہ حکومت اور اس کائنات کا انتظام

وانصرام صرف اور صرف اللہ ہی کے لیے ہے لہٰذا اسی کے ساتھ بندہ اللہ کی مقرر کردہ شریعت کو ماننے میں تسلیم ورضا کا معاملہ روا رکھے۔ دراصل اللہ کی ذات کے ساتھ رضامندی کی حقیقی توضیح وتشریح یہ ہے۔

یہ صورتحال صرف مؤمنین ہی کے لیے خاص ہے۔ کفار اس زمرے سے خارج ہیں کیونکہ وہ اس بارے میں اللہ کی ذات سے کیوں کر رضامندی کا اظہار کر سکتے ہیں؟ جس کے بارے میں وہ اللہ کی ذات سے رضامند نہیں ہیں۔ جہاں تک عمومی طور پر اللہ کی خاطر تسلیم و رضا کا معاملہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اللہ کی قضا و قدر اور اللہ کی مقدر کی ہوئی چیزوں اور روزگار و کاروبار میں الٹ پھیر یا اس میں اتار چڑھاؤ کے مقدر ہونے پر اللہ کی خاطر رضامندی کا اظہار کرے۔

یہ صورت حال جس کا بیان ابھی گذرا ہے اس زمرے میں مؤمن اور کافر دونوں داخل ہیں کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تم دیکھو گے کہ مشرک بھی قضاوقدر پر راضی برضا نظر آتا ہے اور کبھی دیکھو گے کہ کافر بھی مصیبت کے وقت قضاوقدر کے عقیدہ پر جما ہوا دکھائی دیتا ہے اور تمہارے سامنے کہتا ہوا دکھائی دیتا ہے کہ میں اس بات پر قانع ہوں کہ ایسا قضاقدر کی وجہ سے پیش آیا ہے اور ایسا بھی مشاہدہ میں آیا ہے کہ (نمازیں ترک کرنے والے لوگ جو سرے سے نماز ہی ادا نہیں کرتے ان کا قضا وقدر کے اس پہلو پر نمازیوں سے زیادہ قوی ایمان ہوتا ہے) حالانکہ وہ ایک وقت کی بھی نماز ادا نہیں کرتے۔

پتہ یہ چلا کہ مؤمن کے دل میں رضا کے دونوں پہلوؤں کی موجودگی ضروری ہے اور وہ دونوں پہلو جن کا تذکرہ کیا جا چکا (رضاء باللہ اور رضا عن اللہ) ہیں، لیکن یہ بات پیش نظر رہے کہ (رضا باللہ) کا مرتبہ بڑا عالی شان ہے اور اس کی قدر ومنزلت بڑی بلند وبالا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ (رضا باللہ) مؤمنین کے لیے مخصوص ہے، لہٰذا (رضا باللہ) کا فریضہ باجماع امت مؤکد ترین فرض کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی ذات سے بحیثیت رب رضامند نہ ہو تو نہ تو اس کا دین سے کوئی واسطہ ہے اور نہ ہی اس کا کوئی عمل قابل قبول ہے

بلکہ سرے سے اس کا اسلام ہی درست نہیں۔

دوسری قسم:......رضائے مستحب

گذشتہ پیرایہ بیان میں جس تقدیر واجبہ کا ذکر گذرا ہے اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر رضامندی کا اظہار کرنا رضائے مستحب کہلاتا ہے اس کا مقام رضائے واجب سے بھی بڑھ کر ہے۔

رب کریم سے بحیثیت رب رضامندی کا اظہار:

اس سے مراد یہ ہے کہ بندہ اللہ کے علاوہ تمام چیزوں سے منہ موڑ کر رب کریم سے رضامندی کا بھرپور اظہار کرے بایں طور کہ کے علاوہ اللہ جو کچھ ہے اس کی اس کے نزدیک کوئی حیثیت نہ رہے۔ یہی مقربین لوگوں کا شعار ہے۔ اس مرتبہ پر فائز شخص مقربین کے مرتبہ پر فائز سمجھا جاتا ہے۔

سیّدنا فضیل بن عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے تسلیم ورضا کا معاملہ روا رکھنا مقربین کے مرتبہ پر فائز ہونے کا اعزاز خلعت ہے۔ اس مرتبہ پر فائز ہونے کے بعد اس کے اور اللہ کے درمیان تقرب کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں یعنی اعلیٰ درجہ کی روحانی وجسمانی راحت وعیش سے محظوظ ہونے کے سوا اس کے لیے اور کچھ بھی نہیں اور وہ جنت ہے۔'' [1]

دین اسلام سے بحیثیت دین کے رضامندی کا اظہار:

اس سے مراد یہ ہے کہ مؤمن اعمال صالحہ پر عمل پیرا ہونے پر رضامندی کا اظہار کرے۔

محمد ﷺ سے بحیثیت نبی کے رضامندی کا اظہار:

اس سے مراد یہ ہے کہ بندہ نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ کی معرفت اور اس کا فیضان حاصل کرنا پسند کرے اور آپ ﷺ کے آداب کریمانہ کے رنگ میں رنگنا اس کا مطمع نظر ہو

---

[1] حلیة الاولیاء: ۹۷/۸.

اور آپ ﷺ کے اخلاق فاضلہ اور شمائل نبویہ سے آراستہ و پیراستہ ہونے کا اس کا ارادہ ہو اور واجب کے علاوہ اس سے بھی بڑھ کر رضامندی کا جو مرتبہ ہے وہاں تک رسائی کی خاطر وہ آپ ﷺ کی سنت کی اقتدا و پیروی کرے اور اس بات کی تمنا کرے کہ قیامت کے دن نبی کریم ﷺ کی رفاقت نصیب ہو جائے اور آپ ﷺ کی معیت میں حشر و نشر ہو۔

قضا و قدر پر رضامندی:

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''قضا و قدر پر رضامندی کی تین قسمیں ہیں:

۱:......نیکی کے کاموں پر رضامندی کا اظہار (اس قسم کی نیکی کا بندہ مکلّف ہے اس کو اس کی بجا آوری کا حکم دیا گیا ہے۔)

۲:......مصائب و ابتلات پر رضامندی کا اظہار (اس قسم کی بجا آوری مکلّف کے لیے یا تو مستحب ہے یا واجب۔'' [1]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے کلام سے یہ بات مترشح ہو کر سامنے آتی ہے کہ مصائب و آلام اور اللہ کی مقرر شدہ تقدیر یا قضا و قدر پر رضامندی کی دو قسمیں ہیں: ''واجب اور مستحب''

جہاں تک تقدیر واجب کا معاملہ ہے تو اس کا حکم گذشتہ صفحات پر بیان کیا جا چکا۔

جہاں تک رضائے مستحب کا معاملہ ہے تو مصیبت کے وقت اس کا بڑا بلند و بالا مقام ہے۔ اسی میں دل کا چین و سکون ہے۔ دراصل تنگی و عسرت کی حالت سے دوچار ہوتے وقت رب کریم کی حمد و ثنا اور اس کی تعریف کرنے کا نام رضائے مستحب ہے۔ ٹھیک اس طرح جس طرح بندہ خوشی کے وقت رب کریم کی حمد بجا لاتا ہے۔ تنگی اور عسرت کی حالت میں بھی ویسے ہی اللہ کی حمد و ثنا خوانی میں رطب اللسان رہے۔ تسلیم و رضا کے اس مقام تک رسائی بڑی دشوار کن ہے۔ مخلوق خدا میں سے گنے چنے لوگوں کی ہی یہاں تک رسائی ہو پاتی ہے۔

امام ابن عون رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''اللہ کی قضا و قدر پر تسلیم و رضا کا معاملہ روا رکھو حتی کہ تنگی و خوشحالی میں سے جو بھی صورت حال درپیش ہو اس پر راضی برضا رہو۔ یہی وہ نسخہ کیمیا ہے

[1] مجموع الفتاوی : ۱۰/۴۸۲۔۴۸۳۔

جو تمہارے غموں کا اثر کم کرسکتا ہے۔ بلاشبہ یہ نسخہ آخرت کے اجر وثواب جو کہ تمہارا مطمع نظر ہے تک رسائی دلانے کا ذریعہ ہے اور یہ بات یاد رہے کہ بندہ اس وقت تک تسلیم ورضا کی حقیقی لذت محسوس نہیں کرسکتا حتی کہ تسلیم ورضا کا پہلو فقیری محتاجی کی حالت میں بھی مالداری وتونگری کے ہم پلہ ہو جائے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تم کو یہ بات کیوں کر زیب دیتی ہے کہ جب تم اپنے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی قضا وقدر کو حکم عدل قرار دیتے ہو اور اسی کے مقدر کیے ہوئے فیصلہ کی راہ دیکھتے ہو۔ اب جب اس کا مقرر کردہ فیصلہ تمہاری خواہش کے خلاف واقع ہوتا ہے تو ناراضگی وبرہمی کا اظہار کرتے ہو۔ شائد جو تم چاہ رہے تھے اگر اس کے مطابق فیصلہ الٰہی ہو جاتا تو ہوسکتا ہے وہ تمہاری ہلاکت وبربادی کا باعث بنتا۔ اس کے باوجود اگر تمہاری خواہش کے مطابق قضائے الٰہی کا نزول ہوتا ہے تو تم خوش ہوتے ہو اور تسلیم ورضا کا مظاہرہ کرتے ہو۔ یہ دراصل علم غیب سے تمہاری بے بضاعتی اور کم فہمی کا نتیجہ ہے۔ اس صورت حال میں تم اللہ کی قضاوقدر پر کیوں کر بھروسا کرنے والے گردانے جاسکتے ہو۔ اگر تم نے اس بنیاد پر راضی برضا ہونے کا دعویٰ کیا تو تم نے خود اپنے نفس کے ساتھ انصاف سے کام نہ لیا اور نہ ہی تسلیم ورضا تک رسائی حاصل کرنے میں کامیابی سے ہم کنار ہو سکے۔'' [1]

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تسلیم ورضا کے اس پہلو کو اپنے بندوں پر واجب قرار نہیں دیا ہے کیونکہ اگر اس کو واجب قرار دے دیا جاتا تو بندے اس کی انجام دہی کی استطاعت نہ رکھتے اور ان کے لیے یہ تکلیف مالا طاق کے مترادف ہوتا۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ''مصیبت، تنگی اور عسرت وشدت کے وقت کیوں کر حمد وشکر کیا جائے'' یہ تو عجیب وغریب بات ہے!

اس اشکال کے جواب کی دو صورتیں ہے:

ا۔ بندہ کو بخوبی علم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیز بھی بنائی ہے بڑی خوبی کے ساتھ بنائی ہے اور خوب مستحکم وپختہ بنائی ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو کام بھی انجام دیا ہے، وہ ایک حکمت

---

[1] الرضا عن الله بقضائه : ٦٩.

کے تحت ہی انجام دیا ہے۔ اگر بندہ اس بات کو ذہن نشین کر لے تو وہ اللہ کے افعال پر راضی برضا ہو جائے گا اور اللہ کی قضاوقدر پر اس کی حمد وثنا بیان کرنے لگے گا۔

۲۔ بندہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات سے پورے طور پر باخبر ہے کہ کون سی چیز اس کے لیے موزوں ہے؟ اور کس چیز میں اس کی ذاتی مصلحت پنہاں ہے؟ اور اللہ تعالیٰ اس بات سے بھی بخوبی مطلع ہے کہ بندے کے لیے اس کا اختیار خود بندے کی اپنی پسند سے کہیں بہتر ہے۔

سیّدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مؤمن کی شان ہی نرالی ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جو بھی فیصلہ کرتا ہے اس میں اس کے لیے خیر ہی کا پہلو پوشیدہ ہوتا ہے۔'' [1]

لہٰذا تم کو چاہیے کہ تم اس خیر پر اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرتے رہو جو اس نے تمہارے لیے مقدر کر رکھی ہے اگرچہ وہ مصیبت ہی کی شکل میں تمہارے سامنے کیوں نہ رونما ہو اور تم کو اس سے دوچار ہو کر آزمائش کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے؟

اگر بندہ اللہ تعالیٰ سے مصیبت کے زائل ہونے کی دعا کرے تو کیا اس کا یہ رویہ تسلیم ورضا کے منافی عمل ہے؟

بعض صوفیوں اور درویشوں کا کہنا ہے کہ مصیبت کی گھڑی ٹالنے کی خاطر دعا کرنا تسلیم ورضا پر طعنہ زنی اور عیب گوئی کے مترادف عمل ہے۔ اس عمل سے رضامندی کے پہلو پر زد پڑتی ہے۔

مگر اس معاملہ میں صحیح ترین بات تو یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے گلہ شکوہ کرنا اور اللہ کے روبرو اپنی عرضی پیش نہ کرنا قابل مذمت بات ہے، لیکن اگر کوئی انسان اس مسئلہ کو اللہ کے روبرو بطور شکایت پیش کرے جس سے اس کو خطرہ یا نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو اور اس کے ٹلنے

[1] رواہ احمد: ۲۰۲۹۸ وصححہ الالبانی۔

کی اللہ سے دعا کرے یا یہ دعا کرے کہ اس پر سے یہ مصیبت کی گھڑی ٹل جائے تو اس کا یہ عمل تسلیم و رضا کے منافی شمار نہ ہوگا۔

سیّدنا ایوب علیہ السلام پر جب مصیبت کی گھڑی آ کر سایہ فگن ہوگئی تو انہوں نے عین آزمائش کے موقع پر رب کریم کے حضور دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر سے عذاب کی گھڑی ٹال دی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیّدنا ایوب علیہ السلام کو صبر سے متصف کر کے پکارا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا﴾ (ص : ٤٤)

''بے شک ہم نے اسے صبر کرنے والا پایا۔''

امام عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور اسلاف کی ایک جماعت نے (جن کی حیثیت آئیڈیل اور نمونہ کی ہے) دکھ درد اور رنج و غم کی شکوہ شکایت کی ہے اور بنی آدم میں سے کون شخص ایسا ہے جو دکھ درد سے دوچار نہ ہوتا ہو اور جس کو امراض کا سامنا کرنا نہ پڑتا ہو مگر اس بارے میں باعث مذمت بات یہ ہے کہ وہ اپنے دکھ درد یا امراض کا دکھڑا لوگوں کو محض تنگ دلی ناراضگی و خفگی کی بنیاد پر سنائے۔ اگر بندہ ایسا کرتا ہے تو یہ بات قابل مذمت ہے اور اگر بندہ اپنے بھائیوں کے سامنے اپنے امراض کی خبر اس لیے پیش کرتا ہے تاکہ اس کے بھائی بندے اس کے لیے شفائے کاملہ اور عافیت و صحت کی دعا کریں یا یہ کہ خود بخود کراہنے اور دکھ درد کی وجہ سے آہ نکل جائے جو مریض کے لیے باعث سکون و راحت ہو تو اس کو شکوہ شمار نہیں کیا جائے گا۔''[1]

باری تعالیٰ مؤمنین کی صفات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

﴿يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا﴾ (السجدة : ١٦)

---

[1] عمدة القاری : ٢١/٢٢٢.

"مؤمنین لوگ تو وہ ہیں جو خوف اور (اللہ کے فضل و کرم) کی امید رکھتے ہوئے اپنے رب کو پکارتے ہیں۔"

اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ میں اپنے نیک اور صالح بندوں کا وصف بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ وہ آرام وراحت اور چین وسکون کے حصول اور جزا وسزا، عذاب وعقاب کو رفع دفع کرنے کی خاطر اپنے رب کریم کی بارگاہ میں دعا ومناجات کرتے ہیں۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ نفع اندوزی کے حصول اور مضرت رسانی سے محفوظ رہنے کی خاطر دعا کرنا تسلیم ورضا کے منافی نہیں بلکہ اس موقع پر ان دونوں کا آپس میں کوئی تعارض نہیں۔

کیا پریشانی اور مشقت اور رنج والم تسلیم ورضا کے منافی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مشقت عین عبادت ہے اور مصیبت کی وجہ سے رنج والم فطری بات ہے اور غیر متوقع طور پر ناگہانی جو کہ من جانب اللہ نازل ہو جائے اس پر افسوس کرنا رضائے مستحب کے منافی نہیں۔

امام ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"جب کسی انسان کو مصیبت آ لے تو اس وقت رنج وغم کے آثار نمایاں ہونا بندے کو صابر وشاکر اور راضی برضا رہنے کے دائرے سے خارج نہیں ہونے دیتے۔ اگر اس کا دل مطمئن ہو۔"[1]

ہم اس بارے میں مثال سے وضاحت کریں گے کہ مریض کو دیکھیے وہ دوا پینے کے لیے برضا ورغبت تیار نظر آتا ہے اور اس کا دل اس دوا کے استعمال پر مطمئن ہوتا ہے کیونکہ لوگوں کا تجربہ اور ڈاکٹر کی تشخیص کی وجہ سے اسے یہ بات پتہ ہوتی ہے کہ یہ دوا اس کے مرض کا کامیاب ترین علاج ہے اور اس سے قبل کتنے ہی مریض اس دوا کے استعمال کرنے کی وجہ سے شفایاب ہو چکے ہیں۔ جس کی وجہ سے اسے یقین ہوتا ہے اور اس حال میں کہ اس کا دل مطمئن ہوتا ہے کہ یہ دوا اس کے مرض کا علاج ہے۔

[1] فتح الباري: ٧/٥١٤.

لیکن اس اطمینان اور اس تسلیم ورضا مندی کے باوجود اس کو دوا کی کڑواہٹ اور تلخی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ ایسی کڑواہٹ اور تلخی جس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں مگر اس کے باوجود وہ خوشی خوشی اس دوا کو پیتا اور استعمال کرتا ہے۔

ٹھیک یہی مثال سچے مسلمان کی ہے۔ اس کو رب کریم کے حضور سکون قلب حاصل ہوتا ہے اور رب تعالیٰ نے جن واجبات کی انجام دہی کا اس کو حکم دیا ہے اس پر راضی برضا رہنا اس کا شیوہ زندگی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جو مصائب وآلام مقدر کر دیے ہیں اس کے سامنے وہ تسلیم ورضا کا معاملہ کرتا ہے۔ اس کے باوجود کبھی کبھار ایسی صورتحال سے بھی اس کا سامنا ہوتا ہے جہاں اسے مشقت اور دشواری، غم واندوہ سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس پر راضی برضا رہنا تسلیم ورضا کا تقاضا ہوتا ہے۔

چنانچہ روزہ دار برضا ورغبت روزہ رکھتا ہے اور خوشی خوشی اس کام کو انجام دیتا ہے لیکن اسے بھوک وپیاس کی شدت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ اس کو فطری طور پر احساس بھی ہوتا ہے، اور اللہ کی راہ میں جان کا نذرانہ پیش کرنے والا مخلص شخص اس عظیم دینی فریضہ کی انجام دہی برضا ورغبت کرتا ہے اور اس عظیم الشان فریضہ کی ادائیگی کے لیے بخوشی اقدام کرتا ہے۔ اس کے باوجود وہ اس راہ میں کرب والم اور مشقت ودشواری سے نبرد آزمائی کرتا ہے اور اس کی تلخی کو محسوس کرتا ہے۔

تو پتہ یہ چلا کہ تسلیم ورضا کے حصول کے لیے رنج والم اور مشقت ودشواری کی نفی نہیں ہوتی۔ یہ ضروری نہیں کہ رضامندی کے مقام تک رسائی کے لیے بندہ کی طرف سے ان چیزوں کے ازالہ کی شرط ہو بلکہ اس کے برعکس بعض اولوالعزم اور شاہین صفت لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ رنج والم کے عالم میں بھی سرور وکیف محسوس کرتے ہیں۔ ان کے لیے یہ کیفیت نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوتی ہے اور وہ اس حالت میں بھی لذت وآرام سے محظوظ ہوتے ہیں۔

سیدنا ابراہیم بن فاتک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے:

''مصائب وآلام کے عالم میں لذت وراحت محسوس کرنے کا نام رضا ہے۔''[1]

---

[1] شعب الایمان: ۱۰۰۷۸.

اور کسی شاعر کا قول ہے:

"تمہاری خاطر عذاب سے دوچار ہونے میں شیرینی و چاشنی کا مزہ محسوس ہوتا ہے اور تمہاری خاطر ہجر کا سماں بھی قرب کا مزہ دیتا ہے۔" ❶

اس طرح کے رنج والم اور مشقت کی خبر دینا تسلیم و رضا کے منافی عمل نہیں کیونکہ یہ اللہ کی قضاوقدر کا تقاضا ہے جس کی وجہ سے قسمت کی اثر پذیری کا یہ ظہور ہے بلاشبہ یہ سب اللہ کی مقدر کی ہوئی قضاوقدر اور قسمت کا تقاضا ہے، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے اس غلام کے ساتھ معاملہ کیا تھا جب کہ اس نے آپ علیہ السلام کو خبر دی تھی کہ اس کو اثنائے سفر بڑی مشقت اور دشواری سے نبرد آزمائی کرنا پڑی تھی جس کی وجہ سے اس کو سخت تکلیف سے دوچار ہونا پڑا تو پتہ یہ چلا کہ اس طرح کا موقف تسلیم و رضا کے منافی عمل نہیں۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"یہ اس بات کے جائز ہونے کی دلیل ہے کہ انسان اگر درد وکرب یا امراض سے دوچار ہو اور اس کے بارے میں وہ دوسروں کو بتلائے تو اس کا یہ عمل رضامندی اور قضاوقدر کے بارے میں تسلیم و رضا کے منافی نہیں سمجھا جائے گا اور نہ ہی اس کی وجہ سے تسلیم و رضا کے سلسلہ میں کسی طرح کی قدغن لگائی جائے گی البتہ بندے کی طرف سے یہ شکوہ وشکایت بطور ناراضگی و خفگی نہ ہو۔" ❷

کیا میت پر رونا دھونا اور آنسو بہانا تسلیم و رضا کے مخالف عمل ہے:

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کا انتقال پر ملال ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بے ساختہ فرمانے لگے:

"آنکھیں اشکبار ہیں اور دل رنجیدہ ہے ہم وہی کہہ سکتے ہیں جس سے ہمارا رب راضی ہو۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ اے ابراہیم! ہم تمہاری جدائی سے رنجیدہ

❶ جامع العلوم والحكم: ١٩٥.

❷ تفسير القرطبي: ١٥/١١.

اور غمگین ہیں۔''❶

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''بطور رحمت وشفقت میت پر رونا اور آنسو بہانا مستحب ہے۔ بندے کا یہ عمل تسلیم ورضا کے منافی نہیں برخلاف اس رونے کے جو اپنی قسمت اور نصیب کے کھوٹے ہونے کی بنیاد پر ہو۔ یہ معنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان قولیہ جملوں سے مترشح ہیں جو کہ میت پر روتے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے تھے کہ یہ تو شفقت ورحمت کا تقاضا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں ودیعت فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں میں سے رحم وکرم کرنے والے بندوں پر رحم وکرم کا معاملہ کرتا ہے۔''❷

اس صورت حال سے دوچار لوگوں کی چار قسمیں ہیں:

۱۔ لوگوں میں بعض لوگ وہ ہوتے ہیں جو دل کی سختی کے ساتھ صبر کے عادی ہوتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ان کے دل میں رحم وکرم کا مادہ سرے سے ہوتا ہی نہیں۔

۲۔ اور ان میں سے بعض وہ ہوتے ہیں جو جزع وفزع اور چیخ پکار کرتے ہوئے روتے دھوتے ہیں۔

۳۔ اور ان میں بعض وہ ہوتے ہیں جو دل کی سختی کے ساتھ واویلا مچا کر جزع اور فزع کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

۴۔ لیکن قابل ستائش تو وہ مؤمن ہے جو بیک وقت مصائب پر صبر کرے اور لوگوں کے ساتھ رحم وکرم کا معاملہ بھی رکھے۔❸

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب قول النبیؐ إنابك لمحزونون: ۱۳۰۳.

❷ صحیح بخاری، کتاب المرضی، باب عیادۃ الصبیان: ۵٦۵۵.

❸ مجموع الفتاویٰ: (۱۰/٤۷) بتصرف

تیسری قسم:......رضائے محرم

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ قضا قدر کی انواع واقسام سے متعلق رضا کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اور تیسری قسم رضائے کفر وجو داور رضائے فسق وفجور یا رضائے معصیت ہے۔
بالفاظ دیگر گویا کہ یہ سراسر معصیت ونافرمانی ہی ہے اس قسم کی رضا سے وابستگی
شرعا غیر مطلوب ہے بلکہ انسان اس قسم کی رضا سے بغض وعداوت اور دشمنی وعدم
رضامندی کا مکلّف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اس قسم کی حرکت کو ناپسند فرماتا ہے اور کسی
صورت میں بھی باری تعالیٰ اس طرح کے تصرف سے راضی نہیں ہوسکتا۔'' [1]

اس بارے میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے جو حدیث سیّدنا عرس بن عمیرۃ کندی رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے وہ بطور دلیل شاہد عدل ہے۔ راوی مذکور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

''اگر کسی سرزمین پر گناہ کا ارتکاب کیا جاتا ہے اور وہاں جو شخص موجود ہے وہ اس
سے کراہت اور ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے تو اس کی موجودگی کالعدم قرار پاتی
ہے گویا کہ وہ وہاں موجود ہی نہیں اور اگر اس جگہ نہ موجود ہونے والا شخص اس گناہ
کی انجام دہی پر رضامندی اور خوشی کا اظہار کرتا ہے تو غیر حاضری کے باوجود
اسے اس گناہ میں شریک سمجھا جائے گا۔'' [2]

سیّدنا ربیع بن انس رحمہ اللہ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ 'سابقہ زمانے کے صحیفوں میں لکھا ہوا ہے کہ جو اللہ کی معصیت اور نافرمانی کی انجام دہی پر رضامندی کا اظہار کرے تو جب تک وہ اس کیفیت سے دوچار رہتا ہے اس وقت تک اللہ تعالیٰ کسی صورت میں بھی اس کا ذرہ برابر عمل قبول نہیں فرماتا ہے۔'' [3]

---

[1] مجموع الفتاوی: ۱۰/۴۸۲۔۴۸۳۔

[2] ابو داؤد، کتاب الملاحم، باب الأمر والنهي: ۴۳۴۵ و حسنه الالبانی رحمه الله.

[3] الدر المنثور: ۲/۵۷۶۔

بڑے افسوس کا مقام ہے کہ عصر حاضر میں کتنے ہی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو محرمات کا ارتکاب ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں اور اس پر خوشی اور رضامندی کا اظہار کرتے ہیں بلکہ اس کا ارتکاب کرنے والے کو شہ دیتے ہیں اگرچہ بذات خود اس میں شریک نہیں ہوتے مگر اس کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔

گھر کا سرپرست اپنے اہل وعیال میں خباثت و بے حیائی ہوتے ہوئے دیکھتا ہے اور رضامندی ومسرت کا اظہار کرتا ہے چنانچہ اپنی لڑکی کو نوجوانوں سے موبائل پر کال کرتے اور ان سے ملتے جلتے دیکھتا ہے اور آزاد خیالی کا سہارا لیتے ہوئے اس پر رضامندی کا اظہار کرتا ہے اور اس پر فخر کرتا ہے اور اپنی بیوی کو بے پردہ بغیر کسی شرعی حجاب کے باہر آنے جانے کی اجازت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ آزاد خیالی کا تقاضا ہے اور اس پر رضامند نظر آتا ہے بلکہ بعض لوگ تو ایسے بھی ہیں جو اپنے نوجوان لڑکے کو خادمہ کے ساتھ معصیت کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور اسے سنی ان سنی کر کے ٹال جاتے ہیں گویا کہ کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ اس طرح فحاشی پر رضامندی اور سکوت حرام کاری کو فروغ دینا ہے۔

ان میں سے بعض لوگ تو وہ ہیں جو اپنے آپ کو تہذیب وثقافت کا علم بردار کہتے ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ مدمقابل کی طرف سے انجام دیے گئے انواع واقسام کے کفریہ وشرکیہ رسم ورواج پر محض مدمقابل کی دل جوئی کے لیے رضامندی وخوشی کا اظہار کرتے ہیں اور بعض لوگ تقریب ادیان کے مونو گرام کے تحت بدعت اور شرکیہ افکار وخیالات پر تسلیم ورضا کا معاملہ روا رکھتے ہیں۔ (وھلم جرا)

جبکہ اللہ تعالیٰ نے کفار ومشرکین اور فاسقوں فاجروں کی حالت پر رضامندی کے اظہار سے منع فرمایا ہے اور اس بات کی صراحت فرمادی ہے کہ باری تعالیٰ بذات خود اس حالت کو ناپسند فرماتا ہے اور ان کی اس حرکت پر کبھی راضی نہیں ہوسکتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَحْلِفُونَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۖ فَإِن تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَرْضَىٰ عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ﴾ (التوبة: ٩٦)

''یہ اس لیے قسمیں کھا رہے ہیں کہ تم ان سے راضی اور خوش ہو جاؤ اگر تم ان سے راضی اور خوش ہو بھی گئے تو اللہ تعالیٰ تو ایسے فاسق (وفاجر) لوگوں سے راضی اور خوش نہیں ہوا کرتا۔''

امام شوکانی رحمہ اللہ اس آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اللہ تعالیٰ کا ان سے راضی نہ ہونے کی خبر دینے سے مقصود مؤمنین کو ان سے رضامندی کے اظہار سے منع کرنا ہے کیونکہ جس شخص سے اللہ راضی نہ ہو اس سے رضامندی کا اظہار کرنا ایک مؤمن کا شیوہ اور شعار نہیں ہوسکتا۔'' ❶

مؤمن کیوں کر اس شخص سے راضی ہوسکتا ہے جس سے اللہ ناراض ہو۔

یہ قاعدۂ شرعیہ اصولیہ ہے کہ ''معصیت ونافرمانی پر رضامندی عین معصیت ہے اور کفر وشرک پر رضامندی بعینہٖ کفر وشرک ہے۔''

سیّدنا عبداللہ بن شمیط رضی اللہ عنہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''پرانے زمانے کی مثل ہے جو شخص فسق وفجور ہوتے ہوئے دیکھے اور اس پر راضی ہو تو وہ بھی انہیں کے زمرے میں شمار ہوگا اور جو شخص اللہ کی معصیت ونافرمانی ہوتے ہوئے دیکھے اور اس کی تائید کرے تو اس شخص کا عمل معلق رہتا ہے۔ بارگاہ الٰہی تک اس کی رسائی نہیں ہوتی۔'' ❷

ایک شخص نے امام شعبی رحمہ اللہ کے سامنے سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کو حق بجانب قرار دیا اور اس قتل کی تحسین وتعریف بیان کی تو امام شعبی رحمہ اللہ نے جواباً اس شخص سے کہا کہ ''تم نے اپنی اس حرکت کی وجہ سے سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ لیے ہیں'' گویا کہ امام شعبی رحمہ اللہ نے قتل کی سازش پر رضامندی کو عین قتل قرار دیا۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ بڑا ہی حساس اور گھمبیر مسئلہ ہے کہ معصیت پر رضامندی بعینہٖ معصیت شمار ہوا کرتی ہے۔'' ❸

---

❶ فتح القدير : ۲/ ۵۷٤.

❷ حلية الاولياء : ۳/ ۱۳۰.

❸ تفسير القرطبي : ٤/ ۲۸٦.

تسلیم ورضا کے مرتبہ تک رسائی کے طریقے

اب جبکہ ہم تسلیم ورضا کے اقسام سے آشنائی حاصل کر چکے ہیں اور ہمیں پتہ چل گیا کہ تسلیم ورضا کے درجات ومراتب ہیں۔ ان میں سے بعض واجب ہیں اور بعض مستحب اس لیے اب ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم مقام تسلیم ورضا تک رسائی کے طریقوں سے شناسائی حاصل کریں اور اس مرتبہ تک پہنچنے کے اسباب ووسائل کی معرفت کے حصول کی تگ ودو کریں اور اس عظیم الشان عبادت قلبیہ سے سرشار لوگوں کی صف میں کس طرح صف آراء ہونے کی سعادت حاصل کی جاسکتی ہے اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

قبل اس کے کہ ہم تسلیم ورضا کے مرتبہ تک رسائی کی کیفیت پر خامہ فرسائی کی سعادت حاصل کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس مسئلہ کے بارے میں علمائے کرام کے مابین ایک اہم اختلاف کا بھی ذکر کرتے چلیں اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ ''آیا تسلیم ورضا وہبی چیز ہے اللہ تعالیٰ نے قدرتی طور پر انسان کو اس نعمت جلیلہ سے نواز دیا ہے؟ یا یہ کسبی معاملہ ہے؟ بندہ اس کو عبادت ومجاہدہ اور ریاضت نفس سرانجام دے کر حاصل کرسکتا ہے؟''

اس کا جواب یہ ہے کہ تسلیم ورضا کا معاملہ وہبی اور کسبی دونوں طرح کا ہے۔ اس میں دونوں پہلوؤں کا عمل دخل ہے۔ باعتبار سبب یہ کسبی ہے اور حقیقت کے اعتبار سے یہ وہبی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اسباب ووسائل کو وسیلہ بنا کر تسلیم ورضا کے مرتبہ تک رسائی حاصل کرسکتا ہے لیکن تسلیم ورضا کی چاشنی درحقیقت اسباب ووسائل ہی پر تکیہ کر کے حاصل کرنا محال ہے۔ اس طرح تسلیم ورضا کے بلند وبالا مرتبہ تک رسائی حاصل نہیں کی جاسکتی، بلاشبہ مذکورہ طریقہ سے اس کے بلند وبالا مقام کی عظمت کا حصول ناممکن ہے بلکہ اس کی عظمت اور قدر تو اللہ کی طرف سے فضل ہوا کرتا ہے۔ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے وہ اس سے محروم رکھتا ہے۔

تسلیم ورضا کے حصول کے اسباب ووسائل

مؤمن کو جب تسلیم ورضا کے بارے میں شدبد ہوجائے اور اس کے بلند وبالا مراتب کے بارے میں شناسائی ہوجائے اور اس کو وہاں تک رسائی کی خواہش ہونے لگے تو اسے چاہیے کہ وہ اس کے حصول کی معرفت کے طریقے معلوم کرنے کی طرف فوراً متوجہ ہوجائے اور تسلیم ورضا کے مقام عالیہ تک رسائی کے ان اسباب ووسائل کی معرفت کی طرف توجہ مرکوز کرنا شروع کردے جو اس کے لیے تسلیم ورضا کے مقام تک رسائی کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں۔

تسلیم ورضا تک رسائی کے اسباب ووسائل:

۱۔ اس راہ میں پیش آنے والی تکلیفوں اور مشقتوں پر صبر اور اطاعت وفرماں برداری کے کاموں پر عزم اور تحمل کا مظاہرہ اس کے اسباب ووسائل میں سے اہم ترین وسیلہ ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَ مِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَ اَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ﴿۱۳۰﴾ ﴾ (طٰہ: ۱۳۰)

”لہٰذا آپ ان کی باتوں پر صبر وتحمل سے کام لیں اور سورج نکلنے سے پہلے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے پہلے اپنے پروردگار کی تسبیح وتحمید بیان کریں اور رات کے مختلف وقتوں میں بھی اور دن کے حصوں میں بھی تسبیح (کا ورد) کرتے رہیں بہت ممکن ہے کہ تو راضی ہوجائے۔“

مراد یہ ہے کہ ایسا یہ امید رکھتے ہوئے کریں کہ اللہ کے یہاں آپ کو وہ مقام ومرتبہ حاصل ہوجائے جس سے آپ کا نفس راضی ہوجائے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کہ وہ تم کو مقام تسلیم ورضا پر فائز فرمادے، اس طرح کا عمل بھی اس سلسلہ کی اہم ترین کڑی ہے۔

سیّدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک دعا سکھائی تھی اور ان کو حکم دیا تھا کہ وہ اس کا روزانہ ورد کیا کریں اور اپنے اہل وعیال کو اس کا ورد کرنے کی ترغیب دیا کریں۔ اس دعا کے یہ کلمات تھے:

((أَسْئَلُكَ اللّٰهُمَّ الرِّضَا بَعْدَ الْقَضَاءِ .)) ❶

''اے اللہ! قضا وقدر کے وقوع کے بعد میں تجھ سے تسلیم ورضا پر کاربند رہنے کا سوالی ہوں۔''

سیّدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا مانگا کرتے تھے کہ

((اَللّٰهُمَّ اَسْأَلُكَ الصِّحَةَ وَالْعَافِيَةَ وَالْاَمَانَةَ ، وَحُسْنَ الْخُلُقِ ، وَالرِّضَا بِالْقَدْرِ .)) ❷

''اے اللہ میں تجھ سے صحت وعافیت، امانت وپاس داری اور حسن خاتمہ نیز قضا وقدر پر تسلیم ورضا کا طلب گار ہوں۔''

۳۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی حقیقی معرفت بھی تسلیم ورضا کے حصول کا ذریعہ ہے۔

اگر بندہ اس بات کی معرفت سے آشنا ہوجائے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ (حکیم) ہے مہربانی کا برتاؤ کرنا اس کی عادت ہے۔ رحم وکرم اس کی صفت ہے تو ایسا شخص خود بخود نوشتہ تقدیر میں جو مقدر ہو چکا ہے اس پر راضی اور قانع ہوجائے۔ امام آلوسی رحمہ اللہ اس بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''معرفت الٰہی قضا وقدر کے سامنے سر تسلیم خم کردینے کی متقاضی ہوا کرتی ہے اور آزمائش کے وقت سکون واطمینان کا اظہار کرنا ہی معرفت الٰہی ہے۔'' ❸

سیّدنا فضیل بن عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کی ذات سے راضی برضا رہنے کے سب سے زیادہ حق دار معرفت الٰہی سے سرشار لوگ ہوا کرتے ہیں۔'' ❹

---

❶ الرد علی الجهمية للدارمی : ١١٦ واسناده حسن۔ ❷ اعتقاد اهل السنة : ٦٥٢/٤.

❸ روح المعانی : ١٨٠/١١.

❹ حلية الاولياء : ١٠٤/٨.

سیّدنا جنید رحمۃ اللہ کا قول ہے: ''تسلیم ورضا کا فیضان علم ودانش اور عرفان محبت ومعرفت الٰہی کی قوت کے بقدر ہوتا ہے۔'' ❶

بعض اللہ والوں سے دریافت کیا گیا کہ تسلیم ورضا کے بلند وبالا مقام تک رسائی کا کیا طریقہ کار ہوسکتا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: دل سے اس بات کا یقین کہ مولائے کریم اپنی قضاوقدر کے اعتبار سے عدل پرور ہے اور اپنے منصفانہ کردار میں غیر متھم ہے بلاشبہ یہی تسلیم ورضا تک رسائی کا زینہ ہے۔ ❷

۴۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات عالی شان پر توکل بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

کیونکہ رضامندی توکل کا منتہی ہے۔ چنانچہ بندے کے قدم جب توکل کی شاہراہ پر جم جاتے ہیں تو خودبخود اس پر تسلیم ورضا کا فیضان شروع ہوجاتا ہے اور تسلیم ورضا کا مرتبہ پالینے کے بعد اسے رضامندی کا مقام حاصل ہوجاتا ہے۔

۵۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اس کی قسمت میں مقدر فرمادیا ہے اس کو برضا ورغبت قبول کرنا بھی اس سلسلہ کی ایک اہم ترین کڑی ہے۔

سیّدنا یحییٰ بن معاذ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ بندہ کو مقام رضا تک کب رسائی مل پاتی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ بندے نے اپنے رب کریم سے معاملہ کرنے کی غرض سے جب اپنے نفس کو چار اصولوں کا پابند بنالیا ہو بایں طور کہ وہ یہ کہے کہ ''اگر تو مجھے عطا فرمائے گا تو وہ مجھے بسر وچشم قبول ہے اور اگر تو مجھے نہیں دیتا تو میں اس پر راضی ہوں اور اگر تو مجھے چھوڑ دے تب بھی میں تیری عبادت وبندگی بجالانے کے لیے تیار ہوں اور اگر تو مجھے بلائے تو میں تیری ایک آواز پر لبیک کہنے کے لیے تیار ہوں'' ❸ جب ان چار اصولوں کا پابند ہوجائے تو سمجھ لو تسلیم ورضا کے مقام تک اس کی رسائی ہوگئی۔ بعض شعراء کے شعر ہیں:

''تمہارے لیے گذر بسر کے لیے جو کافی ہو اسی پر قناعت کرو اور تسلیم ورضا کا

---

❶ روح المعانی: ۳۰/۲۰۶۔ ❷ حلیۃ الاولیاء: ۱۰/۸۹۔
❸ مدارج السالکین: ۲/۱۷۴۔

استعمال کرو کیونکہ تمھیں پتہ نہیں کہ تمھیں صبح کو، صبح کا سہانا وقت یا شام کو اس کی رنگینیاں نصیب ہوسکیں گی یا نہیں! مال ودولت کی بہتات سے آدمی مال دار نہیں بنتا بلکہ مالداری اور محتاجی نفس کی تونگری اور قناعت پر منحصر ہے۔''❶

۶۔ فقراء ومساکین کی صحبت بھی رضا کے حصول کا ذریعہ ہے۔

سلف صالحین میں سے بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ''جو شخص فقراء ومساکین کی صحبت اختیار کرتا ہے اس کے صلہ میں اللہ تعالیٰ نے جو اس کی قسمت میں لکھ دیا ہے یا اس کے لیے جو مقدر کردیا ہے اس پر اس بارے میں مزید قناعت ورضامندی کا فیضان کرتا چلا جاتا ہے۔''❷

۷۔ موت کا یاد کرنا بھی حصول رضا کا وسیلہ ہے۔

سیّدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے امام اوزاعی رحمہ اللہ کو خط لکھا اور اس میں تحریر فرمایا:

''جو بکثرت موت کو یاد کرتا رہتا ہے اس کو اس کے صلہ میں معمولی مال و دولت پر قناعت حاصل ہوجاتی ہے اور وہ اسی پر راضی برضا رہتا ہے۔''❸

۸۔ عالی حوصلگی اور تزکیہ نفس بھی حصول رضا کا ذریعہ ہے۔

انسان حوصلہ کے اعتبار سے جب بلندی پر فائز ہوجاتا ہے اور اس میں نکھار آجاتا ہے اور اس کے بعد اس کو اپنے نفس کے تزکیہ کی فکر دامن گیر ہوتی ہے بایں طور کہ وہ علائق دنیا اور اس کے میل کچیل سے پاک وصاف ہونا چاہتا ہے تو وہ تسلیم ورضا کے مقام کو پالیتا ہے۔

۹۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کارگاہ حیات میں بطور قضاوقدر جو کچھ درپیش ہو اس پر دل جمعی بھی اس سلسلہ کی اہم ترین کڑی ہے۔

اس مرتبہ تک رسائی بندے کے لیے اس وقت سہل اور آسان ہوجاتی ہے جب بندہ کو اپنی کمزوری وناتوانی اور رب کریم کی طاقت وقوت اور سطوت کی صحیح معرفت نصیب ہوجاتی ہے اور اسے اپنی جہالت اور رب کریم کے بے پایاں علم اور اپنی بے بسی وکم مائیگی اور رب کریم کی عظیم الشان قدرت کا پتہ چل جاتا ہے اور اس کو اس بات کا احساس نصیب ہوجاتا

❶ تفسیر القرطبی: ۳۱۹/۵۔ ❷ البرھان المؤید: ۱۰۹۔ ❸ الصمت: ۳۵۔

ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات رحیم وکریم اور شفیق ومہربان ہے۔ بندے پر رحم وکرم کا معاملہ کرنے والی ہے تو خود بخود بندہ تسلیم ورضا کی حرم سرا میں داخل ہو جاتا ہے اور اس پر اس کو قناعت حاصل ہو جاتی ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے بیٹے یا لخت جگر کی موت کا فیصلہ صادر فرما دیتا ہے مگر تم کو اس کی موت میں پنہاں حکمت کا بظاہر پتہ نہیں ہوتا بلکہ تم کو اس فیصلہ کے سامنے تسلیم ورضا کا سہارا لیتے ہوئے راضی برضا رہنا پڑتا ہے کیونکہ تم کو پتہ ہے کہ اللہ کی ذات حکیم ہے اس کے ساتھ علیم بھی ہے۔ اس کا علم محیط ہے کیونکہ اس بات کا امکان ہے اگر یہ بچہ زندہ رہتا تو فاسق وفاجر ہوتا یا والدین کا نافرمان ہوتا یا زمین پر بگاڑ پھیلانے والا بنتا۔ اس لیے اللہ کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ اسے اس دنیا سے اٹھالیا جائے۔

کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کا تقاضا ہوتا ہے کہ تمہاری نوکری چھوٹ جائے، بلاشبہ یہ بھی حکمت الٰہی کے تحت ہوتا ہے مگر تم کو پتہ نہیں ہوتا کہ اس کے پس پردہ کیا حکمت پوشیدہ ہے۔ اس خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے تم کو تسلیم ورضا سے کام لینا چاہیے کیونکہ ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اس سے بہتر نوکری یا سروس مقدر کر رکھی ہو جو کہ تنخواہ اور برکت کے اعتبار سے اس نوکری سے کہیں بہتر ہو اور تمہارے حق میں خیر وبرکت کا باعث بنے۔

یہ بات تجربہ اور لوگوں کے حالات کے سروے سے منظر عام پر آئی ہے اور معروف ومشہور اور مجرب ہے۔

اگر بندہ اپنی لاعلمی اور جہالت کا اعتراف کرلے اور اللہ تعالیٰ کے علم کے سامنے سر تسلیم خم کرلے اور اس بات پر یقین کرلے کہ مشیت الٰہی کے تحت اللہ تعالیٰ کا اختیار بندے کے اختیار سے کہیں بہتر اور افضل ہے تو ایسا شخص تسلیم ورضا کے مرتبہ تک رسائی پانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

۱۰۔ دل سے غور وفکر بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

تفکر قلبی بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رضا مندی وخوشنودی تک پہنچنے کے وسائل میں سے اہم

ترین وسیلہ ہے، اگر انسان غور و فکر سے کام لے اور اس کو اس بات کا احساس ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کتنا کمزور اور ناتواں بنایا ہے؟ پھر اس کو ایمان کی دولت عطا فرما کر معزز و مکرم بنایا ہے۔ اس کے برعکس کتنی ہی ظالم و جابر قومیں قوت و توانائی کا مجسم پیکر معرض وجود میں آئیں مگر نعمت ایمان سے محرومی ان کا مقدر بنی نتیجتاً ہلاکت و بربادی سے دوچار ہو کر بھولی بسری ہوگئیں۔ اگر بندہ اس بارے میں غور و فکر کرلے تو اس پر اس نعمت خداوندی کے اسرار پنہاں منکشف ہو کر سامنے آ جائیں جس سے اللہ تعالیٰ نے اس کو نوازا ہے۔

اگر وہ اپنے فقر و افلاس کے بارے میں غور و فکر سے کام لے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مال نہیں دیا تو کیا ہوا؟ مگر فسق و فجور، معصیت و بے راہ روی کی راہ پر گامزن ہونے سے تو بچا لیا۔ کیونکہ انسان عیش و عشرت میں پڑ کر اخلاقی امراض کا شکار ہو جاتا ہے چنانچہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مال و دولت کی ان پر بارش کردی ہے جس کی پاداش میں وہ فساد اور فسق و فجور کا شکار ہو کر کہیں کے نہیں رہے۔ بندہ اگر اس زاویے سے غور و فکر کرے تو اپنے اوپر اللہ کی نعمت کی قدردانی کی معرفت سے سرشار ہو جائے اور فقر و افلاس کی حالت اس کے لیے نعمتوں والی زندگی سے کہیں بہتر محسوس ہونے لگے اور اپنی حالت پر راضی برضا ہو جائے۔ (وعلی هٰذا القياس)

تسلیم و رضا اور صبر کے مابین فرق

تسلیم و رضا کا مقام صبر و شکر کے مقام سے اعلیٰ و ارفع ہے، لہٰذا راضی برضا شخص جس حال میں ہے اسی حال پر برقرار رہتے ہوئے تسلیم و رضا کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اپنی حالت زار کے بدلے جس پر وہ راضی ہے کسی دوسری حالت کی طرف منتقل ہونے کی تمنا نہیں کرتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی قسمت میں جو مقدر فرما دیا ہے اس پر وہ رضامندی کا اظہار کر چکا ہے۔

جہاں تک صبر کرنے والے شخص کا معاملہ ہے تو اگرچہ وہ اللہ کی مقرر کردہ تقدیر پر جزع فزع تو نہیں کرتا اور نہ ہی اس کی ذات سے کوئی ایسی حرکت کا صدور ہوتا ہے جو مخالف شرع

ہو لیکن وہ اس بات کی تمنا ضرور کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس حالت سے چھٹکارا دلا کر اس سے بہتر حالت سے نواز دے ورنہ صبر کرتا ہے حتیٰ کہ اس کی دعا مقبول بارگاہ الٰہی ہو جائے۔ وہ موجودہ حالت سے اس سے بہتر اور افضل حالت کی طرف منتقل ہو جائے۔ ایک شخص کے لڑکے کا انتقال ہو گیا۔ سیّدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعزیت کے لیے تشریف لائے تو دیکھا کہ وہ شخص صبر و شکر کا پیکر بنا ہوا ہے تو اس کے قبیلہ کے لوگوں میں سے کسی شخص نے کہا کہ ''بخدا یہی تو تسلیم و رضا ہے تو عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ''یہ رضا ہے یا صبر'' [1]

رضا و صبر میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ رضا بندے کے ساتھ ہر حال میں سایہ کی طرح لگی رہتی ہے چاہے بندہ خوش حالی سے بہرہ ور ہو یا بدحالی سے دوچار ہو۔ ہر وقت اور ہر حال میں اس پر سایہ فگن رہتی ہے۔

جہاں تک صبر کا معاملہ ہے تو بندہ مصائب کے وقت یا مشقت کے موقع پر ہی اس کا سہارا پکڑتا ہے۔

اگر مؤمن کے مقدر میں ہو کہ وہ اللہ کی خاطر اپنے نفس کو تسلیم و رضا کا پابند کر سکے تو کر ڈالے اور اگر اس سے یہ کام نہیں ہو سکتا تو اس کو چاہیے کہ صبر و شکر کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دے کیونکہ اس میں بھلائی ہی بھلائی پنہاں ہے۔

اسی لیے اسلاف میں سے اولوالعزم عابد اور زاہد لوگ صبر و شکر کا پہلو اختیار کرنے سے زیادہ تسلیم و رضا کے مقام پر کمندیں ڈالنے کی کوشش کرتے تھے کیونکہ تسلیم و رضا کا مرتبہ صبر و شکر کے مرتبہ سے کہیں بلند و بالا ہے۔

ابو عبداللہ النباجی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اللہ کے بندوں میں سے کچھ اولوالعزم بندے ایسے بھی ہیں جنہیں تسلیم و رضا کی جگہ صبر و شکر کا راستہ اختیار کرتے ہوئے عار محسوس ہوتی ہے۔'' [2]

---

[1] حلیۃ الاولیاء: ۸/۲۷۷.

[2] تاریخ دمشق: ۲۱/۱۷.

تسلیم و رضا کے ثمرات وفوائد

تسلیم و رضا کے بہت سے ثمرات وفوائد ہیں۔ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ تسلیم و رضا کا پہلا فائدہ جنت میں داخلہ کے پروانہ کا حصول ہے۔

سیّدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''اے ابوسعید! جو اللہ تعالیٰ سے بحیثیت رب اور دین اسلام سے بحیثیت دین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بحیثیت نبی رضامندی کا اظہار کرے اس کے لیے جنت واجب ہوگئی۔''

سیّدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کو یہ بات بڑی پسند آئی (گویا کہ ان کی دلی مراد پوری ہو گئی) انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ اے اللہ کے رسول! اس بات کو دوبارہ ارشاد فرمائیں۔تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکیداً ان جملوں کو دوسری مرتبہ دہرایا۔'' ❶

ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ''جو شخص اس چیز سے رضامندی کا اظہار کرے جس کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے زمین کی طرف اتارا ہے۔اس کا انشاء اللہ جنت میں داخلہ یقینی ہے۔'' ❷

۲۔ تسلیم و رضا کے ثمرات میں سے اہم ترین ثمرہ گناہوں کی بخشش ہے جیسا کہ سیّدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''جب کوئی شخص مؤذن کو اذان دیتے ہوئے سنے اور یہ کہے:

اشهدان لا اله الا الله وحده لا شريك له، وان محمدا عبده ورسوله، رضيت بالله ربا، وبمحمد ﷺ رسولا، وبالاسلام دينًا] تو اس کے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔'' ❸

❶ صحيح مسلم، كتاب الامارة،باب بيان ما اعده الله: ١٨٨٤.

❷ حلية الاولياء: ٢٤٩/٩.

❸ صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب استحباب القول مثل المؤذن: ٣٨٦.

۳۔ تسلیم ورضا کے ثمرات میں سے اہم ترین ثمرہ راضی برضا رہنے والے شخص کو قیامت کے دن اللہ خوش کرے گا حتی کہ وہ بھی راضی ہوجائے۔

نبی کریم ﷺ سے مروی ہے، فرماتے ہیں: ''اگر کوئی مسلمان بندہ صبح اور شام تین مرتبہ ان کلمات کا ورد کرتا ہے: ﴿رَضِيْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّ بِالْإِسْلَامِ دِيْنًا وَّ بِمُحَمَّدٍ ﷺ نَّبِيًّا﴾ تو اللہ تعالیٰ پر اس کا حق بنتا ہے کہ قیامت کے دن وہ اس بندے کو راضی اور خوش کرے۔'' ❶

۴۔ تسلیم ورضا کے ثمرات میں سے اہم ترین ثمرہ حصول رزق میں برکت واضافہ ہے۔

سیّدنا ابو العلاء بن شخیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ بنی سلیم کے ایک فرد نے یہ حدیث بیان کی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس نے نبی کریم ﷺ کا دیدار کیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو جو کچھ عطا فرماتا ہے اس کے ذریعے وہ اسے آزماتا اور پرکھتا ہے اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اس کے حق میں مقدر کر دیا ہے وہ اس پر تسلیم ورضا کا مظاہرہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس میں برکت عطا فرماتا ہے اور اس کے رزق میں وسعت بخشتا ہے اور جو شخص اللہ کی مقدر کی ہوئی چیز پر ناراضگی اور برہمی کا اظہار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے رزق میں برکت و وسعت کا معاملہ نہیں فرماتا۔'' ❷

۵۔ تسلیم ورضا کے ثمرات میں سے اہم ترین ثمرہ رحمت وخوشگواری، مدد ونصرت کا نزول، زندگی کی راحت وسکون اور پاک وحلال روزی کا حصول ہے۔

اکثم بن صیفی رحمہ اللہ کا قول ہے: ''جو شخص اللہ کی مقرر کردہ روزی پر رضامندی کا اظہار کرتا ہے، اس کی زندگی خوش حال اور خوشگوار بن جاتی ہے اور جو شخص اپنے حال پر قانع اور صابر وشاکر ہوکر زندگی گذارتا ہے وہ زندگی کے لطف اور اس کی چاشنی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔'' ❸

---

❶ احمد: ۱۸۹۸۸ وقال الارنووط: صحیح لغیرہ.

❷ احمد: ۲۰۲۹٤ وصححه الالبانی رحمه الله. ❸ القناعة والعفاف: ۱۳۱.

اللہ کی ذات سے رضامندی دنیا کی جنت کا صدر دروازہ ہے اور عارفین وسالکین کی آرام گاہ ہے اور محبین کی زندگی کا شعار ہے اور عابدین کی لازوال نعمت ہے۔

تسلیم ورضا وہ نسخہ کیمیا ہے جو غم، حزن وملال، رنجیدگی وآزردگی، دکھ درد، شکستہ دلی و اداسی، خستہ حالی ومحتاجی سے گلوخلاصی کا ذریعہ ہے۔ یہ تسلیم ورضا ہی ہے جو اطمینان قلب اور جمع خاطر سکون دل اور راحت قلب کا وسیلہ ہے۔ اس سے دل کو چین اور قرار نصیب ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ناراضگی کا معاملہ ہے جو کہ دلی بے چینی و بے قراری اور دلی بے کلی و بے آرامی اور اس میں پریشانی کا باعث ہے۔ ایسے شخص کو سکون کیوں کر نصیب ہو سکتا ہے؟

یہ تسلیم ورضا ہی کی دین ہے کہ وہ بندے کے دل پر سکینت ووقار کے فیضان کا ذریعہ ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ اس راہ میں اس سے بڑھ کر سودمند اور کارگر نہیں، کیونکہ جب مؤمن کے قلب پر سکینت اور طمانینت کا نزول ہوتا ہے تو خود بخود اس کا دل استقامت کا پیکر بن جاتا ہے اور اس کے احوال سدھر جاتے ہیں اور اس کو سکون قلب حاصل ہو جاتا ہے اور اس کو جمع خاطر کی دولت سے سرشاری نصیب ہو جاتی ہے اور وہ امن وامان، چین وسکون، راحت وآرام سے زندگی گزار کر دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔ اسی لیے بعض لوگوں کا مقولہ ہے کہ ''جو کچھ میسر ہے اس پر رضامندی وقناعت اور مقدر پر صبر وشکر کا نام بہترین اور خوشحال زندگی ہے۔''❶

عربی شعراء میں سے کسی شاعر کا قول ہے:

''جس شخص کے دل میں اللہ تعالیٰ (جس کی صفت رحمٰن ہے) تسلیم ورضا کی دولت ڈال دے، تو ایسا شخص استغناء اور لذت آشنائی کی دولت سے سرشار ہو کر زندگی گذارتا ہے اور اس کی زندگی آرام وآسائش اور عیش وعشرت میں کٹی ہے پھر کیا ہے۔ چین وسکون سے اس کی گذر بسر ہوتی ہے۔''❷

---

❶ تفسیر البغوی : ۱۵۹.

❷ تاریخ ابن معین : ٤٠٦/٤.

٦۔ تسلیم ورضا کے ثمرات میں سے اہم ترین ثمرہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رضامندی وخوشنودی کا حصول ہے۔

بندے سے اللہ تعالیٰ کی رضامندی دراصل بندے کی رب کریم کے سامنے تسلیم ورضا کے لیے سرتسلیم خم کردینے کا نتیجہ ہے اگر بندہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے بحیثیت رب کے راضی ہے تو سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ بھی اس سے راضی اور خوش ہے۔

سیّدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ کا ارشادگرامی قدر ہے: ''اللہ تعالیٰ جب کسی قوم سے محبت کرتا ہے تو اسے آزمائش سے دوچار کرکے آزماتا ہے تو جو شخص راضی برضا رہا اس کے لیے رب کریم کی رضامندی اور خوشنودی ہے اور جس شخص نے اس پر ناراضگی وخفگی یا برہمی وغضبناکی کا معاملہ روا رکھا اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی وخفگی ہے۔''❶

سیّدنا ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''اللہ تعالیٰ جب بھی قضا وقدر کے بموجب فیصلہ کرتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ بندے کی طرف سے اس کے فیصلہ کو تسلیم ورضا کی نگاہ سے دیکھا جائے۔''❷

بندے سے اللہ کی رضامندی وخوشنودی کی نعمت دنیا و ما فیہا سے بہتر و برتر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿٧٢﴾﴾ (التوبة: ٧٢)

''اللہ تعالیٰ نے ایماندار مردوں اور عورتوں سے ایسی جنتوں کا وعدہ فرمایا ہے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں جہاں وہ ہمیشہ ہمیش رہنے والے ہیں اور ان صاف ستھرے پاکیزہ محلات کا جو ان ہیشگی والی جنتوں میں ہیں اور اللہ کی

❶ ترمذی: ٢٣٩٦ وحسنه. ❷ الرضا لابن ابی الدنیا: ٤٧.

رضامندی وخوشنودی سب سے بڑی چیز ہے۔ یہی زبردست کامیابی ہے۔''

۷۔ تسلیم ورضا کے ثمرات میں سے اہم ترین ثمرہ عبودیت کی منتہیٰ کا حصول ہے۔

کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات سے رضامندی وخوشنودی بندے کی رب کریم کی عبودیت وبندگی کا اتمام واکمال ہے کیونکہ مقام عبودیت کا اتمام اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات سے تسلیم ورضا اور محبت ومودت اور اس کے سامنے خشوع وخضوع، عاجزی وفروتنی، تذلل وخوشامد کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ عبودیت وبندگی کا یہی وہ مقام ہے جس سے بہرہ ور ہوکر انسان اللہ کی ذات اور اس کی قضا وقدر کے سامنے مسرت وشادمانی اور سرور وانبساط محسوس کرتا ہے۔ مؤمن کے لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات سے سرور وانبساط محسوس کرنے کا یہ سب سے اہم وسیلہ اور ذریعہ ہے۔

۸۔ تسلیم ورضا کے ثمرات میں سے اہم ترین ثمرہ یہ ہے کہ مقام تسلیم ورضا بندے کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کیے احکامات شرعیہ اور اس کی طرف سے مقدر کی ہوئی قضا وقدر کی طرف سے محسوس ہونے والی ناراضگی وخفگی اور تعارض وخلاف ورزی سے چھٹکارے کا ذریعہ ہے۔

اسلاف میں سے کسی نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''اے میرے بیٹے! میری وصیت کو قبول کرو اور میری بات کو گرہ بند کرلو! اگر تم نے میری وصیت کردہ بات کو یاد رکھا تو سعادت مندی کی زندگی سے بہرہ ور ہوگے، اور قابل ستائش موت نصیب ہوگی، میرے بیٹے! اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جو کچھ بندے کے لیے مقدر کردیا ہے جو اس پر راضی برضا رہا اللہ اس کو استغناء کی دولت سے مالا مال کردیتا ہے اور جو شخص دوسروں کے مال ودولت کی طرف للچائی نظروں سے دیکھتا ہے اس کو تنگ دستی ومحتاجی کی حالت میں موت آتی ہے اور جو شخص اللہ کی مقرر کردہ تقدیر پر ناراضگی وخفگی کا اظہار کرتا ہے تو گویا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اس کے مقرر کردہ فیصلہ کے بارے میں متہم قرار دیتا ہے۔''[1] (نعوذ باللہ من ذلك)

[1] حلیة الاولیاء: ۳/۱۹۵.

لہٰذا ابلیس لعین کو ذرا دیکھو! جب اس کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو اس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے جو حکم دیا تھا اس کی بجا آوری کے لیے وہ راضی نہ تھا اسی لیے تو اس نے جواب دیا تھا کہ میں کیسے اس بشر کو سجدہ کروں جس کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے؟ شیطان لعین کی عدم رضامندی نے اسے اللہ کے احکامات کی خلاف ورزی تک پہنچا دیا۔

دور حاضر کے منافقین نے تو سودخوری اور پردہ وحجاب نیز تعدد ازدواج کے بارے میں اللہ کا حکم نہ مان کر تسلیم ورضا کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرتے ہوئے عدم رضامندی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ یہ لوگ تو اپنی تحریر وتقریر میں (نعوذ باللہ) اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے کھلم کھلا جنگ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ گویا کہ یہ لوگ زبان حال سے اعتراض کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ: اے اللہ تو نے میرے اوپر یہ چیز فرض کیوں کی؟ اور فلاں حکم کو واجب قرار کیوں دیا؟ اگرچہ وہ زبان قال سے اس کی صراحت نہ کریں، لیکن ان کے کلام کا سیاق وسباق رب کریم کی فرض کردہ شریعت مطہرہ سے لڑائی جھگڑے کے محور میں چکر کاٹتا ہوا نظر آتا ہے۔

اس موقع پر تسلیم ورضا کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا انسان کو اس قسم کی مخاصمت اور لڑائی سے چھٹکارے کا ذریعہ ہے۔

۹۔ تسلیم ورضا کے ثمرات میں سے اہم ترین ثمرہ رب کریم کے عدل وانصاف کی یاد دہانی بھی ہے۔

اسی لیے نبی کریم ﷺ نے اس موقع پر جب ہم غم واندوہ کے نرغے میں پھنس جائیں، یہ دعا پڑھنے کا حکم دیا ہے:

((اللھم انی عبدك، ابن عبدك، وابن امتك، ناصیتی بیدك، ماض فی حکمك، عدل فی قضاءك.)) [1]

"اے اللہ میں تیرا غلام ہوں اور تیرے غلام بندے کا فرزند ارجمند ہوں نیز تیری

[1] احمد: ۳۷۱۲ وصححه الالبانی رحمه اللہ۔

نیازمند باندی کا لخت جگر ہوں۔ میری پیشانی تیرے قبضہ تصرف میں ہے۔ بندہ عاجز پر تیرا حکم جاری وساری ہے۔ اس ادنیٰ غلام کے بارے میں تیرا فیصلہ تیرے عدل وانصاف کا پرتو ہے۔''

جس شخص کو رب کریم کے عدل وانصاف کا شعور واحساس نہ ہو وہ شخص ظالم وجابر ہے حالانکہ اللہ کے عدل وانصاف کی جھلکی ہر چیز میں موجود ہے۔ یہاں تک کہ شرعی احکام وحدود اوراسلامی سزاؤں میں بھی اس کی عکاسی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ چور کے ہاتھ کاٹنے کی مثال کو ہی لے لیجیے اگر دیکھا جائے تو اس عبرتناک سزا میں بھی اللہ کے عدل وانصاف کی جلوہ نمائی عیاں ہے، کیونکہ اس کے ہاتھ نے جس جرم کا ارتکاب کیا ہے دراصل ازروئے انصاف اس کی یہی سزا ہے۔''

تو پتہ یہ چلا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات اپنی قضا وقدر اور اپنے فیصلہ میں عدل وانصاف کا پرتو ہے اور مقرر کردہ شرعی سزاؤں یا حدود شرعیہ میں اس کے عدل وانصاف ہی کا سکہ رائج ہے۔ اس لیے نہ تو اللہ تعالیٰ کی قضا وقدر پر اعتراض کی گنجائش ہے اور نہ ہی عقوبات شرعیہ پر گلہ شکوہ کرنے کا کوئی پہلو معرض وجود میں ہے۔

۱۰۔ تسلیم ورضا کے ثمرات میں سے اہم ترین ثمرہ رب کریم کا شکر واحسان بجالانا ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے رضامندی وخوشنودی کا اہم ترین ثمرہ اس کی احسان مندی وشکر گذاری ہے۔

لہٰذا ناراضگی وخفگی کا مظاہرہ کرنے والا شخص کسی صورت میں بھی شکر واحسان مندی کا پرتو نہیں ہوسکتا، کیونکہ اس کے دل ودماغ میں یہ بات گردش کرتی رہتی ہے کہ وہ گھاٹے اور خسارے سے دوچار ہے اور اس کی حق تلفی ہوئی ہے گویا کہ اس کا حق مارلیا گیا ہے اور کبھی کبھار تو ایسا ہوتا ہے کہ ایسا شخص اس وہم وگمان میں مبتلا ہوجاتا ہے کہ حقیقت میں وہ نعمتوں سے یکسر محروم ہے۔

یادرکھو! ناراضگی اور خفگی کا اظہار منعم حقیقی اور اس کی بیش بہا نعمتوں کی ناقدری ہے بلکہ

کفران نعمت ہے اور رضامندی وخوشنودی منعم سبحانہ وتعالیٰ کی نعمتوں کی قدردانی ہے۔

۱۱۔ تسلیم ورضا کے ثمرات میں سے اہم ترین ثمرہ مصائب وآلام کی سختی کا ازالہ ہے۔

کسی عربی شاعر کا قول ہے:

''اے مخاطب! تم کو چاہیے کہ تم تقویٰ اور رضامندی کا دامن مضبوطی سے تھام لو۔ ہوسکتا ہے تمہیں جس چیز سے خوف اور ڈر ہے رب کریم کی شان قدرت اس کے آڑے آ کر اس کے لیے اوٹ بن جائے۔

اور اگر تم نے اپنے نفس کو تسلیم ورضا کے سامنے سر تسلیم خم کر لینے کا پابند بنالیا تو سمجھ لو تم کو مصائب وآلام کی شدت وسختی کی تمازت کو ٹھنڈا کرنے کا گر مل گیا اور مصائب وآلام سے کھیلنا تمہارے لیے ایک معمولی سی بات بن گیا۔'' [1]

۱۲۔ تسلیم ورضا کے ثمرات میں سے اہم ترین ثمرہ کینہ وکدورت اور بغض وحسد سے بچاؤ ہے۔

تسلیم ورضا وہ نسخہ کیمیا ہے جو جعل سازی بغض وعداوت، کینہ وکدورت اور حسد جیسی بیماریوں سے سلامتی وحفاظت کا ذریعہ ہے، کیونکہ بندہ کے اندرون خانہ میں اگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قضاء وقدر پر قناعت اور رضامندی نہ پائی جائے تو پھر وہ فلاں فلاں پر نعمت الٰہی کے ظہور اور دوسروں کی عیش وعشرت سے مالا مال زندگی کی طرف بگڑی ہوئی نیت سے دیکھنا شروع کر دیتا ہے اور مخلوق خدا سے دائمی حسد اور بغض کی بیماری کا شکار ہو جاتا ہے اور مارے حسد کے دوسروں سے نعمت الٰہی کے چھن جانے کی تمنا کرنے لگتا ہے۔ دراصل یہ قضا وقدر سے ناراضگی اور خفگی کی دین ہے جو بندے کو اس بیماری میں مبتلا کرنے کا صدر دروازہ ہے۔

۱۳۔ تسلیم ورضا کے ثمرات میں سے اہم ترین ثمرہ حکمت الٰہی پر یقین صادق کی دولت سے سرشاری ہے۔

اس شخص کو جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے مقرر کردہ فیصلوں کی جانب سے خفگی وناراضگی کا شکار

---

[1] نشر طي التعريف : ۱۵۷.

ہے کبھی کبھار شیطان طرح طرح کے وساوس وشبہات کے گرداب میں پھانس دیتا ہے اور اس سے کہتا ہے۔ تقدیر الٰہی کی رو سے مقرر کردہ اس حکم کی کیا حکمت ہے؟ اور فلاں حکم میں کیا راز پنہاں ہے؟ فلاں حکم شرعی کے مطابق عمل کرنا ہم سے کیوں مطلوب ہے؟ ہم حکم الٰہی بموجب فلاں کام کیوں کریں؟ وغیرہ وغیرہ۔

یہاں پر تسلیم ورضا کا کردار نمایاں ہوکر سامنے آجاتا ہے۔ یہ رضامندی وقناعت کی دین ہے جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی بیش بہا حکمت اور اس کے علم محیط پر اعتماد اور بھروسا کرنے اور اپنے معاملہ کو رب کریم کے حکم اور اس کی قضا وقدر کے سامنے سپردگی پر آمادہ کرتی ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ تسلیم ورضا، اور یقین واعتماد دونوں لنگوٹیا یار ہیں اور ناراضگی وخفگی اور شک وشبہ دونوں جڑواں بھائی ہیں دونوں ایک دوسرے سے کبھی جدا نہیں ہوسکتے۔

۱۴۔ تسلیم ورضا کے ثمرات وفوائد میں سے اہم ترین ثمرہ اور فائدہ عابد وزاہد اطاعت شعار وفرماں بردار اور نیک وصالح لوگوں سے راضی برضا رہنے والے شخص کا سبقت لے جانا ہے۔

میرے عزیز بھائیو! رضامندی یا بالفاظ دیگر تسلیم ورضا کا شمار اعمال قلبیہ میں چوٹی کے عمل میں ہوتا ہے۔ یہ بڑا ہی عظیم الشان عمل ہے۔ اس عمل کو انجام دے کر بندہ کبھی کبھار اس مرتبہ تک رسائی پانے میں کامیاب ہوجاتا ہے، جس کے حصول کے لیے اعضاء وجوارح کے ذریعہ بڑی محنت ومشقت درکار ہوتی ہے۔ تسلیم ورضا سے کام لینے والا شخص عابدوں اور زاہدوں کے بلند وبالا مرتبہ پر فائز ہونے میں کامیاب ہوجاتا ہے، اگرچہ وہ عمل کے اعتبار سے ان کے سامنے کچھ بھی حیثیت نہ رکھتا ہو۔

اسی لیے امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"تسلیم ورضا اور محبت ورغبت کا راستہ تو وہ راستہ ہے جو اپنے راہ نورد کو اثنائے راہ نوردی راہ عمل پر گامزن رکھتا ہے اگرچہ وہ رہین فراش ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے باوجود اس راہ میں اس کا قافلہ ہر مرحلہ میں نمایاں اور اپنے ہم سفروں سے آگے

ہی نظر آتا ہے۔"❶

یہی وہ راز ہے جو بوجہ عام اعمال جوارح اور اس قبیل کے افعال سے اعمال قلوب کو امتیازی شان عطا کرتا ہے، بلاشبہ اس بارے میں غور وفکر بھی باعث اجر عظیم ہے اگر چہ وہ بستر مرگ پر فروکش ہو کر چین وسکون کی سانس ہی کیوں نہ لے رہا ہو، برعکس اعمال جوارح واعضاء کے جو کہ محنت ومشقت اور حد سے زیادہ جد وجہد کے جویا ہوتے ہیں۔

اس بات سے بندہ قطعی یہ نتیجہ نہ نکالے کہ مؤمن عمل کی طرف سے بے نیاز ہو کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے۔ نہ نماز پڑھے اور نہ ہی زکاۃ ادا کرے، نہ روزہ رکھے اور نہ ہی حج وعمرہ جیسے جلیل القدر اعمال کی ادائیگی کی طرف توجہ دے، پھر اسی کے ساتھ دعویٰ کر بیٹھے کہ عبادت تو دراصل عمل قلبی کا نام ہے اور اللہ کی محبت وچاہت اور اس سے رضا ورغبت کا معاملہ روا رکھنا عمل جوارح سے مستغنی کرنے کے لیے کافی ہے لہٰذا اب اعمال صالحہ کی انجام دہی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

یہ عظیم ترین گمراہی وبے راہ روی کا پیش خیمہ ہے بلکہ عین گمراہی ہے اور فتنوں کا صدر دروازہ ہے۔ اسی چور راستہ سے ابلیس لعین نے بعض لوگوں کے دلوں میں دراندازی کی ہے اور انہیں گمراہی در گمراہی کے ناپیدا کنار سمندر میں بے یار ومددگار چھوڑ دیا ہے اور اب وہ کفر کی گھٹا ٹوپ اندھیریوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے پھر رہے ہیں، جس بات کا وہ دعوی کر رہے ہیں اگر حقیقت میں وہ سچ ہوتی تو اعمال قلبیہ کا اثر اعضاء وجوارح پر نمایاں طور پر نظر آتا مگر ان کا دعویٰ برائے دعویٰ ہے حقیقت سے اس کو کوئی سروکار نہیں۔

۱۵۔ تسلیم ورضا کے ثمرات وفوائد میں سے اہم ترین ثمرہ اور فائدہ نیکیوں میں زیادتی اور اجر وثواب میں ترقی واضافہ ہے۔

اعمال قلوب میں سے نیک وصالح اعمال کی شان ہی نرالی ہے اور زیادہ سے زیادہ اجر وثواب کمانے میں اس کا نمایاں کردار ہے کیونکہ تسلیم ورضا کا تعلق اعمال قلبیہ سے ہے۔ اسی

❶ مدارج السالكين: ٢/١٧٦.

لیے اس کا اجر وثواب جاری وساری رہتا ہے۔ اس کے ثواب کی کوئی حد اور انتہا نہیں۔ اس میں کبھی انقطاع اور رکاوٹ پیش نہیں آتی۔ اعمال جوارح کا معاملہ اس کے برعکس ہے، اس لیے کہ اس کی ایک حد معین ہے۔

مثال کے طور پر اگر کوئی شخص نماز ادا کرتا ہے اور خلوص نیت کے ساتھ محض اللہ کے لیے اس فریضہ کو انجام دیتا ہے تو جب وہ نماز پڑھنا بند کرتا ہے تو نماز کی انجام دہی کا کام بند کرتے ہی اس کا ثواب بھی منقطع ہو جاتا ہے(بخلاف تسلیم ورضا کے) کہ اس کا ثواب کسی حال میں منقطع نہیں ہوتا اور نہ ہی اس میں توقف درپیش ہوتا ہے چنانچہ بندہ اگر اپنے دل و دماغ سے غور وفکر کر رہا ہو اس حال میں کہ اس کا دل تسلیم ورضا کے سایہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اس کی قضا وقدر پر راضی اور قانع ہو، اسی غور وفکر کے دوران اسے کسی قسم کے حساب وکتاب کی ضرورت پیش آ جائے تو اس کے دل میں تسلیم ورضا کی جو کیفیت موجود ہے اس کی بنیاد پر اس کا اجر وثواب جاری وساری رہتا ہے، اگرچہ اس کا ذہن کسی درپیش مسئلہ میں ہی کیوں نہ الجھا ہو کیونکہ تسلیم ورضا کی کیفیت اس کے دل میں جاگزیں ہے جس کی بنیاد پر وہ اجر وثواب سے بہرہ ور ہوتا رہے گا، چاہے عارضی طور پر کسی اور کام میں کیوں نہ مشغول ہو جائے۔

اسی طرح اللہ کی ذات سے خوف وخشیت کا معاملہ ہے۔ اس کا بھی اجر جاری وساری رہتا ہے، چاہے وقتی طور پر بعض عوارض ہی کیوں نہ پیش آ جائیں مگر اس کا اجر منقطع نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر کوئی شخص اللہ کے خوف وخشیت کی وجہ سے آہ وبکاء کی کیفیت میں مبتلا ہو اور اسی اثنا میں اسے کوئی عارضی کیفیت پیش آ جائے جو اس کی آہ وبکا کی حالت کے لیے رکاوٹ بن جائے تو اس عارضی کیفیت کے درپیش ہونے کے باوجود اللہ کے خوف وخشیت پر مرتب ہونے والا اجر وثواب جاری وساری رہے گا۔ اس میں توقف درپیش نہ ہوگا کیونکہ خوف وخشیت عمل قلبی ہے جو دل میں جاگزیں ہے۔ اس لیے اس کا اجر وثواب بھی منقطع نہیں ہوتا۔ اعمال قلوب کے معجزات میں سے یہ ایک عجیب وغریب معجزہ ہے۔ حقیقت میں اس کیفیت کو اس کے لطائف میں شمار کیا جاتا ہے۔

۱۶۔ تسلیم ورضا کے ثمرات وفوائد میں سے اہم ترین ثمرہ اور فائدہ عزت وشرف اور استغناء اور لذت آشنائی کا حصول ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ﴾ (آل عمران: ٢٦)

''کہہ دے اے اللہ! بادشاہی کے مالک! تو جسے چاہے بادشاہی دیتا ہے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لیتا ہے اور جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلیل کر دیتا ہے، تیرے ہی ہاتھ میں ہر بھلائی ہے، بے شک تو ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔''

بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تو جسے چاہے قناعت کی دولت دے کر عزت وشرف سے ہم کنار کر دے اور جسے چاہے لالچ وحرص کی بیماری میں مبتلا کر کے ذلیل وخوار کر دے۔ ❶

امام راغب اصفہانی رحمہ اللہ اس بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''جو شخص دنیاوی مال ودولت کو کفایت شعاری کے طور پر حاصل کرے اور جو کچھ دنیا اس کے حصہ میں آئی ہے اس کے بارے میں اپنی قسمت پر رضامندی اور قناعت کا اظہار کرے۔ ایسا شخص قناعت اور استغنا کی دولت سے سرشار ہو کر عزت وشرف کی زندگی سے محظوظ ہوتا ہے اور ایک اچھی وخوشگوار زندگی سے بہرہ ور ہو کر زندگی گذارتا ہے اور جب کسی شخص کی نظریں دنیاوی مال ومتاع میں سے اس کو جو کچھ دکھائی دے اس کی لالچ اور طمع کرنے لگتی ہیں اور اسے اپنا ہدف بنا لیتی ہیں تو ایسا شخص انسانی عزت وشرف کے بلند وبالا مقام سے اتر کر جانوروں اور چوپایوں جیسا بن جاتا ہے جو کہ کھاتے ہیں، جب پیٹ بھر جاتا ہے

❶ روح المعانی: ١١٤/٣.

تو اس کی جگالی کرنے لگتے ہیں اور جگالی کر کے دوبارہ اسے نگل لیتے ہیں تا کہ ہضم ہو جائے اس کے علاوہ جانوروں کو اور کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ ان کا مقصد زندگی کیا ہے اور ان کو عدم سے وجود کیوں بخشا گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔" ❶

امام ابن حجر رحمہ اللہ اس بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

"نفس کی آسودگی اور قلب کا سکون تو اللہ کی قضا و قدر پر رضامندی اور قناعت کے اظہار اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اوامر کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے سے حاصل ہوتا ہے۔" ❷

خلاصہ کلام:

تسلیم ورضا یا رضامندی وقناعت ہر قسم کی بھلائی واچھائی کی جڑ اور بنیاد ہے۔

امیر المؤمنین سیّدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سیّدنا ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا:

"امابعد! ہر قسم کی خیر اور بھلائی رضامندی وقناعت میں پوشیدہ ہے۔ اگر تم تسلیم ورضا کا مظاہرہ کرتے ہوئے رضامندی پر قانع ہو سکتے ہو تو ہو جاؤ ورنہ صبر سے کام لیتے ہوئے صبر کرو۔" ❸

رضامندی وقناعت اور امید وبیم کے درمیان فرق

تسلیم ورضامندی کا معاملہ یہ ہے کہ جس شخص کو یہ دولت نصیب ہو جاتی ہے پھر وہ اس کے ساتھ لازم وملزوم کی طرح چسپاں ہو جاتی ہے۔ جو بھی اس کو اپنی زندگی کا خاصہ بنالے تو یہ اپنے التزام کرنے والے کو کبھی بے یار ومددگار اور اکیلا نہیں چھوڑتی چاہے وہ دنیا میں ہو یا برزخ میں، قیامت کے دن ہو یا جنت میں۔ ان تمام مقامات پر وہ اس کے ساتھ رہے گی۔

---

❶ امثال الحدیث: ٤٨.

❷ فتح الباری: ٢٧٢/١١.

❸ الفتاوی الکبریٰ: ٣٩٠/٢.

کیونکہ تسلیم ورضا کے پابند لوگ دنیاوی زندگی میں تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات سے رضامندی کا اظہار کرتے ہی ہیں اس کے ساتھ اپنی قبروں میں بھی وہ تسلیم ورضا کی دولت سے سرشار ہوں گے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ وہ تو جنت میں داخلہ کے وقت بھی رب کریم سے رضامندی کا اظہار کریں گے اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل وکرم کا واسطہ دے کر ہم اس مقام عزت وشرف کے حصول کی دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں بھی اس دولت سے مشرف فرمائے۔ آمین۔

جہاں تک خوف ورجا یا بالفاظ دیگر امید وبیم کا تعلق ہے تو خوف وخشیت سے کام لینے والے اللہ کے بندے دنیاوی زندگی میں اللہ کے عذاب سے خوف کھاتے ہیں اور اس کی رحمت سے امید وآس لگاتے ہیں۔

عالم برزخ میں وہ اس بات کی امید کریں گے کہ قیامت قائم کردی جائے اور اگر وہ جنت کے حصول کے اہل ہیں تو جنت میں داخل ہوجائیں اور عیش وآرام کی زندگی سے محظوظ ہوں۔

جیسا کہ وہ اللہ کے روبرو حاضری سے خوف کھاتے ہیں اور اللہ کی ذات سے امید کرتے ہیں کہ وہ ان پر رحم وکرم کا معاملہ فرمائے اور انہیں اس موقف سے خلاصی نصیب فرمائے۔

جب جنت میں داخل ہوجائیں گے تو پھر وہاں خوف نام کی کوئی چیز ہی نہ ہوگی کیونکہ اہل جنت خوش وخرم رہیں گے نہ تو ان پر خوف اور دہشت کے آثار نظر آئیں گے اور نہ ہی وہ وہاں غم واندوہ کا شکار ہوں گے۔ اسی لیے جنتی جنت میں دنیا کی طرح امیدوں کا سہارا لینے کے لیے مجبور نہیں ہوں گے۔

یہ قلب سے تعلق رکھنے والے اعمال ثلاثہ کے مابین فرق کی توضیح تھی جو وضاحت کے ساتھ بیان ہوئی اس بارے میں بکثرت آیات کا ورود ہوا ہے جو اہل جنت کی رضامندی پر دلالت کرتی ہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان اور دنیدار لوگوں سے راضی اور خوش ہوگا اور ان سے جنہوں نے اس کے راستے میں قربانیاں پیش کیں اور انہیں قیامت کے دن رب کریم راضی کرے گا اور اپنی عطاؤں سے نوازے گا اور وہ کچھ دے گا جس کی وہ رب کریم سے امید کیا کرتے تھے اور آس لگائے رہتے تھے بلکہ ان کے وہم وگمان سے کہیں زیادہ عطا فرمائے گا

اور خوب نوازے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْۤا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۵۸﴾ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۵۹﴾﴾ (الحج: ۵۸، ۵۹)

"اور جن لوگوں نے اللہ کے راستے میں وطن چھوڑا، پھر قتل کر دیے گئے یا مر گئے یقیناً اللہ انھیں ضرور رزق دے گا اچھا رزق اور بے شک اللہ ہی یقیناً سب رزق دینے والوں سے بہتر ہے۔ یقیناً وہ انھیں ایسے مقام میں ضرور داخل کرے گا جس پر وہ خوش ہوں گے اور بے شک اللہ ضرور سب کچھ جاننے والا، بے حد بردبار ہے۔"

قیامت کے دن دل پسند آرام کی زندگی داہنے ہاتھ میں اعمال نامہ حاصل کرنے والوں کے لیے ہوگی اور انجام کار کے اعتبار سے وہ عیش و عشرت کی زندگی سے محظوظ ہوں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ﴿۱۹﴾ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ﴿۲۰﴾ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ﴿۲۱﴾﴾

(الحاقه: ۱۹، ۲۰)

"سو جسے اس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دیا گیا تو وہ کہے گا لو پکڑو، میرا اعمال نامہ پڑھو۔ یقیناً میں نے سمجھ لیا تھا کہ بے شک میں اپنے حساب سے ملنے والا ہوں۔"

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاعِمَةٌ ﴿۸﴾ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ﴿۹﴾﴾ (الغاشية: ۸، ۹)

"کئی چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے۔ اپنی کوشش پر خوش۔"

اور رب کریم کا ارشاد ہے:

﴿يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾ ارْجِعِيٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٢٨﴾﴾

(الفجر: ٢٧، ٢٨)

''اے اطمینان والی جان! اپنے رب کی طرف لوٹ آ، اس حال میں کہ تو راضی ہے، پسند کی ہوئی ہے۔''

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ﴿١٧﴾ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ﴿١٨﴾ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ﴿١٩﴾ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ﴿٢٠﴾ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ﴿٢١﴾﴾ (الليل ١٧، ٢١)

اورعنقریب اس سے وہ بڑا پرہیز گار دور رکھا جائے گا۔ جو اپنا مال (اس لیے) دیتا ہے کہ پاک ہو جائے۔ حالانکہ اس کے ہاں کسی کا کوئی احسان نہیں ہے کہ اس کا بدلہ دیا جائے۔ مگر (وہ تو صرف) اپنے اس رب کا چہرہ طلب کرنے کے لیے (دیتا ہے) جو سب سے بلند ہے۔ اور یقیناً عنقریب وہ راضی ہو جائے گا۔''

اور ایک جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ﴿٦﴾ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ﴿٧﴾﴾

(القارعة: ٦، ٧)

''تو لیکن وہ شخص جس کے پلڑے بھاری ہو گئے۔ تو وہ خوشی کی زندگی میں ہوگا۔''

خاتمہ

گذشتہ بحث میں اس بات کی تاکید ہوگئی کہ اعمال قلوب میں تسلیم ورضا کا مرتبہ بڑا ہی مہتم بالشان ہے۔ یہ وہ عمل ہے جو تقرب الٰہی کا بہترین ذریعہ ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تسلیم ورضا کی وصف بیانی کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''ہر چیز کی ایک امتیازی شان ہوتی ہیں اور دلوں کی امتیازی شان اور اس کا فرض منصبی اللہ تعالیٰ کی ذات سے رضامندی وقناعت ہے۔''❶

تسلیم ورضا کے مرتبہ تک رسائی بڑی دشوارکن ہوا کرتی ہے۔ وہاں تک بہت کم لوگ ہی پہنچ پاتے ہیں۔

سیّدنا شعیب بن حرب رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ''مخلوق میں پائی جانے والی چیزوں میں رضامندی اور خوف نادرالوجود نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔''❷

تسلیم و رضا ہدایت واستقامت کی روشن وتابناک شاہراہ ہے اور صالحین ومتقین کی گذرگاہ ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو اسلام کی دولت سے سرشاری عطا فرما کر انشراح صدر سے نوازا ہے یہ ان کا طریقہ کار اور مذہب ہے، بلکہ یہ تو رب کریم کی طرف سے عطا کردہ نور مبین ہے۔ جو شخص تقویٰ سے سرشار ہو، اس کو نور الٰہی کا سہارا مل جاتا ہے اور وہ قضا وقدر کے سامنے پورے طور پر سر تسلیم خم کر دیتا ہے چاہے وہ خیر ہو یا شر اس کا ایمان ہوتا ہے کہ اللہ کی مقدر کردہ تقدیر کے بموجب فیصلہ ہو کر رہے گا اور جو کچھ پیش آنے والا ہے وہ اللہ کا مقدر کردہ ہے، اللہ جو کچھ کرتا ہے اس کے بارے میں اللہ سے پوچھ گچھ نہیں کی جا سکتی بلکہ بندہ جو کچھ کرتا ہے اس کے بارے میں بلاشبہ پوچھ گچھ ہوگی، کون ہے جو اللہ تعالیٰ سے اس کی

---

❶ تاریخ دمشق: ۵/۳۰۸.　❷ الرضا عن الله بقضائه: ۱۰۷.

تقدیر کے بارے میں سوال و جواب کرے؟

سیّدنا اسحاق رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ایک شخص ابوعبداللہ احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی خدمت میں ان سے سوالات کے لیے حاضر ہوا اور کہنے لگا: اے ابوعبداللہ، کیا معاملہ کی بنیاد اور مسلمان کے عقیدہ کی اساس قضا وقدر پر ہے؟ چاہے وہ خیر ہو یا شر، شیریں ہو یا تلخ، اور اس بات پر کہ اللہ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے اور اللہ کی قضا و قدر پر رضا مندی کا اظہار کیا جائے؟ تو ابوعبداللہ نے جواب دیا: ''ہاں ایسا ہی ہے۔'' [1]

لٰہذا میری نصیحت ہے کہ تسلیم و رضا پر عمل پیرا ہونے کے لیے کمر بستہ ہو جاؤ۔ اگر تم نے ایسا کیا تو ہوسکتا ہے کہ تم اپنے اس عمل خیر کی وجہ سے دنیا وآخرت کی فلاح سے ہم کنار ہو جاؤ۔ عربی کے مشہور شاعر مرندی کا قول ہے:

''ہم کو چاہیے کہ ہم اپنے نفوس کو صبر جمیل کا عادی بنائیں۔ اللہ کی مقرر کردہ قضا و قدر پر رضا مندی کے اظہار کے ہمارے نفوس قدسیہ زیادہ حق دار ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ اے اللہ تو ہمیں اس عمل صالح کی انجام دہی کی توفیق عطا فرما جو تیری رضا مندی کا باعث ہو۔ (هذا واللّٰه اعلم)

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ .

[1] الابانة : ٢/٢٦٢.

اپنے فہم وادراک کا امتحان لیں!

ذیل میں اس موضوع سے متعلق سوالات کو دو مرحلوں کو مدنظر رکھتے ہوئے وضع کیا گیا ہے:

سوالوں کی ایک قسم تو وہ ہے جن کا جواب فوراً دینا ہے، اس قسم کے سوالات کو پہلے مرحلہ میں رکھا گیا ہے۔

سوالوں کی دوسری قسم وہ ہے جو بحث ونظر اور غور وفکر کی متقاضی ہے۔ اس قسم کے سوالات کو دوسرے مرحلہ میں رکھا گیا ہے۔

پہلے مرحلہ کے سوالات جن کا جواب فوراً دینا ہے:

۱۔ رضامندی کے مراتب ودرجات کا بحیثیت اس کے حکم کے تذکرہ فرمائیں؟

۲۔ بحیثیت رب کے اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ رضامندی کا کیا مطلب ہے؟

۳۔ دین اسلام کے ساتھ بحیثیت دین رضامندی کے کیا معنی ہیں؟

۴۔ محمد ﷺ سے بحیثیت نبی رضامندی کے مظاہر چند امور کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ان میں سے تین امور کا ذکر فرمائیں؟

۵۔ کیا میت پر رونا دھونا یا آہ وبکا تسلیم ورضا کے خلاف عمل ہے؟

۶۔ تسلیم ورضا کے حصول کے اسباب میں سے صرف چار اسباب کا ذکر فرمائیں؟

۷۔ صبر ورضا میں کیا فرق ہے؟

۸۔ رضامندی کے ثمرات وفوائد میں سے چار ثمرات وفوائد کا ذکر فرمائیں؟

۹۔ ان صورتوں کا ذکر کریں جو رضامندی وقناعت اور قضا وقدر کے منافی ہوا کرتی ہیں؟

۱۰۔ وہ کون سے دعا ہے جس کی تسلیم ورضا کے باب میں نبی کریم ﷺ نے سیّدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو تعلیم دی تھی؟

دوسرے مرحلہ کے سوالات جو استنباطی انداز کے ہیں:

۱۔ اللہ کی ذات کے ساتھ رضامندی اور عمومی طور پر اللہ کی خاطر تسلیم ورضا کا کیا مطلب ہے؟

۲۔ ان بعض اسباب ووسائل کا تذکرہ کریں جو حصول تسلیم ورضا کے بارے میں مدد ومعاون ہوا کرتے ہیں؟ بشرطیکہ وہ کتابچہ میں ذکر کیے گئے اسباب ووسائل کے علاوہ ہوں۔

۳۔ فقراء ومساکین کی مجالست یا ان کے ساتھ میل جول اور اٹھنا بیٹھنا کیوں کر رضامندی کے حصول کا ذریعہ ہوسکتا ہے، وضاحت فرمائیں۔

۴۔ کیا تسلیم ورضا وہبی مسئلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کو قدرتاً عطا فرمادیتا ہے یا یہ کہ یہ کسبی معاملہ ہے۔ کیا بندے کے لیے ممکن ہے کہ مجاہدۂ نفس اور عبادت وریاضت کے ذریعہ اسے حاصل کر سکے یا نہیں؟

۵۔ سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس مقولہ میں جو انہوں نے سیّدنا ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کے لیے بطور وصیت ارشاد فرمایا تھا: ((اما بعد! فان الخير كله في الرضا فان استطعت ان ترضى والا فاصبر .)) کی وضاحت اور تشریح کریں۔

۶۔ رضا اور خوف وامید کے درمیان کیا فرق ہے؟

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ .
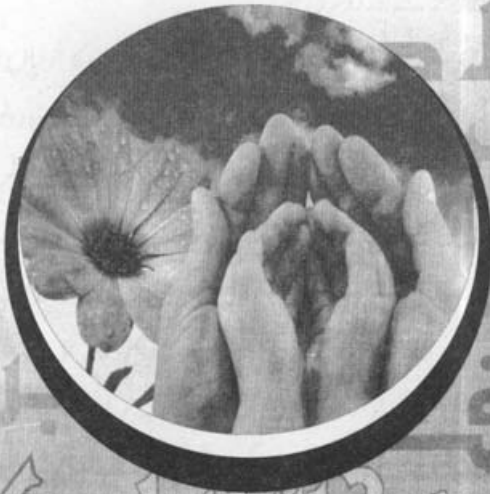
485

مقدمہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ، وَالصَّلاةُ وَالسَّلامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ ، نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ . اما بعد !

چونکہ ایمان کی دو شقیں ہیں:

ایک شق تو شکر ہے اور دوسری صبر۔

اس لیے اس شخص کے لیے ضروری ہے جو اپنی خیر خواہی کا خواہاں ہو اور جسے نجات اور کامیابی کی خواہش ہو اور جو نیک بختی اور سعادت مندی چاہتا ہو وہ ان دونوں عظیم ترین اصول وقواعد کی طرف سے سستی اور تغافل سے کام نہ لیں اور نہ ہی ان دونوں طریقوں سے روگردانی کی راہ اپنائے۔ اس کو چاہیے کہ اللہ کی خوشنودی اور اس کی رضا مندی تک رسائی کے لیے ان دونوں راستوں کے دوش پر سوار ہوکر اعتدال کا طریقہ اپنائے تاکہ اللہ تعالیٰ سے جس دن ملاقات ہو اس دن وہ بندے کو کامیابی وکامرانی سے ہم کنار ہونے والے گروہ میں شامل فرما کر اسے سرخروئی سے سرفراز ہونے کی سعادت نصیب فرمائے۔

سعادت مندوں کی سعادت مندی کی معراج شکر ہے۔ اسی میں ان کی زندگی کی فلاح کا راز مضمر ہے۔ یہی سعادت مندی کی زندگی میں خیر اور بھلائی کی باد بہاراں لے کر نمودار ہوتی ہے۔ دنیا میں پائے جانے والے سعادت مندوں نے سعادت مندی کی راہ شکر ہی کے دوش پر سوار ہوکر طے کی ہے اور صبر وشکر کے دونوں پروں کا سہارا لے کر جنت تک پہنچانے والی شاہراہ کے ذریعہ انہوں نے جنت تک رسائی حاصل کرنے کی تگ ودو کی ہے۔ یہ محض اللہ کا فضل وکرم ہے۔ اللہ جس کو چاہتا ہے اپنے فضل وکرم سے نواز دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات عظیم الشان فضل وکرم والی ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم شکر کی تعریف سے

آشنائی کی کوشش کریں؟اور ہمیں اس کے معانی ومفاہیم سے متعارف ہونا چاہیے اور ہمیں اس کے حکم کا پتہ ہونا چاہیے اور اس کے فوائد وثمرات سے باخبر ہونے کی کوشش کرنی چاہیے اور ہمیں اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ اس کی تہہ تک رسائی کے اسباب ووسائل کیا ہیں؟

اس طرح کے معانی ومفاہیم میرے اس رسالہ میں آپ کو مدون ملیں گے۔ اعمال قلوب کے سلسلہ کا یہ میرا آٹھواں کتابچہ ہے۔اللہ کی توفیق سے جنہیں آپ کے سامنے فائدہ کی غرض سے پیش کرنے کی مجھے سعادت نصیب ہوئی، اس کے ترجمہ وتیاری میں الفرقان ٹرسٹ نے تعاون کیا اور آج یہی مکتبہ والے اس کتابچہ کو چھاپ کر اس کی نشر واشاعت میں حصہ لے رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ان لوگوں کے زمرے میں شامل فرمالے جو بات سنتے ہیں اور پھر بوجہ اتم اس کی اتباع بھی کرتے ہیں اور ہمیں شکر کرنے والوں کی فہرست میں شامل کرلے اور کفر کرنے والوں میں ہماری گنتی نہ فرمائے۔(وھو المستعان وعلیہ التکلان)

محمد صالح المنجد

شکر کی تعریف کا بیان

شکر کی لغوی تعریف:

احسان شناسی اور منت کشی اور اس کے کھلم کھلا اعتراف کا نام شکر ہے۔

(شکر، یشکر، شکرا، وشکورا، وشکرانا) جیسے صیغوں میں ڈھال کر اسے استعمال کیا جاتا ہے۔

یہ فعل متعدی ہے کبھی تو لام کے صلہ کے ساتھ آتا ہے اور کبھی اس کا استعمال بغیر صلہ کے ہوتا ہے۔ لہٰذا کہا جائے گا (شکرته، وشکرت له) مگر علمائے لغت کا کہنا ہے کہ لام کے صلہ کے ساتھ متعدی کے صیغہ میں استعمال کرنا اولیٰ ہے۔ اسی کے معنی میں تشکر بھی ہے۔

کہا جاتا ہے: "رجل شکور" بڑا ہی شکر گزار بندہ اور "شکران" کا صیغہ "کفران" کی ضد ہے۔

شکر کا اطلاق حیوانات کے جسم پر غذا کی اثر کی اثر پذیری پر بھی ہوتا ہے۔ حیوانات پر غذا کے اثر کو بھی شکر سے موسوم کیا جاتا ہے اور اسی طرح جانوروں میں سے اس جانور کو "شکور" کہا جاتا ہے جو کم چارہ کھا کر موٹا اور فربہ ہو جاتا ہو۔

اور کہا جاتا ہے: "واشتکرت السماء" بارش ہونے لگی ہے اور اس کے موٹے موٹے بوندے گر رہے ہیں اور کہا جاتا ہے "واشکر الضرع واشتکر" مراد یہ ہے کہ "تھن دودھ سے لبریز ہو گیا۔" [1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ شکر کے معانی ومفاہیم زیادتی اور نماء کے مدار میں چکر کاٹتے رہتے ہیں۔

---

[1] لسان العرب: ٤/٤٢٤.

شکر کی اصطلاحی تعریف:

علی الاعلان یا خفیہ طور پر معصیت و نافرمانی سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے فرماں برداری اور اطاعت الٰہی کے کاموں میں جد وجہد صرف کرنے کا نام شکر ہے۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ منعم حقیقی کے شکر کا خیال کرتے ہوئے اپنی غلطی اور لغزش کا اعتراف یا تقصیر پر ندامت کا نام شکر ہے۔ ❶

امام فراء رحمہ اللہ شکر کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''احسان کی قدر شناسی اور اس کا زبان سے اقرار شکر کہلاتا ہے۔ ❷

اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ ''بندے پر الہ العالمین کی نعمتوں کے اثر کا ظہور اس حال میں کہ اس کا دل ایمان کی دولت سے معمور و مخمور ہو اور اس کی زبان اللہ کی حمد وثناء سے سرشار ہو۔ اس کے اعضاء و جوارح اللہ کی عبادت اور طاعت کے نشے میں چور ہوں۔ دراصل بندے کی یہی وہ کیفیت ہے جو شکر کہلاتی ہے۔''

حمد اور شکر کے مابین فرق

قابل تعریف یا لائق ستائش چیز کی اس کی صفات لازمہ اور متعدیہ کا خیال کرتے ہوئے تعریف وتوصیف کا نام حمد ہے۔

اور جہاں تک شکر کا تعلق ہے تو وہ زبان، قلب اور اعضا و جوارح سے ہوتا ہے لیکن شکر صرف صفات متعدیہ پر ہی ادا کیا جاتا ہے۔ گویا کہ شکر صفات متعدیہ کے لیے خاص ہے۔

چنانچہ حمد وثنا صرف اور صرف زبان سے ہی ادا کی جاسکتی ہے اور جہاں تک شکر کا تعلق ہے تو وہ قول و فعل اور قلب میں سے ہر ایک کی وساطت سے ادا کیا جاسکتا ہے۔

حمد وثنا یا تو صفات لازمہ کی توصیف بیانی کرتے ہوئے کی جاتی ہے، جیسے کہ حسن و جمال یا صفات متعدیہ سے متعلق ہوتی ہے، جیسے کہ فضل و احسان وغیرہ اور جہاں تک شکر کا

---

❶ تفسیر قرطبی: ۱/۴۳۸.
❷ تفسیر قرطبی: ۲/۱٦٦.

تعلق ہے تو وہ صفات متعدیہ کے ساتھ خاص ہے جیسے احسان یا بھلائی ومہربانی یا نیکی واچھے سلوک وغیرہ پر شکرگزاری کا فریضہ انجام دینا شکر کہلاتا ہے۔

کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ حمد وشکر میں سے دونوں ایک دوسرے کے قائم مقام بن جاتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں۔ ایسا جابجا وارد ہوا ہے۔ [1]

کہا جاتا ہے کہ "حمد تو شکر کی جگہ استعمال ہوسکتی ہے مگر شکر حمد کی جگہ استعمال نہیں ہوسکتا۔" [2]

شکر کے متعلقات

اب جبکہ ہمیں اس کا بخوبی علم ہو چکا ہے کہ منعم کی محبت سے قلب کے تعلق ولگاؤ اور اعضاء وجوارح کے ذریعے رب کریم کی اطاعت وفرماں برداری اور زبان سے باری تعالیٰ کے ذکر اور اس کی حمد وثنا کا اجرا شکر کہلاتا ہے، جس سے یہ بات عیاں ہوکر سامنے آجاتی ہے کہ اللہ کے شکر کی بنیاد تین چیزوں پر استوار ہے اور وہ دل، زبان اور اعضا وجوارح ہیں۔

دل کے ذریعے شکر:

دل کے ذریعے شکر کا مطلب یہ ہے کہ بندے کو اس بات کا یقین ہو کہ وہ جن آسائشوں اور نعمتوں سے محظوظ ہو رہا ہے یہ محض اللہ کا اس پر انعام واکرام ہے یہ ساری کی ساری اسی منعم حقیقی کی عطا کردہ چیزیں ہیں۔

بعض لوگوں کا وطیرہ بنا ہوا ہے کہ جس شخص نے ان کو دے دلا کر مالا مال کر دیا یا کسی عہدے اور منصب پر فائز کر کے ان کو اعزاز بخشا ہے تو وہ اس بنیاد پر حاصل شدہ نعمت کو اس کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اس ذات باری تعالیٰ کو بھول جاتے ہیں جس نے اس شخص کو مال داری اور تونگری عطا کی ہے جس کی بنیاد پر اس بندے نے اس پر احسان کیا ہے اور اس کے دماغ سے یہ بات محو ہو جاتی ہے کہ مال داری اور تونگری تو محض وسیلہ ہے، ورنہ دینے والی اور عطا کرنے والی تو اللہ ہی کی ذات بابرکات ہے۔ بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۴۳. [2] ادب الکاتب: ۳۱.

لوگ اصل مصدر و سرچشمہ کا شکر ادا کرنا بھول جاتے ہیں اور اس سے متفرع شاخوں سے وابستہ ہو کر اسی کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اسی لیے بچوں کی تربیت کے اہم اصول وقواعد میں سے اہم ترین قاعدہ یہ بھی ہے کہ انہیں یہ بات باور کرائی جائے کہ یہ نعمت جس سے وہ محظوظ ہو رہے ہیں، اس کا مصدر و سرچشمہ کیا ہے،؟ اس کا منعم حقیقی کون ہے؟ اور یہ بات ان کے ذہن نشیں کرائی جائے کہ اللہ تعالیٰ ہی روزی روٹی دینے والا ہے۔ وہی اس کا محور اور مرکز ہے۔ اس طرح بچے کی ذہنی نشو ونما رب کریم کے شکر پر استوار ہوگی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝ ﴾

(فاطر : ۳)

”اے لوگو! اللہ کی نعمت یاد کرو جو تم پر ہے، کیا اللہ کے سوا کوئی پیدا کرنے والا ہے، جو تمھیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہو؟ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، تو تم کہاں بہکائے جاتے ہو؟“

شکر کرنے والے کو جب نعمت شکر کی حقیقی معرفت اور پہچان ہو جائے تو اس کو چاہیے کہ ظاہری وباطنی نعمتوں کی نعمت شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے منعم حقیقی اور احسان وفضل کرنے والے کا شکر بجالائے۔

زبان سے شکر:

بندے کی زبان دراصل اس کے دل کی ترجمان ہے جو کچھ دل کے اندر ہے زبان سے اس کی تعبیر ادا ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر دل اللہ کے شکر واحسان سے لبریز ہے تو بندہ اللہ کی حمد وثنا میں رطب اللسان نظر آتا ہے۔ اس قاعدہ کلیہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ذرا اذکار نبویہ پر غور وفکر کرو تو اس میں اللہ کی حمد وثنا اور رب العالمین کے ذکر وشکر کا پہلو نمایاں نظر آئے گا۔

۱۔ نبی کریم ﷺ جب اپنی نیند پوری کر کے بیدار ہوتے تھے تو ان کلمات کا ورد فرماتے تھے ((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ .)) ❶ ''لائق ستائش ہے وہ ذات جسنے موت کے بعد ہم کو زندگی بخشی اور اسی کی طرف اٹھ کر جانا ہے'' اور ہم امتیوں کو آپ ﷺ نے اس دعا کے ورد کا حکم مرحمت فرمایا ہے اور ہمیں تاکید کی ہے کہ ہم اس کا ورد کیا کریں: ((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ عَافَانِیْ فِیْ جَسَدِیْ ، وَرَدَّ عَلَیَّ رُوْحِی ، واذن لي بذكره .)) ❷ ''تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے مجھے صحت وعافیت سے بہرہ ور فرمایا ہے اور میرے جسم کو قوت ونشاط دے کر چاق وچوبندی عطا فرمائی ہے اور میرے جسم میں دوبارہ روح واپس لوٹادی ہے اور مجھے اپنے ذکر واذکار کی مزید مہلت عطا فرمائی ہے۔''

۲۔ سیّدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب سونے کے لیے بستر پر فروکش ہوتے تھے تو یہ دعا پڑھتے تھے:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنا ، وَسَقَانَا ، وَكَفَانَا ، وَآوَانَا ، فَكُمْ مِمَّنْ لَا كَافِیَ لَهُ وَلَا مؤوی)) ❸

''تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے خاص ہیں جس نے ہم کو کھلا پلا کر شکم سیر کیا ہے اور ہماری حفاظت ونگہبانی کا بندوبست فرمایا ہے اور ہم کو پناہ دے کر امن وامان سے ہم کنار کیا ہے (دنیا) میں کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جن کا نہ تو کوئی محافظ یا پرسان حال ہے اور نہ ہی ان کو کوئی پناہ دینے والا ہے۔''

۳۔ سیّدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ کھانے سے فراغت کے بعد جب دسترخوان اٹھایا جاتا تو آپ ﷺ اس دعا کا ورد کیا کرتے تھے:

---

❶ صحیح بخاری ، کتاب الدعوات، باب ما یقول اذا نام : ٦٣١٢.

❷ ترمذی ، کتاب الدعوات، باب منه دعاء : ٣٤٠١ وحسنه الالبانی رحمه الله.

❸ صحیح مسلم ، کتاب الذکر والدعاء، باب الدعاء عند النوم: ٢٧١٥.

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ کَفَانَا وَ أَرْوَانا غَیْرَ مَکْفِيٍّ وَلَا مَکْفُوْرٍ ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّنَا غَیْرَ مَکْفِيٍّ وَلَا مُوَدَّعٍ وَلَا مُسْتَغْنًی رَبَّنَا .)) ❷

''تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جو ہماری حفاظت ونگہبانی کے لیے کافی ہوگیا اور جس نے ہم کو سیراب کیا (اے ہمارے رب ہم تیری حمد وستائش بجالاتے ہیں) ہم تیری نعمت کی ناشکری یا ناقدری کرنے والے نہیں ہیں اور اے ہمارے رب کریم! ہم تیری نعمت کو بے حقیقت یا بے وقعت سمجھ کر یا اس سے منہ پھیر کر یا اس سے بے نیاز ہوکر نہیں اٹھ رہے ہیں۔''

۴۔ سیّد الاستغفار کے بارے میں یہ دعا وارد ہوئی ہے:

((اَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ ، وَاَبُوْءُ لَكَ بِذَنْبِي .)) ❸

''اے اللہ! میں اپنے اوپر تیری بے پایاں نعمتوں کا اعتراف کرتا ہوں اسی کے ساتھ تیرے روبرو اپنے گناہوں کا بھی معترف بھی ہوں۔''

۵۔ تہجد کی دعاؤں میں سے یہ دعا ماثورہ وارد ہوئی ہے:

((اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ .)) ❹

''الہ العالمین! ساری کی ساری حمد وثنا اور ہر طرح کی تعریف تیرے لیے ہی ہے توہی آسمانوں، زمینوں اوران کے مابین جو کچھ موجود ہے اس کو روشن کرنے والا نور مبین ہے۔''

اور ((اَللّٰهُ اَکْبَرُ کَبِیْرًا ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ کَثِیْرًا ، وَسُبْحَانَ اللّٰهِ بُکْرَةً وَّ اَصِیْلًا .)) ...... ''اللہ سب سے بڑا اور باعظمت ہے اور بڑائی وکبریائی والا

❶ صحیح بخاری ، کتاب الأطعمة، باب ما يقول اذا فرغ من طعامه : ٥٤٥٩.

❷ صحیح بخاری ، کتاب الدعوات، باب لکل نبی دعوة مستجابة : ٦٣٠٦.

❸ صحیح بخاری ، کتاب التهجد، باب التهجد بالليل : ١١٢٠.

❹ ابو داؤد ، کتاب الصلاة، باب ما یستفتح به الصلاة من الدعاء : ٧٦٤ وصححه الحاكم۔

ہے اللہ کے لیے حد سے زیادہ تعریفیں وستائشیں ہیں اللہ ہی کے لیے صبح وشام تقدیس وتمجید ہے۔''

۶۔ سیّدنا عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرماتی ہیں کہ ایک رات میں نے رسول اللہ ﷺ کو بستر پر سے غائب پایا۔ مجھے فکر دامن گیر ہوئی، جس کی وجہ سے میں نے آپ ﷺ کو تلاش کرنا شروع کر دیا ٹٹولتے ہوئے اتفاق سے میرا ہاتھ آپ ﷺ کے تلووں پر پڑا درآنحالیکہ آپ ﷺ نماز ادا کر رہے تھے اور آپ ﷺ کے پیر زمین پر جمے ہوئے تھے اور آپ ﷺ فرما رہے تھے:

((اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوْذُبِكَ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ ، وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ ، لَا أُحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ ، أَنْتَ كَمَ أَثْنَيْتَ عَلَى نَفْسِكَ .)) [1]

''معبود کریم! میں تیری رضا مندی کا وسیلہ پکڑتے ہوئے تیرے غیظ وغضب اور تیرے عفوو درگذر کے ذریعہ تیری سزا وجزا، عقاب وعتاب، اور خود تیری ذات کے سہارے تیری پناہ میں آتا ہوں تیری تعریفوں کو میں احاطہ شمار میں نہیں لاسکتا بلاشبہ تو تو ہوبہو ویسا ہی ہے جیسی کہ تو نے خود بنفس نفیس اپنے توصیف بیانی کی ہے۔''

۷۔ اور ہر نماز کے بعد بطور ورد پڑھی جانے والی دعا سیّدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر مشفقانہ انداز میں ارشاد فرمایا: ''اے معاذ! اللہ کی قسم میں تم سے محبت کرتا ہوں، بس ہر نماز کے بعد اس دعا کا ورد کرنا نہ بھولنا:

((اَللّٰهُمَّ اَعِنِّيْ عَلٰى ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ .)) [2]

''الٰہ العالمین! تو اپنے ذکر وفکر، اپنی شکر گذاری واحسان مندی اور اپنی بہترین

---

[1] صحيح مسلم ، كتاب الصلاة ، باب ما يقال في الركوع والسجود : ٤٨٦ .

[2] ابوداؤد ، كتاب الوتر، باب في الاستغفار: ١٥٢٢ وصححه الحاكم وقال صحيح على شرط مسلم۔

عبادت وریاضت کی ادائیگی کے بارے میں میرا معاون بن کر میری مدد فرما۔"

اعضاء وجوارح کے ذریعے شکر ادا کرنا:

اعمال صالحہ اور افعال خیر کے ذریعہ اعضاء وجوارح کا شکر وجود پذیر ہوا کرتا ہے۔ جو لوگ چالیس سال کی عمر سے تجاوز کر جاتے ہیں، قرآن کریم نے ان کو مخاطب کر کے یوں وصیت کی ہے:

﴿حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ بَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْۤ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَ عَلٰى وَالِدَيَّ وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ﴾ (الاحقاف: ۱۵)

"یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری قوت کو پہنچا اور چالیس برس کو پہنچ گیا تو اس نے کہا: اے میرے رب! مجھے توفیق دے کہ میں تیری اس نعمت کا شکر کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر انعام کی ہے اور یہ کہ میں وہ نیک عمل کروں جسے تو پسند کرتا ہے۔"

آیت کریمہ میں بندے نے اللہ تعالیٰ سے اس کی نعمت کا شکر بجالانے کی توفیق کے بعد عمل صالح کی انجام دہی کی دعا کی ہے۔

اعضا وجوارح کے شکر ادا کرنے کے وسائل میں سے اہم ترین وسیلہ ہر جوڑ کی طرف سے روزانہ صدقہ وخیرات بھی ہے۔ چنانچہ اس بارے میں سیّدنا ابوذر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے نقل فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: "تم میں سے ہر شخص پر اس کے اعضاء وجوارح کے جوڑوں میں سے ہر جوڑ پر روزانہ صدقہ واجب ہوتا ہے" اور یہ بات معروف ہے کہ جسم انسانی میں (۳۶۰) جوڑ موجود ہیں ان تمام جوڑوں کی طرف سے شکر ادا کرنے کیا صورت ہوسکتی ہے؟ بندہ کیسے ان تمام جوڑوں کی طرف سے روزانہ صدقہ ادا کرسکتا ہے؟ اس اشکال کا جواب دیتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

"ہر تسبیح صدقہ ہے اور ہر تحمید صدقہ ہے اور ہر تہلیل صدقہ ہے اور ہر تکبیر صدقہ

ہے اور یہی نہیں بلکہ امر بالمعروف صدقہ ہے اور نہی عن المنکر صدقہ ہے۔'' ❶

سیّدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں:

''ہر میٹھا بول صدقہ ہے اور بندے کا اپنے بھائی کی مدد کر دینا صدقہ ہے اور کسی کو پانی کا ایک گھونٹ پلا کر سیراب کر دینا صدقہ ہے، اور راستہ سے تکلیف دہ چیز ہٹا دینا صدقہ ہے۔'' ❷

اس طرح کے صدقات کی فہرست طویل ہے جن کو حافظ ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ''شرح اربعین نوویہ'' جس کا نام ''جامع العلوم والحکم'' اس میں ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ صدقات میں ایک قسم تو صدقات بدنیہ کی ہے، جیسا کہ سیّدنا ذوالقرنین نے اپنی قوم کو سدود یا ڈیم بنانے کا فن سکھا کر کیا تھا۔ انہوں نے بند بنانے کا ہنر اپنی جاہل قوم کو سکھا کر اسے سلیقہ مند بنا دیا تاکہ وہ اپنے آپ کو اپنے دشمنوں کے شر سے محفوظ اور مامون کر سکیں اور ان کے شر سے بچاؤ حاصل کر کے اپنے آپ کو محفوظ کر سکیں۔

اسی طرح اعضاء وجوارح کے شکر میں سے سجدۂ شکر بھی ہے۔

سیّدنا ابی بکرۃ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں نقل کرتے ہیں کہ ''جب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی خوشی کا معاملہ درپیش ہوتا یا کوئی خوشخبری دی جاتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بارگاہ الٰہی میں بطور شکرانہ فوراً سجدہ ریز ہو جاتے اور سجدہ کر کے شکر کا مظاہرہ فرماتے۔'' ❸

سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس جب مسیلمہ کذاب (مرتد) کے قتل ہونے کی خبر پہنچی، عرب جس کے دام میں پھنس چکے تھے اور جس کا وجود مسلمانوں کے لیے سخت آزمائش تھا تو آپ اس خبر کو سنتے ہی سجدہ ریز ہو گئے محض شکر کا مظاہرہ کرتے ہوئے آپ نے یہ فریضہ سرانجام دیا۔ ❹

---

❶ صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب استحباب صلاۃ الضحی: ۷۲۰.

❷ الادب المفرد: ۴۲۲ وصححه الالبانی رحمه الله.

❸ ابوداؤد، کتاب الجهاد، باب فی سجود الشکر: ۲۷۷۴ وصححه الالبانی رحمه الله.

❹ عون المعبود: ۳۲۸/۷.

سیّدنا ابو موسیٰ ہمدانی رحمہ اللہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ ''یوم نہروان کو میں سیّدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا۔ اچانک سیّدنا علی رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ ذوالثدیین کو تلاش کرو۔ لوگوں نے تلاش کیا مگر اس کا پتہ نہ چل سکا۔ اس کی وجہ سے سیّدنا علی رضی اللہ عنہ پسینہ پسینہ ہو گئے اور فرمانے لگے: ''اللہ کی قسم نہ تو میں نے جھوٹ بولا ہے اور نہ ہی میں جھٹلایا گیا ہوں'' جاؤ اسے تلاش کرو۔ راوی کہتے ہیں ہم نے تلاش بسیار کے بعد آخر اسے ڈھونڈھ نکالا۔ ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے لوگوں نے اسے نالے میں مقتولین کے بیچ دبا ہوا پایا۔ یہ خبر سنتے ہی سیّدنا علی رضی اللہ عنہ سجدہ میں گر گئے اور شکرانہ ادا کیا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش گوئی کے طور پر بتلا دیا تھا کہ ذوالثدیین خوارج کے ساتھ ہوگا اور ان کی مصاحبت اختیار کرے گا۔ [1]

جب کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی توبہ قبول ہوگئی تو وہ اللہ کے شکر کی خاطر سجدہ میں گر گئے۔

اسلاف میں سے کسی برگزیدہ بندے کی ماں جمعہ کے دن نماز عصر کے بعد مشرف باسلام ہوئی تو وہ سجدہ میں گر گئے اور اتنا طویل سجدہ کیا کہ سورج غروب ہونے تک سجدہ ریز رہے۔ [2]

سجدۂ شکر ہر نعمت کے لیے مشروع قرار نہیں دیا گیا ہے بلکہ سجدۂ شکر ہر اس نعمت کے لیے مشروع قرار دیا گیا ہے جس کا وقوع تازہ اور نیا ہو۔ سیّدنا ابونصر الارغیانی فرماتے ہیں:

''سجدۂ شکر ہر اس نعمت کے وقوع پذیر ہونے پر سنت ہے جو اچانک نعمت غیر مترقبہ کے طور پر پیش آئے یا کسی بلا اور مصیبت کے ٹل جانے پر سجدۂ شکر مسنون ہے لیکن جن نعمتوں سے آپ محظوظ ہو رہے ہیں اور وہ آپ پر دائمی طور پر سایہ فگن ہیں تو ان کی طرف سے سجدۂ شکر سنت نہیں۔'' [3]

زید بن جدعان رحمہ اللہ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں:

''ہم لوگ ایک دن سیّدنا حسن بصری رحمہ اللہ کی خدمت میں موجود تھے یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ ابوخلیفہ العبدی رحمہ اللہ کے گھر میں روپوش تھے۔ اسی

---

[1] مصنف عبدالرزاق: ۵۹۶۲.
[2] حلیۃ الاولیاء: ۵/۱۶۰.
[3] الباعث علیٰ انکار البدع: ۶۱.

اثنا میں ایک شخص آیا۔ اس نے خوشخبری سنائی کہ حجاج بن یوسف کی وفات ہوگئی ہے۔ یہ بات سنتے ہی سیّدنا زید بن جدعان رحمہ اللہ سجدے میں چلے گئے۔'' ❶

تازہ اور نئی نعمتوں سے مراد ولادت ہونا یا کسی معرکہ میں فتح نصیب ہونا یہ اور ان جیسی چیزیں نعم متجددہ یعنی تازہ نعمتیں کہلاتی ہیں۔

نماز شکر کی مذکورہ تینوں قسموں پر محیط ہے اور وہ ان تینوں قسموں کو اپنے جلو میں سمیٹے ہوئے ہے۔

نماز کے اندر مذکورہ تینوں قسم کے مظاہر (جن کا تذکرہ گذشتہ سطور میں ہو چکا ہے) بدرجہ اتم موجود ہیں۔

نماز دل کے شکر کو اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہے کیونکہ وہ اخلاص وللّٰہیت اور خشوع وخضوع پر مشتمل ہے۔

نماز زبان کے شکر کا بھی پرتو ہے کیونکہ وہ قرآن کریم کی تلاوت وقراءت اور رحمٰن کریم کے ذکر سے عبارت ہے۔

نماز اعضاء وجوارح کے شکر کی بھی آئینہ دار ہے کیونکہ وہ رکوع وسجود اور تسلیم وتحریم جیسے اعمال وافعال کا مجموعہ ہے۔

لہٰذا نماز کی پابندی اور اس کی ادائیگی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا شکر بجالانے کا بہترین طریقہ اور ذریعہ ہے۔

شکر کے معانی ثلاثہ کا بیان

شکر کے معانی کے فہم وادراک کا دارومدار تین امور کی معرفت پر منحصر ہوا کرتا ہے۔ اسی کو شکر کے معانی ثلاثہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ا۔ نعمت شناسی:

نعمت شناسی کے عناصر رئیسہ کا ذہن نشین ہونا اور ان کے مابین تمیز کی جستجو اس باب

❶ فضيلة الشكر للخرائطي : ٦٦.

کی سرخی ہے اور بلاشبہ مومن کامل نعمت شناسی اور شکر گزاری کی دولت سے سرشار ہو کر منعم حقیقی کی معرفت تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ جب مؤمن کو منعم حقیقی کی معرفت نصیب ہو جاتی ہے تو اللہ کی محبت کا فیضان بندہ کے دل میں ہونا شروع ہو جاتا ہے جو خالق کائنات سے محبت کا سبب بنتا ہے اور جب محبت کے فیضان کی آمد شروع ہو جاتی ہے تو بندہ اپنے محبوب تک رسائی کی دل وجان سے تگ ودو شروع کر دیتا ہے اور اس کے شکر کی خاطر کمر بستہ ہو جاتا ہے۔ جب اس مقام پر بندہ فائز ہو جاتا ہے تو اسے عبادت وریاضت میں مزہ آنے لگتا ہے کیونکہ عبادت منعم کی شکر گزاری کی روشن اور تابناک شاہراہ ہے۔ بلاشبہ منعم حقیقی اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات بابرکات ہے۔

۲۔ بندہ منعم حقیقی کی طرف سے دی گئی نعمت کو بسر وچشم قبول کرے اور انہیں خوشی خوشی برضا ورغبت ہاتھوں ہاتھ لے:

نعمت الٰہی کی قدر شناسی اور اس کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ بندہ اس تقدیر پر تسلیم ورضا کا معاملہ روا رکھے جو رب کریم نے اس کے حق میں مقدر کر دی ہے اور اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کی قدر شناسی اس کا شیوۂ زندگی بن جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی قسمت میں جن نعمتوں کا حصول مقدر فرما دیا ہے، اس پر راضی برضا رہے اور رب کریم نے جن نعمتوں سے اس کو نوازا ہے ان کو بے وقعت اور کم مایہ نہ سمجھے بالفاظ دیگر احساس کمتری میں مبتلا ہو کر ان کی ناقدری نہ کرے۔

۳۔ منعم حقیقی کی حمد وثنا بجالائے:

اس کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ **عام** : وہ یہ کہ بندہ منعم حقیقی کی جود وکرم، نیکی واحسان، بھلائی ومہربانی، انعام وبخشش اور سخاوت وعنایت جیسے بے مثال اوصاف کریمانہ کے ذریعہ توصیف بیانی کرے۔

۲۔ **خاص**: وہ یہ ہے کہ تم اپنے اوپر باری تعالیٰ کے انعامات واکرامات کا خوش دلی کے ساتھ مظاہرہ کرو اور اللہ تعالیٰ نے تم کو جن نعمتوں سے نوازا ہے۔ ان کا کھلم کھلا مظاہرہ

کرو اور تحدیث بالنعمۃ کے طور پر اس کو بیان بھی کرو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝۱۱﴾ (الضحیٰ: ۱۱)

''اور اپنے رب کی نعمتوں کو بیان کرتے رہا کرو۔''

تحدیث بالنعمہ جس کا یہاں حکم دیا گیا ہے اس بارے میں دو قول ہیں:

پہلا قول یہ ہے کہ تم اسے اللہ کی اطاعت و فرماں برداری کے کاموں میں صرف کرو۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو جن نعمتوں سے نوازا ہے، اس کی قدر شناسی کرو اور ان کو شمار کرنے کی کوشش کرو اور بطور شکر اس کی ثنا خوانی کرتے ہوئے برملا اس کا اظہار کرو اور کہو کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو فلاں فلاں نعمت سے نوازا ہے اسی لیے بعض مفسرین نے سورۂ والضحیٰ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے تم کو جن نعمتوں سے نواز کر تم پر انعام و اکرام کیا ہے اس کا شکر ادا کرو۔'' خصوصاً اس سورۂ کریمہ میں جن نعمتوں کا تذکرہ ہے ان کی قدر شناسی کرتے ہوئے شکر گذاری کا کام انجام دو شکران نعمت کے طور پر یتیم و لاوارث کے ساتھ نرمی سے پیش آ ؤ، ان کی ڈھارس بندھاؤ۔ ذرا غور تو کرو اللہ تعالیٰ نے تم کو ٹھیک اس وقت راہ دکھلائی جب کہ تم راہ بھٹک گئے تھے اور تم کو ناداری کی حالت میں پا کر تونگری عطا فرمائی۔ اس لیے اللہ کے انعامات کا تذکرہ تشکر اور ممنونیت کے ساتھ کرو۔ اللہ کے فضل و کرم اور اس کے احسانات کے زیر بار ہوتے ہوئے نیز اس کی بیش بہا قدرت سے ڈرتے ہوئے کہ کہیں وہ تمہیں ان نعمتوں سے محروم نہ کر دے۔

سیدنا ابو رجاء عطاردی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کا ہمارے درمیان سے گذر ہوا تو دیکھتے کیا ہیں کہ آپ ریشم کی کڑھی خوبصورت شال اوڑھے ہوئے ہیں۔ اتنی خوبصورت شال میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ واقعی بڑا نفیس لباس زیب تن کیے ہوئے تھے۔ اس بارے میں پوچھنے پر آپ رضی اللہ عنہ ارشاد فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس شخص پر انعام و اکرام کیا ہو اور اسے اپنی

نعمتوں سے نوازا ہو تو باری تعالی بطور شکرانہ اپنی نعمت کا اثر اپنے اس بندے پر دیکھنا پسند فرماتا ہے۔''[1]

سیّدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر کھڑے ہوکر ارشاد فرمایا:

''جو شخص چھوٹی اور معمولی چیز پر اللہ کا شکرادا نہ کرے وہ زیادہ اور بڑی چیز پر کیوں کر ممنونیت واحسان مندی کا اظہار کرسکتا ہے اور جو شخص بندوں کا شکرادا نہ کرے تو وہ اللہ کا شکرادا نہیں کرسکتا، اور اللہ کی نعمت کا اظہار شکر ہے اور تحدیث بانعمت سے روگردانی کفران نعمت ہے اور جماعت سے وابستگی باعث رحمت ہے اور تفرقہ وانتشار عذاب ہے۔''[2]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''کھاؤ پیو، صدقہ خیرات کرو اور خوب پہنو، اوڑھو۔ بشرطیکہ تکبر اور اسراف اور فضول خرچی واتراہٹ کا مظاہرہ نہ ہو۔ اللہ تعالی بندے پر اپنی نعمت کے ظہور کا اثر دیکھنا پسند فرماتا ہے۔''[3]

امام حسن علیہ السلام کا مشہور قول ہے:

''بکثرت نعمت الٰہی کا ذکر خیر کیا کرو تحدیث نعمت کے طور پر اللہ کی نعمت کا ذکر دراصل نعمت خداوندی کی قدر شناسی ہے۔''[4]

عربی کے مشہور شاعر حبیشی رحمہ اللہ کے اشعار ہیں:

''نعمتوں کا ذکر رب کریم کے شکرانہ کے طور پر کیا کرو۔ ہر اس خیر کا تحدیث نعمت کے طور پر ذکر کرو جو اس نے عطا کی ہیں۔ ہم یہ بات اس لیے کہہ رہے ہیں کہ

---

[1] احمد: ۱۹۹٤۸ وصححه الالبانی رحمه الله۔

[2] احمد: ۱۸٤۷۲ وحسنه الالبانی رحمه الله۔

[3] احمد: ٦۷۰۸ وحسنه شعیب الارنووط۔ [4] شعب الایمان: ٤٤۲۱۔

اسے فخر ومباہات کا بہانہ نہ بنالیا جائے بلکہ ہم نے تو اللہ کا شکر ادا کرنے کی غرض سے یہ کہا ہے کیونکہ شکرانِ نعمت کی حیثیت فریضہ واجبہ کی ہے۔''❶

تحدیث نعمت ضابطہ:

تحدیث نعمت کے سلسلہ میں مخلوق خدا تین قسموں میں منقسم ہو جاتی ہے:

۱۔ نعمت الٰہی کی شکر گزاری کے ساتھ ساتھ اللہ کی حمد وثنا بجالانے کا فریضہ انجام دینے والے لوگ۔

۲۔ نعمت الٰہی کا سرے سے انکار کرنے والے اور اس کی طرف سے چشم پوشی کر کے کفران نعمت کرنے والے۔

۳۔ اور اس بات کا پروپیگنڈہ کرنے والے کہ وہ اس نعمت خداوندی کے حصول کے حق دار ہیں حالانکہ حقیقت میں دیکھا جائے تو وہ اس کے اہل نہ ہوں۔

بعض جاہلوں اور نادانوں کا خیال ہے کہ زرق برق عمدہ اور قیمتی قسم کے لباس کی خرید و فروخت اور عالی شان گاڑیوں وموٹر کاروں پر سوار ہونا اور انواع واقسام کے عمدہ اور قیمتی لذیذ ترین کھانوں کا شوق تحدیث نعمت کا مظہر ہے۔ یہ سارے کے سارے دعوے اپنی جگہ پر غلط فہمی اور کج روی کا مصداق ہیں اور سراسر غلط ہیں۔ تحدیث بنعمۃ اللہ کا اظہار تو اس چیز میں ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے جس نعمت سے تم کو نوازا ہے اور جو چیز بطور انعام واکرام تم کو عطا کی ہے اگر اللہ تعالیٰ نے تم کو وسعت وفراخی عطا کی ہے تو پہنو اوڑھو اور خرید وفروخت کا فریضہ انجام دو جس سے پتہ چلے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو وسعت اور فراخی سے بہرہ ور کیا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ نے تم کو اتنا دیا ہے جو تمہارے اور تمہارے اہل وعیال کے لیے کافی ہے اور وسعت وفراخی سے تم محروم ہو تو اللہ تعالیٰ نے تم کو جو کچھ دیا ہے اسی کے بقدر خرچ کرو اور بلاوجہ کی شیخی مت بگھارو یا دکھاوا مت کرو اور فضول خرچی کر کے اپنے آپ اوپر وسعت سے زیادہ بوجھ مت ڈالو اور تکلیف مالا یطاق کا مصداق مت بنو۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

---

❶ نشرطي التعريف : ١٥٤.

"شیخی بگھارنے والا اور بلا وجہ دکھاوا کرنے والا ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی کرایہ کا لباس زیب تن کیے ہو بالفاظ دیگر دوسروں کا لباس پہن کر تیس مار خاں بنا ہوا ہو۔"❶

سیّدنا ابوالاحوص اپنے والد بزرگ وار سے روایت کرتے ہیں کہ ان کے والد نے فرمایا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضری دی اس حال میں کہ میری بری حالت ہو رہی ہے، میری ہیئت گدائی کو دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"کیا تمہارے پاس روپیہ پیسہ ہے؟" میں نے کہا: "جی ہاں ہے" فرمایا: "کس قسم کا مال واسباب ہے؟" میں نے جواب دیا: ہر طرح کا مال موجود ہے میرے پاس (اونٹ، بکری، گھوڑے اور خشم وخدم) سب کچھ ہیں تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اگر اللہ تعالیٰ نے تم کو مال ودولت سے نوازا ہے تو وہ تمہارے اوپر اس کا اثر بھی دیکھنا چاہتا ہے۔"❷

تو پتہ یہ چلا کہ (تحدیث نعمت) اسی وقت مطلوب ہے جب اللہ تعالیٰ نے تم کو مال ودولت سے نوازا ہو۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نعمت کا کتمان کس موقع پر لازم ہے؟

تحدیث نعمت کا کام صالحین اور اتقیاء کے سامنے کرنا موزوں اور مناسب ہے، اس بنیاد پر حاسدین کے سامنے کتمان نعمت کی انجام دہی کفران نعمت شمار نہیں ہو گی۔ کیونکہ ایسا شخص کتمان نعمت بخل یا اللہ تعالیٰ کی جانب سے تقصیر یا حق تلفی کے اظہار کی خاطر نہیں کر رہا ہے بلکہ وہ تو یہ کام فتنہ کے سدباب کی وجہ سے کر رہا ہے یا بدنظر کی نظر بد اس کی دسیسہ کاریوں اور اس کے ضرر ونقصان یا اس کے حسد کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے وہ شخص اس کام کو انجام دے رہا ہے اور نقصان سے بچنا مقاصد شرعیہ کا محکم باب ہے۔

---

❶ صحیح بخاری، کتاب التفسیر: ٤٩٢١۔ صحیح مسلم: ٢١٢٩.

❷ احمد: ١٥٩٢٩ وصححه الحاکم ووافقه الذهبی۔

شکر گذاری کی کیفیت

اللہ کی نعمتوں کی شکر گذاری کے عمل کی انجام دہی پانچ چیزوں کے وجود کے بغیر ناممکن ہے:

۱۔ خشوع وخضوع کا اظہار کرنا۔

شکر کرنے والے کا اپنے محسن کے سامنے خشوع وخضوع کا مظاہرہ کرنا۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

''شکر کرنے کے بارے میں نعمت کا وجود اساس اور بنیاد ہے، جس بنیاد پر شکر کا وجود عمل میں آیا ہے۔ اسی اعتبار سے اس کا برمحل استعمال اور نعمت سے نوازنے والے کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا شکر کہلاتا ہے۔'' ❶

۲۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے محبت کا اظہار کرنا۔

مراد یہ ہے کہ شاکر اپنے محسن ومنعم سے بے لوث محبت کرے اور وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات ہے بالفاظ دیگر شاکر مشکور کی محبت سے سرشار ہو کر زندگی کے ایام گذارنا پسند کرے۔

۳۔ اللہ کی نعمتوں کا دل کی گہرائیوں سے اعتراف اور زبان سے اقرار کرے۔

۴۔ اللہ کی نعمتوں سے محظوظ ہو کر اس کی حمد وثنا بجالائے۔

۵۔ اور اللہ کی نعمتوں کا مصرف مکروہات اور منہیات کو نہ بنائے بلکہ انہیں اللہ کی رضامندی اور خوشنودی کی جگہوں میں ہی صرف کرے۔ سیدنا محمد بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ ''شکر اللہ کا تقویٰ ہے اور اس کی اطاعت وفرماں برداری کے کاموں پر عمل کرنا ہے۔'' ❷

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''شکر کی اساس اور بنیاد منعم کے سامنے عاجزی وفروتنی، تذلل وخواری اور محبت

---

❶ تفسیر البیضاوی : ١٦٤.

❷ تفسیر الطبری : ٣٥٤/١٠.

وجاہت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے انعام واکرام کا اعتراف ہے۔''

جو نعمت کی قدر نہ کرے اور سرے سے اس کی طرف سے غفلت کا شکار ہو بلکہ اسے نعمت کی قدر شناسی آتی ہی نہ ہو یا وہ اس بارے میں جاہل محض ہو۔ ایسا شخص نعمت کا شکر گذار کیوں کر گردانا جاسکتا ہے؟ بلکہ وہ تو ناشکرا ہے۔

یا جو نعمت سے متعارف ہو اور اسے اس کا خوب اچھی طرح عرفان بھی حاصل ہو لیکن تجاہل عارفانہ برتے وہ ناشکرا ہے۔

جو شخص نعمت الٰہی سے متعارف ہو اور منعم کا عرفان بھی اس کو حاصل ہو لیکن نعمت کا کھلم کھلا انکار کرے ٹھیک اس طرح جس طرح کافر منعم حقیقی کی نعمت کا انکار کرتا ہے تو ایسا شخص کفران نعمت کا مرتکب ہے۔

اور اگر کسی شخص کو نعمت الٰہی کا عرفان حاصل ہو اور منعم سے بھی متعارف ہو اور زبان سے اس کا اقرار بھی کرتا ہو اور منعم حقیقی کے سامنے عاجزی وفروتنی کا مظاہرہ نہ کرے اور نہ ہی اس پر عرفان محبت کا فیضان ہو اور نہ ہی وہ راضی برضا ہو تو ایسا شخص کفران نعمت کا مرتکب ہے۔ اس کو شکران نعمت کی توفیق کیوں کر نصیب ہو سکتی ہے۔

شکر کرنے والا تو وہ شخص ہے جس پر عرفان محبت کا فیضان ہو اور منعم حقیقی کی نعمت کا وہ قدر شناس بھی ہو نیز اس کو نعمت الٰہی کے فیضان کا اعتراف بھی ہو اور وہ اپنے منعم کے سامنے خشوع وخضوع سے پیش آنے والا ہو اور حب الٰہی سے سرشاری کی توفیق سے بہرہ ور بھی ہو۔ اسی کے ساتھ تسلیم ورضا کا پرتو ہو اور اس نعمت کو اللہ کی خوشنودی ورضامندی اور اس کی اطاعت وفرماں برداری کے کاموں میں استعمال کرنا اس کا شیوۂ زندگی ہو تو اس کو شکران نعمت کی دولت سے سرشار سمجھا جائے گا۔ بلاشبہ یہی وہ بندہ ہے جو نعمت کا قدر شناس ہے۔ [1]

---

[1] طریق الهجرتین : ١/١٦٨.

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے درجات

یہاں پر ایک اہم ترین مسئلہ کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے وہ یہ کہ اگر نعمتوں کے مابین تفاضل (مرتبہ میں تفاوت) پایا جائے؟ تو کیا شکر میں بھی تفاضل کی ضرورت درپیش ہوگی؟

ہاں شکر کے بارے میں بھی یہ امر ضروری ہے کہ اس موقع پر بندے کی طرف سے شکر بھی اسی کے مماثل اور ہم پلہ ہوگا اور ہر نعمت کے بقدر شکر ادا کیا جائے گا اور اس میں بھی تفاضل کی صورت درپیش ہوگی۔ نعمت جس نوعیت کی ہوگی اسی نوعیت کا شکر بھی معرض وجود میں آئے گا۔ اگر نعمت عظیم الشان ہے تو اسی کے مماثل اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا شکر بھی ادا کیا جائے گا۔

نعمت کا شکر سے بدلہ دینا:

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی نعمت کا بدلہ شکر کے ذریعہ ادا نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی شکران نعمت کو مقابل نعمت گردانا جاسکتا ہے، کیونکہ یہ بات تو طے ہے کہ نعمت الٰہی کا بدلہ شکر سے ادا کرنا غیر ممکن ہے، بلاشبہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو بندوں کی طرف سے ادا کیا شکرانہ نہیں پہنچتا، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَن يَنَالَ اللّٰهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا﴾ (الحج: ۳۷)

''اللہ کو ہرگز نہ ان کے گوشت پہنچیں گے اور نہ ان کے خون۔''

سیّدنا داوٗد علیہ السلام کے بارے میں یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے رب کریم سے عرض کیا:

''اے میرے رب! میں تیرا کیوں کر شکر ادا کر سکتا ہوں جبکہ میری طرف سے شکر کی ادائیگی کی حیثیت مجھ پر تیری طرف سے عطا کردہ انعام واکرام ہی تو ہے؟ یہ محض تیرا فضل وکرم ہے کہ مجھے شکر کی توفیق نصیب ہو رہی ہے ورنہ میری کیا بساط کہ میں تیری نعمت کا بذریعہ شکر حق ادا کرسکوں؟ یہ بات سن کر اللہ تعالیٰ نے جواب دیا: اے داوٗد! تو نے اب میرے شکر کا حق ادا کر دیا، یعنی جب تم نے انعام واکرام اور بخشش کا بدلہ شکر سے نہ ادا کر پانے (یا اس بارے میں اپنی

تقصیر) کا اعتراف کرلیا تو تم نے اپنے اس اعتراف تقصیر سے میرے شکر کا حق ادا کردیا۔" ❶

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"تمام تعریفیں اور ساری حمد وثناء اس ذات باری تعالیٰ کے لیے خاص ہیں: جس کی نعمتوں میں سے کسی نعمت کا ابھی کما حقہ شکر ادا بھی نہیں ہو پاتا کہ نئی نعمت کا نزول ہو جاتا ہے جس کے عطاء کرنے والے کے لیے اس پر شکر ادا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔" ❷

مراد یہ ہے کہ ہر لحہ ہم لوگ رب کریم کی عطاءت اور بخشش کے زیر بار رہتے ہیں۔ ہم اس کی بخششوں اور نوازشوں کا بدلہ بذریعہ شکر ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ اس کی کون کون سی نعمتوں کا ہم شکر ادا کریں؟ ابھی ایک نعمت کا شکر ادا نہیں کر پاتے کہ نئی نعمت کا نزول ہو جاتا ہے۔

تمام تعریفیں اس خداوند کریم کے لیے ہیں جس نے اپنی نعمتوں پر ہم بندوں سے صلہ یا بدلہ نہیں مانگا اور نہ ہی اس کے مقابلہ کی ادائیگی کا ہمیں مکلّف قرار دیا ہے اور اس سلسلہ میں ہم لوگوں کو معافی دے کر آزادی عطا فرمادی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ صادر فرما کر ہماری کمزوری وناتوانی پر اپنے رحم وکرم کا مظاہرہ کیا ہے، یہی نہیں بلکہ حد سے زیادہ انواع واقسام کی بھرپور نعمتوں سے اس نے ہم کو ڈھانپ رکھا ہے۔ اسی پر بس نہیں ہے بلکہ اس کے انعام واکرام کی برکھا ہر دم برس رہی ہے۔ اس کے مقابل اس نے ہمارے ٹوٹے پھوٹے معمولی شکر کو بھی قبولیت کا مقام عطا فرما کر ہم بندوں کی ڈھارس بندھوائی ہے۔ امام سلیمان التمیمی رحمہ اللہ کا قول ہے:

"اللہ تعالیٰ نے بندوں کو حسب ضرورت نعمتوں سے نواز ہے مگران کو حسب استطاعت شکر کا مکلّف قرار دیا ہے۔" ❸

---

❶ تفسیر ابن کثیر: ۷۱۱/۲۔ ❷ تفسیر ابن کثیر: ۷۱۱/۲۔

❸ الشکر لابن ابی الدنیا: ۸۔

شکر کا شرعی حکم

مسلمانوں پر شکر مؤکد ترین واجب کی حیثیت رکھتا ہے۔ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ شکر کی معرفت حاصل کرے،اور اس بارے میں غوروفکر سے کام لے اور اس کے معانی ومفاہیم کا اپنی ذاتی زندگی پر اجرا کرے۔

شکر کے وجوب پر دلالت کرنے والی مختلف النوع شرعی دلیلوں کی بہتات ہے۔ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔ اللہ کی اطاعت وفرماں برداری کے ساتھ ساتھ شکر کا ذکر وارد ہوا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿١٥٢﴾﴾ (البقرہ: ۱۵۲)

''سوتم مجھے یاد کرو، میں تمھیں یاد کروں گا اور میرا شکر کرو اور میری ناشکری مت کرو۔''

آیت کریمہ میں اللہ نے اپنی اطاعت وفرماں برداری کے کاموں کے ساتھ صراحت کے ساتھ مباشرہ شکر کا ذکر کیا ہے اور امر کا صیغہ استعمال کیا ہے جو وجوب کا متقاضی ہے۔اس بنیاد پر بندے پر شکران نعمت واجب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ ﴿١٤﴾﴾ (لقمان: ۱۴)

''اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے بارے میں تاکید کی ہے، اس کی ماں نے کمزوری پر کمزوری کی حالت میں اسے اٹھائے رکھا اور اس کا دودھ چھڑانا دو سال میں ہے کہ میرا شکر کر اور اپنے ماں باپ کا۔''

رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سا مال ودولت ہم پس انداز کیا کریں اور اسے اپنے پاس رکھ چھوڑا کریں؟ آپ ﷺ نے جواب دیا:''تم میں ہر شخص کو شکر کرنے والا دل

ذکر کرنے والی زبان اور ایسی بیوی جو آخرت کا زادِ راہ اختیار کرنے میں مدد ومعاون ہو، جیسی انمول دولت اختیار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔''❶

ناشکری کی مذمت اور قباحت:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لِيَأْكُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ وَمَا عَمِلَتْهُ أَيْدِيهِمْ ۖ أَفَلَا يَشْكُرُونَ ﴿٣٥﴾﴾

(یس : ۳۶)

''تاکہ وہ اس کے پھل سے کھائیں، حالانکہ اسے ان کے ہاتھوں نے نہیں بنایا، تو کیا وہ شکر نہیں کرتے۔''

امام بیضاوی رحمہ اللہ اس آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

''شکر کا حکم اس بات کی غمازی کررہا ہے کہ اس کا ترک کرنا قابل مذمت ہے۔''❷

انبیاء علیہم السلام کو شکر کی ادائیگی کا حکم دیا گیا ہے:

شکر ان عبادتوں اور ریاضتوں میں سے نہیں جس کی ادائیگی کا صرف اس امت محمدیہ کو حکم دیا گیا ہے بلکہ شکر تو وہ عظیم الشان عبادت ہے جس کا حکم دے کر سابقہ امتوں کو بھی اس کا مکلّف قرار دیا گیا تھا۔ چنانچہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن کریم میں اس بات کی توثیق کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ اس نے سابقہ انبیاء علیہم السلام کو شکر کی بجاآوری کا حکم دیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَالَ يَا مُوسَىٰ إِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسَالَاتِي وَبِكَلَامِي فَخُذْ مَا آتَيْتُكَ وَكُن مِّنَ الشَّاكِرِينَ ﴿١٤٣﴾﴾ (الاعراف : ١٤٤)

''فرمایا اے موسیٰ! بے شک میں نے تجھے اپنے پیغامات اور اپنے کلام کے ساتھ لوگوں پر چن لیا ہے، پس لے لے جو کچھ میں نے تجھے دیا ہے اور شکر کرنے

---

❶ رواہ ابن ماجة، کتاب النکاح، باب افضل النساء: ١٨٥٦ وصححه الالبانی رحمه الله.

❷ تفسیر بیضاوی: ٤٣٣.

والوں میں سے ہو جا۔"

عبادت کو شکر کے ساتھ ضم کر کے ان دونوں کے درمیان تعلق کو بیان کیا گیا ہے۔

چونکہ عبادت کا دارومدار شکر پر ہے، اسی لیے جو شخص شکر گذار ہے وہی عابد وزاہد شمار ہوتا ہے اور جو شخص ناشکرا ہو وہ کیوں کر عبادت گذار گردانا جا سکتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ كُلُوا۟ مِن طَيِّبَٰتِ مَا رَزَقْنَٰكُمْ وَٱشْكُرُوا۟ لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿١٧٢﴾﴾ (البقرۃ: ۱۷۲)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمھیں عطا فرمائی ہیں اور اللہ کا شکر کرو، اگر تم صرف اس کی عبادت کرتے ہو۔"

شکر کے احکام میں سے یہ بھی ہے کہ "شکر بندوں کی تخلیق اور اس کائنات کے انتظام وانصرام کی غرض وغایت ہے۔"

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس بات سے آگاہ کیا ہے کہ مخلوق کا عدم سے وجود بخشنے اور اس پر حکمرانی چلانے کی اور اس کائنات کے انتظام وانصرام کی غرض وغایت شکر ہے جہاں تک بندے کی تخلیق کی غرض وغایت کا معاملہ ہے تو وہ اس آیت کریمہ سے واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَٱللَّهُ أَخْرَجَكُم مِّنۢ بُطُونِ أُمَّهَٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْـًٔا وَجَعَلَ لَكُمُ ٱلسَّمْعَ وَٱلْأَبْصَٰرَ وَٱلْأَفْـِٔدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٧٨﴾﴾

(النحل: ۷۸)

"اور اللہ نے تمھیں تمھاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے اور اس نے تمھارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنا دیے، تاکہ تم شکر کرو۔"

یہ آیت کریمہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو رحم مادر سے نکال کر حیات دنیوی سے مالا مال کیا اور ان کو قوت سماعت وبصارت اور دل ودماغ کی نعمت سے اس لیے

سرشار کیا ہے تا کہ وہ اللہ کا شکر ادا کریں۔

جہاں تک انتظام وانصرام کو شکر کی غرض وغایت قرار دینے کا مسئلہ ہے وہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے عیاں ہے:

﴿وَ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝﴾ (آل عمران : ۱۲۳)

''اور بلاشبہ یقیناً اللہ نے بدر میں تمھاری مدد کی، جب کہ تم نہایت کمزور تھے، پس اللہ سے ڈرو، تا کہ تم شکر کرو۔''

یہ آیت کریمہ اس بات کی دلیل ہے کہ

اس آیت کریمہ میں اس بات کی وضاحت کردی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں تقویٰ اور خوف الٰہی سے سرشاری کا حکم مرحمت فرمایا ہے تا کہ وہ اس کے شکر گذار بندے بن سکیں۔

اس بنیاد پر کہا گیا ہے کہ ''شکر مخلوق خدا کی تخلیق کی غرض وغایت ہے اور اللہ کے حکم کا منشا بھی یہی ہے یعنی بندے کو پیدا ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ اللہ کا شکر ادا کرے اور اسے حکم خداوندی کا پابند اسی لیے بنایا گیا ہے تا کہ شکر گذار بندہ بن سکے۔''

ناشکری وکفر کا بیان ذم کے سیاق میں وارد ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ناشکری اور کفر کی متعدد اور جابجا مقامات پر مذمت فرمائی ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَ بِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ ۝﴾

(العنكبوت : ٦٧)

''تو کیا وہ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں؟''

اللہ تعالیٰ کی مذمت کا تقاضا ہے کہ اس عمل کی مخالفت میں اس کے مخالف کام انجام دیا جائے اور کفر کا مخالف کام شکر ہے یہاں پر یہ بات واضح ہو کر سامنے آگئی کہ شکر گذاری وجوب کا درجہ رکھتی ہے۔

لوگوں کو شاکر و کافر دو گروہوں میں تقسیم کرنے کا بیان

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ ان میں سے ایک قسم تو شاکرین کی ہے اور دوسری قسم کافرین کی ہے۔ اس کے علاوہ تیسری قسم کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّا هَدَيْنَٰهُ ٱلسَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ۝ ﴾ (الانسان : ٣)

''بلاشبہ ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، خواہ وہ شکر کرنے والا بنے اور خواہ ناشکرا۔''

نبی کریم ﷺ کی وفات کے وقت اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی خبر کے بموجب لوگ دو قسموں میں بٹ گئے تھے۔ ان میں ایک گروہ وہ تھا جو کفر کا ارتکاب کر کے الٹے پاؤں پھر گیا تھا اور دوسرا گروہ مؤمنین کا تھا جو صبر و شکر کا مجسم پیکر بنے ہوئے اللہ کی قضا و قدر پر راضی برضا نظر آ رہے تھے اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے کافرین کی مذمت کی ہے اور شاکرین کی مدح سرائی بیان فرمائی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ ٱلرُّسُلُ ۚ أَفَإِي۟ن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ ٱنقَلَبْتُمْ عَلَىٰٓ أَعْقَٰبِكُمْ ۚ وَمَن يَنقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَن يَضُرَّ ٱللَّهَ شَيْـًٔا ۗ وَسَيَجْزِى ٱللَّهُ ٱلشَّٰكِرِينَ ۝ ﴾ (آل عمران : ١٤٤)

''اور نہیں ہے محمد مگر ایک رسول، بے شک اس سے پہلے کئی رسول گزر چکے تو کیا اگر وہ فوت ہو جائے یا قتل کر دیا جائے تو تم اپنی ایڑیوں پر پھر جاؤ گے اور جو اپنی ایڑیوں پر پھر جائے تو وہ اللہ کو ہرگز کچھ بھی نقصان نہیں پہنچائے گا اور اللہ شکر کرنے والوں کو جلد جزا دے گا۔''

اس تقسیم سے یہ بات واضح ہوگئی کہ بندے پر شکر واجب ہے اور کفران نعمت یا ناشکری حرام ہے جس سے صراحتاً منع کیا گیا ہے بلکہ کفران نعمت ہی اللہ کے نزدیک مبغوض ترین چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ ناشکری کو بندوں کے لیے پسند نہیں کرتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِن تَكْفُرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنكُمْ ۖ وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۖ وَإِن تَشْكُرُوا يَرْضَهُ لَكُمْ ۗ﴾ (الزمر : ٧)

''اگر تم ناشکری کرو تو یقیناً اللہ تعالیٰ تم سے بہت بے پروا ہے اور وہ اپنے بندوں کے لیے ناشکری پسند نہیں کرتا اور اگر تم شکر کرو تو وہ اسے تمھارے لیے پسند کرے گا۔''

ان امور کی نشاندہی
جو شکر تک پہنچانے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں

قرآن کریم اور سنت رسول نے ہمارے لیے ان بعض طریقوں کی نشاندہی کی ہے اور ان کے بارے میں وضاحت کر کے بتلا دیا ہے اگر ہم نے قرآن وسنت کے بتلائے ہوئے راستہ کو اختیار کیا تو ہم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی شکر گذاری اور اس کے انعامات واکرامات کی قدر شناسی کے حق دار بن جائیں گے۔ بایں طور ہم منزل مقصود تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ان میں سے چند امور کا تذکرہ مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ انسان اپنے سے کم درجہ کے شخص کی طرف دیکھے:

سیّدنا ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''اپنے سے کم تر درجہ کے انسان کی طرف دیکھو اور جو تم سے بلند مرتبہ ہو اس کی طرف للچائی نگاہ سے مت دیکھو۔ اگر تم نے ایسا کر لیا تو تم اپنے اوپر اللہ کی نعمت کی عظمت شان کی حقارت اور بے بضاعتی سے بچ جاؤ گے۔'' [1]

سیّدنا حسن رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ''جب سیّدنا آدم علیہ السلام پر ان کی ذریت کو پیش کیا گیا تو انہوں نے اپنی ذریت کے مابین تفاوت کا مشاہدہ کیا۔ دیکھا کہ ان میں بعض لوگ بعض سے قدر و منزلت میں متفاوت ہیں تو سیّدنا آدم علیہ السلام نے رب کریم سے درخواست کی کہ

[1] ترمذی، کتاب صفة القيامة، باب انظروا الى من هو أسفل منكم: ٢٥١٣ وصححه.

''اے میرے رب! کیا ہی موزوں ہوتا جو آپ ان سب کو برابر درجہ کا بنا دیتے'' ان میں تفاوت ملحوظ نہ رکھتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے سیّدنا آدم علیہ السلام کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا: ''اے آدم! میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ میرا شکر کیا جائے'' جب اہل فضل اپنے اوپر انعام واکرام اور فضل وکرم کا مشاہدہ کرے گا تو وہ میری حمد وثنا بیان کر کے میری شکر گذاری کا فریضہ سرانجام دے گا۔'' [1]

امام ابن قیم رحمہ اللہ اس بات کی توضیح کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: ''اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ اس کا شکر بجالایا جائے اور رب کریم چاہتا ہے کہ عقلاً اور شرعاً اور فطرتاً اس کی شکر گذاری کا فریضہ سرانجام دیا جائے۔ اس بنیاد پر اس کے شکر کا وجوب ہر طرح کے واجبات سے بڑھ کر مؤکد ترین واجب ہے اور بندوں پر اس کی حمد وثنا، اس کی توحید و انفرادیت، اس کی محبت وچاہت، اس کی نعمتوں ونوازشوں کا تذکرہ، اس کے فضل واحسان کا اعتراف، اس کی تعظیم وجلالت شان کی جوہر شناسی اور اس کی عظمت وکبریائی کی قدردانی، اس کے سامنے خشوع وخضوع اس کی نعمت کا شکر اور اس کا اقرار واجب کیوں نہ ہو؟ اس کی ذات تو بندے سے تمام قسم کے واجبات کی ادائیگی کی خواہاں ہے۔'' [2]

تو پتہ یہ چلا کہ بندے کی طرف سے شکر گذاری کے فریضہ کی انجام دہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب اور مرغوب ترین چیز ہے اور اللہ کے نزدیک اس کا بڑا اجر وثواب ہے۔ اسی کی خاطر اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا ہے اور اپنی کتابوں کو نازل کیا ہے اور شریعت مطہرہ کے اصول واحکامات کو بنایا اور لاگو کیا ہے۔ اس کا لازمی تقاضا تھا کہ اس کے لیے اسباب ووسائل مہیا کیے جائیں جس کو اختیار کر کے مکمل طریقہ پر شکر ادا کیا جاسکے۔ اس بارے میں منجملہ وسائل واسباب میں سے چند وسائل یہ ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ظاہری وباطنی عادات واطوار میں فرق رکھا ہے۔ ان میں موروثی وخلقی عادات واطوار، مذہب وعقیدہ، مالداری وتونگری، معیشت وروزی اور حیات وممات کے اعتبار سے تفاوت رکھا ہے۔ اسی لیے

[1] مصنف ابن ابی شیبۃ: ۳۵۲۲۷۔ [2] شفاء العلیل: ۲۲۱۔

اگر صحت مند اور چاق وچوبند شخص مصیبت زدہ اور آفت کے مارے انسان کو دیکھتا ہے یا مالدار وتونگر شخص فقیر ومحتاج کا مشاہدہ کرتا ہے اور مؤمن کافر کا نظارہ کرتا ہے تو اس کی نگاہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت کی صناعی کی عظمت بڑھ جاتی ہے۔ اس بنیاد پر اللہ کے شکر کی قدردانی اس کی عظمت شان کے اسرار پنہاں اس پر کھل کر سامنے آجاتے ہیں اور اس کے اوپر اللہ کی نعمت کی جوہر شناسی کی معرفت کا فیضان شروع ہوجاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جس نعمت سے اس کو نواز کر اس پر اپنا فضل وکرم کیا ہے۔ اس کو اس کی قدردانی نصیب ہوجاتی ہے۔ پھر ہوتا یہ ہے کہ اس کی شکرگذاری واحسان مندی۔ اس کے خشوع وخضوع، اور نعمت الٰہی کی قدرشناسی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

انسان کو شکرگذاری اور احسان مندی کا اس وقت دامن تھامے رہنے کی ضرورت درپیش ہوتی ہے جب وہ اپنے سے بلند مرتبہ یا بلند قامت شخص کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا شروع کردیتا ہے۔ اس وقت منعم حقیقی کا شکر ادا کرتے ہوئے اس کو اس بات کا اعتراف اور یقین ہونا چاہیے بلکہ اس بات پر اس کا ایمان راسخ ہونا چاہیے۔ دراصل یہ اللہ کی بنائی ہوئی قسمت اور تقدیر کا معاملہ ہے ہمیں اس میں چوں چرا کا کوئی حق نہیں پہنچتا اور نہ ہی شکرگذاری سے اعراض اس کا حل ہے بلکہ اس وقت بھی شکر کی ادائیگی پر قائم رہنے ہی میں بھلائی ہے کیونکہ بعض لوگ جب اس شخص کو دیکھتے ہیں جو ان سے خوش حال اور بہتر ہو تو وہ ناامیدی اور مایوسی کا شکار ہوکر رب کریم کا شکر ادا کرنا بند کردیتے ہیں اور شکرگذاری واحسان مندی کے فریضہ کی انجام دہی سے اعراض کرنا شروع کردیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَٰٓئِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَآ ءَاتَىٰكُمْ﴾ (الانعام: ۱۶۵)

’’اور وہی ہے جس نے تمھیں زمین کے جانشین بنایا اور تمھارے بعض کو بعض پر درجوں میں بلند کردیا، تاکہ وہ ان چیزوں میں تمھاری آزمائش کرے جو اس نے

تمھیں دی ہیں۔''

۲۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی نعمت کی قدر شناسی کرے:

اللہ تعالیٰ کی بندوں پر حد سے زیادہ نعمتیں اور بخششیں ہیں اس لیے اس کی عطایات اور بخشش کو گنا اور شمار نہیں کیا جا سکتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوهَا﴾ (النحل: ١٨)

''اور اگر تم اللہ کی نعمت شمار کرو تو اسے شمار نہ کر پاؤ گے۔''

مؤمن جب اللہ کی نعمتوں کو غور و فکر کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو اس کے اندر اللہ تعالیٰ کے شکر و احسان مندی کا جذبہ کروٹیں لینے لگتا ہے۔ بلاشبہ اللہ کی نعمتوں کی یاددہانی بندے کو شکران نعمت کے لیے آمادہ کرنے اور اس کی طرف راغب کرنے یا اس فریضہ کی انجام دہی کے لیے ابھارنے کا ذریعہ ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''نعمت الٰہی کی یاددہانی یا اس کی طرف توجہ اور میلان نعمت کی قدردانی اور اس کا شکر ادا کرنے کا باعث اور سبب ہے۔'' [1]

جیسے کہ نعمت سے تجاہل یا اس سے روگردانی نعمت کی ناشکری اور اس کی ناقدری کا سبب اور وسیلہ ہے۔ امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اللہ کی ظاہری و باطنی یا اس کی خاص و عام نعمتوں سے تجاہل و اعراض یا ان سے ناواقفیت و تجاہل عارفانہ ہی شکر و احسان مندی کے راستے کی رکاوٹ ہے۔ یہی وہ بنیادی رکاوٹ ہے جو شکر تک پہنچنے کے راستہ کو مسدود کر کے رکھ دیتی ہے۔'' [2]

اللہ کی نعمتوں میں سے سب سے پہلی نعمت جس سے اس نے اپنی مخلوق کو نوازا ہے وہ اس کی ایجاد کی نعمت ہے اس نے ہم کو کالعدم اور لاوارث نہیں بنایا بلکہ ہماری تخلیق فرما کر ہمیں عدم سے وجود بخشا۔ یہ محض ان کا احسان ہے۔

اس کے بعد اس نے ہمیں بنی آدم کا ایک فرد بنا کر انسانیت کا لبادہ زیب تن کروایا ہے۔

[1] فتح القدير : ٣١٧/٢.
[2] احياء علوم الدين : ١٢٦/٤.

یہ محض اس کا شکر واحسان ہے کہ اس نے ہم کو جمادات اور حیوانات کی قبیل سے نہیں بنایا۔ بلکہ بنی آدم اور انسان کی شکل عطا فرما کر ہمارا اعزاز واکرام فرمایا ہے یہ بھی اس کی نعمت ہے۔ اس کے بعد نعمت اسلام وایمان کی دولت عطا فرما کر ہم پر اپنا انعام واکرام کیا ہے۔ یہ اس کا فضل وکرم ہے کہ اس نے ہم کو یہودی یا نصرانی یا برہمن ومجوسی نہیں بنایا۔ چنانچہ یہ بھی اس کا ہم پر احسان، فضل اور انعام ہے۔

پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے محض اپنی عنایت سے ہم کو راہ مستقیم کی ہدایت کی نعمت سے مشرف فرما کر ہم پر احسان کیا ہے اور ہمیں فاسقوں اور گمراہوں میں نہیں بنایا۔ یہ بھی اللہ کا ہم پر انعام واکرام ہے۔

پھر اہل سنت والجماعت سے ساتھ منسلک ہونے کی توفیق عطا فرما کر اس نے ہم کو اپنے خاص انعام واکرام سے نوازا ہے۔ اس کا شکر ہے کہ اس نے ہم کو بدعتیوں اور گمراہوں کے ٹولہ سے نجات عطا فرمائی ہے۔

میرے عزیز بھائی! جب تم کو اس بات کی معرفت نصیب ہوگئی کہ تم اللہ تعالیٰ کی مذکورہ تمام نعمتوں سے مالا مال ہو اور دن ورات اس کی نعمتوں میں ڈوبے ہوئے ہو تو تم پر اللہ کا یہ حق بنتا ہے کہ تم اس کی شکر گذاری اور قدر شناسی کا فریضہ سرانجام دو۔ اور اس کے ذاکر وشاکر بندے بن جاؤ اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والے ہو جاؤ اور اس کے حضور انابت کرتے ہوئے جبین نیاز ٹیک دو اور تمام قسم کی طاعات وفرماں برداری کے کاموں میں حصہ لیتے ہوئے اس کے مطیع وفرماں بردار بن کر کارگاہ حیات میں گذر بسر کرو۔

دعوت وارشاد کے اسٹیج سے عوام الناس کو اللہ کی نعمتوں کی یاد دہانی کرانا بڑی اہمیت کی حامل بات ہے اور اس کا اس راہ میں بنیادی اور نمایاں کردار ہے۔ ذرا سورج ہی کی مثال لے لو اور اس کی خلقت پر غور وفکر کرو اور دیکھو تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے مدار میں کس حکمت کے ساتھ محصور کرکے وجود بخشا ہے اور اس کے طلوع وغروب کا ایک ٹائم ٹیبل متعین کر دیا ہے۔ اسی کے بموجب وہ طلوع وغروب ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنے مدار سے ہٹ کر اوپر کی راہ لے لے

تو پوری کائنات برف کی طرح جم جائے اور اگر نیچے کا رخ کر لے تو مارے تپش کے یہ کائنات جل کر بھسم ہو جائے۔

ذرا چاند کی طرف نظر اٹھا کر دیکھو اور غور وفکر کرو کہ یہی وہ چاند ہے جس سے پوری کائنات روشن ہے۔ اگر چاند زمین کے قریب آ جائے تو سمندروں میں مدوجزر یا سونامی جیسا بھونچال آ جائے اور دنیا غرق ہو جائے اور اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹ کر دور چلا جائے تو زمین میں سوکھا پڑ جائے اور لوگ قحط سالی سے دوچار ہو جائیں۔

ذرا غور وفکر سے کام لو تو پتہ چلے گا ''اگر فضا میں اوزون کی لہر یا خلا نہ پایا جائے تو ہم کیسے نقصان دہ شعاعوں سے محفوظ و مامون رہ سکتے ہیں اور کیسے اس نقصان دہی سے بچاؤ کا سامان مہیا کر سکتے ہیں؟''

اے بنی نوع انسان! تم پر اللہ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ بھی ہے کہ اس نے آدم زادوں کو بالخصوص اپنے ہاتھ سے بنایا اور عدم سے وجود بخشا ہے۔ تمام مخلوقات میں بنی آدم کو اللہ تعالیٰ نے اس خصوصیت سے نوازا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا ہے کہ

﴿قَالَ يَٰٓإِبۡلِيسُ مَا مَنَعَكَ أَن تَسۡجُدَ لِمَا خَلَقۡتُ بِيَدَيَّۖ﴾

''فرمایا: اے ابلیس! تجھے کس چیز نے روکا کہ تو اس کے لیے سجدہ کرے جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا؟''

ذرا آیات کونیہ پر غور وفکر سے کام لو۔ عالم موجودات یا اس جہان ہستی میں جن نعمتوں کا رب کریم نے تم پر فیضان فرمایا ہے اس کے بارے میں غور وفکر سے کام لو۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿أَلَمۡ تَرَوۡاْ أَنَّ ٱللَّهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِي ٱلۡأَرۡضِ وَأَسۡبَغَ عَلَيۡكُمۡ نِعَمَهُۥ ظَٰهِرَةٗ وَبَاطِنَةٗۗ﴾ (لقمان : ۲۰)

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ نے جو کچھ آسمانوں میں اور جو زمین میں ہے تمھاری خاطر مسخر کر دیا اور تم پر اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں پوری کر دیں۔''

''کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی ہر چیز کو ہمارے کام میں لگا رکھا ہے اور تمہیں اپنی ظاہری و باطنی نعمتیں بھرپور دے رکھی ہیں۔''

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ﴿٣٢﴾ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآىِٕبَیْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ﴿٣٣﴾ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴿٣٤﴾ ﴾ (ابراهيم: ٣٢ تا ٣٤)

''اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے کچھ پانی اتارا، پھر اس کے ساتھ تمھارے لیے پھلوں میں سے کچھ رزق نکالا اور تمھارے لیے کشتیوں کو مسخر کیا تاکہ وہ سمندر میں اس کے حکم سے چلیں اور تمھاری خاطر دریاؤں کو مسخر کر دیا اور تمھاری خاطر سورج اور چاند کو مسخر کر دیا کہ پے درپے چلنے والے ہیں اور تمھاری خاطر رات اور دن کو مسخر کر دیا اور تمھیں ہر اس چیز میں سے دیا جو تم نے اس سے مانگی اور اگر تم اللہ کی نعمت شمار کرو تو اسے شمار نہ کر پاؤ گے۔ بلاشبہ انسان یقیناً بڑا ظالم، بہت ناشکرا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے سورۂ نحل میں برملا ارشاد فرمایا ہے جس کو ''سورہ النعم'' کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے کیونکہ اس سورۃ میں جابجا نعمتوں کا ذکر وارد ہوا ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿١٤﴾ وَاَلْقٰى فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿١٥﴾ وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجْمِ هُمْ

يَهْتَدُوْنَ ۝ اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

(النحل: ١٤ تا ١٨)

''اور وہی ہے جس نے سمندر کو مسخر کر دیا تا کہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس سے زینت کی چیزیں نکالو، جنھیں تم پہنتے ہو اور تو کشتیوں کو دیکھتا ہے، اس میں پانی کو چیرتی چلی جانے والی ہیں اور تا کہ تم اس کا کچھ فضل تلاش کرو اور تا کہ تم شکر کرو اور اس نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیے کہ وہ تمھیں ہلا نہ دے اور نہریں اور راستے بنائے، تا کہ تم منزل تک پہنچ جاؤ اور علامتیں (بنائیں) اور ستاروں کے ساتھ وہ راستہ معلوم کرتے ہیں۔ تو کیا وہ جو پیدا کرتا ہے، اس کی طرح ہے جو پیدا نہیں کرتا؟ پھر کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے اور اگر تم اللہ کی نعمت شمار کرو تو اسے شمار نہ کر پاؤ گے۔ بے شک اللہ یقیناً بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔''

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ۝﴾ (النحل: ٨١)

''اور اللہ نے تمھارے لیے ان چیزوں سے جو اس نے پیدا کیں، سائے بنا دیے اور تمھارے لیے پہاڑوں میں سے چھپنے کی جگہیں بنائیں اور تمھارے لیے کچھ قمیصیں بنائیں جو تمھیں گرمی سے بچاتی ہیں اور کچھ قمیصیں جو تمھیں تمھاری لڑائی میں بچاتی ہیں۔ اسی طرح وہ اپنی نعمت تم پر پوری کرتا ہے تا کہ تم فرماں بردار بن جاؤ۔''

اللہ تعالیٰ کی ہم لوگوں پر بیش بہا نعمتوں میں سے عظیم ترین نعمت دین کا اتمام واکمال ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدۃ : ۳)

''آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔''

بعض لوگوں کی کج فہمی اور کجروی کی بات یہ ہے کہ وہ اللہ کی نعمتوں کی نسبت اپنی طرف یا اپنی ذہانت وذکاوت یا اپنی قدرت واستطاعت یا اپنے زوربازو کی طرف کرتے ہیں جیسا کہ قارون نے کیا، جس نے برملا کہا تھا کہ ''یہ سب کچھ مجھے میری اپنی سمجھ بوجھ کے بل بوتے پر ہی تو دیا گیا ہے۔'' (القصص : ۷۹)

یا بعض جگہ اللہ کی نعمتوں کی نسبت مشینری اور اعلیٰ ٹیکنالوجی کی طرف کی جاتی ہے جیسا کہ جاہل قسم کے معاصرین کا وطیرہ ہے۔ انھوں نے ٹیکنالوجی پر بھروسا کر کے نعمتوں کو ٹیکنالوجی کی صناعی کی طرف منسوب کر دیا ہے جبکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ﴾ (القصص : ۷۸)

''تمہارے پاس جتنی بھی نعمتیں ہیں سب اللہ ہی کی دی ہوئی ہیں۔''

اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ﴿٦٨﴾ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ﴿٦٩﴾ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ﴿٧٠﴾﴾

(الواقعۃ: ٦٨ تا ٧٠)

''پھر کیا تم نے دیکھا وہ پانی جو تم پیتے ہو؟ کیا تم نے اسے بادل سے اتارا ہے یا ہم ہی اتارنے والے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اسے سخت نمکین بنا دیں، پھر تم شکر ادا کیوں نہیں کرتے؟''

بعض لوگ اس مسئلہ کے بارے میں پیچیدگی کا شکار ہو جایا کرتے ہیں جو کہ اسلاف سے منقول ہے کہ انھوں نے تمنا کی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں سرے سے پیدا ہی نہ کیا ہوتا یا یہ

کہ وہ جمادات ونباتات کی شکل میں پیدا ہوتے جس کی بنیاد پر بہت سے لوگ شک وشبہ کا شکار ہوجاتے ہیں اوران پر یہ معاملہ گنجلک اور پیچیدہ بن کر مشکلات کا شاخسانہ بن جاتا ہے۔ وہ اسلاف کے اس قول کو اللہ تعالیٰ کی قدرت ایجاد وخلق اور قدرت اماتہ واحیاء کی بے وقعتی کے باب میں شمار کرتے ہیں۔

جبکہ حقیقت تو یہ ہے جس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ مذکورہ اسلاف شاکرین وذاکرین تھے لیکن کبھی کبھار وہ ایسی کیفیات سے دوچار ہوجاتے تھے جو کہ خوف وخشیت کی قبیل سے ہوا کرتی تھیں اس موقع پر مارے خوف الٰہی وخشیت خداوندی کے وہ تمنا کر بیٹھتے تھے کہ ان کا وجود ہی نہ ہوتا اور وہ عدم سے وجود میں نہ آتے تاکہ انہیں حساب وکتاب کے جھمیلے سے چھٹکارا نصیب ہوجاتا اور رب کریم کے سامنے محاسبہ سے وہ نجات پا جاتے لیکن ان کی عادت وخصلت میں یہ بات داخل نہ تھی کہ وہ موت وزیست یا عدم سے وجود کی انجام دہی سے دست برداری کی تمنا کریں۔

ان امور میں سے جو شکر تک رسائی کا ذریعہ ہیں ایک اہم ترین ذریعہ بندے کا اس بات سے شناسائی حاصل کرنا ہے کہ نعمتوں کے بارے میں اس سے پوچھ گچھ ہوگی۔

لٰہذا بندے کو یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ وہ نعمتوں کے بارے میں مسؤل ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ۝﴾ (التکاثر : ۸)

''پھر یقیناً تم اس دن نعمتوں کے بارے میں ضرور پوچھے جاؤ گے۔''

جب بندہ کے ذہن اور دماغ میں یہ بات رچ بس جائے کہ قیامت کے دن اس سے نعمتوں کے بارے سوال وجواب ہوگا اور اسے ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کے بارے میں حساب وکتاب دینا پڑے گا حتی کہ ٹھنڈے پانی کا بھی اس کو حساب وکتاب دینا پڑے گا تو خود بخود شکر مندی اور نعمتوں کی قدردانی کی طرف اس خوف سے اس کی توجہ مبذول ہونے لگے گی کہ کہیں اسے حساب وکتاب کے کٹہرے میں نہ کھڑا ہونا پڑ جائے۔

بعض لوگ اس مسئلہ کو سمجھنے میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں اور مقررہ اندازے سے آگے نکل جاتے ہیں اور مبالغہ آمیزی کا شکار بن جاتے ہیں۔ وہ اس کی پاداش میں اپنے اوپر نعمتوں سے محظوظ ہونے کو حرام قرار دے دیتے ہیں تاکہ قیامت کے دن اس کے بارے میں ان سے پوچھ گچھ نہ ہو جبکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی اسی میں ہے کہ ہم ان سے محظوظ ہوں اور ان کے استعمال سے لطف اندوز ہوں اور ان نعمتوں کا شکر بھی ادا کریں، ٹھیک اس طرح جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے شکر کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝﴾

(البقرة: ٦٠)

''کھاؤ اور پیو اللہ کے دیے ہوئے میں سے اور زمین میں فساد کرتے ہوئے دنگا نہ مچاؤ۔''

اور ایک دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ۝﴾ (البقرة: ١٧٢)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمھیں عطا فرمائی ہیں اور اللہ کا شکر کرو، اگر تم صرف اس کی عبادت کرتے ہو۔''

بلکہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر بغیر ان سے محظوظ ہوئے ادا ہی نہیں ہو سکتا اگر ہم ان کے استعمال سے لطف اندوز نہ ہوں تو ہم کیوں کر اس کا شکر ادا کر سکتے ہیں؟

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض لوگ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں میں سے کسی نعمت سے لطف اندوز ہونے کو اپنے اوپر حرام قرار دے لیتے ہیں جبکہ حقیقت میں وہ اس سے بھی قیمتی چیز سے نادانستہ طور پر مستفید ہو رہے ہوتے ہیں اور وہ اپنی دانست میں یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم نے تو فلاں اہم ترین نعمت سے محظوظ ہونا چھوڑ دیا ہے۔

ایک شخص سیّدنا حسن بصری رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا کہ میرا ایک پڑوسی

ہے جو فالودہ نہیں کھاتا ہے، تو سیّدنا حسن بصری رحمہ اللہ نے اس شخص سے دریافت فرمایا: کیوں؟ اس شخص نے جواب دیا، اس خوف سے کہ کہیں اسے اس نعمت کا شکر ادا نہ کرنا پڑ جائے تو سیّدنا حسن بصریؒ نے جواب دیا: کیا وہ شخص ٹھنڈا پانی پیتا ہے؟ تو سائل نے جواب دیا: جی ہاں۔ تو سیّدنا حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ تمہارا پڑوسی جاہل اور نادان ہے اس کو پتہ نہیں کہ ٹھنڈا پانی اس کے لیے سب سے بڑی نعمت ہے، تو فالودہ کو اپنے اوپر حرام کر لینے سے کیا فائدہ؟ ٹھنڈا پانی تو اس کے حق میں اس سے کہیں بڑی نعمت ہے۔ ❶

اس کے باوجود ہم اس قسم کے لوگوں سے کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں سے صرف نظر چند نعمتیں ایسی بھی ہیں جن سے نفع اندوزی کے بارے میں تم کسی صورت میں صرف نظر نہیں کر سکتے اور تم ان سے مستفید ہونے کے سلسلہ میں استغنا سے کام نہیں لے سکتے وہ تنفس اور انسانی جسم میں سانس کی روانی کی نعمت ہے یا دل کی دھڑکنوں اور حرکتوں یا جسم میں خون کے دوران جیسی اہم ترین نعمتیں ہیں کیا تم ان بیش بہا نعمتوں کا شکر ادا کر سکتے ہو؟

اگر وہ اس کا جواب نفی میں دیں کہ نہیں ہم تو ان قیمتی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر سکتے تو ہم اس کے جواب میں عرض کریں گے: ہاں۔ بندے کے لیے کسی صورت میں یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اللہ کی طرف سے عطا کردہ نعمتوں میں سے کسی نعمت کا شکر ادا کر سکے لیکن اس کے باوجود وہ ان نعمتوں سے مستفید ہوتا رہتا ہے اور وہ اپنے اوپر اللہ کی نعمت کے اظہار کا اعتراف بھی کرتا ہے۔ اس کے بعد اس کا شکر ادا کرنے کے بارے اپنی تقصیر و کوتاہی کا بھی معترف نظر آتا ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ کہا کرتے تھے:

((أَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ ، وَأَبُوْءُ بِذَنْبِي .)) ❷

”اے رب! تو نے جو نعمتیں مجھے عطا کی ہیں میں ان کا اقرار کرتا ہوں اور اپنے گناہوں کا بھی معترف ہوں۔“

---

❶ تفسیر قرطبی : ٦/٢٤٣.

❷ صحیح بخاری ، کتاب اللباس، باب المستوشمة : ٥٩٤٧.

خلاصہ کلام: ...... جو شخص اللہ کی حلال کردہ چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لے اور بغیر کسی شرعی عذر کے ان کے کھانے پینے سے پرہیز کرنا شروع کر دے تو ایسا شخص قابل مذمت ہے اور اس کا شمار بدعتیوں میں ہے اور جو شخص اس قسم کی نعمتوں کو کھائے پیے اور انہیں استعمال بھی کرے مگر اس پر واجب ہونے والے شکر کی ادائیگی نہ کرے تو ایسا شخص قابل مذمت ہے اور اہل حق اللہ کی حلال کردہ چیزوں سے بغیر اسراف وتبذیر کے لطف اندوز ہوتے ہیں اور ان کے شکر کی ادائیگی کی تگ ودو میں مصروف بھی نظر آتے ہیں۔ ❶

ان امور میں سے جو وسائل شکر تک رسائی کا ذریعہ ہیں ایک اہم ترین ذریعہ اللہ کی بارگاہ میں دست طلب دراز کرنا ہے کہ بندہ کہے: رب کریم! شکرگزاری اور اپنی نعمتوں کی قدر شناسی کی خاطر میری مدد فرما۔

اس بارے میں بیان کردہ اہم ترین وسائل اور ذرائع میں سے یہ بھی ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ میں ہماری مدد اور اعانت فرمائے اور شکر کی توفیق عطا فرما کر ہمیں اس نعمت سے بہرہ ور فرمائے:

((اَللّٰهُمَّ اَعِنِّيْ عَلٰى ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ .)) ❷

''اے اللہ! اپنے ذکر وفکر، اپنی شکرگزاری وقدر شناسی اور صحیح طریقہ پر اپنی عبادت وریاضت کی ادائیگی کی راہ میں میری مدد فرما۔''

ان امور میں سے جو شکر تک رسائی کا ذریعہ ہیں اہم ترین ذریعہ اس بات کی معرفت ہے کہ اللہ تعالیٰ شاکرین وذاکرین اور اس کی نعمتوں کی قدردانی کرنے والوں سے تعلق اور لگاؤ کا اظہار کرتا ہے۔

امام قتادۃ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''تمہارا رب کریم منعم حقیقی ہے یعنی انعام واکرام کرنے والا داتا ہے۔ اس کو

---

❶ مجموع فتاوی : ۳۱۲/۳۲.

❷ ابو داؤد ، کتاب الوتر، باب في الاستغفار : ۱۵۲۲ وصححه الحاكم و وافقه الذهبي۔

شکر گزاری اور نعمت شناسی پسند ہے۔ جو شخص اس کی نعمت کی قدر دانی کرتا ہے وہ اس سے محبت کرتا ہے۔''❶

شکر کے فوائد وثمرات

شکر کے متعدد ثمرات وفوائد ہیں۔ ان ثمرات کا اللہ کی ذات کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ یہ ثمرات وفوائد بندوں کے لیے خاص ہیں۔ اگر بندہ رب کریم کا شکر بجالاتا ہے تو وہ اپنے اس عمل کی وجہ سے خود اپنی عاقبت سنوارتا ہے اور شکر خود اس کی ذات کے لیے فائدہ مند ثابت ہوتا ہے اور اگر کوئی ناشکری کرتا ہے تو اس کا وبال وہ خود بھگتتا ہے۔ اس میں کسی کا کیا جاتا ہے۔ ناشکری ناشکرے کے لیے وبال ہوا کرتی ہے۔ سیّدنا سلیمان علیہ السلام کے بارے میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کی وصف بیانی کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

﴿قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۖ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ۭ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ۝۴۰﴾

(النمل: ٤٠)

''اس نے کہا: یہ میرے رب کے فضل سے ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں اور جس نے شکر کیا تو وہ اپنے ہی لیے شکر کرتا ہے اور جس نے ناشکری کی تو یقیناً میرا رب بہت بے پروا، بہت کرم والا ہے۔''

اللہ کے عذاب سے نجات اور خلاصی:

اگر لوگ اللہ پر ایمان لے آئیں اور اس کی شکر گزاری کا فریضہ انجام دیتے رہیں تو اس کو بندوں کو عذاب دے کر کیا فائدہ حاصل ہوگا اور نہ اس کا کوئی مقصد یا اس کی کوئی غرض وغایت باقی بچے گی۔ اس بات کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

❶ تفسیر طبری: ٦/٢١٨.

﴿مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيمًا ﴿١٤٧﴾﴾ (النساء: ١٤٧)

''اللہ تمھیں عذاب دینے سے کیا کرے گا، اگر تم شکر کرو اور ایمان لے آؤ اور اللہ ہمیشہ سے قدر کرنے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔''

امام ابن جریر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اللہ جل شانہ شکر کرنے والوں اور مومنوں کو عذاب نہیں دیتا۔''[1]

امام حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ لوگوں کو اپنی مشیت کے بقدر نعمتوں سے محظوظ فرماتا رہتا ہے۔ اگر اس کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا نہ کیا جائے اور اس کی ناقدری کی جائے تو اللہ تعالیٰ انہیں نعمتوں کو عذاب کی شکل میں تحلیل فرما دیتا ہے یعنی یہی نعمتیں اس پر عذاب بن کر مسلط ہو جاتی ہیں۔''[2]

اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کا حصول:

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے سے رضامندی اور خوشنودی کا اظہار کرتا ہے جو اگر کھانے کا لقمہ بھی اپنے منہ میں ڈالتا ہے تو اس پر اللہ کی حمد و ثنا بیان کرتا ہے یا پانی کا ایک گھونٹ بھی گلے سے اتارتا ہے تو رب کریم کی تعریف و تقدیس بیان کرتا ہے۔''[3]

اللہ کے فضل و کرم اور اس کی ہدایت و استقامت کی بازیابی:

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے بندوں کے درمیان برملا اعلان کیا ہے کہ شکر گزار اور نعمت شناس و قدرداں بندے ہی اس کے فضل و کرم اور اس کی ہدایت و استقامت کے لیے مخصوص ہیں۔

---

[1] تفسیر طبری: ٤/٣٣٨۔ [2] الشکر لابن ابی الدنیا: ١٧۔

[3] صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب استحباب حمد اللہ تعالیٰ: ٢٧٣٤۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ كَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ﴿٥٣﴾ ﴾ (الانعام : ٥٣)

''اور اسی طرح ہم نے ان میں سے بعض کی بعض کے ساتھ آزمائش کی ہے تاکہ وہ کہیں کیا یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہمارے درمیان میں سے احسان فرمایا ہے؟ کیا اللہ شکر کرنے والوں کو زیادہ جاننے والا نہیں؟''

امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

''اللہ تعالیٰ ارشاد فرما رہا ہے کہ مجھے اس بات کا علم ہے کہ میری مخلوق میں سے کون میری نعمت کا شکر گزار و قدر شناس ہے اور کون میری نعمت کا ناقدرا اور منکر ہے؟ اور میرا احسان اس شخص پر ہے جس پر میں نے اپنی نعمت کی قدردانی اور شکرگزاری کے بدلے ہدایت واستقامت کا فیضان کرکے احسان واکرام کا معاملہ روا رکھا ہے اور میرا عذاب اس شخص پر ہے جس کے گلے میں میں نے اپنی نعمت کی ناشکری کی پاداش میں راہ استقامت سے کج روی وگمراہی کا طوق ڈال دیا ہے۔اس کے لیے ناکامی اور خسارہ ہی خسارہ ہے۔'' [1]

شکر کے فوائد وثمرات میں سے نعمت الٰہی کی قدردانی بھی ہے:

مؤمن کے لیے ''شکر'' محافظ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ شکر ہی ہے جو نعمت الٰہی کو اس کے زوال کے ذرائع واسباب سے محفوظ رکھنے کے بارے میں سکیورٹی گارڈ کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ اسی لیے بعض علما نے شکر کو نعمتوں کا داروغہ کہا ہے۔ یہ شکر ہی ہے جو نعمت کو پابسلاسل کرکے رکھتا ہے اور اسے ہاتھ سے نکل کر جانے نہیں دیتا اور نہ ہی اسے بھاگنے کا موقع فراہم ہونے دیتا ہے۔

اسی لیے سیّدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا قول ہے: ''نعمتوں کو اللہ کا شکر ادا کرکے اپنی

[1] تفسیر طبری : ٥/٢٠٤.

مٹھی کرلو۔'' ❶ کہیں ایسا نہ ہو کہ نعمت الٰہی کا فیضان ہو اور تم اس کو حاصل نہ کرسکو اور دیکھتے ہی دیکھتے نعمت تمہارے ہاتھ سے نکل جائے۔

شکر کے فوائد وثمرات میں سے خیر وبرکت کا زیادہ سے زیادہ حصول بھی ہے:

اللہ تعالیٰ نے شاکرین وذاکرین کو اپنی نعمتوں سے زیادہ سے زیادہ محظوظ ہونے کی خوشخبری سنائی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝﴾ (ابراهيم : ٧)

''اور جب تمھارے رب نے صاف اعلان کر دیا کہ بے شک اگر تم شکر کرو گے تو میں ضرور تمھیں زیادہ دوں گا اور بے شک اگر تم ناشکری کرو گے تو بلاشبہ میرا عذاب یقیناً بہت سخت ہے۔''

تو پتہ یہ چلا کہ شکر نعمتوں میں اضافے اور بڑھوتری کا ذریعہ ہے اور نعمتوں کے چھن جانے سے حفاظت کا وسیلہ بھی۔

امام حسن رحمہ اللہ کا فرمان ہے:

''مجھے بتلایا گیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی قوم کے ساتھ انعام واکرام کا معاملہ کرتا ہے تو وہ ان سے شکر گذاری کا مطالبہ بھی کرتا ہے اگر اس قوم کے لوگ نعمت کا شکر ادا کر کے اس کی قدر دانی کا ثبوت پیش کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کو قدرت حاصل ہے کہ وہ ان کی شکر گذاری کے بدلہ نعمت میں مزید اضافہ کرتا چلا جائے اور اگر وہ کفران نعمت کا ثبوت پیش کر کے نعمت کی ناقدری کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس نعمت کو عذاب میں بدل کران پر مسلط کر دینے پر بھی بخوبی قادر ہے۔'' ❷

سیّدنا ربیع بن انس رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ اس بندے کو یاد رکھنے کا وعدہ کرتا ہے جو اس کے ذکر میں رطب

❶ شعب الایمان : ٤٥٤٦.
❷ شعب الایمان : ٤٥٣٦.

اللسان رہے اور اس شخص کو مزید عطا کرنے کا عہد کرتا ہے جو اس کا شکر ادا کرے اور اس شخص پر عذاب مسلط کر دینے کی وارننگ دیتا ہے جو اس کی نعمت کی ناقدری کر کے کفران نعمت کا ثبوت فراہم کرے۔"❶

اسی لیے اسلاف کرام رحمہم اللہ اجمعین شکر کو دو ناموں سے موسوم کیا کرتے تھے: (الحافظ) کیونکہ شکر اس نعمت کی حفاظت و نگہبانی کا فریضہ انجام دیتا ہے جس سے بندہ محظوظ ہو رہا ہے۔ (الجالب) کیونکہ شکر نعمت کو کھینچ کر لے آنے کی مقناطیسی طاقت وقوت رکھتا ہے۔ وہ نعمتوں کو چن چن کر شاکرین کی جھولی میں ڈالنے کا فریضہ سر انجام دیتا ہے۔ کسی عربی شاعر کا قول ہے:

"ہر اس نعمت الٰہی سے مستفید ہوتے وقت جس سے اس نے تم کو بہرہ ور کیا ہے شکران نعمت کے طور پر اس کی قدر دانی کرتے ہوئے رب کریم کا شکر ادا کرنا نہ بھولو! یقیناً شکر نعمتوں کو کھینچ کر تمہاری جھولی میں ڈالنے کی طاقت اور قوت رکھتا ہے۔"❷

اللہ تعالیٰ نے شکران نعمت کے ثواب کو مشیت کے ساتھ معلق نہیں کیا ہے:

اللہ تعالیٰ نے عام طور پر بہت سے اجر و ثواب کو اپنی مشیت کے ساتھ مشروط قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿بَلْ إِيَّاهُ تَدْعُونَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ إِنْ شَآءَ﴾

(الانعام: ٤١)

"بلکہ تم اسی کو پکارو گے تو وہ دور کر دے گا جس کی طرف تم اسے پکارو گے، اگر اس نے چاہا۔"

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا مغفرت اور بخشش کے بارے میں صریح قول ہے:

﴿يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ (آل عمران: ١٢٩)

---

❶ تفسیر طبری: ۳۹/۲. ❷ عدہ الصابرین: ۹۸.

"وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔"

رزق کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہی انداز بیان اختیار فرمایا ہے:

﴿وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ﴾ (البقرة: ٢١٢)

"اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔"

اور توبہ کے بارے میں بھی اس کی قبولیت کو اللہ تعالیٰ نے مشیت سے معلق کیا ہے:

﴿وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ﴾ (التوبة: ١٥)

"اور اللہ توبہ کی توفیق دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔"

اور جہاں تک شکر کا معاملہ ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کو بغیر کسی تعلیق کے مثبت فرمایا ہے

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ۝١٤٥﴾ (آل عمران: ١٤٥)

"اور ہم شکر کرنے والوں کو جلد جزا دیں گے۔"

اور ایک دوسری آیت میں رب کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝١٤٤﴾ (آل عمران: ١٤٤)

"اور اللہ شکر کرنے والوں کو جلد جزا دے گا۔"

مذکورہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے شکران نعمت کے اجر و ثواب کو اپنی مشیت سے معلق قرار نہیں دیا ہے بلکہ آیات مذکورہ بغیر کسی شرط کے مطلق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یوں نہیں کہا (سیجزی الشاکرین ان شاء) یا (سیجزی ان شاء الشاکرین) بلکہ ان آیات کو بغیر کسی قید کے نازل فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے شاکرین کو اپنے اوصاف کریمانہ سے موسوم فرمایا ہے:

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے آپ کو "شاکر" اور "شکور" کے نام موسوم کیا ہے اور اپنے شکر گذار بندوں کو بھی انہیں اسماء سے متصف فرما کر اپنے اوصاف کریمانہ کا پرتو قرار دیا ہے اور انہیں اپنے اسمائے حسنیٰ کا ٹائٹل فراہم کر کے ان کی دل جوئی فرمائی ہے۔ شکر گذار بندوں

سے رب کریم کی محبت کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے یہی دلیل کافی وشافی ہے نیز اللہ تعالیٰ کے نزدیک شاکرین کی افضلیت و برتری رب کریم کا ان سے محبت وتعلق کا یہی جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ [1]

شکر کے فوائد وثمرات میں سے دعا کی قبولیت بھی ہے:

سیّدنا ابراہیم ادھم رحمہ اللہ سے کسی نے شکوہ کیا:

''ہمیں کیا ہوگیا ہے سمجھ میں نہیں آتا۔ ہم دعا کرتے ہیں مگر ہماری دعا قبول نہیں ہوتی؟ تو سیّدنا ابراہیم ادہم رحمہ اللہ نے جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''تم نے اللہ کی معرفت حاصل کرنے کے باوجود اس کی اطاعت وفرماں برداری سے روگردانی کررکھی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جانتے ہوئے بھی تم نے ان کی سنتوں کی اتباع اور پیروی نہیں کی اور قرآن کریم سے تم بخوبی آشنا ہو اس کے باوجود تم نے اس پر عمل کو شیوۂ زندگی نہیں بنایا اور اللہ کی نعمتوں سے محظوظ ہونے کے باوجود تمھیں اس کا شکر ادا کرنے کی فرصت نہیں ہے۔ جنت کے بارے میں معلوم ہوتے ہوئے بھی تم نے کبھی جنت نہیں مانگی اور جہنم کے بارے میں علم ہونے کے باوجود تم نے کبھی اس سے کنارہ کشی کی تگ ودو نہیں کی اور شیطان کے بارے میں علم ہونے کے باوجود کبھی تم سے اس سے نبرد آزمائی کی کوشش نہیں کی بلکہ تم نے اس کی ہاں میں ہاں ملا کر اس کا ساتھ دیا ہے اور موت کے بارے میں پورا علم رکھنے کے باوجود تم نے اس کی تیاری کی طرف توجہ مرکوز نہیں کی اور مردوں کو تم نے خود اپنے ہاتھوں سے دفن کیا ہے لیکن اس سے درس عبرت لینے کی تم کو کبھی توفیق نہ ہوئی اور اپنے عیوب ونقائص کو چھوڑ کر لوگوں کے عیوب ونقائص تلاش کرنا تمہارا مشغلہ بن گیا تو کہاں سے تمہاری دعا قبول ہو؟۔'' [2]

---

[1] مدارج السالکین: ۲/۲۴۲، ۲۴۴.

[2] تفسیر قرطبی: ۲/۳۰۳.

لوگوں کے احسان کی قدر شناسی کا بیان

لوگوں کے احسانات اور ان کے فضل وکرم کا بدلہ ان کے احسانات کا شکریہ ادا کر کے انجام دینے کا شریعت اسلامیہ نے ہمیں حکم دیا ہے خصوصاً والدین کے ساتھ ان کے احسانات کی قدر شناسی کر کے حسن سلوک کا حکم وارد ہوا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ﴾ (لقمان: ١٤)

”میرا شکر کر اور اپنے ماں باپ کا۔“

علمائے کرام کا اس بارے میں قول ہے:

”خالق کائنات کے احسانات کا شکر ادا کرنے کے بعد لوگوں میں سب سے زیادہ حسن سلوک، نیکی کے برتاؤ، اطاعت وفرماں برداری، خشوع وخضوع، تابعداری اور قدردانی وشکرگزاری کی وہ ذات مستحق ہے۔ جس کے ساتھ احسان وحسن سلوک جیسے اہم فریضہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت وریاضت اور اپنی اطاعت و فرماں برداری کا قرین بنا کر پیش کیا ہے اور ان کے احسان کی شکر گذاری کو اپنی شکرگذاری کے ساتھ ضم کر کے بیان فرمایا ہے (بلاشبہ وہ والدین کی ذات بابرکات ہے)“ [1]

اسی طرح نبی کریم ﷺ نے ہر اس شخص کا شکر ادا کرنے کا حکم دیا ہے جو تمہارے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرے یا نیک سلوک روا رکھے۔ چنانچہ سیّدنا جابر رضی اللہ عنہ سے وارد حدیث مرفوع میں منقول ہے کہ ”جو شخص انعام واکرام سے نوازا جائے اس کو چاہیے کہ حسب مقدور بطور شکر اس کا بدلہ دے۔ اگر دے سکے اور اگر اس کا بدلہ دینے کے لیے اس کے پاس کچھ نہ ہو تو کم از کم اپنے محسن کی تعریف وتوصیف بیان کرے۔ جس شخص نے اپنے محسن کی تعریف کی تو گویا کہ اس نے اس کے احسان کی قدر شناسی کی اور جس شخص نے اپنے محسن کے احسان کی تعریف نہ کی اس نے گویا کہ اس کے احسان کی ناقدری کی۔“ [2]

[1] تفسیر قرطبی: ٥/١٧١.
[2] ابو داؤد، کتاب الأدب: ٤٨١٣ وحسنه الالبانی۔

اگر تم بطور مکافات اس کو کچھ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو کم از کم نیکی کرنے والے محسن شخص کی تعریف ہی کر دیا کرو۔ مثال کے طور پر تم کہو: جزاك اللّٰه خیرا ۔ کیونکہ دعا شکر گزاری کا وسیلہ ہے اور عربی محاورہ مشہور ہے:

"جو اپنے ہاتھ پیروں سے محسن کے احسان کا بدلہ چکانے سے قاصر ہو اس کو چاہیے کہ "زبان کے اس لوتھڑے کو جنبش دے اور شکریہ کے کلمات کے ذریعے اپنے محسن کی دل جوئی کرے۔"

لوگوں کے شکر کی ادائیگی کے مظاہر میں سے یہ بھی ہے کہ تحفہ تحائف اور انعام واکرام میں دی ہوئی چیز کی عیب جوئی نہ کرے۔ امام مناوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"شکر کی سپاس گذاری کا اتمام یہ ہے کہ انعام واکرام میں ملی ہوئی چیز کی عیب پوشی کی جائے اور اسے حقارت کی نظر سے نہ دیکھا جائے۔" ❶

اللہ تعالیٰ نے اپنی شکر گذاری کو بندوں کی سپاس گذاری کے ساتھ مربوط کر دیا ہے۔

سیّدنا ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"جو لوگوں کا شکر ادا نہ کرے اس نے گویا کہ اللہ کا شکر ادا نہ کیا۔" ❷

حدیث مذکور کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بندے کا شکر قبول نہیں فرماتا جو لوگوں کی نیکیوں اور ان کی بھلائیوں کا شکر ادا نہیں کرتا یا اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کی طبیعت اور عادت لوگوں کی ناشکری اور ان کے احسانات کی ناقدری بن جائے تو اس کی نحوست کی اثر پذیری یہ ہوتی ہے کہ ایسا شخص خالق کائنات کے ساتھ کفرانِ نعمت کا عادی بن جاتا ہے۔

بندوں کی شکر گذاری اور رب کریم کی شکر گذاری میں فرق ہے:

رب کریم کی سپاس گذاری میں خشوع وخضوع، تذلل و عاجزی، عبودیت اور انکساری کا داعیہ موجزن ہوتا ہے اور بندے کی شکر گذاری کا مقصد اس کے احسانات کا بدلہ دینا ہے اور

---

❶ فیض القدیر : ٦/٢٢.

❷ ابوداؤد ، کتاب الأدب، باب فی شکر المعروف : ٤٨١١۔ ترمذی : ١٩٥٤ وقال حسن صحیح۔

اپنے بھائی کے لیے دعا کرنا ہے۔ اس نوعیت کے شکر میں خشوع وخضوع، تذلل وانکساری اور عبودیت وبندگی مطلوب نہیں ہوتی اور نہ ہی اس قسم کی چیزوں کا اس میں کوئی دخل ہے۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ''جو ذات مرتبہ میں تم سے بلند وبالا ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات۔اس کے شکر کا مطلب اس کی اطاعت وفرماں برداری کرنا ہے اور جو ذات تمہارے ہم پلہ ہو احسان کے بدلے میں اس کو مکافات یا بدلے سے نوازنا شکر ہے اور جو ذات مرتبہ میں تم سے کم تر ہو اس پر احسان کرنا شکر کہلاتا ہے۔'' [1]

اللہ تعالیٰ کی سپاس گزاری مطلق ہے اس کی ذات بغیر کسی قید کے عمومی طور پر بھرپور شکر کی مستحق ہے اور اس میں اور بندے کے شکر میں فرق یہ ہے کہ بندوں کا شکریہ اس وقت ادا کیا جاتا ہے جب ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ خیر اور بھلائی کا کام کرواتا ہے تو بطور جزا اس خیر اور بھلائی کی انجام دہی پر اس شخص کا شکریہ ادا کرنا پڑتا ہے جس کے ہاتھ سے یہ کام انجام پذیر ہوا چنانچہ بندہ والدین کی حسن تربیت کا شکر ادا کرتا ہے اور معلم نے اس کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا ہے اس پر وہ شکر ادا کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ [2]

مخلوق کا شکر ادا کرنا خالق کے شکر کی ادائیگی میں رخنہ انداز نہیں ہوتا نہ ہی قابل مذمت ہے بلکہ مشکل اس وقت درپیش ہوتی ہے جب بندہ مخلوق کا تو شکر ادا کرے اور خالق کائنات کا شکر ادا کرنے میں پس وپیش سے کام لے۔

لوگوں سے سپاس گزاری کا مطالبہ کرنے کا بیان

مومن اگر اپنے مسلمان بھائی کو کوئی فائدہ پہنچائے تو اس سے شکر موصول ہونے کا انتظار نہ کرے بلکہ اس کو چاہیے کہ اللہ کی ذات سے اس کے اجر وثواب کے حصول کا منتظر رہے اور بندہ کی طرف سے شکر موصول نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں وہ اپنے مقصد میں ناکام ونامراد ہے الا یہ کہ اس نے یہ خیر کا کام لوگوں کی واہ واہ وصول کرنے کے لیے کیا ہو تو اور بات

---

[1] روح المعانی: ۲۵۸/۱.
[2] مجموع الفتاویٰ: ۳۳۹/۱۴.

ہے (مگر اس صورت میں اس کو ریاء کار اور شہرت کا بھوکا یا ہوس پرست کہا جائے گا) ہم اللہ تعالیٰ سے اس قسم کی نیت سے سلامتی اور عافیت کے خواستگار ہیں۔

بلکہ بعض علماء نے اس بارے میں یہ تصریح فرمادی ہے کہ اگر نیکی اور بھلائی کرنے والے کے بارے میں یہ بات معروف ومشہور ہو کہ اس شخص کو نیکی کے کام سے لوگوں کی ثناء خوانی مقصود ہے تو ایسی صورت حال میں جو شخص اس کی نیکی اور بھلائی سے مستفید ہوا اس کو چاہیے کہ ایسے شخص کی قصداً ثناء خوانی سے پرہیز کرے اور ہی اس کا شکریہ ادا نہ کرے، کیونکہ شکرگذاری کا مطالبہ ظلم ہے اور ہمیں ظالم کی مدد کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ [1]

نعمت کی ناشکری اور اس کی ناقدری کا بیان

ناشکری (شکران نعمت) کی ضد ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو کفران نعمت سے منع فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی ان نعمتوں کی ناقدری سے جس سے اس نے بندے کو نوازا ہے ڈرایا دھمکایا ہے اور ہمارے اسلاف رحمہم اللہ کفران نعمت کی ناعاقبت اندیشی سے بہت ڈرتے اور خوف کھاتے تھے۔

سیّدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا اس بارے میں یہ عالم تھا کہ آپ جب اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں پر جن سے وہ مالا مال تھے نگاہ دوڑاتے تھے تو یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ اَنْ اُبَدِّلَ نِعْمَتِكَ كُفْرًا ، اَوْ اَكْفُرَھَا بَعْدَ مَعْرِفَتِهَا ، اَوْ اَنْسَاھَا فَلَا اُثْنِی بِهَا .)) [2]

''اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں اس بات سے کہ میں تیری نعمت کی لذت وچاشنی کو ناشکری کی کڑواہٹ میں بدل ڈالوں، یا میں تیری نعمت کا عرفان نصیب ہوجانے کے بعد اس کی ناقدری کا شکار ہوجاؤں، یا میں نعمت پا کر اس میں ایسا محو ہوجاؤں کہ میں منعم کو ہی بھلا بیٹھوں اور اس کی حمد وثناء تک نہ کرسکوں۔''

---

[1] الاذکار للنووی: ٦١٥.
[2] شعب الایمان: ٤٥٤٥.

بعض لوگ کبھی کبھار بعض حالتوں میں کفران نعمت کا شکار ہو جاتے ہیں اور اللہ کی نعمتوں کی ناقدری کرنا شروع کر دیتے ہیں ان بعض احوال میں سے چند کا ذکر مندرجہ ذیل ہے:

مصائب ومشکلات کے وقت کفران نعمت:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ۝﴾ (هود: ٩)

''اور یقیناً اگر ہم انسان کو اپنی طرف سے کوئی رحمت چکھائیں، پھر اسے اس سے چھین لیں تو بے شک وہ یقیناً نہایت نا امید، بے حد ناشکرا ہوتا ہے۔''

امام ابن جریر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے بیان فرماتے ہیں:

''انسان کا معاملہ بڑا عجیب وغریب ہے وہ اپنے منعم کا بڑا ہی ناشکرا واقع ہوا ہے اور اپنے اس رب کریم کا جس نے محض اپنے فضل وکرم سے اسے اپنی نعمتوں سے نواز کر اس پر اپنا انعام واکرام کیا ہے شاذ ونادر ہی شکر ادا کرتا ہے۔''[1]

اگر انسان کو اس بات کا ادراک ہو جائے کہ جو بھی مصیبت وابتلاء اسے پہنچتی ہے وہ اس کے گناہوں اور نافرمانیوں کی پاداش میں ہی پہنچتی ہے پھر وہ اس پر اللہ کی حمد وثناء بیان کرتا ہے اور اپنی تقصیر وکوتاہی پر اپنے نفس کو لعنت ملامت کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَاۤ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَاۤ اٰتٰىكُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۝﴾

(الحديد: ٢٢ تا ٢٣)

''کوئی مصیبت نہ زمین پر پہنچتی ہے اور نہ تمھاری جانوں پر مگر وہ ایک کتاب میں ہے، اس سے پہلے کہ ہم اسے پیدا کریں۔ یقیناً یہ اللہ پر بہت آسان ہے۔ تا کہ

---

[1] تفسير طبری: ٧/٩.

تم نہ اس پر غم کرو جو تمھارے ہاتھ سے نکل جائے اور نہ اس پر پھول جاؤ جو وہ تمھیں عطا فرمائے اور اللہ کسی تکبر کرنے والے، بہت فخر کرنے والے سے محبت نہیں رکھتا۔"

اللہ تعالیٰ نے ناشکرے انسان کی مذمت فرمائی ہے اور اس سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے درحقیقت بے وفا وناشکرا بندہ تو وہ ہے جو مصیبت کے وقت اللہ کی نعمت کی ناقدری وناشکری کرے۔ امام حسن رحمہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے بارے میں تفسیر کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

"﴿إِنَّ الْإِنسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ ۝﴾ (العادیات: ٦)

اس سے مراد ناشکرا ونالائق بندہ ہے جو مصائب وآلام کے وقت نعمتوں کی شکر گذاری بھول جائے اور وفاداری کی بجائے ناشکری پر اُتر آئے۔" [1]

عصر حاضر جیسے مادی دور میں تاجر اور بزنس مین لوگوں کی مثال ہمارے سامنے ہے، اگر کسی شخص کی روزانہ کی آمدنی ایک لاکھ ریال ہو اور اتفاق سے کسی دن کساد بازاری کا شکار ہو کر پچاس ہزار کی آمدنی پر بازار بند ہو جائے اس موقع پر ذرا اس سے پوچھو (مارکیٹ کا کیا حال ہے؟) تو فوراً کہے گا (یار آج سیل ہی نہیں ہوئی ہے) کیا بتائیں آمدنی ہی نہیں ہے (ہم تو ہر طرح سے خسارے میں چل رہے ہیں) لیکن وفاداری اور اللہ کی شکر گذاری کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ اس حال میں بھی اللہ کی حمد وثناء بیان کرتا اور کہتا کہ ہم ہر حال میں اللہ کا شکر بجا لاتے ہیں۔ یہی وفاداری کا تقاضا ہے کہ بندہ راضی برضا رہے۔

ناشکری اور بے وفائی کی وبا عورتوں میں عموماً زیادہ پائی جاتی ہے، تم پوری زندگی اس پر احسان وکرم کی بارش کرتے رہو اور پوری عمر اس کا خیال کرتے رہو اور اس کے ناز ونخرے برداشت کرتے رہو مگر ازراہ بشریت کسی دن تم سے ذرہ برابر کوتاہی سرزد ہو جائے تو اسی وقت یہ عورت برملا کہنا شروع کر دے گی: میں نے زندگی میں کبھی سکون کی سانس نہیں لی اور مجھے

[1] تفسیر ابن کثیر: ٤/ ٧٠٠.

کبھی تمہاری طرف سے راحت نصیب ہی نہیں ہوئی تمہاری طرف سے زندگی میں کبھی کوئی خیر وبھلائی مجھے حاصل ہی نہیں ہوئی۔ اس عورت کا اس موقع پر یہ انداز تخاطب اختیار کرنا ظلم ہے اسی لیے زیادہ تر عورتیں ہی جہنم میں جائیں گی کیونکہ وہ شوہروں کی حد سے زیادہ ناشکری ہوتی ہیں۔ اگر شوہر کی ناشکری اور ناقدری عورتوں کے جہنم میں جانے کا باعث بنے گی تو اس شخص کا کیا ہوگا جو اللہ کی نعمتوں کا ناقدرا اور ناشکرا ہو؟

صبر اور شکر کے درمیان تقابلی موازنہ:

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ایمان کی دو شقیں ہیں: ایمان کا پہلا نصف شکر ہے اور دوسرا نصف صبر سے عبارت ہے۔'' [1]

اہل علم کے مابین صابر فقیر اور شاکر غنی کے درمیان تقابلی موازنہ کرنے کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ ان دونوں میں سے کون افضل وبرتر ہے؟ بعض اہل علم کے نزدیک صحت وعافیت کے عالم میں شکر کی ادائیگی ابتلاء وآزمائش کی حالت میں صبر کرنے سے کہیں بہتر اور افضل ہے۔ اس سلسلہ میں مطرف بن عبداللہ رحمہ اللہ کا قول ہے:

''میں صحت وعافیت اور تندرستی کے عالم میں اللہ کا شکر بجالاؤں مجھے اس بات سے کہیں زیادہ مرغوب ہے کہ مصائب وآلام میں گرفتار ہوکر اور گردش ایام کی زد میں آکر صبر کروں۔'' [2]

مراد یہ ہے کہ مجھے نعمتوں سے محظوظ ہوتے ہوئے شکر کی توفیق نصیب ہوجائے یہ میرے لیے اس بات سے کہیں زیادہ مرغوب اور محبوب ہے کہ میں آزمائش وابتلاء کے گرداب میں پھنس کر صبر کروں اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو وصیت کی ہے کہ اس کا ہر فرد اللہ تعالیٰ سے عفوودرگذر اور صحت وعافیت کی دعا مانگا کرے۔ [3]

---

[1] زادالمعاد: ٣٠٤/٤.   [2] مصنف عبدالرزاق: ٢٠٤٦٨۔ شعب الایمان: ٤٤٣٥.

[3] سنن الترمذی، کتاب الدعوات، باب فی العفو والعافیة: ٣٥٩٤ وحسنه.

اس موقع پر آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے مصائب وابتلاء سے دوچار ہونے کی دعا کرو تاکہ اس پر صبر کرنا پڑے۔

بعض علماء کا رجحان ہے کہ ابتلاء وآزمائش پر صبر صحت وعافیت کے موقع پر شکر سے بہتر اور افضل ہے، لیکن دل کو چھوتی ہوئی بات یہ ہے کہ صبر اور شکر میں سے دونوں کے دونوں موقع ومحل کے اعتبار سے اپنے قرین کے حق میں افضلیت کا مقام رکھتے ہیں۔ چنانچہ غنی اور مالدار شخص کے لیے شکر افضل ترین چیز ہے اور مفلس وفقیر کے حق میں صبر کا مرتبہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

سیّدنا ابوسہل صعلوکی رحمہ اللہ سے صبر وشکر کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ ان دونوں میں کون افضل اور برتر ہے؟ تو انہوں نے برجستہ جواب دیا: ''دونوں کے دونوں بذات خود اپنی کیفیت کے اعتبار سے برابر کا درجہ رکھتے ہیں یہ اور بات ہے کہ شکر مالداروں کا مشن ہے اور صبر تنگ دستوں کی بیساکھی ہے۔'' ❶

مصیبت کے وقت شکر ادا کرنا:

مصائب وآلام سے دوچار ہونے والے کے لیے صبر وتحمل کی بجائے اس پر اللہ کی شکر گزاری ادا کرنے کا عظیم مقام ومرتبہ ہے۔ کسی عربی شاعر کا قول ہے:

''میرے نفس کے لیے اس کے مرض کا راز فاش ہوگیا تو اس نے اس کو منظر عام پر لانے سے روگردانی کا رویہ اختیار کیا اور شکر اور حمد کا دامن پکڑ کر اس سے دل کھول کر اپنے گلے شکوے بیان کر ڈالے۔'' ❷

حقیقت میں مصیبت بھی اپنے پہلو میں نعمت چھپائے ہوئے ہوتی ہے جس کا شکر ادا کرنا بندے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

امام الحرمین علامہ جوینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

❶ الدرالمنثور : ۱/ ۳۵۰.

❷ قری الضیف : ۲/ ۳۵۰.

''دنیا کے مصائب بھی بندے سے شکر کے متقاضی ہوا کرتے ہیں بلاشبہ جس کی شکرگزاری بندہ مؤمن پر لازم ہوتی ہے، کیونکہ درحقیقت مصائب وآلام بھی بندے کے لیے نعمت ہی ہوا کرتے ہیں بلکہ مصائب حصول نعمت کی منہ بولتی دلیل ہوا کرتے ہیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ مصائب بندے کے لیے بہت سے فوائد کا پیش خیمہ ہوتے ہیں اور حد سے زیادہ اجر وثواب کا باعث ہوتے ہیں۔ اس سے بہت سی امیدیں برآتی ہیں اور اس سے بڑے اغراض ومقاصد وابستہ ہوتے ہیں جن کے سایہ میں مصائب کی سختی ماند پڑ جاتی ہے اور اس کی چھاؤں تلے مصائب وآلام کی تپش سرد پڑ کر کافور ہو جاتی ہے۔'' [1]

سیّدنا شریح رحمہ اللہ کا قول ہے:

''جب بھی کوئی بندہ کسی مصیبت وابتلاء سے دوچار ہوتا ہے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے اس کو اس کے عوض میں تین نعمتیں بطور تحفہ نصیب ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ جس ابتلاء ومصیبت سے وہ دوچار ہے وہ اس کے دین وایمان کے لیے قاوح نہیں ہے، دوسرے یہ کہ وہ اس ابتلاء سے بڑھ کر نہیں ہے جس سے وہ دوچار تھا اور تیسرے یہ کہ یہ مصیبت تو اس کے لیے مقدر تھی اسے آج نہیں تو کل پیش آنا ہی تھا اور وہ اللہ کے حکم سے واقع ہوئی اس پر گلہ شکوہ کیسا؟'' [2]

بندے کو جب نعمت الٰہیہ کی قدردانی کا یہ گر نصیب ہو جائے اور وہ نعمتوں میں پوشیدہ اس راز سے باخبر ہو جائے تو خود بخود اس کے اندر شکر الٰہی کا جذبہ موجزن ہونا شروع ہو جاتا ہے اور وہ اس بات پر اللہ کا شکر بجا تا ہے کہ جو مصیبت آنی تھی وہ تو آ گئی مگر اللہ کا شکر ہے کہ دین وایمان محفوظ اور صحیح سلامت ہے نیز اس کی وجہ سے اس پر کسی قسم کی زد نہیں پڑی اور نہ ہی اس کی بلاخیزی سے اس کے پائے ثبات میں تزلزل آیا اور یہ مصیبت جتنی ہمہ گیر اور بھیانک تصور کی جا رہی تھی اس سے کہیں کم تر ہو کر رونما ہوئی اس کے بعد بندہ

---

[1] فیض القدیر: ۲/ ۱۳۳۔ [2] تاریخ دمشق: ۲۳/ ۴۲۔

اس بات پر اللہ کی حمد وثنا بیان کرتا ہے اور اس کا شکر ادا کرتا ہے کہ مصیبت آئی اور آ کر چلی بھی گئی مگر اس کے پائے استقامت کو ذرہ برابر ڈگمگا نہ سکی۔ مصیبت کی قدر دانی اور اس کی شکر گذاری میں ممد ومعاون ثابت ہونے والے وسائل وذرائع میں سے مصیبت سے دوچار ہونے کے بعد اس پر مرتب ہونے والے محاسن وفضائل کی معرفت سے آشنائی بھی ہے جیسے کہ اس مصیبت کی پاداش میں حاصل شدہ اجر وثواب کی وصولی ہے جس کا تذکرہ ابھی ابھی گذر چکا اس سلسلہ میں امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''جس شخص کا اس بات پر ایمان نہ ہو کہ مصائب وابتلاء سے دوچار ہونے کا اجر وثواب مصیبت وابتلاء کی شدت وتلخی سے کہیں زیادہ میٹھا اور شیریں ہے تو اس شخص سے مصیبت پر شکر ادا کرنے کی توقع نہیں کی جاسکتی وہ کبھی بھی مصائب وآلام کے گرداب میں پھنس کر شکر ادا نہیں کر سکتا۔''[1]

[1] احیاء علوم الدین: ۴/۱۳۱.

خاتمہ

اللہ تعالیٰ نے ہمیں انواع واقسام کی ظاہری وباطنی نعمتوں سے نواز رکھا ہے۔ لہٰذا بندے کو چاہیے کہ اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے اور شکر گزاری وعبادت شعاری میں اللہ ہی کی ذات کو منفرد قرار دے، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں شاکرین کی وصف بیانی کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ ''ان کی تعداد تھوڑی ہے اور وہ گنے چنے چند لوگ ہوا کرتے ہیں۔'' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴿١٣﴾﴾ (سبا: ١٣)

''اور بہت تھوڑے میرے بندوں میں سے شکر گزار ہیں۔''

اور ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٢٤٣﴾﴾ (البقرة: ٢٤٣)

''بے شک اللہ لوگوں پر بڑے فضل والا ہے اور لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔''

سیّدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا: اے اللہ! مجھے اپنے ان گنے چنے لوگوں میں بنادے جو معدودے چند ہوا کرتے ہیں تو سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس شخص سے کہا کہ تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟ تو مخاطب نے جواب دیا: ''اے امیر المومنین! اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَمَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿٤٠﴾﴾ (هود: ٤٠)

''اور اس کے ہمراہ تھوڑے سے لوگوں کے سوا کوئی ایمان نہیں لایا۔''

بعض نے ان کی تعداد مرد وعورت ملا کر ۸۰ اور بعض نے اس سے بھی کم بتلائی ہے اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴾ (سبا : ١٣)

''اور بہت تھوڑے میرے بندوں میں سے شکر گزار ہیں۔''

اور ایک موقع پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ قَلِيْلٌ مَّا هُمْ ﴾ (ص : ٢٤)

مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے اور یہ لوگ بہت ہی کم ہیں۔''

چنانچہ سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ اس شخص کے منہ سے یہ بات سنی تو بے ساختہ بول اٹھے کہ تم سچ کہہ رہے ہو۔'' [1]

اس کمی کا سبب یہ ہے کہ ابلیس ملعون نے بنی نوع انسانی کو گمراہ کرنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے اور اس بات کا عہد کرلیا ہے کہ بنی آدم کو شکر گذاری کا موقع نہیں دے گا۔ ہر صورت میں وہ ان کے لیے اس راہ کا روڑا بن کر سامنے کھڑا رہے گا تا کہ بہت کم بندے شکر گذاری کی سعادت حاصل کرسکیں۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کے بارے میں خبر دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ اس نے رب کریم کے سامنے عہد کرتے ہوئے یہ بات کہی ہے:

﴿ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ﴾ (الاعراف : ١٧)

''پھر میں ہر صورت ان کے آگے سے اور ان کے پیچھے سے اور ان کی دائیں طرفوں سے اور ان کی بائیں طرفوں سے آؤں گا اور تو ان کے اکثر کو شکر کرنے والے نہیں پائے گا۔''

اس کا مطلب ہے کہ ابلیس لعین نے شکر کی اہمیت کو بھانپ لیا تھا اور اس کی قدر و منزلت کا اندازہ لگالیا تھا جبھی تو وہ اس مقامِ عزت و شرف تک رسائی کے راستے میں رکاوٹ بن کر کھڑا ہوگیا۔ اسی لیے بعض سلف صالحین کا کہنا ہے کہ ''اگر شیطان کو اس بات کا علم ہو جاتا کہ دنیا میں شکر گذاری سے بھی افضل اللہ تعالیٰ کی ذات تک رسائی کا کوئی اور طریقہ کار ہے تو

[1] الزهد للامام احمد : ١١٤.

وہ اس کے سامنے بھی سیسہ پلائی دیوار کی طرح آ کر کھڑا ہو جاتا۔'' ❶ اسی لیے کہا گیا ہے کہ شکر کی ادائیگی بڑا ہی کٹھن اور دشوار کام ہے امام آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے کماحقہٗ شکر کی ادائیگی ناکوں چنے چبانے کے مترادف ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء میں سے سوائے دو افراد کے اس بارے میں کسی کی تعریف نہیں کی ہے (ایک سیّدنا نوح علیہ السلام اور دوسرے سیّدنا ابراہیم علیہ السلام)'' ❷

اور اللہ تعالیٰ کے اس قول ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ﴾ (البلد: ٤) یعنی ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا ہے (مراد یہ ہے کہ انسان کی زندگی محنت ومشقت سے معمور ہے) کے بارے میں (امام حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بندہ خوشی کے عالم میں شکر ادا کرنے کی مشقت سے نبرد آزمائی کرتا ہے اور ابتلاء ومصیبت کے وقت اس پر صبر کرنے کی تکلیف برداشت کرتا ہے ❸ تو معلوم یہ ہوا کہ شکر نام ہے۔ مشقتوں اور آزمائشوں سے نبرد آزمائی اور مجاہدۂ نفس کا۔

اے اللہ! ہمیں قول وقرار میں صائب الرائے ہونے کی توفیق عطا فرما اور اپنی کتاب عزیز اور اپنے نبی ﷺ کی سنت مبین کو گرہ بند بنانے والا بنا دے اور ہم پر تو نے جن نعمتوں وکرم فرمائیوں کا فیضان کیا ہے اس کی شکر گزاری وقدردانی کی سعادت نصیب فرما اور اپنی سپاس گزاری وشکران نعمت کی انجام دہی کا ایسا حوصلہ اور ہمت عطا فرما جو ہمارے لیے تیری رضامندی تک رسائی کا ذریعہ ہو اور ہم کو ابلیس ملعون کے وسوسوں سے محفوظ ومامون رکھ (اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَاء)

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ.

---

❶ فيض القدير: ٥٢٦/١.

❷ روح المعاني: ١٨٩/١٣.

❷ تفسير قرطبي: ٥٦/٢٠.

اپنے فہم وادراک کا امتحان لیں!

ذیل میں اس موضوع سے متعلق سوالات کو دو مرحلوں کو مدنظر رکھتے ہوئے وضع کیا گیا ہے:

سوالوں کی ایک قسم تو وہ ہے جن کا جواب فوراً دینا ہے (اس قسم کے سوالات کو پہلے مرحلہ میں رکھا گیا ہے)۔

سوالوں کی دوسری قسم وہ ہے جو غور وفکر کی متقاضی ہے اس قسم کے سوالات کو دوسرے مرحلہ میں رکھا کیا گیا ہے۔

پہلے مرحلہ کے سوالات جن کا جواب فوراً دینا ہے:

۱۔ حمد اور شکر کے مابین کیا فرق ہے؟ ۲۔ شکر کے تین معانی ہیں، انہیں بیان کریں؟

۳۔ اللہ کی نعمت کا اظہار کرنے کا کیا اصول اور ضابطہ ہے؟

۴۔ کتمان نعمت کب واجب ہوتا ہے؟

۵۔ شکران نعمت یا نعمت کی قدر شناسی کے وجوب کے بارے میں متنوع دلائل وارد ہوئے ہیں ان میں سے ہر نوع کو دلیل کے ذریعہ ثابت کریں، ہر نوع کے لیے ایک دلیل کافی ہے۔

۶۔ نعمت کی قدردانی کے ثبوت کے لیے بہت سے وسائل اور طریقے ہیں ان میں سے اہم ترین وسائل وذرائع کا صراحت کے ساتھ ذکر کریں۔

۷۔ شکر دراصل عبادت ہے اور ہر عبادت کے کچھ ثمرات وفوائد ہوتے ہیں تو شکر کے کیا ثمرات وفوائد ہیں؟

۸۔ رب کریم کی شکرگذاری اور بندے کے احسان کا شکر ادا کرنے کے درمیان کیا فرق ہے؟

۹۔ صبر سے کام لینے والا مفلس وفقیر اور حمد وشکر بجالانے والا غنی وتونگر دونوں میں افضل اور برتر کون ہے؟

۱۰۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی تحریر کردہ کتابوں میں سے ایک کتاب میں شکر اور صبر کے

بارے میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ان کی کتاب کا نام بتلائیں؟

دوسرے مرحلہ کے سوالات جو استنباطی انداز کے ہیں:

۱۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ایمان کے دو حصے ہیں'' نصف شکر ہے اور دوسرا نصف صبر ہے۔اس عبارت کی وضاحت کریں؟

۲۔ نماز کے اندر شکر کے تینوں انواع واقسام کا سنگم ہو جاتا ہے۔اس کو وضاحت کے ساتھ بیان کریں؟

۳۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ ''اپنے رب کی نعمتوں کا اظہار کرو یا انہیں بیان کرو۔'' (الضحیٰ: ۱۱) اس آیت کریمہ میں بندے کو کس چیز کو بیان کرنے کا مکلّف قرار دیا گیا ہے؟

۴۔ بندہ کب اور کس موقع پر (شاکر الانعمه) کے وصف سے متصف ہونے کا مستحق قرار پاتا ہے؟

۵۔ کیا بندے کی اللہ کے لیے شکر گذاری اس کی نعمت کے مقابلہ میں بطور صلہ ہوا کرتی ہے؟

۶۔ حدیث شریف کے اس پیرایہ (لا یشکر اللہ من لا یشکر الناس) کی تشریح کریں؟

۷۔ علمائے کرام نے شکر کے بارے میں ایک صورت کا ذکر کیا ہے جس میں بندے کی طرف اپنے ہم جنس بندے کی شکر گذاری کو حرام قرار دیا گیا ہے؟ وہ کون سی صورت ہے جس میں بندے کی طرف سے بندے کی شکر گذاری حرام ہے؟

۸۔ کفران نعمت کی متعدد صورتیں ہیں ان میں سب سے بڑی صورت کون سی ہے؟

۹۔ ہم مصائب کے موقع پر اللہ کا کیسے شکر ادا کریں؟

۱۰۔ نبی کریم ﷺ نے ((افلا اکون عبدا شکورا)) کس مناسبت سے کہا تھا؟

۱۱۔ دو ایسی کتابوں کا ذکر فرمائیں جن کا بنیادی موضوع شکر ہو اور ان میں شکر کے بارے میں سیر حاصل بحث کی گئی ہو؟

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ.

549
أعمال
القلوب
صبر وتحمل
اخلاص
خوف
شکر
غور وفکر
رضا
ورع
تقویٰ

مقدمہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى اَشْرَفِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ ، نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ . اما بعد !

اللہ تعالیٰ نے صبر کو اس شہ سوار کی مانند بنایا ہے جو کبھی لڑکھڑا کر نہیں گرتا اور صبر کی مثال اس ننگی تلوار کی طرح ہے جو کبھی کند نہیں پڑتی۔ صبر اس لشکر کی مانند ہے جو کبھی ہزیمت کا شکار نہیں ہوتا، اور اس کی مثال اس مضبوط قلعہ کی ہے جس پر حملہ آور غلبہ حاصل کر کے اسے نیست ونابود نہیں کر سکتا، اور صبر اس سواری کے مانند ہے جو اپنے شہ سوار کو لے کر کبھی راستہ نہیں بھٹکتی، صبر وتحمل اور اللہ کی نصرت مدد دونوں جڑواں بھائی ہیں، بلاشبہ اللہ کی نصرت اور مدد صبر کرنے والے کے ساتھ ہے، صبر کا مقام جسم میں سر کی مانند ہے، صبر ہی دنیا وآخرت میں نجات وفلاح اور کامیابی وکامرانی کی کنجی ہے۔ صبر اللہ کے راستہ میں اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر جانوں کے نذرانے پیش کرنے والوں کے لیے بیش بہا تحفہ ہے خصوصاً اس وقت جبکہ نصرت الٰہی کا نزول ہوتا ہوا دکھائی نہ دے اور دعوت وتبلیغ سے وابستہ داعیوں کے لیے اس وقت امید کی کرن ہے جب لوگ اس کی بات ماننے میں پس وپیش سے کام لیں۔ اسی طرح صبر عالم دین کے لیے اس وقت زاد راہ کی حیثیت رکھتا ہے جب وہ علم دین کے حصول کے لیے راہ نوردی کرتے ہوئے غریب الدیاری اختیار کرے گویا کہ صبر چھوٹے بڑے، بچے بوڑھے، کمسن نوجوان، عورت ومرد ہر ایک کے لیے بہترین زاد راہ ہے ان میں سے ہر ایک صبر کا سہارا پکڑتا ہے اور اسی کے دامن رحمت میں آکر پناہ حاصل کرتا ہے اور اسی کے مرکزی پلیٹ فارم سے اپنا سفر شروع کرتا ہے۔

تو سوالات یہ پیدا ہوتے ہیں:

☆ آخر یہ صبر ہے کیا؟

☆ اس کی انواع واقسام کیا ہیں؟

☆ اس کے فوائد وثمرات کیا ہیں؟

☆ کیسے اس پر عزم مقام تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے؟

☆ اور وہ کون سی رکاوٹیں اور آفتیں ہیں جو اس مقام تک رسائی کی راہ میں دیوار بن سکتی ہیں؟

یہی وہ عناصر ہیں جن کے بارے میں ہم اس کتابچہ کے اندر بحث کریں گے یہ اعمال قلوب کے سلسلہ میں لکھے جانے والے مقالات یا اس سلسلہ میں لکھے گئے کتابچوں میں نواں کتابچہ ہے۔اللہ کی توفیق سے جنہیں آپ کے سامنے فائدہ کی غرض سے پیش کرنے کی مجھے سعادت نصیب ہوئی، اس کے ترجمہ وتیاری میں الفرقان ٹرسٹ نے تعاون کیا اور آج یہی مکتبہ والے اس کتابچہ کو چھاپ کر اس کی نشر واشاعت میں حصہ لے رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں ہماری مدد کرے اور ہمیں اس عمل کی انجام دہی میں اپنی نصرت واعانت سے نواز دے۔

محمد صالح المنجد

صبر کی تعریف کا بیان

صبر کی لغوی تعریف:

عربی زبان میں صبر کے معنی حبس یا قید و بند اور روکے رکھنے کے آتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ﴾ (الكهف : ٢٨)

''اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رکھ جو اپنے رب کو پہلے اور پچھلے پہر پکارتے ہیں، اس کا چہرہ چاہتے ہیں۔''

مراد یہ ہے کہ اس طرح کے مؤمنین کو اپنی صحبت سے مستفید ہونے کا موقعہ عنایت فرمایئے اور ان کو اپنی مجلس سے علیحدہ مت کیجیے بلکہ اپنے آپ کو ان کے ساتھ روکے رکھیے۔

بنی اسرائیل نے کہا تھا جس کے بارے میں خبر دیتے ہوئے باری تعالیٰ نے خود یوں ارشاد فرمایا ہے:

﴿ لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ ﴾ (البقرة : ٦١)

''ہم سے ایک ہی کھانے پر کسی صورت میں بھی صبر نہ ہو سکے گا۔''

مراد یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے کفران نعمت کا ثبوت دیتے ہوئے یہ کہا کہ ہم ایک ہی کھانے پر اکتفا کرنے کی خاطر اپنے نفس کو جبراً ہرگز ہرگز روکنے کی طاقت نہیں رکھتے گویا کہ ایک طرح کا کھانا (من وسلوی) پر اکتفا کر کے ہم صبر نہیں کر سکتے۔

کہا جاتا ہے (قُتِلَ فُلانٌ صبرًا) مراد یہ ہے کہ اسے قتل کرنے کی غرض سے قید کر لیا گیا ہے اب اسے اس وقت تک قید و بند کی صعوبت برداشت کرنی پڑے گی حتی کہ قتل کر دیا

جائے۔ میزان صرفی کے اعتبار سے کہا جائے گا (صبر ، یصبر ، صبرا) نیز زبان وادب کے اعتبار سے صبر (جزع وفزع) کی ضد ہے ان میں سے ہر ایک کے معنی ایک دوسرے کے عکس ہوا کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے (رجل صابر ، وصبار ، وصبیر ، وصبور) اور عربی زبان میں مؤنث کا صیغہ بھی (صبور) ہی آتا ہے۔

اور جب کہا جائے (التصبر) تو اس سے مراد یہ ہے کہ اس نے مشقت اور صعوبت برداشت کر کے صبر کیا۔ مراد یہ ہے کہ دکھاوے کی خاطر بلاوجہ کا بطور تکلف صبر کا مظاہرہ کیا۔

اور کہا جاتا ہے صبر کے پانچ مختلف مراتب اور درجات ہیں:

(۱) صابر (۲) مصطبر (۳) متصبر

(٤) صبور (٥) وصبار

ان میں سے صابر تو صبر کے سلسلہ میں عام طرح کے مرتبہ پر فائز شخص کو کہا جاتا ہے اس کے بعد مصطبر کا مرتبہ ہے یعنی صبر پر جما رہنے والا اور ابتلاء سے دوچار شخص اسی طرح (متصبر) کہہ کر وہ شخص مراد لیا جاتا ہے جو بناوٹی طور پر صبر کرے اور اپنے نفس کو دکھاوے کی غرض سے بناوٹی صبر کے لیے آمادہ کرے اور (صبور) سے مراد صبر عظیم کا مظاہرہ کرنے والا۔ جس کا صبر لوگوں میں مثال ہو جس نے صبر کی انتہا کر دی ہو۔ بایں طور کہ اس کا مدمقابل اس کی سکت نہ رکھتا ہو اور (صبار) سے مراد حد سے زیادہ صبر وتحمل سے کام لینے والا۔ [1]

صبر کی اصطلاحی اور فنی تعریف:

نفس کو مرغوبات ومحبوبات سے روکنے کی مشقت وصعوبت برداشت کرنا اور ہوائے نفس کے چنگل میں پھنس جانے سے نفس کو بچائے رکھنا صبر کہلاتا ہے۔

یا نفس کو اس چیز کی انجام دہی کی طرف گامزن رکھنا جس کی انجام دہی اللہ کو مطلوب ہے اور اس عمل کی انجام دہی سے روکے رکھنا جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔

اسی لیے مصیبت وابتلاء کا مقابلہ کرتے ہوئے ڈٹے رہنے والے شخص کو (صابر) کہا

[1] ملاحظہ ہو: لسان العرب : ٤/٤٣٧۔ القاموس المحیط : ١/٥١٤.

جاتا ہے کیونکہ اس نے اپنے نفس کو جزع وفزع سے روکے رکھا۔ لہٰذا اس کو صابر کہا گیا۔

ماہ رمضان کو ''شہر صبر'' کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ مسلمانان عالم اس ماہ مبارک کے ایام میں کھانے پینے اور شہوت وغیرہ پوری کرنے کی عادت سے اجتناب کی مشقت وصعوبت برداشت کرتے ہیں۔

صبر وتحمل کے مراتب ودرجات:

صبر کا کوئی ایک مرتبہ نہیں جس پر اکتفا کرلیا جائے بلکہ اس کے مختلف مراتب ومراحل ہیں اور ان میں سے بعض بعض سے افضل وبرتر ہیں۔

چنانچہ اللہ کی طاعت وبندگی کی بارے میں نفس پر قابو پا کے اس کی انجام دہی کی صعوبت اور مشقت برداشت کرنا صبر کے سلسلہ میں بڑا ہی بلندترین مرتبہ ہے۔ اس کی قدر و قیمت معاصی سے اجتناب پر صبر سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ واجبات کی جنس کے اعمال کی انجام دہی اللہ کے نزدیک ترک منکرات کی جنس سے متعلق اعمال سے اجتناب کے بارے میں قدرومنزلت کے اعتبار سے کہیں اعلیٰ وارفع ہے اس کا مرتبہ بڑا ہی عظیم الشان ہے بنسبت ترک منکرات کے۔

معاصی سے پرہیز واجتناب باعث رنج وغم یا ایسی تقدیر جو کہ باعث مصائب وآلام ہو اس پر صبر وتحمل سے کہیں بلند وبالا مقام کی حامل ہے کیونکہ واجب کی ادائیگی پر صبر اور محرمات کے ارتکاب سے اجتناب یا ترک حرام پر نفس کشی ایک اختیاری بات ہے۔ لیکن مصیبت وابتلا ایک غیراختیاری چیز ہے یہ بندے کی دسترس سے بالاتر بات ہے بلکہ اس کی وقوع پذیری اجباری ہے قضاوقدر کی رو سے اسے وقوع پذیر ہونا ہی ہونا ہے اس لیے اس پر صبر وتحمل کرنے کا نمبر اللہ کی طاعت وبندگی اور اس کے ذنوب ومعاصی سے اجتناب پر صبر وتحمل کی انجام دہی کے بعد آتا ہے۔

اس بارے میں علامہ ابن قیم رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

''میں نے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کو کہتے ہوئے سنا ہے، آپ کے الفاظ ہیں کہ سیّدنا

یوسف علیہ السلام کا عزیز مصر کی بیوی کی خواہش کی اتباع نہ کرنے پر صبر و نفس کشی کا مرتبہ ان کے بھائیوں کے انہیں اندھے کنویں میں ڈال دینے اور ان کو کوڑیوں کے دام بیچ ڈالنے اور ان کے درمیان اور ان کے والد کے درمیان تفریق ڈالنے کی حرکت پر صبر و تحمل سے مرتبہ میں کہیں عظیم الشان ہے کیونکہ یہ سارے کے سارے امور جو کہ سیّدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی جانب سے پیش آئے غیر اختیاری ہیں۔ اس میں سیّدنا یوسف علیہ السلام کا کوئی قصور نہ تھا خصوصاً اس موقع پر جب کہ معاملہ غیر اختیاری ہو تو اس صورت حال میں بندے کے لیے صبر کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ اور عزیز مصر کی بیوی کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا وہ اختیاری تھا۔ اس لیے اس موقع پر صبر کرنا عارفین کا مرتبہ ہے۔ اسی لیے اس قسم کے صبر کی شان زیادہ ہے۔

جہاں تک بندے کا معاصی پر صبر کا معاملہ ہے تو وہ اختیاری ہے۔ اس میں بندے کو اختیار ہوتا ہے چاہے تو یہ کام کرے اور چاہے تو نہ کرے اور نفس سے محاذ آرائی کرتے ہوئے ذنوب و معاصی سے اجتناب کرے۔ خاص طور پر اس موقع پر جبکہ اسباب و وسائل بھی مہیا ہوں اور اس کے کر گذرنے کا داعیہ بھی پایا جاتا ہو اور طبیعت کا میلان بھی اس طرف ہو سکتا ہو جیسا کہ سیّدنا یوسف علیہ السلام کا عزیز مصر کی بیوی کے ساتھ معاملہ تھا۔ وہاں پر سارے اسباب و دواعی مہیا تھے کیونکہ اس وقت سیّدنا یوسف علیہ السلام کی چڑھتی جوانی تھی اور آپ علیہ السلام شادی شدہ بھی نہ تھے۔ آپ کے پاس اس کا نعم البدل بھی نہ تھا جو آپ کی شہوت کی تمازت کو کم کر سکتا اور آپ وہاں اجنبی تھے اور اجنبی ایک ان جانے ملک میں اپنے اجنبی پن کی وجہ سے اس طرح کے معاملہ میں اتنی شرم محسوس نہیں کرتا جتنی کہ اس کو اپنے دوستوں، ہم نشینوں اور اہل وعیال کے مابین محسوس ہوتی ہے اور آپ عزیز مصر کے یہاں ایک غلام کی حیثیت سے اپنے شب و روز گذار رہے تھے اور غلام کے اندر آزاد شخص کی طرح جھجھک نہیں ہوتی بلکہ وہ تو غلام بے دام ہوتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ عورت بڑی ہی حسین و جمیل تھی اور منصب اور عہدہ والی تھی اور سیّدنا یوسف علیہ السلام کی آقا تھی اور وہاں پر کوئی نگرانی کرنے والا بھی موجود نہ تھا جس کا کھٹکا لگا ہو اور یہ حسن کا پیکر خود آپ علیہ السلام کو اس کام کی دعوت دے رہی تھی۔ وہ دل و جان سے

آپ پر فریفتہ تھی اور اپنی خواہش کی تکمیل کا اسے حد سے زیادہ ارمان تھا اور کسی صورت میں بھی وہ اپنے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنا چاہتی تھی۔ ان تمام وسائل کے باوجود وہ دھمکی بھی دیتی جارہی تھی کہ اگر انہوں نے اس کی خواہش پوری نہ کی تو انہیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں گی اور ذلت واہانت سے دوچار ہونا پڑے گا ان تمام اسباب کی موجودگی کے باوجود سیّدنا یوسف علیہ السلام نے صبر و تحمل سے کام لیا اور اللہ کے پاس اس کے بدلے میں جو اجر و ثواب ہے، اس کو مدنظر رکھتے ہوئے جگر گردہ پتہ کیا، لہٰذا اس صبر اور کنویں میں ڈالے جانے پر صبر میں کیوں کر برابری ہوسکتی ہے (کنویں میں ڈالے جانے پر صبر اختیاری صبر نہ تھا بلکہ اس کی حیثیت عزیز مصر کی عورت کے ساتھ صبر سے جدا تھی) وہ صبر صبر اجباری تھا اور اسی لیے اس میں اور اس میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

اطاعت وفرماں برداری کے کاموں پر صبر و تحمل سے کام لینا محرمات ومنہیات سے اجتناب افضل و برتر ہے یہ تو کاملین وعارفین کا مرتبہ ہے کیونکہ شارع حکیم کے نزدیک اطاعت وفرماں برداری کی انجام دہی کی مصلحت معصیت ونافرمانی سے کنارہ کشی کی مصلحت وپالیسی سے کہیں زیادہ مرغوب ومحبوب ہے اور شارع حکیم کے نزدیک بندگی وتابع داری، فرماں برداری وتعمیل حکم میں خلل اندازی یا اس میں فساد وفتور معصیت وانحراف، نافرمانی وعدم تعمیل، حکم میں خلل اندازی اور اس میں فساد وفتور کے وقوع کے سلسلہ مبغوض ترین چیز ہے۔

صبر کا شرعی حکم:

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صبر و تحمل سے کام لینے کا بذات خود حکم صادر فرمایا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا ۫ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۲۰۰ ﴾ (آل عمران : ۲۰۰)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! صبر کرو اور مقابلے میں جمے رہو اور مورچوں میں ڈٹے رہو اور اللہ سے ڈرو، تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔''

ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ﴾ (البقرة : ٤٥)

''اور صبر اور نماز کے ساتھ مدد طلب کرو۔''

جہاں مذکورہ صورت حال کے برعکس معاملہ ہو وہاں شارع حکیم نے صبر کرنے سے منع فرمایا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَ لَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ﴾

(محمد : ٣٥)

''پس نہ کمزور بنو اور نہ صلح کی طرف بلاؤ اور تم ہی سب سے اونچے ہو اور اللہ تمھارے ساتھ ہے۔''

اور مشرکین سے برسرپیکار رہنے والے جوانمردوں سے عین مقابلہ کے موقعہ پر یا میدان کارزار میں آمنے سامنے ہونے والے جانبازوں کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ﴾ (الانفال : ١٥)

''ان کو پیٹھ دکھا کر میدان کارزار سے راہ فرار اختیار نہ کرنا۔''

اور ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا﴾ (آل عمران : ١٣٩)

''تم سستی نہ کرو اور نہ ہی غمگین ہو۔''

مراد یہ ہے کہ سختیوں سے گھبرا کر دشمنان خدا کے مقابلہ میں کہیں سستی و پژمردگی کا شکار نہ ہو جانا اور پیش آمدہ حوادث و مصائب پر غمگین ہو کر کہیں بیٹھ نہ رہنا۔

صبر پانچ قسم کے احکامات تکلیفیہ کے مدار میں چکر لگاتا ہے، لہٰذا صبر میں سے کوئی قسم واجب کا حکم رکھتی ہے تو کوئی مستحب اور کوئی مکروہ کی قبیل سے ہے تو کسی کا تعلق حرام سے ہے اور اس میں کوئی قسم مباح بھی ہے۔ یہی وہ اقسام ہیں جن کے اردگرد صبر چکر کاٹتا ہے اور انہیں

اقسام کو اس باب میں احکامات تکلیفیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔"❶

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کو صبر کرنے اور نہ کرنے کا اختیار ہوتا ہے چاہے تو کر لے اور یہ الوالعزمی کی بات ہوتی ہے اور چاہے تو نہ کرے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہوتا ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۚ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ﴿١٢٦﴾﴾ (النحل : ١٢٦)

"اور اگر تم بدلہ لو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنی تمھیں تکلیف دی گئی ہے اور بلاشبہ اگر تم صبر کرو تو یقیناً وہ صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے۔"

اس صورت حال میں اگرچہ مظلوم کو پورا اختیار ہے کہ وہ ظالم سے بھرپور بدلہ لے مگر ظلم نہ کرے لیکن انتقامی جذبہ کی آگ کو اپنے صبر کی برودت سے ٹھنڈا کر ڈالے وہ عاقبت کے اعتبار سے انتقام لینے سے کہیں بہتر اور افضل ہے۔ اس توضیح سے یہ ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ صبر کی مختلف اقسام میں سے ایک قسم وہ بھی ہے جس کو صبر مستحب کہا جاتا ہے اگر صبر ہر صورت میں وجوب کا حکم رکھتا تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ مذکورہ صورتحال میں صبر کو ضرور واجب قرار دیتا۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ اس صورتحال کی مزید توضیح کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

"واجب پر صبر کرنا واجب کا حکم رکھتا ہے اور واجب کے خلاف حکم شرعی کو پس پشت ڈالتے ہوئے صبر کرنا حرام ہے اور حرام سے اجتناب کرتے ہوئے نفس کشی کرنا واجب ہے اس کے برعکس حرام پر عمل پیرا ہوتے ہوئے صبر کرنا حرام ہے، جیسا کہ مستحب صورتحال کی وجہ سے صبر کرنا مستحب ہے اور مستحب چیزوں پر احکامات شرعیہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے صبر کرنا مکروہ ہے اور مکروہات سے اجتناب کرتے ہوئے صبر کا دامن تھامے رہنا مستحب ہے نیز مکروہات کے ارتکاب کی خاطر جی مارنا مکروہ ہے اور مباح کی خاطر صبر وتحمل کا مظاہرہ کرنا مباح ہے۔"❷

---

❶ مدارج السالكين : ٢/١٥٦-١٥٧.
❷ عدة الصابرين وذخيرة الشاكرين : ٢٣.

لٰہذا کہا جاسکتا ہے احکام واجبہ کی خاطر صبر کرنا واجب ہے اور محرمات سے اجتناب کرتے ہوئے صبر کا سہارا لینا بھی واجب ہی کی قبیل سے ہے اور اللہ تعالیٰ کی المناک اور دردناک قضا وقدر پر جزع وفزع نہ کرنا اور اس پر ناراضگی وبرہمی کا اظہار نہ کرنا بھی وجوب کے زمرے میں آتا ہے۔

اس بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ نماز فجر کی ادائیگی پر صبر وتحمل سے کام لینا واجب ہے۔

زنا ودواعی زنا پر صبر کرنا واجب کی قبیل ہے۔

مصیبت سے دوچار ہوتے وقت نفس پر کنٹرول کرنا اور نوحہ وماتم نہ کرنا اور ناراضگی وبرہمی کا مظاہرہ نہ کرنے کا بھی اسی نوع میں شمار ہے اور مندوبات ومکروہات سے اجتناب پر صبر کرنا مستحب ہے۔

اس بنیاد پر قیام اللیل کے لیے اٹھنے پر صبر کرنا مستحب ہے۔

اور کھڑے ہوکر پانی نہ پینے کی خاطر صبر کا مظاہرہ کرنا مستحب ہے۔

اور کبھی کبھار صبر مکروہات میں شمار ہوتا ہے مثال کے طور پر اگر کسی بندے نے مستحب کام کرنے کی خاطر صبر وتحمل کی مشقت برداشت کی اور اس کام کو قصداً انجام نہ دیا اسی طرح مکروہ کام کی انجام دہی پر صبر کرنا مکروہ کہلاتا ہے۔

کبھی صبر کرنا شرعاً حرام سمجھا جاتا ہے اور وہ حرام کاری کے ارتکاب کی خاطر صبر وتحمل سے کام لینا ہے مثال کے طور پر کوئی شخص طاقت وقوت اور اثر ورسوخ کے باوجود اس وقت صبر سے کام لے جبکہ کوئی بدنیت اس کے اہل خانہ سے بدخواہی کرنے کا قصد کرے اور اس پر بری نگاہ ڈالے تو ایسے وقت صبر وتحمل حرام ہے۔

اور کبھی صبر کرنا شریعت کی رو سے مباح سمجھا جاتا ہے وہ مباح پر صبر کرنا ہے یا مباح کے دفاع میں نفس کو مارنا ہے۔

محل وقوع کے اعتبار سے صبر کی انواع واقسام

اس اعتبار سے صبر کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ بدنی ۲۔ نفسی

پھر اس تقسیم کے بعد صبر کی یہ دونوں قسمیں دو گروپوں میں بٹ جاتی ہیں:

۱۔ اختیاری ۲۔ اضطراری

اس طرح گویا کہ محل وقوع کے اعتبار سے صبر کی چار قسمیں ہو گئیں:

۱۔ **بدنی اختیاری:** جیسے کہ مشقت طلب کاموں کی انجام دہی پر جی مارنا۔

۲۔ **بدنی اضطراری:** جیسے کہ پٹائی کھاتے وقت چوٹ کو برداشت کرنا، کیونکہ پٹائی کے وقت صبر کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا اس وقت بہر صورت پٹائی کے درد والم کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔

۳۔ **نفسی اختیاری:** مثال کے طور موسیقی اور گٹار یا سارنگی وغیرہ نہ سننے کے لیے نفس کو آمادہ کرنے پر صبر وتحمل سے کام لینا۔

۴۔ **نفسی اضطراری:** جیسا کہ محبّ کا محبوب کے داغ مفارقت کے رنج وغم پر صبر وتحمل سے کام لینا خصوصاً اس وقت جبکہ محبوب کو اس سے جدا کر دیا گیا ہو یا اس کے درمیان اور محبوب کے درمیان کوئی رکاوٹ کھڑی کر دی گئی ہو۔

چوپائے بھی مؤخر الذکر دونوں قسموں میں انسانوں کی طرح ہوا کرتے ہیں وہ ان دونوں طرح کے صبر میں انسانوں کے ہم پلہ ہیں لیکن جب صبر اختیاری کا معاملہ آتا ہے تو وہاں پر جانوروں اور انسانوں کا راستہ جدا جدا ہو جاتا ہے وہاں پر انسان کو امتیازی خصوصیت حاصل ہو جاتی ہے اور وہ اس باب میں اپنی نرالی شان کی وجہ سے جانوروں سے ممیّز سمجھا جاتا ہے۔

صبر و تحمل کی انجام دہی کا موزوں ترین وقت

اس بارے میں سیّدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ایک عورت کے پاس سے گذر ہوا جو ایک قبر پر بیٹھی رو پیٹ رہی تھی تو نبی کریم ﷺ نے اسے مخاطب کر کے فرمایا: ''اللہ سے ڈر اور صبر و تحمل سے کام لے۔'' تو اس عورت نے جواب دیا: ''تم کو اس سے کیا سروکار ہے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اور مجھ سے دور ہو جاؤ۔'' تم کو میری مصیبت کا کیا اندازہ؟ تم اگر میری طرح مصیبت سے دوچار ہو تو تمہیں پتہ چلے مگر تم تو اس سے ناواقف ہو۔ نبی کریم ﷺ نے اس عورت سے اس حال میں بحث و مباحثہ کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اس طرح کی صورتحال سے نپٹنے کے لیے ایک داعی کے لیے یہی موزوں ترین اسلوب دعوت ہے اور یہی مناسب اور صحیح موقف کا انتخاب ہے بعد میں اس کو بتلایا گیا یہ نبی کریم ﷺ تھے جو تم کو نصیحت کر رہے تھے یہ سن کر وہ نبی کریم ﷺ کے دروازے پر نبی کریم ﷺ سے معذرت کی غرض سے خود چل کر آئی تو دیکھتی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے دروازے پر نہ کوئی سکیورٹی گارڈ ہے اور نہ کوئی چوکیدار۔ اس نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بطور معذرت عرض کیا: مجھے معاف فرما دیجیے میں نے آپ ﷺ کو پہچانا نہیں تھا تو نبی کریم ﷺ نے جواباً ارشاد فرمایا:

> ''صبر تو غم واندوہ سے دوچار ہوتے وقت اول وہلہ میں ہوتا ہے اب اس پر کف افسوس ملنے سے کیا فائدہ؟'' [1]

امام قرطبی رحمہ اللہ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''نفس انسانی پر صبر و تحمل اس وقت بڑا ہی شاق گذرتا ہے جبکہ مصیبت کا اس پر حملہ ہو اور معاملہ گرم ہو اس موقع پر صبر کا ثواب بھی بڑا ہی عظیم الشان ہے۔ اس وقت صبر کرنا جگر گردے کی بات ہے اور صبر و استقامت کے بلند ترین مرتبہ پر

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب زیارۃ القبور: ۱۲۸۳۔ صحیح مسلم: ۹۲۶.

ثابت قدمی کی دلیل بھی اور جب معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے اور مصائب وآلام کی تلخی ختم ہو جائے تو پھر تو سب کو صبر آ ہی جاتا ہے۔ اس میں کوئی بڑی بات نہیں اسی لیے کہا گیا ہے عقل منداور ہوشمند شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ مصیبت وابتلاء کے وقت احمق شخص سے تین گنا زیادہ چوکس وچوکنا رہے۔'' ❶

صبر کی حقیقت اور اس کی قدر ومنزلت

ا۔ اللہ کی اطاعت وفرماں برداری پر صبر کی بڑی قدر وقیمت ہے:

صبر کے مختلف انواع واقسام میں سے قدر ومنزلت میں بلندترین مرتبہ اور نفوس انسانی پر بوجھل ترین چیز اللہ کی اطاعت وفرماں برداری پر صبر وتحمل ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں مختلف مقامات پر اس کا حکم دیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ﴾ (مریم: ٦٥)

''سو اس کی عبادت کر اور اس کی عبادت پر خوب صابر رہ۔''

یعنی کسی کے کہنے سننے کی پرواہ مت کرو اپنے دل کو خدا کی بندگی پر جمائے رکھو جو سارے جہان کا رب ہے اور سب سے نرالی صفات رکھتا ہے۔

مذکورہ آیت کریمہ میں لفظ (اصطبر) کا ورود ہوا ہے اور یہ لفظ (اصبر) کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے، چونکہ ترکیب جملہ میں الفاظ کی زیادتی معنی کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے اس قاعدۂ کلیہ کی بنیاد کہا جاسکتا ہے کہ (لفظ) اصطبر (اصبر) کے مقابلہ میں زیادہ فصیح و بلیغ ہے اور اپنے معنی و مراد کی طرف دلالت میں زیادہ موزوں ومناسب ہے بنسبت (اصبر) کے۔ مراد یہ ہے کہ لفظ (اصطبر) یہاں پر معنی کی طرف رہنمائی کرنے میں اکمل واتم ہے اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا﴾ (طه: ١٣٢)

---

❶ تفسیر القرطبی : ٢/١٧٤.

''اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دے اور اس پر خوب پابند رہ۔''

مراد یہ ہے کہ نماز کی ادائیگی پر پابندی کے ساتھ جم جایئے اور اپنے گھر والوں اور اہل وعیال کو بھی اس کی تاکید کرتے رہیے۔

اطاعت وبندگی کے کاموں میں صبر کے تین مراحل ہیں:

الف :......اطاعت وبندگی کی ابتدا سے پہلے کا مرحلہ۔

کسی بھی عبادت کی ابتدا میں نیت کی درستگی اور تصحیح ہدف کا مرحلہ بنیادی مرحلہ ہوتا ہے اس پر صبر وتحمل سے کام لینا اور ریاء کاری کے دواعی کو جذب اندوں سے آمیزاں نہ ہونے دینے پر صبر کرنا اس سلسلہ کا اولین مرحلہ ہے۔

ب:......اثنائے اطاعت وبندگی بیچ منجدھار میں موجوں سے نبرد آزمائی کا مرحلہ آتا ہے۔

وہ یہ ہے کہ اللہ کی عبادت وبندگی کی راہ میں اثنائے عبادت اللہ سے عدم غفلت ولاپرواہی کے بارے میں صبر وتحمل کا مظاہرہ کرنا اور اللہ کی عبادت وبندگی میں سستی وکاہلی میں مبتلا نہ ہونا اور اس کے ارکان وواجبات وغیرہ کی رورعایت کرنا یہ اثنائے طاعت وبندگی مذکورہ چیزوں کی رعایت اس سلسلہ کا دوسرا مرحلہ ہے۔

ج:......عبادت وبندگی سے فراغت کے بعد کا مرحلہ ہے۔

یہ وہ مرحلہ ہے جس میں بندے کو بڑی احتیاط کی ضرورت درپیش ہوتی ہے بایں طور اس نے جو عبادت وریاضت کا فریضہ انجام دیا ہے اس کا ڈھنڈھورا نہ پیٹے بلکہ اس کو صیغہ راز میں رکھے اور اس راز کو افشا نہ ہونے دے اور نہ ہی غرور کا شکار ہو اور نہ ہی اس کی انجام دہی پر کسی قسم کا احسان جتلائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا تُبْطِلُوا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰى﴾ (البقرۃ: ۲٦٤)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے صدقے احسان رکھنے اور تکلیف پہنچانے سے برباد مت کرو۔''

اور ایک دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَا تُبْطِلُوٓا اَعْمَالَكُمْ﴾ (محمد : ۳۳)

''اے ایمان والو! اپنے ایمان کو غارت مت کرو۔''

۲۔ معصیت و نافرمانی سے کنارہ کشی واجتناب پر صبر کی بڑی قدر و قیمت ہے:

اس کا معاملہ بھی سابق الذکر مسئلہ کی طرح ہے۔ معصیت کو ترک کرنے سے پہلے اس سے کنارہ کشی کی نیت کا استحضار کر کے اپنے نفس پر کنٹرول کی جدوجہد کرنا ضروری ہے۔ جب نفس پر قابو پا کر اسے ترک کر دیا تو اس سے گلوخلاصی کے دوران اس پر صبر کرنا اور اسکی انجام دہی سے پرہیز کرنے کے بارے میں نفس کشی کرنا اس سلسلہ کا دوسرا مرحلہ ہے اور گناہوں کے اسباب کو اپنے اندرون سے نکال دینے کے بعد اس کے عدم انجام دہی کی توفیق مل جانے کی وجہ سے غرور و تکبر میں مبتلا نہ ہونا بھی اس سلسلہ کا آخری مرحلہ ہے۔

۳۔ مصائب پر صبر کی بھی بڑی قدر و منزلت ہے:

امام مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''صبر جمیل تو وہ نعمت ہے جس پر جزع وفزع کی گنجائش ہی نہیں۔''[1]

جو چیز صبر وتحمل کے منافی ہے وہ نوحہ و ماتم، جزع وفزع، نالہ وشیون ہے، جسے کرایہ کی نوحہ کرنے والی عورتیں کیا کرتی ہیں یا یہ ان جیسی پیشہ ور خواتین کی عادت ہوا کرتی ہے۔ صبر کرنے کے بجائے ان کا کام گالوں پر تھپڑ رسید کرنا، گریباں چاک کرنا، کپڑے نوچنا اور لباس چاک کر کے تار تار کر ڈالنا اور سر پٹخنا، شور و واویلا، چیخ و پکار اور جاہلی نعرے بازی کرنا ہوتا ہے یہ اور اس طرح کی تمام چیزوں سے پرہیز کرتے ہوئے اس موقع پر صبر وتحمل سے کام لینے کی بڑی قدر و منزلت ہے۔

جیسے انسان اپنے امراض وعلل کو طبیب یا ڈاکٹر یا حکیم کے سامنے کھول کر بیان کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں اسی طرح مرض کی شدت کی وجہ سے کراہنا یا تکلیف محسوس کرنا جس کا قصد نفس کو تسلی دینا اور سکون حاصل کرنا ہو یا کرب والم سے راحت کے خیال سے ایسا کرنا

---

[1] تفسیر ابن کثیر : ۶۱۹/۲.

جائز ہے، اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

جہاں تک سفیان ثوری رحمہ اللہ کا یہ قول ''تین چیزوں کو صبر میں شمار کیا جاتا ہے: (۱) کسی کے سامنے اپنی تکلیف کی شکایت نہ کرنا۔ (۲) اپنی مصیبت کا کسی کے سامنے گلہ شکوہ نہ کرنا۔ (۳) اور خود اپنے میاں مٹھو بن کر اپنی ذات کا تزکیہ نہ کرنا عین صبر ہے۔'' [1]

اس قول کی تشریح وتوضیح میں کہا گیا ہے کہ یہاں پر سیّدنا سفیان ثوری رحمہ اللہ کے اس مقولہ کا مقصد یہ ہے کہ بندہ اپنے کرب یا اپنی مصیبت کو ناراضگی وناخوشی یا اللہ کی قضاوقدر پر عدم اطمینان کی بنیاد پر بیان نہ کرے اور ہرکس وناکس کے سامنے اسے گاتا نہ پھرے اور مذکورہ اسباب کی بنیاد پر اس کا برسرعام ڈھنڈورا نہ پیٹے، اگر اس کے پس پردہ کوئی نیک نیتی یا اجروثواب والی غرض پوشیدہ ہوتو اس کا بیان کرنا جائز ہے، اس میں کوئی حرج نہیں مثال کے طور پر تم لوگوں کے سامنے امراض کے علاج ومعالجہ کی غرض سے لوگوں سے دریافت کرو یا اس مصیبت سے چھٹکارے اور نجات کی غرض سے اپنا حال دل بیان کرڈالو یہ اور اس طرح کی صورت حال میں اس کا جواز ہے کیونکہ اس طرح کا رویہ اللہ تعالیٰ کی قضا وقدر سے ناراضگی اور خفگی نہیں کہلاتا اور ایسا کرنے سے انسان صبر وتحمل کے دائرے سے خارج قرار نہیں دیا جاسکتا۔

یہاں پر اس حقیقت کا بھی انکشاف کردوں کہ ہر وہ شخص جو صبر سے کام لینے کا دعوی کرے اسے صابر نہیں کہا جاسکتا بلکہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جن کا ظاہر حال گواہی دیتا ہے کہ وہ مصائب پر صابر وشاکر ہیں لیکن درحقیقت وہ جزع فزع کا شکار ہوتے ہیں جس کی بنیاد پر صبر کے اجروثواب سے محرومیت ان کا مقدر بن جاتی ہے۔

صبر وتحمل کے فوائد وثمرات

صبر وتحمل بہت سے ثمرات وفوائد کے حصول کا ذریعہ ہے اور بہت زیادہ منافع کی دستیابی کا وسیلہ ہے، عظیم الشان خوبیوں کا گنجینہ ہے اور مؤمن کے لیے ہر طرح کی بھلائی سے آراستگی

---

[1] تفسیر الطبری: ۷/ ۱٦٠.

کا ذریعہ ہے۔ کسی عربی شاعر کا قول ہے:

''میں دشواریوں اور سختیوں کو آسان سمجھتا رہتا ہوں حتی کہ میں اپنی دلی خواہش کو حاصل نہ کرلوں اور صبر کرنے والے کی امنگیں اور امیدیں بہرصورت شرمندۂ تعبیر ہو کر رہتی ہیں۔'' ❶

اللہ کے نبی سیّدنا یوسف علیہ السلام کے واقعہ پر تدبرانہ نظر ڈال کر دیکھو جب انہوں نے اپنی بے جا قید و بند کی صعوبت پر صبر وتحمل سے کام لیا تو ان کے صبر نے ان کو غلامی سے آزاد کرا کر حکومت کے تخت پر فائز کردیا۔ کسی عربی شاعر کا قول ہے:

''کیا اللہ کے رسول علیہ السلام کی مظلومانہ قید و بند اور تہمت کی آلودہ طرز زندگی میں تمہارے لیے اسوہ اور نمونہ کا سامان نہیں جنہوں نے صبر جمیل کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک لمبے عرصہ تک حبس بے جا کی سزا کاٹی جس کے نتیجہ میں صبر جمیل نے انہیں سیاہ وسفید کا مالک بنا کر تخت شاہی کا حق دار بنادیا۔'' ❷

امام غزالی رحمہ اللہ اس بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے صابرین کو مختلف اوصاف سے متصف کیا ہے اور قرآن کریم میں کم وبیش ستر (۷۰) جگہ صبر کا تذکرہ فرمایا ہے نیز بلند وبالا درجات اور خیرات وبرکات کو صبر کی طرف منسوب کیا ہے اور اسے صبر کا ثمرہ اور نتیجہ قرار دیا ہے۔'' ❸

لہٰذا ہم یہاں پر ان بعض فوائد وثمرات کا ذکر کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں جو محض صبر کی وجہ سے صابرین کے لیے منتج ہو کر منظر عام پر آتے ہیں۔

کامیابی وکامرانی صبر وتحمل کا نتیجہ ہے:

قرآن کریم نے صبر وتحمل اور فلاح وکامیابی کو باہم مربوط کر کے دونوں کا رشتہ مستحکم کردیا ہے اور کامیابی وکامرانی کو صبر کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

❶ روح المعانی: ۱۷۶/۴۔ ❷ تاریخ بغداد: ۴۷۹/۱۳۔

❸ احیاء علوم الدین: ۶۱/۴۔

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا ۟ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٢٠٠﴾﴾ (آل عمران : ٢٠٠)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! صبر کرو اور مقابلے میں جمے رہو اور مورچوں میں ڈٹے رہو اور اللہ سے ڈرو، تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔''

آیت کریمہ میں کامیابی وکامرانی کو ان امور کے ساتھ مربوط کر کے بیان کیا گیا ہے جن کا تذکرہ وضاحت کے ساتھ اس میں موجود ہے۔

صبر وتحمل حفاظت فراہم کرنے کا ذریعہ ہے:

اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو اس بات کے حکم سے آگاہ کر دیا ہے کہ بلاشبہ وہ گھاٹے اور خسارے میں ہے الا یہ کہ جو ایمان لائے اور بارگاہ الٰہی میں سر تسلیم خم کر دے اور نیک عمل کرے اور صبر وتحمل سے کام لینے والا ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''زمانے کی قسم ہے! (مراد شب وروز ہیں) بلاشبہ انسان سراسر نقصان اور گھاٹے میں ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے اور (جنہوں نے) آپس میں حق کی وصیت کی (مراد اللہ کی شریعت کی پابندی اور محرمات ومعاصی سے اجتناب کی) تلقین کی اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔'' مراد مصائب وآلام پر صبر، احکام وفرائض شریعت پر عمل کرنے میں صبر، معاصی سے اجتناب پر صبر، لذت وخواہشات کی قربانی پر صبر، صبر بھی اگرچہ تواصی بالحق میں شامل ہے تاہم خصوصیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے الگ ذکر کیا گیا ہے۔ (العصر : ١، ٣)

صبر وتحمل مغفرت اور اجر عظیم کے حصول کا ذریعہ ہے:

عمل صالح کی انجام وہی کے ساتھ صبر وتحمل پر عمل پیرا ہونے والے شخص کو مغفرت اور اجر کبیر کی خوش خبری سنائی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿١١﴾﴾ (هود : ١١)

''مگر وہ لوگ جنھوں نے صبر کیا اور نیک اعمال کیے، یہ لوگ ہیں جن کے لیے

بڑی بخشش اور بہت بڑا اجر ہے۔''

مراد یہ ہے کہ اہل ایمان راحت وفراغت ہو یا تنگی ومصیبت دونوں حالتوں میں اللہ کے احکام کے مطابق طرزِ عمل اختیار کرنے میں صبر وتحمل سے کام لیتے ہیں۔

صبر وتحمل جنت تک رسائی کا راستہ ہے:

نبی کریم ﷺ نے اس شخص کو جس کی دونوں آنکھوں کی بینائی جاتی رہے جنت کی بشارت سنائی ہے۔ چنانچہ سیّدنا انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو حدیث قدسی بیان کرتے ہوئے اپنے کانوں سے سنا ہے، آپ ﷺ فرمارہے تھے:

''اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:'' اگر میں اپنے بندے کو اس کی دو محبوب ترین چیزیں لے کر آزماؤں اور وہ اس پر صبر وتحمل سے کام لے تو میں ان دونوں چیزوں کے بدلہ اس کو جنت کا پروانہ عطا کر دیتا ہوں۔''[1]

یہاں پر دو چیزوں سے مراد اس کی دونوں آنکھیں ہیں۔

اگر کسی بندۂ مؤمن کا اس کائنات میں بسنے والوں میں سے کوئی محبوب ترین شخص اٹھالیا جاتا ہے اور وہ اس پر صبر کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے اجر وثواب کی امید رکھتا ہے تو اس کے لیے جنت کے علاوہ اور کوئی بدلہ نہیں۔ چنانچہ اس بارے میں سیّدنا ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

''میرے نزدیک میرے اس بندۂ مؤمن کے لیے اہل دنیا میں سے جس کے محبوب کو میں نے اٹھالیا ہو اور وہ اس پر صبر وتحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اجر و ثواب کی امید رکھے) جنت کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔''[2]

اس عورت کا قصہ مشہور ہے جس کو نبی کریم ﷺ نے جنت کی بشارت دی تھی بشرطیکہ وہ صبر وتحمل سے کام لے چنانچہ اس بارے میں سیّدنا عطاء بن ابی رباح رضی اللہ عنہ سے مروی ہے

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المرضی، باب فضل من ذهب بصره: ٥٦٥٣.

[2] صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب العمل الذی یبتغی به وجه اللّٰه تعالیٰ: ٦٤٢٤.

فرماتے ہیں کہ سیّدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''کیا میں تمہیں زمین پر جنتی عورت کا مشاہدہ نہ کروا دوں؟'' میں نے عرض کیا: کیوں نہیں۔ اتنی دیر میں ایک کالی عورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنا ماجرا بیان کیا کہ مجھے مرگی کی بیماری ہے یا مجھ پر غشی طاری ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے میں عریاں ہو جاتی ہوں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے میرے لیے دعا کیجیے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کو جواب دیا کہ اگر تم چاہو تو صبر و تحمل سے کام لو اور اس کے بدلے تیرے لیے جنت ہے اور اگر تم چاہو تو میں اللہ تعالیٰ سے دعا کیے دیتا ہوں کہ وہ تجھے اس بیماری سے نجات دے دے۔ تو اس عورت نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مشورہ سن کر کہا کہ میں صبر کروں گی! مگر اتنا ضرور کہوں گی کہ یہ جو میں ننگی اور عریاں ہو جاتی ہوں، اس بارے میں میرے لیے دعا کیجیے کہ میں عریاں نہ ہوا کروں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے دعا کی۔ [1]

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو مخاطب کر کے یہ خوشخبری سنائی ہے اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ان کے لیے جنت تو ہے مگر جنت کے حصول سے پہلے اس کے لیے ابتلاء و آزمائش بھی ناگزیر ہے اور اس پر صبر کرنا بندۂ مؤمن کا شیوۂ بندگی ہونا ضروری ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُم ۖ مَّسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ ۗ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ﴿٢١٤﴾ ﴾

(البقرة: ٢١٤)

''کیا تم نے گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی تک تم پر ان لوگوں جیسی حالت نہیں آئی جو تم سے پہلے تھے، انھیں تنگدستی اور تکلیف پہنچی

[1] صحيح بخاری، كتاب المرضی، باب فضل من يصرع من الريح: ٥٦٥٢۔ صحيح مسلم: ٢٥٧٦.

اور وہ سخت ہلائے گئے، یہاں تک کہ رسول اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے تھے، کہہ اٹھے اللہ کی مدد کب ہوگی؟ سن لو بے شک اللہ کی مدد قریب ہے۔"

سیّدنا علی بن حسین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں:

"جب قیامت کا دن آئے گا اور ایک منادی ندا لگائے گا کہ صابرین کہاں ہیں؟ اٹھ کر کھڑے ہو جائیں، یہ سن کر مخلوق خدا میں سے لوگوں کا ایک گروہ کھڑا ہوگا، اس سے کہا جائے گا: چلو جنت کی طرف چلو، راستہ میں ملائکہ سے ان کی ملاقات ہو جائے گی، تو وہ لوگ فرشتوں سے کہیں گے: ہم صابرین کی جماعت سے تعلق رکھنے والے اہل صبر و استقامت ہیں، تو ملائکہ ان سے دریافت کریں گے ذرا اپنے صبر کی کیفیت بتلاؤ۔ تم کیا کیا کرتے تھے؟ تو وہ کہیں گے کہ ہم نے اللہ کی اطاعت و بندگی اور اس کی فرماں برداری پر صبر و تحمل سے کام لیا اور اللہ تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی سے اجتناب اور اس سے پہلوتہی پر صبر کیا، تو ملائکہ کہیں گے جنت میں داخل ہو جاؤ، بھلائی اور نیک کام کرنے والوں کا اجر و ثواب کیا ہی اچھا ہے۔"[1]

سیّدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"جنت کو انسانی طبیعت پر گراں گذرنے والی چیزوں سے گھیر دیا گیا ہے اور جہنم کو شہوات نفسانی کے چنگل میں جکڑ دیا گیا ہے۔"[2]

تو اے ابن آدم' طبیعت پر گراں گذرنے والی چیزوں پر صبر کیے بغیر جنت میں کیوں کر داخل ہو سکتے ہو؟ اور تم اپنے آپ کو شہوات نفسانیہ پر کنٹرول کیے بغیر کیوں کر جہنم کی آگ سے بچا سکتے ہو؟

حدیث مذکور اس بات کی غمازی کر رہی ہے کہ جنت تک رسائی کا راستہ (مکارہ) یعنی طبیعت پر گراں بار چیزوں کو عبور کرتا ہوا گذرتا ہے کیونکہ حدیث میں (حفت) کا لفظ وارد ہوا

---

[1] حلیة الاولیاء: ۳/۱۳۹، ۱۴۰.

[2] صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعیمها و أهلها، باب صفة الجنة: ۲۸۲۳.

ہے اس مراد یہ ہے کہ جنت کو (مکارہ) ہر چہار جانب سے طبیعت پر گراں بار چیزیں گھیرے ہوئے ہیں۔ اگر تم مکارہ یعنی طبیعت پر گراں بار چیزوں کے پرخطر راستہ کو عبور نہیں کرو گے تو جنت میں کیسے داخل ہو گے؟ لہٰذا جنت میں داخلہ اسی صورت میں ممکن ہے جب تم دل کو ناپسند چیزوں پر قائم پل پر پیادہ چلتے ہوئے صحیح سلامت اس سے گذر جاؤ اور ایسا بغیر صبر وتحمل کی بیساکھی کا سہارا لیے ہوئے ناممکن ہے اور جہاں تک عذاب جہنم کا معاملہ ہے تو اسے شہوات ومرغوبات سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔ گناہوں سے اجتناب اور ان سے کنارہ کشی کے بارے میں صبر وتحمل سے کام لیے بغیر جہنم سے گلوخلاصی ناممکن ہے (اللّٰھم اعذنا من عذاب النار) .

فرشتے صبر کرنے والوں کو جنت میں سلام کرتے ہیں:

اللہ تعالیٰ صابرین کی وصف بیانی کرتے ہوئے بوجہ امتنان بیان فرما رہا ہے کہ اس کے ملائکہ جنت میں صابرین وشاکرین پر سلام بھیجتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ﴾ (الرعد: ٢٤)

''سلام ہو تم پر اس کے بدلے جو تم نے صبر کیا۔ سو اچھا ہے اس گھر کا انجام۔''

صابرین کو جنت میں بیت الحمد بطور جزا عطا کیا جائے گا:

اگر بندہ اپنی اولاد کے فوت ہو جانے پر صبر سے کام لے تو اللہ تعالیٰ اس کے عوض جنت میں اس کے لیے ایک گھر الاٹ کر دیتا ہے جس کا نام بیت الحمد ہے۔ اس بارے میں سیّدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جب کسی بندے کا لڑکا فوت ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے ملائکہ کو مخاطب کر کے کہتا ہے: کیا تم نے میرے بندے کے بچے کی روح قبض کر لی تو فرشتے جواب دیتے ہیں: جی ہاں۔ تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''تم نے اس کے لخت جگر کو اس سے جدا کر دیا۔ تو فرشتے کہتے ہیں: جی ہاں۔ تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے سوال کرتا ہے کہ میرے بندے نے اس موقع پر کیا کہا؟ تو فرشتے جواب دیتے ہیں: اس

نے آپ کی حمد وثنا بیان کی اور (انا للّٰه وانا الیه راجعون) کہا تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کا یہ جواب سن کر فرشتوں کو حکم دیتا ہے: ''میرے بندے کے لیے جنت میں ایک گھر بناؤ اور اس کا نام بیت الحمد رکھ دو۔'' [1]

صبر و تحمل اجر و ثواب کی حفاظت کا ذریعہ ہے:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۝﴾

(یوسف : ۹۰)

''بے شک حقیقت یہ ہے کہ جو ڈرے اور صبر کرے تو بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''

صبر و تحمل اللہ کی طرف سے ثواب کے حصول کا ذریعہ ہے:

اللہ تعالیٰ نے اہل علم کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الصَّابِرُونَ ۝﴾ (القصص : ۸۰)

''اور ان لوگوں نے کہا جنھیں علم دیا گیا تھا، افسوس تم پر! اللہ کا ثواب اس شخص کے لیے کہیں بہتر ہے جو ایمان لایا اور اس نے اچھا عمل کیا اور یہ چیز نہیں دی جاتی مگر انھی کو جو صبر کرنے والے ہیں۔''

مراد یہ ہے کہ جنت کے مستحق صابر و شاکر لوگ ہی ہوں گے جو دنیاوی لذتوں سے کنارہ کش اور آخرت کی زندگی میں رغبت رکھنے والے ہوں۔

صبر کرنے والوں کے اجر و ثواب میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے:

اللہ تعالیٰ نے صابر و شاکر لوگوں کے اجر میں کئی گنا اضافہ ہونے کی خبر دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

---

[1] ترمذی، کتاب الجنائز، باب فضل المصيبة إذا احتسب : ۱۰۲۱ وحسنه۔

﴿ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا ﴾ (القصص : ٥٤)

''یہ لوگ ہیں جنھیں ان کا اجر دوہرا دیا جائے گا، اس کے بدلے کہ انھوں نے صبر کیا۔''

جبکہ اعمال صالحہ کا اجر متعین اور محدود ہے لیکن صبر کا اجروثواب لا محدود ہے۔ اس کی مثال اس دریائے ناپیدا کنار کی ہے جس کا کوئی ساحل نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ ﴾ (الزمر : ١٠)

''صرف صبر کرنے والوں ہی کو ان کا اجر کسی شمار کے بغیر دیا جائے گا۔''

اس آیت کریمہ میں صابرین کی فضیلت بیان کی گئی ہے کہ ان کو ان کے صبر کے بدلے میں اس طرح پورا پورا اجر دیا جائے گا کہ اسے حساب کے پیمانوں سے ناپنا ممکن نہیں ہوگا یعنی ان کا اجر غیر متناہی ہوگا۔ سیّدنا سلیمان بن قاسم رحمہ اللہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں:

''ہر عمل کا اجر وثواب محدود ہوتا ہے مگر صبر کا معاملہ اس قاعدۂ کلیہ سے جداگانہ ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمادیا ہے:

﴿ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ ﴾ (الزمر : ١٠)

''صرف صبر کرنے والوں ہی کو ان کا اجر کسی شمار کے بغیر دیا جائے گا۔''

گویا کہ اس کا ثواب موسلا دھار بارش کی مانند ہے۔'' [1]

امام اوزاعی رحمہ اللہ اس بارے میں فرماتے ہیں:

''صبر کرنے والوں کے اجر وثواب کی نہ تو نپائی ہوگی اور نہ اسے تولا جائے گا انہیں بغیر ناپے تولے پیمانے بھر بھر کر کے دیا جائے گا۔'' [2]

صابرین کو من جانب اللہ دین میں امامت کی خلعت سے نوازا جاتا ہے:

اللہ تعالیٰ نے دین میں امامت وسربلندی کے منصب کو صبر ویقین سے مربوط کردیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

[1] ذم الهوى : ٦٠.　[2] تفسير ابن كثير : ٤/٦٣.

﴿وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۟ؕ وَ كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یُوْقِنُوْنَ﴾ (السجدة : ٢٤)

''جب انھوں نے صبر کیا ہم نے ان میں سے کئی پیشوا بنائے، جو ہمارے حکم سے ہدایت دیتے تھے، اور وہ ہماری آیات پر یقین کیا کرتے تھے۔''

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''صبر ویقین کے ذریعہ دین میں امامت کے منصب پر فائز ہوا جا سکتا ہے گویا کہ دین میں منصب امامت تک رسائی کا زینہ (صبر ویقین) ہی ہے۔'' [1]

صبر ویقین اللہ کی معیت کے حصول کا وسیلہ ہے:

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے صابرین کے لیے اپنی معیت کا وعدہ فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ﴾ (البقرة : ١٥٣)

''یقیناً اللہ تعالیٰ صابرین کے ساتھ ہے۔''

مراد یہ ہے کہ جو شخص اللہ کی پسندیدہ باتوں پر عمل کرتا ہے چاہے وہ نفس پر کتنی ہی شاق کیوں نہ گذریں اور دل پر کتنی ہی گراں بار کیوں نہ ہوں اور اللہ کی ناپسندیدہ باتوں سے بچتا رہے چاہے خواہشات اس کو اپنی طرف کتنا ہی کھینچیں ایسے شخص کو اللہ کی معیت حاصل ہو کر رہتی ہے۔

صبر ویقین اللہ کی مدد کے حصول کا ذریعہ ہے:

اللہ تعالیٰ نے صبر ویقین کو اپنی نصرت کا ذریعہ بنایا ہے اور اسے صابرین وشاکرین کا ہتھیار قرار دیا ہے اور بندے کو اس کا سہارا پکڑ کر استعانت کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ﴾ (البقرة : ٤٥)

''صبر اور نماز کے ساتھ مدد طلب کرو۔''

جو شخص صبر کی دولت سے عاری ہے اس کو تائید غیبی اور نصرت الٰہی کیوں کر حاصل ہو سکتی

[1] مجموع الفتاوی : ٣٥٨/٣.

ہے؟ یہ صبر ہی ہے جس کے ذریعہ کردار کی پختگی اور دین میں استقامت حاصل ہوتی ہے۔

صبر ویقین اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مدد کے حصول کا ذریعہ ہے:

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''دل کے نہ چاہتے ہوئے بھی محض صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی ناپسندیدہ چیز کے ارتکاب سے کنارہ کشی میں بڑی خیر وبرکت کا پہلو پوشیدہ ہے اور صبر ویقین ہی کے ساتھ نصرت الٰہی کا نزول ہوتا ہے۔''[1]

اور یہ امر واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کی کمک فراہم کرکے اس وقت مدد اور نصرت کی جب انہوں نے صبر ویقین اور خشیت الٰہی وتقوی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا وَ يَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿١٢٥﴾ ﴾

(آل عمران : ۱۲۵)

''کیوں نہیں! اگر تم صبر کرو اور ڈرتے رہو اور وہ اپنے اسی جوش میں تم پر آ پڑیں تو تمھارا رب پانچ ہزار فرشتوں کے ساتھ تمھاری مدد کرے گا، جو خاص نشان والے ہوں گے۔''

فرعون پر بنی اسرائیل کی فتح اور غلبہ کے اسباب میں سے اہم ترین سبب بنی اسرائیل کی صبر ویقین سے سرشاری تھی اور ان کا مصیبت وناگہانی پر پختہ صبر ویقین تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿١٣٧﴾ ﴾ (الاعراف : ۱۳۷)

''اور ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے، اس سرزمین کے مشرقوں اور

[1] احمد : ۲۸۰۰ وصححہ الارنؤوط.

اس کے مغربوں کا وارث بنا دیا، جس میں ہم نے برکت رکھی ہے اور تیرے رب کی بہترین بات بنی اسرائیل پر پوری ہوگئی، اس وجہ سے کہ انھوں نے صبر کیا اور ہم نے برباد کر دیا جو کچھ فرعون اور اس کے لوگ بناتے تھے اور جو عمارتیں وہ بلند کرتے تھے۔''

آیت کریمہ میں مصنوعات سے مراد کارخانے، انڈسٹریاں، عمارتیں، اور ہتھیار وغیرہ ہیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ اس جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

''صبر کی اصل عزم و جزم اور پختہ ارادگی اور مستقل مزاجی ہے اور اس کا ثمرہ اور پھل کامیابی اور کامرانی ہے۔'' [1]

صبر دشمنوں کی مکاری اور چال و فریب سے نجات کا ذریعہ ہے:

اللہ تعالیٰ نے صبر اور تقوی کو دشمن کی چال اور اس کی دھوکا دہی و دغابازی کے لیے عظیم ترین ڈھال بنا دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا﴾

(آل عمران: ۱۲۰)

''اور اگر تم صبر کرو اور ڈرتے رہو تو ان کی خفیہ تدبیر تمھیں کچھ نقصان نہیں پہنچائے گی۔''

صبر اللہ کی رحمت اور ہدایت کے حصول کا ذریعہ ہے:

اللہ تعالیٰ نے صابرین وشاکرین کو تین چیزوں سے بطور خاص نوازا ہے۔ یہ خصوصیت ان کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہے۔ ان میں سے ایک تو اللہ کی خاص نوازشوں کا حصول ہے اور اس کی خاص رحمت سے بہرہ وری ہے اور اس کی ہدایت سے سرشاری ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٥٥﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ

[1] تاریخ دمشق: ۵۱/۴۰۸.

إِنَّآ إِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿١٥٦﴾ أُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۚ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿١٥٧﴾ ﴾ (البقرة: ١٥٥ تا ١٥٧)

''اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دے۔ وہ لوگ کہ جب انھیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں بے شک ہم اللہ کے لیے ہیں اور بے شک ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے مہربانیاں اور بڑی رحمت ہے اور یہی لوگ ہدایت پانے والے ہیں۔''

صبر ویقین اللہ تعالیٰ کی محبت کے حصول کا ذریعہ ہے:

اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کو صبر کے ساتھ مربوط کر دیا ہے اور صبر کرنے والوں کو اپنی محبت کا اہل قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَكَأَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ أَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٤٦﴾ ﴾

(آل عمران: ١٤٦)

''اور کتنے ہی نبی ہیں جن کے ہمراہ بہت سے رب والوں نے جنگ کی، تو نہ انھوں نے اس مصیبت کی وجہ سے ہمت ہاری جو انھیں اللہ کی راہ میں پہنچی اور نہ وہ کمزور پڑے اور نہ انھوں نے عاجزی دکھائی اور اللہ صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

صبر اللہ تعالیٰ کی ثناء کے حصول کا سبب ہے:

یہ صبر ہی کی دین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ بندے سیّدنا ایوب علیہ السلام کی بڑے ہی حسین وجمیل پیرایہ بیان میں تعریف کی ہے اور کیوں نہ کرتے؟ انہوں نے تو حقیقی صبر کا نمونہ پیش کر دیا تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ۚ نِعْمَ الْعَبْدُ ۖ إِنَّهٗ أَوَّابٌ ﴿٤٤﴾ ﴾ (ص: ٤٤)

''بے شک ہم نے اسے صبر کرنے والا پایا، اچھا بندہ تھا۔ یقیناً وہ بہت رجوع

کرنے والا تھا۔''

صبر و یقین بذات خود سرتاپا نور ہی نور ہے:

سیّدنا ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''نماز نور ہے، صدقہ ایسی دلیل و برہان ہے جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں اور صبر روشنی وضیاء ہے اور قرآن یا تو تمہارے حق میں باعث حجت ہے یا تمہارے خلاف حجت قاطع ہے۔''[1]

صبر اللہ کی آیات ونشانیوں سے مستفید ہونے کا ذریعہ ہے:

اللہ تعالیٰ نے اس بات سے باخبر کیا ہے کہ اس کی آیات بینات یا اس کی روشن نشانیوں سے صابرین وشاکرین ہی مستفید ہوا کرتے ہیں بلاشبہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی خاطر حد سے زیادہ صبر کرنے والے ہیں انہیں کو اللہ تعالیٰ کی آیات بینات سے استفادہ کی توفیق نصیب ہوتی ہے۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے مبالغہ کا صیغہ استعمال کرکے اس کی اہمیت کی مزید وضاحت فرمادی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللَّهِ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ﴾

(ابراهيم : ٥)

''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر بھیجا کہ اپنی قوم کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال اور انھیں اللہ کے دن یاد دلا، بلاشبہ اس میں ہر ایسے شخص کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو بہت صبر کرنے والا، بہت شکر کرنے والا ہے۔''

مراد یہ ہے کہ دونوں قسم کے حالات سننے سے صابر وشاکر بندوں کو عبرت حاصل ہوتی

[1] صحيح مسلم، كتاب الطهارة، باب فضل الوضوء: ٢٢٣.

ہے کہ مصیبت کے وقت گھبرانا اور راحت کے وقت اترانا نہیں چاہیے جو لوگ پہلے کامیاب ہوئے ہیں وہ سختیوں پر صبر کرنے سے ہی ہوئے ہیں۔ اس مسئلہ کے پیش نظر سورۂ لقمان میں اللہ تعالیٰ کا قول وارد ہوا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝۳۱ ﴾ (لقمان : ۳۱)

''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ بے شک کشتیاں سمندر میں اللہ کی نعمت سے چلتی ہیں، تا کہ وہ تمھیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائے۔ بے شک اس میں ہر بڑے صابر، بڑے شاکر کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں۔''

اور قوم سبا کا قصہ بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَ مَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝۱۹ ﴾ (سبا : ۱۹)

''ہم نے انھیں کہانیاں بنا دیا اور انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، ہر طرح ٹکڑے ٹکڑے کرنا، بلا شبہ اس میں ہر بہت صبر کرنے والے، بہت شکر کرنے والے کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں۔''

اور اسی طرح نعمت کے معرض بیان میں جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے بندوں پر اپنا احسان کیا ہے۔ کشتی اور جہازرانی کا بھی ذکر ہے۔ یہ کشتی ہی ہے جو بندوں کو اور ان کے ساز و سامان کو لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا کام کرتی ہے۔ یہ وہ نعمت الٰہیہ ہے جس پر صابرین و شاکرین ہی تدبر و تفکر کر کے مستفید ہوتے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ مِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ۝۳۲ اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝۳۳ ﴾ (الشوریٰ : ۳۲، ۳۳)

''اور اسی کی نشانیوں میں سے سمندر میں چلنے والے جہاز ہیں، جو پہاڑوں جیسے ہیں۔ اگر وہ چاہے ہوا کو ٹھہرا دے تو وہ اس کی سطح پر کھڑے رہ جائیں۔ بے شک اس میں ہر ایسے شخص کے لیے یقیناً کئی نشانیاں ہیں جو بہت صبر کرنے والا، بہت شکر کرنے والا ہے۔''

قرآن کریم کے اندر یہ چار مواقع ایسے ہیں جو اس بات کی دلیل فراہم کرتے ہیں کہ اللہ کی آیات اور نشانیوں سے صابرین وشاکرین ہی استفادہ کرتے ہیں۔ انہیں کو اس کی توفیق حاصل ہوتی ہے۔ یہ رتبہ بلند انہیں کے لیے خاص ہے۔

صبر مطلوب تک رسائی اور حاجت برآری کا ذریعہ ہے:

کسی عربی شاعر کا قول ہے:

''مایوسی اور قنوطیت کا ہرگز ہرگز شکار نہ ہونا، اگرچہ حصول مدعا میں کتنی ہی تاخیر کیوں نہ ہو جائے۔ اگر تم نے صبر کے دوش پر سوار ہو کر منزل مقصود تک رسائی کی کوشش کی تو اللہ کی مدد آ کر رہے گی اور تم اس کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرو گے۔ صبر وشکر کرنے والا اپنی مراد کو پا کر رہتا ہے اور وہ اس لائق ہے کہ اپنی حاجت کے حصول تک رسائی پا جائے اور یقیناً پا کر رہتا ہے۔ ٹھیک اس طرح جس طرح بار بار دروازہ کھٹکھٹانے والا بالآخر دروازے کے اندر داخلہ حاصل کر لیتا ہے۔'' [1]

اور ایک دوسرے عربی شاعر کا کہنا ہے:

''بہت ہی کم لوگ ایسے ہیں جو کسی کام کی انجام دہی کی کوشش میں جدیت سے کام لیں اور صبر کو اپنا ساتھی بنائیں جو شخص ایسا کرتا ہے وہ ضرور سرخرو ہوتا ہے۔'' [2]

---

1. دیوان الحماسۃ : ۲/۳۳۔۳۴.
2. المستطرف : ۲/۱۲۵.

اللہ تعالیٰ صبر و شکر کا نعم البدل عطا فرماتا ہے:

سیّدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

''ہر وہ مسلم شخص جس کو مصیبت اپنے نرغے میں لے لے اور وہ زبان سے وہی کلمات نکالے اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے جس کے نکالنے کا حکم دیا ہے:

((انا للہ وانا الیہ راجعون، اللھم اجرنی فی مصیبتی، واخلف لی خیرا منھا الا اخلف اللہ لہ خیرا منھا.))

''ہم اللہ ہی کے لیے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ اے اللہ! مجھے میری اس مصیبت میں اجر و ثواب سے نواز دے اور اس کا نعم البدل عطا فرما تو اللہ اس دعا کی برکت سے اس کو اس کا نعم البدل عطا فرماتا ہے۔''

سیّدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب ابو سلمہ کا انتقال ہو گیا تو میں نے کہا: ابو سلمہ سے بہتر کون مسلم شخص ہو سکتا ہے؟ اور میں نے مذکورہ دعا کا ورد کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے نعم البدل کے طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں مجھے شوہر عطا فرمایا۔'' [1]

صبر و شکر دنیا میں عزت اور شرف کا ذریعہ ہے:

صبر و شکر ہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر بندہ دنیا میں عزت و کمال کی اوج ثریا پر فائز ہو جاتا ہے۔ وہ اس لیے کہ صابر و شاکر شخص لوگوں کے سامنے اپنی جبین نیاز نہیں ٹیکتا اور نہ ہی ان کے سامنے سربسجود ہوتا ہے اور لوگوں کے مال و دولت کی طرف للچائی نگاہوں سے نہیں دیکھتا اور نہ ہی لوگوں کی جیبیں ٹٹولنے کی تگ و دو کرتا ہے۔

چنانچہ غزوۂ تبوک میں ابو الاعور سلمی رضی اللہ عنہ نے بلند آواز سے صدا لگائی: ''اے قریش کی جماعت! اجر و ثواب اور صبر و شکر میں سے جتنا زاد راہ تمہارا حصہ ہے اسے حاصل کرنے کی

[1] صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب ما یقال عند المصیبۃ: ۹۱۸.

کوشش کرو، کیونکہ صبر دنیا میں عزت وشرف، بزرگی کے حصول کا ذریعہ ہے اور آخرت میں اللہ کے فضل وکرم کا پرتو ہے لہٰذا صبر وشکر سے کام لو اور آپس میں اس کی تلقین کرتے رہا کرو۔" ❶

عربی زبان کے شاعر سلیم بن المھاجر البجیلی کا کلام ہے:

"میں نے اپنے چہرے پر صبر وشکر کا خوبصورت غازہ لگالیا تو اس سے میرا چہرہ کھل اٹھا اللہ تعالیٰ نے صبر وشکر کی برکت سے بخیلوں کے سامنے میرے چہرے کو رسوا ہونے سے بچالیا۔" ❷

صبر کے مختلف میادین عمل کا بیان

صبر وشکر کی بنیاد تین چیزوں پر قائم ہوتی ہے:

۱۔ اللہ کی اطاعت وفرماں براداری پر صبر وشکر ادا

۲۔ اللہ کی معصیت سے اجتناب پر صبر وشکر بجالانا

۳۔ اور اللہ کی قضا وقدر پر تسلیم ورضا کا پہلو اختیار کرتے ہوئے شکرانہ ادا کرنا۔

اگر ہم ان تینوں بنیادی اصولوں کی فروعات وشاخوں پر نظر دوڑائیں تو ہمیں اس بارے میں متعدد فروعات کا پتہ چلتا ہے۔ ہم یہاں پر صبر وشکر کے اجزائے ترکیبی کے اہم ترین اوراق کی ورق گردانی کرنے جارہے ہیں جن سے انسان کو بہرصورت گذرنا پڑتا ہے یا بالفاظ دیگر حیات انسانی میں جن کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ وہ مندرجہ ذیل ہیں:

دنیا میں پیش آنے والے مصائب پر صبر سے کام لینا:

بلاشبہ دنیا اپنی طبیعت حال کے اعتبار سے مصیبتوں اور مشقتوں سے بھری پڑی ہے۔ کسی شخص کے لیے یہ بات ناممکن ہے کہ وہ دنیاوی زندگی میں سعادت مندی وخوش بختی سے مالا مال ہوکر گذر بسر کرے، بلکہ جب تک انسان کی جان میں جان ہے اور اس کی سانسوں کا سلسلہ جاری وساری ہے اس وقت تک دنیاوی زندگی میں اسے مصیبتوں اور مشقتوں سے نبرد آزمائی کرنا ہی کرنا ہے۔ یہ دنیا کی طبیعت حال کا تقاضا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

❶ تاریخ دمشق: ٤٦/ ٥٦. ❷ المستطرف: ١/ ١٥٩.

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ﴾ (البلد : ٤)

''یقیناً ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا ہے۔''

مراد یہ ہے کہ انسان کی زندگی محنت و مشقت سے معمور اور مصائب و آلام اور شرور و فتن سے بھری ہوئی ہے۔ دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ ؕ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾﴾ (البقرة : ١٥٥)

''اور یقیناً ہم تمھیں خوف اور بھوک اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی میں سے کسی نہ کسی چیز کے ساتھ ضرور آزمائیں گے اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دے۔''

نفسانی خواہشات پر صبر بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ﴾ (المنافقون : ٩)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمھارے مال اور تمھاری اولاد تمھیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔''

اس بارے میں سیّدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ ''جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں ہم تنگی و عسرت کا شکار ہوئے تو ہم نے صبر و شکر کا مظاہرہ کیا اور جب ہم خوش حالی اور راحت البالی سے مالا مال ہو گئے تو ہم نے اپنے (اس شعار) کو بالائے طاق اٹھا کر رکھ دیا اور صبر کرنا بھول گئے۔''[1]

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جب انہیں قید و بند کی حالت کا سامنا ہوتا ہے تو صبر و شکر سے کام لیتے ہیں لیکن اس حالت سے رہائی کے بعد جب خوش حالی اور آزادی نصیب ہو جاتی

[1] ترمذی ، کتاب صفة القیامة، باب احادیث : ابتلینا بالضراء : ٢٤٦٤ وحسنة۔

ہے اور ان پر دنیا کے دروازے کھل جاتے ہیں اور مال و دولت کی بارش ہونے لگتی ہے اور آل اولاد بھی خوب سے خوب تر ہاتھ آجاتی ہے تو صبر کرنا بھول جاتے ہیں۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ صبر کے معاملہ میں دنیا میں پائے جانے والے لوگ یکساں نہیں گردانے جاسکتے۔ اسی لیے اسلاف کا کہنا ہے:

''مصیبت پر مؤمن اور کافر دونوں صبر کا مظاہرہ کرتے ہیں اور عافیت و آسودگی کے عالم میں صبر و شکر صدیقین کا شعار ہے۔'' [1]

نفسانی خواہشات پر صبر کے لیے چار شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے:

۱۔ ایک تو یہ کہ انسان اسی پر تکیہ کرکے نہ بیٹھ جائے اور نہ ہی اس کے دام میں پھنس کر اسی کا اسیر ہو جائے۔

۲۔ کہیں اس کے حصول کی خاطر دن رات اسی کا راگ نہ الاپنے لگے اور اس کی تلاش میں سرگرداں رہنے لگے جیسا کہ بعض دنیادار لوگ مال و دولت بٹورنے کی خاطر دنیاداری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیتے ہیں اور وہی ان کا مقصد زندگی بن جاتا ہے حتی کہ ان کے پاس نماز تک ادا کرنے کا وقت باقی نہیں بچتا، یا اللہ کے ذکر کے لیے ان کے پاس وقت نہیں ہوتا۔ مادیت ان کے دل و دماغ میں اتنی رچ بس جاتی ہے کہ ان کو اللہ کے ذکر کے لیے وقت تک نصیب نہیں ہوتا اور بعض نوکری پیشہ لوگ ایسے بھی ہیں جن کو اپنی ڈیوٹی کا اتنا خیال ہوتا ہے کہ اس کی خاطر وہ عبادات اور واجبات شرعیہ کو بھی وہ نظر انداز کر دیتے ہیں اور محرمات و منکرات کا ارتکاب ان کے لیے ایک عام سی بات بن جاتی ہے اور اپنے کام کاج نیز اپنی ڈیوٹی، نوکری میں حد سے زیادہ منہمک رہتے ہیں، گویا کہ ان کی ڈیوٹی اور نوکری ہی ان کا قبلہ و کعبہ بن جاتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ اسی کی پوجا کرنے لگتے ہیں جیسا کہ کسی انگریز دانشور کا کہنا ہے:

''برطانیہ میں لوگوں کا حال یہ ہے کہ ہفتے کے سات دن وہ یہاں کی مرکزی

[1] تسلية اهل المصائب : ۱۸۵.

بینک کی عبادت کرتے ہیں اور ساتویں دن وہ چرچ یا کنیسہ جا کر خدا کے سامنے حاضری دیتے ہیں۔"

۳۔ اس بارے میں ایک شرط یہ ہے کہ اللہ کے حق کی ادائیگی کے سلسلہ میں صبر وشکر کا مظاہرہ کرے جیسا کہ زکوۃ کی ادائیگی ہے یا رشتہ داروں کے حقوق کا لحاظ رکھنے کا معاملہ ہے یا صدقات وخیرات کرنے کرانے کا مسئلہ ہے۔

۴۔ اس سلسلہ کی چوتھی شرط یہ ہے کہ اس کو حرام مصرف میں نہ لائے۔

صبر وشکر کے مختلف میادین میں سے انسان کا لوگوں کے پاس جو مال ودولت ہے اس کو للچائی نظر سے نہ دیکھنے پر صبر کرنا بھی انتہائی اہم فریضہ ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو مال ودولت، اہل وعیال جیسی جن پیش بہا نعمتوں سے مالا مال کیا ہے اس سے دھوکا نہ کھانا اور غرور میں مبتلا نہ ہونا بھی اس سلسلہ کی اہم ترین کڑی ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ۬ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَ رِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ۝۱۳۱﴾ (طه : ۱۳۱)

"اور اپنی آنکھیں ان چیزوں کی طرف ہرگز نہ اٹھا جو ہم نے ان کے مختلف قسم کے لوگوں کو دنیا کی زندگی کی زینت کے طور پر برتنے کے لیے دی ہیں، تاکہ ہم انھیں اس میں آزمائیں اور تیرے رب کا دیا ہوا سب سے اچھا اور سب سے زیادہ باقی رہنے والا ہے۔"

مراد یہ ہے کہ ہم نے ان پر اپنے انعام واکرام کی بارش محض انہیں آزمانے یا ان کا امتحان لینے کے لیے کی ہے۔ ان کو دیکھ دیکھ کر تمہارے منہ میں پانی نہیں آنا چاہیے۔

قارون کی قوم کے بعض لوگوں نے جب قارون پر مال ودولت کی ریل پیل دیکھی تو وہ اپنی تنگ دستی پر صبر کرنا بھول گئے اور یہ دنیادار برسرعام کہنے لگے:

﴿يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَاۤ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝۷۹﴾

(القصص : ۷۹)

"اے کاش! ہمارے لیے اس جیسا ہوتا جو قارون کو دیا گیا ہے، بلاشبہ وہ یقیناً بہت بڑے نصیب والا ہے۔"

بندے کو اس طرح کی ناشکری نہیں کرنی چاہیے۔ جیسا کہ قارون کی قوم کے لوگوں نے کی تھی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس بات کی صراحت اور توضیح فرمادی ہے کہ بعض لوگوں کو مال و دولت، اہل وعیال میں سے سب کچھ ملتا ہے مگر ایک اندازہ کے مطابق رفتہ رفتہ عطا کیا جاتا ہے اور ان کی بھلائیوں اور خوبیوں کے بقدر رزق کا نزول ہوکر رہتا ہے لیکن وہ یہ نہ سمجھیں کہ ان کے ساتھ یہ معاملہ ان کی فضیلت اور کرامت کی وجہ سے ہورہا ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ یہ امہال واستدراج کی بناء پر ہے انہیں جتنی ڈھیل دی جارہی ہے اسی قدر ان کی شقاوت کا پیمانہ لبریز ہوتا جارہا ہے۔ لہٰذا ان کا یہ کہنا کہ اگر ہم خدا کے یہاں مبغوض ومردود ہوتے تو یہ مال ودولت اور اولاد وغیرہ کی بہتات کیوں ہوتی؟ ان کی خام خیالی اور بھول ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّ بَنِيْنَ ﴿۵۵﴾ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۶﴾ ﴾ (المؤمنون: ۵۵ تا ۵۶)

"کیا وہ گمان کرتے ہیں کہ ہم مال اور بیٹوں میں سے جن چیزوں کے ساتھ ان کی مدد کررہے ہیں۔ ہم انھیں بھلائیاں دینے میں جلدی کررہے ہیں، بلکہ وہ نہیں سمجھتے۔"

۵۔ صبر کے مختلف میدانوں میں سے عظیم الشان میدان تبلیغ اور دعوت الی اللہ کی راہ میں پیش آمدہ مشقتوں اور صعوبتوں کو برداشت کرنا اور ان پر صبر وتحمل کا مظاہرہ کرنا بھی ہے۔

اسلام کے داعیوں اور واعظین ومبلغین پر عصر حاضر کے لوگوں کی دین سے بیزاری اور شرع متین سے دوری ڈھکی چھپی نہیں ہے، جس کی بنیاد پر اسلامی داعیوں اور مبلغوں پر عائد ذمہ داری دوچند ہوجاتی ہے، عوام الناس کی دین سے بیزاری دعوت دین کی راہ میں بڑی محنت ور جانفشانی کی خواہاں ہے اور منکرات پر نکیر کرنے کی متقاضی ہے اور حق کو علی الاعلان

برسرِعام بیان کرنے کا تقاضا کر رہی ہے۔ اسی لیے سیّدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اپنے دور میں پائے جانے والے انحرافات وکج روی کے سیل رواں کو روکنے کی ذمہ داری کی عظیم ترین اہمیت کو جب بھانپ لیا تو فرمایا تھا:

''کان کھول کر سن لو! میں اس معاملہ کا علاج و معالجہ کرنے کا اقدام کرنے جا رہا ہوں جس کی انجام دہی میں اللہ کے علاوہ اور کوئی میرا سہارا نہیں بن سکتا۔ اسی کی مدد اور نصرت میرا کام بنا سکتی ہے، یہ وہ مشن ہے جس کی انجام دہی کی راہ میں بوڑھے اور عمر دراز لوگوں نے عمریں فنا کر دیں اور نوجوان بوڑھے ہو گئے، جس نے عجمی کو گویائی کے ہنر سکھلا دیئے اور اعرابی بدو جس کی وجہ سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے، حتی کہ انہوں نے اس کو دین خیال کرنا شروع کر دیا اس کے علاوہ وہ کسی اور چیز کو حق تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔'' [1]

سیّدنا نوح علیہ السلام نے دعوت وتبلیغ کی راہ میں ساڑھے نو سو سال تک صبر و تحمل سے کام لیا اور اس راستے میں مصائب اور تمام قسم کی تکلیفوں کو برداشت کیا۔ کون سی ایسی آزمائش اور نہ ہوگی جس کو انہوں نے خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت نہ کیا ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَالَ رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَنَهَارًا ۝ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِيٓ إِلَّا فِرَارًا ۝﴾ (نوح: ۵، ۶)

''اس نے کہا اے میرے رب! بلاشبہ میں نے اپنی قوم کو رات اور دن بلایا۔ تو میرے بلانے نے دور بھاگنے کے سوا ان کو کسی چیز میں زیادہ نہیں کیا۔''

اس کے بعد داعی کو اس بات کا ادراک ہونا چاہیے کہ دعوت وتبلیغ کی راہ میں پیش آنے والی صعوبتیں اور مشقتیں صرف بدنی ہی نہیں ہوتیں بلکہ کبھی کبھار وہ نفسی بھی ہوتی ہیں۔ بندہ دعوت وتبلیغ سے دشمنی رکھنے والے موذی لوگوں کی باتوں کو سن کر نفسیاتی طور پر کوفت محسوس کرتا ہے نیز دشمنان دین کی باتیں نفسیاتی طور پر اذیت رسانی کا باعث ہوتی ہیں۔

[1] الاعتصام للشاطبی: ۱/۱۲.

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ وَ لَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝۱۸۶﴾

(آل عمران : ۱۸۶)

”یقیناً تم اپنے مالوں اور اپنی جانوں میں ضرور آزمائے جاؤ گے اور یقیناً تم ان لوگوں سے جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور ان لوگوں سے جنھوں نے شرک کیا، ضرور بہت سی ایذا سنو گے اور اگر تم صبر کرو اور متقی بنو تو بلاشبہ یہ ہمت کے کاموں سے ہے۔“

اور ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ۝۱۰﴾

(المزمل : ۱۰)

”اور اس پر صبر کر جو وہ کہتے ہیں اور انھیں چھوڑ دے، خوبصورت طریقے سے چھوڑنا۔“

یہی نہیں بلکہ انہوں نے اپنی اپنی قوم کے لوگوں کو مخاطب کر کے کہہ دیا تھا:

﴿وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝۱۲﴾

(ابراهیم : ۱۲)

”اور ہم ہر صورت اس پر صبر کریں گے جو تم ہمیں تکلیف پہنچاؤ گے اور اللہ ہی پر پس لازم ہے کہ بھروسا کرنے والے بھروسا کریں۔“

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا﴾ (الانعام : ۳٤)

''اور بلاشبہ یقیناً تجھ سے پہلے کئی رسول جھٹلائے گئے تو انھوں نے اس پر صبر کیا کہ وہ جھٹلائے گئے اور ایذا دیے گئے، یہاں تک کہ ان کے پاس ہماری مدد آ گئی۔''

اس طرح ایک داعی زندگی کی پر پیچ راہوں کو صبر کے دوش پر سوار ہو کر عبور کرتا ہوا اپنی منزل مقصود کی طرف رواں دواں رہتا ہے اور آہستہ آہستہ اپنے سفر کی مسافت طے کر لیتا ہے اور انجام کار اسی کے حق میں ہوتا ہے اگرچہ نصرت الٰہی اور تائید غیبی کے نزول میں تاخیر ہی کیوں نہ ہو جائے؟ مگر وہ صبر کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَ الضَّرَّاۗءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿٢١٤﴾ ﴾

(البقرة: ٢١٤)

''کیا تم نے گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی تک تم پر ان لوگوں جیسی حالت نہیں آئی جو تم سے پہلے تھے، انھیں تنگدستی اور تکلیف پہنچی اور وہ سخت ہلائے گئے، یہاں تک کہ رسول اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے تھے، کہہ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب ہوگی؟ سن لو! بے شک اللہ کی مدد قریب ہے۔''

اس لیے داعی کو مایوسی کا شکار نہیں ہونا چاہیے اور اللہ کی ذات سے حسن ظن رکھتے ہوئے اس بات کا یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید بہرصورت آ کر رہے گی، البتہ اس میں دیر سویر ہو سکتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـــَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَاۗءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَاۗءُ ۭ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿١١٠﴾ ﴾

(یوسف: ١١٠)

''یہاں تک کہ جب رسول بالکل ناامید ہو گئے اور انھوں نے گمان کیا کہ بے

شک ان سے یقیناً جھوٹ کہا گیا تھا تو ان کے پاس ہماری مدد آ گئی، پھر جسے ہم چاہتے تھے وہ بچا لیا گیا اور ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے ہٹایا نہیں جاتا۔''

اس بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر وہ شخص جو دعوت حق کی انجام دہی کا کام کرے یا نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے، اسے لوگوں کی طرف سے ایذا رسانی سے ضرور دوچار ہونا پڑے گا اور اس کا علاج صبر و تحمل ہے اور اللہ کی خوشنودی کے لیے اس آزمائش سے نبرد آزمائی ضروری ہے پھر اس بارے میں اللہ سے مدد طلب کرنا داعی دین کی پہچان ہے اور اس موقع پر سے اللہ کی طرف رجوع بندۂ مومن کا شیوہ ہے۔

۵۔ صبر کی عظیم الشان مہم میدان کارزار میں دشمن سے برسر پیکار ہوتے ہوئے اور مدمقابل سے مڈبھیڑ کے وقت صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا بھی ہے اور کیوں نہ ہو؟ کیونکہ اس موقع پر صبر و تحمل اور ثابت قدمی کامیابی و کامرانی نیز اللہ کی مدد کے حصول کی شرط اولیں ہے اور ایسے وقت راہ فرار اختیار کرنا یا پیٹھ پھیر کر میدان کارزار سے بھاگ کھڑے ہونا کبیرہ گناہوں میں سے عظیم ترین گناہ ہے۔ اسی لیے اس طرح کے مواقع پر اللہ تعالیٰ نے ثابت قدمی کو واجب کیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا﴾ (الانفال: ٤٥)

''جب تم کسی گروہ کے مقابل ہو تو جمے رہو۔''

خود باری تعالیٰ نے اس وقت راہ فرار اختیار کرنے اور پیٹھ دکھانے کے انجام سے ڈرایا دھمکایا ہے اور بلاشبہ جب معرکہ آرائی زوروں پر ہو اور گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہو اور کشتوں کے پشتے لگ رہے ہوں، جان توڑ لڑائی کا سامنا ہو تو اس وقت صبر کرنا الوالعزمی کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی موقع کے لیے ارشاد فرمایا ہے:

﴿أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ ﴿١٤٢﴾﴾ (آل عمران: ١٤٢)

''کیا تم نے گمان کر لیا کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی تک اللہ

نے ان لوگوں کو نہیں جانا جنھوں نے تم میں سے جہاد کیا اور تاکہ وہ صبر کرنے والوں کو جان لے۔''

مراد یہ ہے کہ قتال کی آزمائش کے بغیر تم جنت میں چلے جاؤ گے؟ نہیں ایسا نہیں بلکہ جنت ان لوگوں کو ملے گی جو آزمائش میں پورے اتریں گے اور ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝ ﴾ (آل عمران : ١٤٤)

''اور نہیں ہے محمد مگر ایک رسول، بے شک اس سے پہلے کئی رسول گزر چکے تو کیا اگر وہ فوت ہو جائے، یا قتل کر دیا جائے تو تم اپنی ایڑیوں پر پھر جاؤ گے اور جو اپنی ایڑیوں پر پھر جائے تو وہ اللہ کو ہرگز کچھ بھی نقصان نہیں پہنچائے گا اور اللہ شکر کرنے والوں کو جلد جزا دے گا۔''

اللہ تعالیٰ نے سیّدنا طالوت علیہ السلام کا قصہ بیان کرتے ہوئے ان میں منتخب ترین لوگوں کو سلیکٹ کرتے کراتے آخر میں اس مومن گروہ اور ان میں سے منتخب ترین نفوس قدسیہ اور چیدہ چیدہ لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّىْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّىْۤ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ ﴾ (البقرۃ : ٢٤٩)

''پھر جب طالوت لشکروں کو لے کر جدا ہوا تو کہا: بے شک اللہ ایک نہر کے

ساتھ تمھاری آزمائش کرنے والا ہے، پس جس نے اس میں سے پیا تو وہ مجھ سے نہیں اور جس نے اسے نہ چکھا تو بے شک وہ مجھ سے ہے، مگر جو اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر پانی لے لے۔ تو ان میں سے تھوڑے لوگوں کے سوا سب نے اس سے پی لیا۔ تو جب وہ اور اس کے ساتھ وہ لوگ نہر سے پار ہو گئے جو ایمان لائے تھے، تو انھوں نے کہا آج ہمارے پاس جالوت اور اس کے لشکروں سے مقابلے کی کوئی طاقت نہیں۔ جو لوگ سمجھتے تھے کہ یقیناً وہ اللہ سے ملنے والے ہیں انھوں نے کہا کتنی ہی تھوڑی جماعتیں زیادہ جماعتوں پر اللہ کے حکم سے غالب آ گئیں اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

۶۔ صبر و تحمل کی مختلف مہمات میں سے اہم ترین مہم طلب علم پر صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا بھی ہے۔ کیونکہ علم حاصل کرنا بڑا دشوار کن اور مشقت طلب معاملہ ہے اس کے حصول میں بڑی عرق ریزی اور محنت و مشقت کی ضرورت درپیش ہوتی ہے اور طالب علم اگر صبر کے اسلحہ سے لیس نہ ہو تو وہ اپنی مراد تک کسی صورت میں رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ اسی لیے سیّدنا خضر علیہ السلام نے سیّدنا موسیٰ علیہ السلام سے ارشاد فرمایا تھا:

﴿اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝ وَ كَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ۝﴾ (الکهف : ٦٧، ٦٨)

"آپ میرے ساتھ ہرگز ہرگز صبر نہیں کر سکتے، اور جو چیز آپ کے احاطہ علم میں نہ ہو اس پر بھلا آپ صبر کر بھی کیسے سکتے ہیں؟"

تو سیّدنا موسیٰ علیہ السلام نے جواباً ارشاد فرمایا تھا:

﴿سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّ لَاۤ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا ۝﴾

(الکهف : ٦٩)

"اس نے کہا اگر اللہ نے چاہا تو تو مجھے ضرور صبر کرنے والا پائے گا اور میں تیرے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کروں گا۔"

طلب علم کے بارے میں صبر وتحمل کے ضمن میں یہ بات بھی داخل ہے کہ علم میں دسترس اور پختگی کے مرتبہ تک رسائی کے بعد ہی مسند افتاء پر فائز ہوا جاسکتا ہے جب تک طالب علم کے اندر علمائے کرام کی صفات نہ پائی جائیں اس وقت تک مسند افتاء پر جلوہ افروز ہونے کے لیے اسے اپنے آپ کو پیش کرنا صبر کے منافی عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طالب علم کے لیے اس بارے میں بھی صبر کی تلقین وارد ہوئی ہے۔

اسی مسئلہ کے ضمن میں یہ بات بھی درج کی جاتی ہے کہ معلم درس وتدریس کے فرائض کی انجام دہی میں نیز طالب علم کو سکھانے اور اسے پڑھنے پڑھانے اور مسائل سمجھانے، اسی طرح فروعات کو ان کے ذہن نشین کرانے اور ان کے ادراک وفہم کو اجاگر کرنے اور ان کے مطالعہ اور مراجعہ جیسے مسائل کے سلسلہ میں صبر وتحمل کا مظاہرہ کرے۔

صبر وتحمل میں زادِ راہ کی حیثیت رکھنے والے اسباب ووسائل

ایک اہم مسئلہ کی وضاحت:

بہت سے وہ لوگ جو مصائب یا آزمائش کی گھڑی میں بے صبری اور ناشکری کا مظاہرہ کرتے ہیں اور جب ان کو اس بارے میں سمجھایا جاتا ہے یا نصیحت کی جاتی ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو صبر کی توفیق ہی نصیب نہیں فرمائی ہے یا ہماری قسمت میں صبر نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ جب انہیں عبادت وریاضت میں سے کسی نوعیت کی عبادت کی انجام دہی کا حکم دیا جاتا ہے اور وہ اس کو صبر وشکر سے بجالانے کے عادی نہیں ہوتے تو وہ یہ حربہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ اور اس طرح کی اور چیزیں بھی ہیں جہاں وہ اس قسم کی بات کرتے ہیں۔ ان کے دماغ میں یہ بات گردش کرتی رہتی ہے کہ صبر بھی اللہ کی طرف سے عطا کردہ عطیہ ہے انسان کے اندر بذات خود اس کے حصول کی طاقت اور قوت نہیں اور نہ ہی وہ اسے اپنی جدوجہد سے حاصل کرسکتا ہے؟''

لیکن ایسا نہیں ہے یہ محض ان کی خام خیالی ہے ورنہ اگر صبر کسبی نہ ہوتا تو ہم ان نصوص کے سامنے جن میں صبر کا حکم دیا گیا ہے ہاتھ پر ہاتھ رکھے حیرت واستعجاب کے عالم میں بیٹھے

رہتے۔ یہ محض ان کی بہانے بازی ہے کیونکہ سنت نبویہ میں نصوص قطعیہ موجود ہیں جو اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ صبر بھی مختلف خصلتوں کی طرح ایک خصلت ہے جس کا حصول ممکن ہے۔

چنانچہ سیّدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"جو شخص صبر کرنے کی کوشش کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو صبر و تحمل کی دولت سے مالا مال کر دیتا ہے۔" [1]

یہ قضیہ امر مسلم کی حیثیت رکھتا ہے کہ لوگ اپنی خلقت یا جبلت کے اعتبار سے صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنے میں ایک دوسرے سے مختلف ہوا کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض صبر و تحمل کا پہاڑ ہوتے ہیں اور بعض لوگوں سے بڑی مشکل صبر ہو پاتا ہے یعنی ان کی طبیعت میں تحمل و برداشت کا مادہ کم ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ صبر عمل قلبی کا نام ہے اللہ کی توفیق وعنایت سے انسان ریاضت نفسیہ شاقہ اور مستقل جدوجہد نیز اس سلسلہ میں عملی تدریب اور مجاہدۂ نفس اسی کے ساتھ ان اسباب ووسائل کو زادراہ بنا کر جو صبر و شکر کے بارے میں مددگار ہیں۔ صابرین وشاکرین کے مرتبہ تک رسائی پانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

۱۔ وہ کون سے اسباب ووسائل ہیں جو صبر و شکر کی راہ میں مددگار ثابت ہوا کرتے ہیں؟

صبر کے سلسلہ میں مددگار بننے والے اسباب ووسائل میں سے دنیاوی زندگی کی فطرت شناسی اور جس مشقت سے وہ متصف ہے اس سے آشنائی ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بڑی مشقت اور تکلیف کے ساتھ وجود بخشا ہے اور انسان اپنے رب سے ملنے تک یہ کوشش اور تمام کام اور محنتیں کر کے اس سے ملاقات کرنے والا ہے۔ چنانچہ دنیاوی زندگی میں مصائب وآلام اور مشکلات وصعوبات پیش آنا اس دنیا کا دستور ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ دنیا مصائب اور پریشانیوں سے خالی ہو۔ اگر ایسا ہے تو وہ دنیا نہیں بلکہ بہشت آخرت ہے۔ اس بارے میں عربی شاعر ابوالحسن التھامی رحمہ اللہ کے اشعار کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

"تمہاری گھٹی میں پریشانیاں ملی ہوئی ہیں اس کے باوجود تم مشکلات ومصائب

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، باب الاستعفاف عن المسألۃ: ١٤٦٩.

اور تلخیوں سے خالی زندگی کے خواہاں ہو۔ جو شخص زمانہ کے دھارے کو اُلٹی طرف موڑنے کی کوشش کرے اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے پانی کے اندر آگ کا انگارہ تلاش کرر ہا ہو۔''

جو شخص اس حقیقت سے تجاہل برتے وہ دنیاوی زندگی میں ٹھوکریں کھا کر منہ کے بل گر پڑتا ہے اور جو شخص دنیاوی زندگی کی ماہیت اور کیفیت سے آشنا ہوتا ہے تو جب کارگاہ حیات میں اسے کسی قسم کی ابتلا اور آزمائش یا پریشانی وتلخی کا سامنا ہوتا ہے تو اس موقع پر وہ اپنے دل میں وہ جذبہ کارفرما پاتا ہے جو اس کے امراض قلوب کا مداوا ثابت ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے سارے مصائب وآلام دور ہو جاتے ہیں اور سختیاں کافور ہو جاتی ہیں۔

۲۔ صبر کے سلسلہ میں مددگار بننے والے اسباب ووسائل میں سے اس بات کا ایمان وایقان بھی ہے کہ یہ ساری کی ساری کائنات اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے یہ اللہ کی مشیت میں ہے وہ جسے چاہتا ہے نوازتا ہے اور جسے چاہتا ہے نہیں دیتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ﴾ (النحل : ۵۳)

''اور تمھارے پاس جو بھی نعمت ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے۔''

اگر انسان کو آزمائش سے نبرد آزمائی کرنا پڑے تو اس موقع پر اسے چاہیے کہ وہ (انا للہ وانا الیہ راجعون) کا ورد کرے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴾١٥٦

(البقرۃ : ۱۵۶)

''وہ لوگ کہ جب انھیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں بے شک ہم اللہ کے لیے ہیں اور بے شک ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔''

بلاشبہ بندہ، اس کے اہل وعیال، اس کا مال و دولت ساری کی ساری اللہ کی ملکیت اور اس کے قبضہ وتصرف میں ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے عاریت کے طور پر بندے کو اس کا مالک بنایا ہے اور عاریت میں عطا کرنے والے کو اس بات کا اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنی دی ہوئی

چیز جب چاہے واپس لے لے۔ سیّدہ ام سلیم رضی اللہ عنہا کو جب اس قضیہ کا ادراک ہو گیا تو سیّدنا ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کا اس بارے میں عجیب وغریب قصہ پیش آیا۔ ہوا یہ کہ جب سیّدنا ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے لاڈلے بیٹے کا انتقال ہو گیا تو ام سلیم رضی اللہ عنہا نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ آپ کا کیا خیال ہے اس چیز کے بارے میں جو کسی قبیلہ کے لوگوں نے کسی معتبر گھرانے کے لوگوں کے پاس بطور عاریت رکھی ہو اور وہ آ کر اپنی امانت طلب کریں تو کیا ان لوگوں کو اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ وہ ان کی امانت واپس کرنے میں چوں چرا سے کام لیں سیّدنا ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا نہیں تو ام سلیم رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ ''آپ بھی اپنے لڑکے کے بارے میں اجر وثواب کی امید کرتے ہوئے صبر سے کام لیں۔'' ❶

۳۔ صبر کے سلسلہ میں مددگار بننے والے اسباب میں صبر وشکر پر اجرو ثواب کے حصول کی معرفت بھی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿٥٨﴾ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿٥٩﴾﴾

(العنکبوت: ۵۸ تا ۵۹)

''یہ ان عمل کرنے والوں کا اچھا بدلہ ہے۔ جنھوں نے صبر کیا اور اپنے رب ہی پر بھروسا رکھتے ہیں۔''

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''حسن عاقبت کا پیش نظر رہنا صبر کرنے کے لیے معاون کی حیثیت رکھتا ہے۔'' ❷

سیّدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''قیامت والے دن دنیاوی زندگی میں صحت وعافیت سے محظوظ ہونے والے لوگ جب آزمائش میں زندگی گذارنے والوں کو اجر وثواب ملتا ہوا دیکھیں گے تو اس بات کی تمنا کریں گے کہ کاش کہ دنیا میں ان کھالوں کو قینچیوں سے کاٹ کاٹ کر تکا بوٹی کر دیا گیا ہوتا۔'' ❸

---

❶ صحيح مسلم، كتاب الأداب، باب استحباب تحنيك المولود: ۲۱۴۴. ❷ مدارج السالكين: ۱۶۷/۲.
❸ ترمذي، كتاب الزهد، باب يوم القيامة و ندامة المحسن: ۲۴۰۲ وحسنه الالباني

۴۔ صبر کے سلسلہ میں مددگار بننے والے اسباب میں صبر کی نیت بھی ہے۔

سیّدنا عبدالواحد بن زید رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جس شخص نے اللہ کی اطاعت وفرماں برداری کی خاطر صبر کرنے کی نیت کی تو اللہ تعالیٰ اس کو صبر کرنے کی طاقت اور قوت سے نواز دیتا ہے اور جس شخص نے اللہ کی نافرمانی اور معصیت کی انجام دہی سے کنارہ کشی پر صبر کرنے کی نیت کی تو اللہ تعالیٰ اس بارے میں اس کی غیب سے مدد فرماتا ہے اور اس کو اس سے گلوخلاصی عطا فرمادیتا ہے۔'' [1]

۵۔ صبر کے سلسلہ میں مددگار بننے والے وسائل میں سے اللہ کی مدد ونصرت کے حصول پر یقین واعتماد بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر تنگی اور بدحالی کے بعد دوگنی آسانی اور خوشحالی کا وعدہ کر رکھا ہے۔ یہ محض اللہ کی رحمت وعنایت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝﴾ (الانشرح: ٥، ٦)

''یقیناً مشکل کے ساتھ آسانی ہے، بیشک مشکل کے ساتھ راحت بھی ہے۔''

اللہ تعالیٰ آزمائش کے بقدر اپنی مدد اور نصرت کا نزول فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں فرماتا اس کا وعدہ وقوع پذیر ہو کر رہتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِينَ لَا يُوقِنُونَ ۝﴾

(العنکبوت، الروم: ٦٠)

''پس صبر کر، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور وہ لوگ تجھے ہرگز ہلکا نہ کر دیں جو یقین نہیں رکھتے۔''

اور یہ بات یقینی ہے کہ دیر یا سویر افق سے صبح صادق کی کرنیں نمودار ہو کر رہتی ہیں اگرچہ رات کتنی طویل کیوں نہ ہو۔ کسی عربی شاعر کا قول ہے:

---

[1] حلیة الاولیاء: ٦/١٦٣.

''اے مصیبت! تجھے جتنا سخت ہونا ہو سخت ہوتی چلی جا، جب مصیبت طول پکڑتی ہے تو خود بخود اس کی گھنگھور گھٹا چھٹ جاتی ہے اور اے مصیبت! تیری سیاہ ترین رات پر صبح کی سفیدی کا غازہ نمایاں نظر آ رہا ہے۔'' ❶

سیّدنا یعقوب علیہ السلام نے سیّدنا یوسف علیہ السلام کے گم ہو جانے پر صبر کیا۔ یہی نہیں بلکہ اپنی اولاد میں دو بیٹوں کی گم شدگی پر تحمل کا مظاہرہ کیا اور تاریخی جملہ فرمایا: ﴿فَصَبْرٌ جَمِيلٌ﴾ (یوسف: ۸۳) یعنی بلاشبہ اس موقعہ پر صبر ہی بہتر اور افضل ہے۔ نہ تو خفگی و ناراضگی کا مظاہرہ کیا اور نہ ہی اویلا مچایا اور بڑے وثوق اور اعتماد کے ساتھ فرمایا:

﴿عَسَى اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَمِيعًا﴾ (یوسف: ۸۳)

''عنقریب اللہ تعالیٰ ان سب کو میرے پاس لے آئے گا۔''

مزید یہ کہ اپنی پریشانیوں اور رنج و غم کی فریاد اللہ کی بارگاہ میں پیش کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّمَا أَشْكُو بَثِّي وَحُزْنِي إِلَى اللَّهِ﴾ (یوسف: ۸۶)

''میں تو اپنی پریشانیوں اور رنج و غم کی فریاد اللہ ہی سے کر رہا ہوں۔''

مگر مخلوق کے سامنے گلہ و شکوہ نہیں کیا۔ اس کے نتیجہ میں اللہ کی مدد اور نصرت کا نزول ہوا اور ان کی ساری کی ساری اولاد ایک جگہ اکٹھی ہو گئی۔

۶۔ صبر کے سلسلہ میں مددگار بننے والے اسباب میں سے اللہ کی ذات سے مدد و استعانت طلب کرنا اور اس کی جناب میں پناہ لینا اور اس سے نصرت و اعانت کا سوال کرنا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ﴾ (النحل: ۱۲۷)

''آپ صبر کریں بغیر توفیق الٰہی کے آپ صبر کر بھی نہیں سکتے۔''

امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اس آیت کریمہ میں اس بات کی خبر دی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور

❶ روح المعانی: ۷۹/۱۳۔

اس کی اعانت اور اس کی قوت اور قدرت کے بغیر صبر کا تصور محال ہے۔'' [1]

۷۔ صبر کے سلسلہ میں مددگار بننے والے اسباب میں قضا قدر پر ایمان بھی ہے۔

صبر کے بارے میں مددگار چیزوں میں سے اہم ترین چیز اللہ کی مقدر کی ہوئی تقدیر پر ایمان لانا ہے۔ اسی کے ساتھ بندے کی اس بارے میں یقین و معرفت بھی ہے کہ اللہ کی قضا وقدر کا نفاذ ہو کر رہتا ہے۔ لہٰذا اللہ کی قضا کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا اور اس بات پر یقین رکھنا کہ اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں اس سلسلہ کی اہم ترین کڑی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴾ (الحدید: ۲۲)

''کوئی مصیبت نہ زمین پر پہنچتی ہے اور نہ تمھاری جانوں پر مگر وہ ایک کتاب میں ہے، اس سے پہلے کہ ہم اسے پیدا کریں۔ یقیناً یہ اللہ پر بہت آسان ہے۔''

پھر بندے کو اس بات کا بخوبی علم ہے کہ جزع وفزع، تنگ دلی و بے قراری، نکتہ چینی وعیب گوئی، شکوہ شکایت، کبیدہ خاطری و بے چینی سے کوئی فائدہ نہیں اور نہ ہی اس قسم کی حرکتوں سے کھوئی چیز واپس مل سکتی ہے۔ عقل مند اور ہوش مند تو وہ شخص ہے جو ایسی صورتحال میں صبر کا سہارا لیتا ہے اور مصیبت کے موقع پر تحمل سے کام لیتا ہے۔ اس کے برعکس جاہل و نادان شخص بلبلاہٹ و گھبراہٹ اور کبیدہ خاطری و بے چینی میں مبتلا ہو جاتا ہے لیکن اخیر میں اسے بھی صبر کے دامن میں پناہ ملتی ہے۔ اگر وہ شروع ہی سے صبر کا دامن تھام لیتا تو اس کے لیے یہ کہیں بہتر اور موزوں ہوتا مگر اس نے اپنی اس حرکت کی وجہ سے اجر وثواب اور اخیر میں مجبوراً صبر ہی کی آغوش میں آنا پڑا۔

۸۔ صبر کے سلسلہ میں مددگار بننے والے اسباب و وسائل میں سے اس بات کی معرفت و پہچان بھی ہے کہ مصیبت بندۂ عاجز کی صلاح وتقویٰ کے قدر ہو گی۔

سیّدنا سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: اے اللہ کے رسول! لوگوں میں کون لوگ ایسے ہیں جو حد سے زیادہ ابتلا وآزمائش

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ۲/ ۷۸۱.

کا شکار بنے؟ فرمایا: وہ انبیاء علیہم السلام ہیں ان کے بعد ان کے پیروکاروں میں ان سے جو جتنا قریب تھا، وہ آزمایا گیا۔ آدمی اپنے دین میں ثبات واستقامت کے بقدر آزمائش میں ڈالا جاتا تھا اگر اس کا دین فولاد کی طرح صلابت کا آئینہ دار ہوتا تو اس کی آزمائش بھی ویسی ہی ہوتی اور اس کے دین میں کمزوری اور ضعف ہوتا تو اس کی ابتلا وآزمائش بھی ویسی ہی ہوتی اور بندہ پیہم آزمائش کا شکار رہتا حتی کہ وہ آزمائش اسے اس پوزیشن پر لاکر چھوڑتی کہ وہ زمین پر چلتا پھرتا اور اس کے ذمہ ایک گناہ بھی نہ ہوتا۔ مراد یہ ہے کہ گناہوں سے پاک اور صاف ہوجاتا۔ [1]

۹۔ صبر کے سلسلہ میں مددگار بننے والے اسباب میں اہم سبب صابرین وشاکرین کے بے مثال قصوں اور واقعات میں تدبر وتامل بھی ہے۔

مثال کے طور پر انبیاء علیہم السلام کے واقعات اور قصوں میں غور وفکر کی نظر دوڑانا۔ دراصل انبیاء علیہم السلام کے قصے مدرسہ یا اسکول ہیں جہاں سے انسان کو صبر وتحمل کی ٹریننگ اور تعلیم ملتی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی ہمارے پیش نظر رہے کہ انبیاء علیہم السلام کی حیثیت ان کی نبی کی حیثیت سے قبل بشر کی ہی ہے۔ وہ بھی ہماری طرح بشر ہوا کرتے تھے ان کی بشریت نبوت پر مقدم ہے۔

چنانچہ سیّدنا نوح علیہ السلام کے قصہ کو ہی لے لیجیے انہوں نے اپنی قوم میں دعوت دین کی راہ میں بڑے عظیم الشان صبر وتحمل کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے اپنی قوم کو (ساڑھے نو سو سال) دعوت دی اور پوری زندگی اسی جد وجہد اور اسی دعوت وتبلیغ میں گذار دی اس راہ میں تکلیفوں اور اذیتوں نیز اپنی قوم کی پھبتیوں اور جملہ بازیوں پر صبر کیا اور ان کے استہزاء وتمسخر کا جواب بڑے حکیمانہ ومدبرانہ انداز میں دیا۔ اس کو ان کی قوم کے لوگوں نے دیوانگی اور گمراہی و بے راہ روی سے موسوم کیا مگر سیّدنا نوح علیہ السلام صبر کی ذرہ پہن کر اس میدان کارزار میں ڈٹ گئے اور صبر واستقلال کا پہاڑ بن کر اپنی قوم کی سرکشی وطغیانی کا مقابلہ کرتے رہے حتی کہ ان کی قوم کے لوگوں نے دھمکی دیتے ہوئے کہا:

﴿لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ﴿١١٦﴾﴾ (الشعراء: ۱۱۶)

[1] ترمذی، کتاب الزهد، باب ما جاء في الصبر على البلاء: ۲۳۹۸ وقال: حسن صحیح

''اے نوح! اگر تو باز نہ آیا تو یقیناً تجھے سنگسار کر دیا جائے گا۔''

آپ علیہ السلام نے اس کے باوجود صبر وتحمل کا مظاہرہ کیا۔ یہ تھا سیّدنا نوح علیہ السلام کا صبر وتحمل۔

سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کو بھی بڑی عظیم آزمائش سے دوچار ہونا پڑا۔ چونکہ آپ نبی تھے آپ نے بھی اس آزمائش کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ایک پکے موحد، اللہ کے وعدے پر بھرپور یقین رکھنے والے مردِ آہن کی طرح اس آزمائش پر صبر کیا۔ چنانچہ جب آپ کو دہکتی ہوئی آگ میں جھونکا گیا تو اس موقع پر آپ کی زبان صدق سے آخری جملہ یہی نکلا تھا ﴿حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ﴾ [1] ''اللہ ہی کی ذات میرے لیے کافی ہے اور وہی میرا بہترین کارساز ہے''

جب سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کو بطور قربانی ذبح کرنے کا حکم دیا گیا، اس وقت بھی آپ علیہ السلام نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا اور بحکم خداوندی بیٹے کو ذبح کرنے کا تہیہ کر لیا نیز اس فریضہ کی انجام دہی کی خاطر چھری اٹھا کر بیٹے کو لٹا دیا اور اللہ کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ یہ تھا صبر ابراہیم علیہ السلام جس کا تذکرہ چل رہا ہے۔

اس کے بعد بیوی اور شیرخوار بچے کو بے آب وگیاہ وادی میں تن تنہا چھوڑ دینے کا حکم صادر ہوا۔ صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے آپ اس حکم کو بھی برضا ورغبت بجالائے حالانکہ آپ کے صاحبزادے ابھی شیرخوار ہی تھے۔ ولادت کو تھوڑا عرصہ ہی گذرا تھا اور باپ کے لاڈلے اور چہیتے بیٹے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بطور معجزہ بانجھ پن کے باوجود محض اپنی قدرت کی کرشمہ سازی کے طور پر یہ اولاد عطا فرمائی تھی اور سیّدنا اسماعیل علیہ السلام آپ علیہ السلام کے بڑھاپے کا سہارا بھی تھے کیونکہ سیّدنا ابراہیم علیہ السلام جب بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے اس وقت سیّدنا اسماعیل علیہ السلام کی ولادت باسعادت ہوئی اس موقع پر یہ بیٹا آپ علیہ السلام کے بڑھاپے کی بیساکھی تھا۔ ان تمام اسباب کی موجودگی میں آپ علیہ السلام نے حکم الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے اپنے لاڈلے بیٹے اور اس کی ماں کو صبر وتحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہاں لے جا کر چھوڑ دیا۔ جہاں انہیں چھوڑنے کا حکم دیا گیا تھا ان لوگوں کو بے آب وگیاہ میدان میں چھوڑ کر جب

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب أین رکز النبیّ الرایة یوم الفتح: ٤٢٨٨.

واپس جانے لگے تو آپ علیہ السلام کی بیوی سیّدنا ہاجرہ علیہا السلام نے پوچھا: آپ ہمیں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں! جبکہ یہ وادی جہاں نہ کوئی آدم ہے اور نہ آدم زاد؟ یہ بات سیّدنا ہاجرہ علیہا السلام نے بار بار دہرائی! اس کے باوجود سیّدنا ابراہیم علیہ السلام نے ان کی طرف نظر التفات نہ ڈالی تو سیّدنا ہاجرہ علیہا السلام نے بالآخر خود ہی کہا: کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ تو سیّدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ہاں۔ تو سیّدنا ہاجرہ علیہاالسلام نے فرمایا: جائیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔ سیّدنا ابراہیم علیہ السلام ان دونوں کو چھوڑ کر شام واپس چلے آئے اور ادھر سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے دوسرا بیٹا (سیّدنا اسحاق علیہ السلام) عطاء فرمایا اور سیّدنا اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں یعقوب علیہ السلام پیدا ہوئے، اور مکہ مکرمہ میں اللہ تعالیٰ نے سیّدنا اسماعیل اور ان کی والدہ ہاجرہ علیہا السلام کو بطور انعام واکرام زمزم عطاء فرمایا یہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ اور بھی اعزازات سے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو مکہ مکرمہ میں نوازا۔

سیّدنا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کی طرف سے دھمکیوں اور چیلنجوں پھر تکلیفوں اور ایذاؤں کا سامنا کیا اور قوم فرعون کی طرف سے بھی اسی طرح کے معاملہ سے دوچار رہے مگر دونوں قوموں کو صبر واستقامت کے ساتھ دعوت دیتے رہے۔ چنانچہ آپ علیہ السلام نے قوم فرعون کو دعوت دینے پر صبر کیا اور ان کے ظلم وجور کو برداشت کیا۔ ان کی ایذا رسانی نیز ان کی دھمکیوں اور پھبتیوں کو سنا اور برداشت کیا حتی کہ اللہ کا وعدہ آ پہنچا اور اللہ تعالیٰ نے قوم فرعون کو تباہ وبرباد کردیا۔ اس کے بعد بنی اسرائیل کی ہٹ دھرمی اور اذیت ناک رویہ پر صبر وتحمل سے کام لیا۔ اسی لیے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا رسانی کا معاملہ درپیش ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بھائی موسیٰ علیہ السلام کی تکلیفوں اور ان کی قوم کی طرف سے ان کو دی گئی اذیتوں کا تصور کرلیتے تو غم ہلکا ہوجاتا۔ اسی لیے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ''اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام پر رحم وکرم کا معاملہ فرمائے۔ انہیں اس سے زیادہ تکلیفیں دی گئیں اور انہوں نے صبر وتحمل سے کام لیا۔'' [1]

سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کی طرف جھوٹی اور باطل تہمتوں کا سامنا کرنا پڑا اور ان

[1] صحيح بخاري: ٣٤٠٥ـ صحيح مسلم: ١٠٦٢.

کی قوم نے جو سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام کے قتل پھر ان کو سولی پر چڑھانے کا ڈھونگ رچایا تھا۔ اس سازش سے نبرد آزمائی کے لیے انہیں صبر و تحمل سے کام لینا پڑا حتی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ آسمان کی جانب بطور حفاظت اٹھا لیا۔ چنانچہ وہ محفوظ و مامون آسمان پر موجود ہیں۔

خاتم الانبیاء ﷺ کتنی مصیبتوں اور اذیتوں اور ظلم کا شکار بنے حتی کہ نبی کریم ﷺ کو مجنون اور دیوانہ، جادوگر کہا گیا۔ اس میں سب سے بھونڈی تہمت طرازی یہ تھی کہ آپ پر جھوٹ اور دروغ گوئی کی تہمت لگائی گئی اور عقل مند شخص کے لیے یہ بات نا قابل برداشت ہے کہ اسے مجنون یا دیوانہ کہا جائے اور کسی امین وراست گو شخص کو اگر خائن کہا جائے تو یہ بات اس پر بجلی بن کر گرنے کے مترادف ہے اور بندۂ مؤمن کو اگر (شاعر، جادوگر، دیوانہ، پاگل) کہہ کر پکارا جائے تو کیا اس کا ضمیر اس کو گوارا کرے گا؟ جبکہ نبی کریم ﷺ مخلوق کائنات میں کامل ترین انسان تھے۔ صدق ووفا کے پیکر تھے عقل وفہم کے اعتبار سے دنیا کی کامل ترین شخصیت ہونے کا اعزاز رکھتے تھے۔ اس کے باوجود آپ ﷺ کو اپنی قوم کی طرف سے ایسے بھونڈے القاب سے موسوم کیا جانا ایک نا قابل برداشت بات ہے۔

یہی نہیں بلکہ آپ ﷺ کو حد سے زیادہ اذیتیں اور تکلیفیں دی گئیں اور آپ ﷺ کی راہ میں کانٹے بچھائے گئے اور آپ ﷺ کو خود آپ کے شہر سے نکالا گیا اور آپ ﷺ کے قتل کی سازش کی گئی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ﴾

(الانفال: ۳۰)

''اور جب وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، تیرے خلاف خفیہ تدبیریں کر رہے تھے، تاکہ تجھے قید کر دیں یا تجھے قتل کر دیں یا تجھے نکال دیں۔''

یہی نہیں آپ ﷺ کے بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو انہوں نے قتل کر ڈالا، اور بعض کو سخت اذیتیں اور تکلیفیں دیں، اور نبی کریم ﷺ کے لیے یہ بات نا قابل برداشت اور سوہان روح تھی کہ آپ ﷺ کی آنکھوں کے سامنے آپ ﷺ کے متبعین و پیروکاروں پر

ظلم وستم ڈھایا جاتا تھا اور بعض کو تکلیفیں دے کر موت کی نیند سلا دیا جاتا تھا چنانچہ نبی کریم ﷺ کا جب سیّدنا یاسر اور سیّدنا سمیہ رضی اللہ عنہا کے پاس سے اس حال میں گذر ہوتا کہ انہیں اذیتیں دی جارہی ہوتیں تو آپ ﷺ ان دونوں سے فرمایا کرتے تھے: ''اے آل یاسر! صبر وتحمل سے کام لو، بلا شبہ یقینی طور پر تمہارا ٹھکانہ جنت ہے۔'' ❶

نبی کریم ﷺ ہجرت کرکے جب مدینہ منورہ آگئے تو وہاں بھی آپ ﷺ کو منافقین کی دسیسہ کاریوں سے نبرد آزمائی کرنا پڑی اور ان کی طرف سے اذیتوں اور تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اس بارے میں بطور مثال افک کا واقعہ کافی ہے۔ کیا اس سے بڑھ کر اور کوئی ایذا رسانی ہوسکتی ہے۔ ام المؤمنین کو دروغ گوئی اور تہمت طرازی کا نشانہ بنایا جائے؟ یہودیوں کی اس چال پر بھی نبی کریم ﷺ نے صبر وتحمل سے کام لیا جبکہ انہوں نے آپ ﷺ کو زہر کھلانے کی کوشش کی، جس کی وجہ سے آپ ﷺ پر کبھی کبھی بخار کی شدت والی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی اور جوڑی بخار کا عارضہ لاحق ہو جایا کرتا تھا حتیٰ کہ آپ ﷺ کی وفات کا بھی یہی سبب بنا۔ اس طرح ہمارے حبیب ﷺ نے صبر وتحمل کو اپنا شعار بنایا حتیٰ کہ رب کریم کی طرف سے موت کا پروانہ آپہنچا جبکہ آپ ﷺ اپنے پیغام رسالت کو امت تک پہنچا چکے تھے اور اللہ کی طرف سے سونپی امانت کو ادا کر چکے تھے۔

یہی حال آپ ﷺ کے جانثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا تھا جن میں سرفہرست سیّدنا بلال، سیّدنا سمیہ، سیّدنا صہیب رومی، سیّدنا عمار، سیّدنا مقداد رضی اللہ عنہم اجمعین تھے ان میں سے ہر ایک طرح طرح کی اذیتوں اور تکلیفوں سے دوچار ہوا اور انہیں مختلف قسم کے عذاب سے دوچار ہونا پڑا مگر انہوں نے صبر وتحمل کا ثبوت پیش کیا اور ان کے پائے استقلال میں ذرہ برابر جنبش نہ آئی بلکہ انہوں نے ثبات واستقامت کا پہاڑ بن کر اس کا مقابلہ کیا اور ان کی ایذا رسانیوں کی ذرہ برابر پروا نہ کی۔ چنانچہ صحابی جلیل سیّدنا خبیب رضی اللہ عنہ کو قید کر لیا گیا تھا تاکہ انہیں قتل کر دیا جائے اور سولی پر لٹکا دیا جائے۔ اس کے باوجود ان کا کہنا تھا: ''مجھے اس بات کی قطعی پرواہ

❶ رواه الحاكم: ٥٦٦٦ وقال: صحيح على شرط مسلم ولم يخرجاه ووافقه الذهبي۔

نہیں ہے کہ میں قتل کر دیا جاؤں اس میں حال کہ میں دولت اسلام سے سرشار ہوں۔ اب چاہے جس کروٹ موت آئے مجھے اس کا کوئی گلہ نہیں ہے۔" [1] اسی نہج کو تابعین اور تبع تابعین رضی اللہ عنہم اجمعین نے اختیار کیا اور اس پر چل کر ایک مثالی کردار ادا کیا۔

سیّدنا عروۃ بن زبیر کا تابعین رحمہم اللہ میں چنیدہ لوگوں میں شمار ہوتا ہے اور آپ تابعین میں عظیم المرتبت شخصیت کے حامل تھے۔ آپ کا ایک لڑکا تھا اس کا نام محمد تھا۔ جو بڑا خوبرو اور حسین وجمیل تھا۔ ایک دن وہ خلیفہ وقت ولید بن عبدالملک کے ایوان میں جا پہنچا۔ خوبرو تو تھا ہی اس پر طرہ یہ کہ بڑی زرق برق پوشاک میں ملبوس ہو کر قصر شاہی میں داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر خلیفہ وقت ولید نے کہا کہ قریش کے نوجوان تو اس طرح ہوتے ہیں، جس طرح محمد ہیں!! اور اس نے اس نوخیز نوجوان کے لیے برکت کی دعا نہ کی۔ یہ کہنا تھا کہ محمد بن عروۃ بن زبیر رحمہ اللہ کو اس کی نظر لگ گئی۔ اس کے بعد محمد بن عروۃ بن زبیر رحمہ اللہ ولید کی مجلس سے باہر نکلے اور چوپایوں کے اصطبل میں آ کر گر پڑے اور گرنے کے بعد وہاں سے اٹھ نہیں پائے، بس اصطبل میں پڑے رہے حتی کہ چوپایوں نے انہیں وہیں بھوسے کی طرح روند ڈالا۔ جس کی وجہ سے ان کی موت واقع ہوگئی۔

اس کے بعد سیّدنا عروہ بن زبیر رحمہ اللہ کے پیر میں "غرغرینہ" نامی بیماری کا عارضہ لاحق ہوگیا۔ ڈاکٹروں یا حکیموں نے ایک پیر کو کاٹ کر الگ کرنے کی تجویز پیش کی اور یہ طے پایا کہ اسے آری کے ذریعہ کاٹ کر تن سے جدا کر دیا جائے تاکہ جسم کے دوسرے حصہ میں اس کے زہریلے اثرات سرایت نہ کرسکیں۔ اگر پیر کاٹا نہ گیا تو یہ ان کی موت کا سبب بن سکتا ہے۔ لہٰذا اسے ڈاکٹروں کی تجویز کے مطابق کاٹا جانے لگا۔ جب آری ہڈی کاٹنے کی حد تک پہنچی تو اس موقع پر سیّدنا عروۃ رحمہ اللہ نے اپنا سر تکیہ پر رکھ لیا اور ان پر غشی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ جب افاقہ ہوا تو چہرے سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ مارے پسینہ کے شرابور تھے اور تکبیر وتہلیل اور اللہ کے ذکر سے رطب اللسان تھے۔ پھر کٹے ہوئے پیر کو ہاتھ میں لیا اور اسے الٹنے پلٹنے لگے

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی: ۳۹۸۹.

اور ہاتھ میں لیے اسے بوسہ دینے لگے اور کہنے لگے کہ جہاں تک اس ذات کا تعلق ہے جس نے تجھے میری خدمت کے لیے مسخر کیا تھا۔ وہ بخوبی جانتا ہے کہ میں کبھی حرام کاری کی طرف تیرے دوش پر سوار ہوکر نہیں گیا اور نہ کسی معصیت و نافرمانی کے لیے میں چل کر گیا اور نہ ہی میں نے کبھی اللہ کی ناراضگی کی طرف قدم اٹھایا۔ اس کے بعد حکم دیا کہ اسے غسل دیا جائے اور اسے خوشبوؤں میں معطر کیا جائے اور اسے کفن پہنا کر آراستہ کیا جائے اور اس کو قبر میں لے جاکر دفنا دیا جائے۔ اس حادثہ کے بعد جب سیّدنا عروۃ رحمہ اللہ سفر سے واپس تشریف لائے جبکہ پیر کاٹ کر تن سے جدا کیا جاچکا تھا اور اپنے بیٹے سے محروم ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود اس وقت ان کی زبان پر بس یہ جملہ تھا "ہمیں اپنے اس سفر میں بڑے مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔" اس کے بعد لوگوں نے یہ تجویز رکھی کہ آپ کو کوئی ایسی دوا پلادی جائے جو مخدر ہو اور ہوش و حواس کو زائل کر کے غم بھلادے تاکہ آپ کو درد والم محسوس نہ ہو آپ نے اس حرکت سے منع کر دیا اور فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے مجھے ابتلا و آزمائش سے اسی لیے تو دوچار کیا ہے تاکہ وہ میرے صبر کے پیمانے کی پیمائش کر سکے۔" [1]

اسی طرح صبر و تحمل سے سرشاری کے بارے میں سیّدنا احمد بن نصر خزاعی رحمہ اللہ کی مثال پیش کی جاتی ہے آپ کبار علماء سلف میں سے ہیں۔ آپ ببانگ دہل حق کی صدا بلند کرنے والوں میں سے ایک تھے اور نیکی کا اعلانیہ حکم دینا آپ کا طرۂ امتیاز تھا اور منکر سے روکنا آپ کا شیوہ تھا۔ آپ بھی خلق قرآن کے فتنہ آزمائش کا شکار ہوئے مگر آپ کے پائے ثبات واستقلال میں ذرہ برابر جنبش نہ آئی۔ چنانچہ آپ بڑی دلیری سے اس فتنہ کے سامنے سیسہ پلائی دیوار کی طرح اڑ کر کھڑے ہو گئے ان کو سامراء قید کر کے لے جایا گیا۔ وہاں آپ نے قید وبند کی صعوبتیں کاٹیں۔ وہیں ان کے سامنے مسئلہ خلق قرآن کا معاملہ پیش کیا گیا اور اس بارے میں خلیفہ وقت کے حکم کی تابعداری کے لیے کہا گیا۔ انہوں نے اس کو قبول کرنے سے

[1] صفة الصفوة : ۲/ ۸۷.

انکار کر دیا۔ جس کی پاداش میں ان کی گردن مار دی گئی ۔ ان کے سر کو تن سے جدا کر کے بغداد کے مشرقی جانب لٹکا دیا گیا۔

سیّدنا جعفر بن محمد صائغ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''میں نے قتل ہوتے وقت سیّدنا احمد بن نصر خزاعی رحمہ اللہ کو دیکھا ہے جب انہیں قتل کیا گیا تو ان کے تن سے جدا سر سے [لا الـه الا اللّٰه] یعنی کلمہ طیبہ کی صدا بلند ہو رہی تھی۔ یہ آپ کی کرامات میں سے ایک کرامت کی کرشمہ سازی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے کہ انہوں نے اللہ کے راستے میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا ہے۔'' [1]

خود سیّدنا امام احمد رحمہ اللہ کی مثال لے لیں انہوں نے فتنہ خلق قرآن میں کیسے عظیم الشان اور بے مثال صبر کا مظاہرہ کیا ہے۔امام احمد اور ان کے ہمراہ محمد بن نوح رحمہما اللہ کو مامون کے پاس لے جایا گیا مگر اللہ کی مشیت کہ محمد بن نوح رحمہ اللہ کو راستے ہی میں مرض لاحق ہو گیا۔ انہوں نے امام احمد رحمہ اللہ کو وصیت کی کہ وہ اس معاملہ میں صبر سے کام لیں اور یہ وصیت کر کے محمد بن نوح رحمہ اللہ راستے ہی میں وفات پا گئے۔ چنانچہ سیّدنا امام احمد رحمہ اللہ کو پابہ سلاسل لایا گیا۔ خلیفہ وقت کے دربار میں حاضری سے قبل بعض لوگ امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کو تقیہ کی احادیث کی یاد دہانی کرانے لگے اور کہنے لگے کہ ابتلا اور شدت کے وقت انسان کے لیے عین ممکن ہے کہ وہ توریہ سے کام لے حتی کہ آزمائش کی آندھی ٹل جائے تو امام صاحب رحمہ اللہ نے جواب دیا کہ تم سیّدنا خباب رضی اللہ عنہ کے بارے میں کیا توجیہ کرو گے؟ اس سے مراد سیّدنا خباب رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث ہے جس میں وارد ہوا ہے: وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شکایت کی اور شکوہ کرتے ہوئے عرض کیا کہ ''کیا ہمارے لیے مدد طلب نہیں فرمائیں گے؟ کیا ہمارے لیے غیبی امداد کی دعا نہیں کریں گے؟'' تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''سابقہ امتوں میں لوگوں کو گڑھا کھود کر اس

---

[1] تاریخ بغداد : ۵/۱۷۷.

میں گاڑ دیا جاتا تھا اور ان کے سر کے بیچ (مانگ کی جگہ پر) آری رکھ کر دو ٹکڑے کر دیے جاتے تھے۔ اس کے باوجود کوئی چیز انہیں ان کے دین سے نہیں روک سکتی تھی اور لوہے کی کنگھیوں سے ان کے جسم کے گوشت کو کھینچ لیا جاتا تھا مگر پھر بھی یہ ایذا رسانی ان کو دین سے نہیں روک سکی تھی۔''❶ حتیٰ کہ ان کو ایذا پہنچانے والے مایوس ہو جاتے تھے اور تھک ہار کر بیٹھ جاتے تھے۔

اس کے بعد سیّدنا امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا: ''اے اللہ! مجھے مامون کی صورت نہ دکھلا چنانچہ امام احمد رحمہ اللہ ابھی مامون کے سامنے پیشی کے لیے پہنچ بھی نہ پائے تھے کہ اس کا انتقال ہو گیا اور اس کا ولی عہد خلیفہ منتخب کیا گیا اور آزمائش جوں کی توں قائم رہی۔ ان میں سے بعض لوگوں نے کہا! اللہ کے لیے اپنے نفس پر رحم کھاؤ۔ یہ خلیفہ جو آیا ہے یہ آپ کو تلوار سے قتل نہیں کرے گا لیکن آپ کو اتنا مارے گا اتنا مارے گا کہ آپ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ اس کے باوجود انہوں نے فتنہ خلق قرآن میں خلیفہ وقت کی ہاں میں ہاں ملانے سے انکار کر دیا۔

خلیفہ وقت نے امام احمد رحمہ اللہ سے پوچھا: کیا آپ صالح رشیدی کو جانتے ہیں؟ تو امام صاحب نے جواب دیا: ''ان کے بارے میں سنا ہے'' خلیفہ نے جواب دیا: وہ میرے مؤدب تھے۔ ان سے میں نے خلق قرآن کے بارے میں سوال کیا انہوں نے میری مخالفت میں جواب دیا، میں نے ان کو اوندھے منہ زمین پر گھسیٹنے کا حکم دیا کہ ان کو اتنا گھسیٹا جائے کہ خود بخود موت واقع ہو جائے۔ اس کے بعد امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی مشکیں کس دی گئیں اور جلادوں کو حاضر کیا گیا جلادوں میں ہر جلاد دو دو کوڑے لگاتا، اس کے بعد خلیفہ جھنجھلا کر کہتا: ان کی مشکوں کو خوب اچھی طرح کس دو۔ اس کے بعد دوبارہ پھر سے جلاد امام احمد رحمہ اللہ کے شانوں پر مارنا شروع کر دیتے۔ اس کے بعد پھر خلیفہ کہتا: اے احمد! اپنے آپ کو ہلاکت میں کیوں ڈال رہے ہو؟ میں تم پر شفیق اور مہربان ہوں۔ یہ بات سن کر امام صاحب کے سر پر کھڑا جلاد آپ کے سر پر ٹھنا مارتا اور دوسرا جلاد کہتا: تمہارا ستیاناس ہو اے احمد! تم نے میرا جواب نہیں دیا۔ مجھے جواب دو جس پر تمہاری گلوخلاصی منحصر ہے تاکہ میں تم کو آزاد کر

❶ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ فی الإسلام: ۳۶۱۲.

دوں۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے: اے امیر المؤمنین! مجھے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ سے دلیل لا کر دکھادو جو کہ تمہارے قول کی تائید کرتی ہو تو میں اسے مان لوں گا۔ اس کے بعد جلاد آتا اور بے تحاشہ مارتا پیٹتا اور مار پیٹ کی کاروائی چلتی رہتی حتی کہ جلادوں نے اتنا مارا، اتنا مارا کہ آپ پر غشی طاری ہوگئی اور بیڑیاں ہاتھوں میں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد آپ کو ہوش نہ رہا تو ایک شخص نے بتلایا کہ اس کے بعد ہم نے آپ کو منہ کے بل اوندھا لٹادیا اور آپ کے جسم کے اوپر چٹائی ڈال دی اور اسے پیروں سے خوب روندا۔ امام احمد رحمہ اللہ نے جواب دیا مجھے اس کا ذرہ برابر احساس تک نہ ہوا۔ اس کے بعد آپ رحمہ اللہ کو جیل میں ڈال دیا گیا پھر (۲۸) ماہ کے بعد آپ کو جیل سے رہائی مل پائی۔

اسلاف امت میں سے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے بارے میں کسی کا قول ہے:

> ''اللہ کے راستے میں اس شخص نے اپنے نفس کی پرواہ نہ کی اور اپنے نفس کو اللہ کے لیے بے دریغ تج دیا، ٹھیک اس طرح جس طرح سیّدنا بلال حبشی رضی اللہ عنہ نے دین کے راستے میں اپنے نفس کی پرواہ نہ کی تھی، لہٰذا اگر امام احمد رحمہ اللہ نہ ہوتے تو اسلام کا نام ونشان مٹ جاتا۔'' [1]

اگر بندہ اسلاف میں سے اولوالعزم لوگوں کی سیرت اور کارناموں پر نظر دوڑائے اور ان کی آزمائشوں کی یاد تازہ کرے تو یہ قصے اس کو صبر وتحمل کی راہ میں مددگار ثابت ہوں اور اس کے پائے استقامت میں ثبات پیدا کرنے کا سبب بن جائیں اور مصیبت وآزمائش پر جزع وفزع کرنے سے اسے روکنے اور باز رکھنے کا ذریعہ ثابت ہوں۔

صبر وتحمل کے منافی آفتوں اور فتنوں کا بیان

عمل خیر کی قبیل سے چاہے جو بھی عمل ہو اس کی انجام دہی کی راہ میں بعض آفتیں آڑ بن کر ضرور کھڑی ہوجایا کرتی ہیں، پھر وہ بندۂ مؤمن کو کسی صورت میں بھی بحسن وخوبی

---

[1] حلیة الاولیاء: ۹/ ۱۷۱-۲۰۳.

کام نہیں کرنے دیتیں یا کم از کم اس کو مکمل طور پر شرمندۂ تعبیر ہونے نہیں دیتیں بلکہ راستے کی رکاوٹ بن کر عمل خیر میں رخنہ اندازی ضرور ڈالتی ہیں۔ یہی معاملہ صبر کا بھی ہے اس راہ میں بھی بعض آفتیں اور فتنے سر اٹھایا کرتے ہیں جو کہ فریضہ صبر کے منافی شمار کیے جاتے ہیں۔ ان آفتوں اور فتنوں میں سے مندرجہ ذیل چند آفتوں اور فتنوں کا ذکر پیش خدمت ہے۔

ا۔ جلد بازی:

انسان اپنی طبیعت اور خلقت کے اعتبار سے بڑا ہی جلد باز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی گھٹی میں یہ چیز ودیعت کر رکھی ہے اور اس کی خلقت کو اسی صورت میں ڈھالا ہے۔ اللہ تعالیٰ بذات خود ارشاد فرماتا ہے: ﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ﴾ ''انسان جلد باز مخلوق ہے۔'' (الانبیاء : ۳۷) اس لیے انسان کو چاہیے کہ سمجھ بوجھ کے ساتھ کام کرے اور صبر کرے یہاں تک کہ نتیجہ تک رسائی مل جائے چاہے اس میں تاخیر ہی کیوں نہ واقع ہو۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو صبر کا حکم دیا ہے اور جلد بازی سے کام لینے سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ جلد بازی سے کام نہ لینا اولوالعزم انبیاء علیہم السلام کا اسوۂ حسنہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ﴾

(الاحقاف : ۳۵)

''پس صبر کر جس طرح پختہ ارادے والے رسولوں نے صبر کیا اور ان کے لیے جلدی کا مطالبہ نہ کر۔''

بہت سی اصلاحی اور دعوتی تنظیمیں افق عالم پر ابھریں اور ناکامی ونامرادی ان کا مقدر بنی کیونکہ ان کے کارندوں نے اس کے فوائد وثمرات کے حصول میں جلد بازی سے کام لیا اور وقت سے پہلے ہی اس کا پھل حاصل کرنے کی تگ ودو شروع کر دی اور صبر وتحمل سے کام نہ لیا بلکہ جلد بازی میں سب کچھ گنوا بیٹھے۔

۲۔ غیظ وغضب:

غیظ وغضب بھی ان آفتوں اور مصیبتوں میں سے ایک آفت ہے جو صبر کے منافی

بلکہ اس کی خیر و برکت کو چاٹ جانے والی بلا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے نبی محمد ﷺ کو اس بلا سے متنبہ اور آ گاہ فرمایا ہے بلکہ اس کے برے انجام کار سے ڈرایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ ۘ إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ مَكْظُومٌ ﴿٤٨﴾ ﴾ (القلم : ٤٨)

''پس اپنے رب کے فیصلے تک صبر کر اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو، جب اس نے پکارا، اس حال میں کہ وہ غم سے بھرا ہوا تھا۔''

۳۔ مایوسی:

مایوسی و ناامیدی بھی صبر کی راہ کا کانٹا ہے۔ اسی لیے سیّدنا یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو مایوسی سے منع فرما کر اس کے برے انجام سے متنبہ اور آ گاہ فرما دیا تھا۔ فرمایا تھا:

﴿ يَا بَنِيَّ اذْهَبُوا فَتَحَسَّسُوا مِنْ يُوسُفَ وَأَخِيهِ وَلَا تَيْأَسُوا مِنْ رَوْحِ اللَّهِ ۖ ﴾ (یوسف : ٨٧)

''اے میرے بیٹو! جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کا سراغ لگاؤ اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔''

مصائب و آلام کے وقت صبر امید کی کرن ثابت ہوتا ہے اس بنا پر مایوسی کے مریض کے لیے مجرب نسخہ کیمیا ہے اور جو شخص اللہ کی رضا کے لیے اس کی راہ میں صبر و تحمل سے کام لیتا ہے اللہ تعالیٰ اسے ناکام و نامراد ہونے نہیں دیتا اور نہ ہی اسے مایوسی و ناامیدی کا شکار بنا کر ضائع ہونے کے لیے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے بلکہ صبر و تحمل کے نتیجہ میں اللہ کی طرف سے مدد ضرور آتی ہے۔ چاہے اس میں تھوڑی بہت تاخیر ہو جائے مگر اللہ کی مدد آ کر ہی رہتی ہے۔

خاتمہ

نبی کریم ﷺ نے مصائب و آزمائش کے وقت صبر وتحمل کو وسیلہ کے طور پر اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے۔ چنانچہ سیّدنا ابوثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''تمہارے پیچھے ایسے ایام آنے والے ہیں جو ایام صبر ہوں گے، جن دنوں میں صبر کرنا ہتھیلی پر انگارے رکھنے کے مترادف ہوگا ایسی صورت حال میں دین پر عمل کرنے والے کا اجر پچاس آدمیوں کے عمل کرنے کے برابر ہوگا۔'' [1]

نبی کریم ﷺ نے دین میں آزمائش کو ایام صبر قرار دیا ہے اور شہوات نفسانیہ کی بڑھکتی آگ نیز محکم شبہات سے لبریز ایام کا اس تعبیر بلیغ کے ذریعہ ذکر فرمایا ہے۔ مراد یہ ہے کہ آخری زمانہ میں صورت حال ایسی ہوگی جس میں دین پر صبر کرنا مٹھی میں انگارے پکڑنے کے مترادف ہوگا۔ ایسے زمانے میں صبر کرنے والے ہی اصل دین دار ہوں گے۔ شبہات کے چکر میں پڑ کر ان کے پائے ثبات میں ذرہ برابر جنبش پیدا نہ ہوگی اور نہ ہی وہ شبہات کے اسیر ہو کر اس کی غلامی کرنے پر آمادہ ہوں گے۔ انہیں چاہے جتنی تکلیفیں اور اذیتیں دی جائیں ان کے دین میں ذرہ برابر ضعف یا کمزوری پیدا نہ ہوگی۔

حدیث مذکور میں اسی صورت حال کو ایام صبر کے نام سے موسوم کیا گیا ہے کیونکہ صورت حال ایسی ہوگی کہ ان ایام میں صبر کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ ہوگا اور مؤمن کے لیے صبر وتحمل کے علاوہ اور کوئی طریق کار سودمند نہ ہوگا۔ کسی عربی شاعر کا قول ہے:

''یہ صبر کا زمانہ ہے آنکھ بند پر کانٹوں پر چل کر نکل جاؤ اور اللہ کے لیے صبر وتحمل

---

[1] ابو داؤد کتاب الملاحم، باب الأمر والنهى : ٤٣٤١ وصححه الحاكم ووافقه الذهبى.

سے کام لو اور نرمی اور بردباری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالو۔ چونکہ سلف صالحین نے صبر کی اہمیت وافادیت کا اندازہ لگالیا تھا اسی لیے تو انہوں نے لوگوں کو مصائب سے نپٹنے کے لیے صبر وتحمل سے کام لینے کی غرض سے ٹریننگ کر کے تیاری کا حکم دیا ہے۔'' ❶

سیّدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

''صبر وتحمل سے کام لینے کی عادت ڈالو، کیونکہ ہوسکتا تم پر ناگہانی طور پر مصائب کا نزول ہونا شروع ہوجائے اور تم مصیبتوں میں مبتلا ہوجاؤ۔'' ❷

سیّدنا ابودرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں:

''جو شخص مصائب سے مقابلہ کے لیے صبر وتحمل سے مسلح ہوکر تیار نہ ہو تو وہ آزمائش کا مقابلہ نہیں کرسکتا بلکہ ایسا شخص اس کے سامنے عاجز ہوکر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوجائے گا۔'' ❸

کسی عربی شاعر کا قول ہے:

''اپنے آپ کو صبر جمیل کا عادی بناؤ اللہ کی قضا وقدر پر راضی برضا رہنا افضل ترین کام ہے اور پورے صبر وتحمل کے ساتھ ہدایت کے پرچم تلے ثابت قدمی کے ساتھ جم جاؤ اور صبر تو انسان کا افضل ترین توشہ ہے۔''

ادیان سابقہ سے تعلق رکھنے والے صالحین اپنے بیٹوں اور اہل وعیال کو صبر کی وصیت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ سیّدنا لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو وصیت کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ اللہ کے راستے میں جو اذیتیں اور تکلیفیں پہنچیں اس پر صبر کرنا نہ بھولنا۔ فرماتے ہیں:

﴿يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿١٧﴾﴾ (لقمان: ۱۷)

---

❶ نشرطي التعريف: ۸۷. ❷ شعب الايمان: ۹۷۲۰۔ السنن الواردة فی الفتن: ۱۷.
❸ مصنف ابن ابی شیبة: ۳۴۵۹۶.

''اے میرے چھوٹے بیٹے! نماز قائم کر اور نیکی کا حکم دے اور برائی سے منع کر اور اس (مصیبت) پر صبر کر جو تجھے پہنچے، یقیناً یہ ہمت کے کاموں سے ہے۔''

آج ہمارا حال یہ ہے کہ دشمنوں اور اعدائے اسلام کی ہمارے اوپر یلغار ہے اور اہل ایمان وتقوی کو کمزور کرنے کی سازش کی جارہی ہے اور ملحدین اور زنادقہ دندناتے پھر رہے ہیں اور الیکٹرانک میڈیا یعنی انٹرنیٹ اور دیگر ذرائع ابلاغ نے فساد کا بیج بونے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے۔ آج ہمارے لیے صبر کے علاوہ اور کوئی کارگر ہتھیار دستیاب نہیں ہے۔ اللہ کی اطاعت وفرماں برداری اور اس کی نافرمانی ومعصیت پر ہمارے لیے صبر کے علاوہ اس وقت اور کوئی چارۂ کار نہیں۔ آج مصائب وآلام اور قضا وقدر پر صبر کرنا ہمارے لیے از حد ضروری امر بن گیا ہے۔

تو اے عزم وارادے میں کمزور وناتواں انسان کان کھول کر سن لو! راستہ بڑا طویل ہے، جس کو عبور کرتے کرتے سیّدنا آدم علیہ السلام تھک گئے اور جس کے لیے سیّدنا نوح علیہ السلام کو بھی بڑی جدوجہد کرنی پڑی اور جس کی بنا پر سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا، اور سیّدنا اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کی غرض سے چھری کے نیچے لیٹنا پڑا، اور سیّدنا زکریا علیہ السلام پر آرا چلا دیا گیا، اور نفس پر ضبط کرنے والے سیّدنا یحیٰی علیہ السلام کو ذبح کردیا گیا، اور جس کی مضرت رسانی کا سیّدنا ایوب علیہ السلام نے سامنا کیا، اور سیّدنا داوٗد علیہ السلام نے جس کی وجہ سے آہ وبکا کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا، اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جس کی بنیاد پر جادوگری اور جنون سے موسوم کرکے متہم کیا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک شہید کیے گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک لہولہان کردیا گیا اور چہرے کو بے حال کردیا گیا، اور جس کی وجہ سے سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ پر خنجر کا وار کرکے زخمی کیا گیا۔ یہی وہ راستہ ہے جس کو عبور کرنے کی غرض سے ابن مسیّب اور مالک رحمہما اللہ پر تکلیفوں کے پہاڑ توڑے گئے۔ یہ اور اس طرح کی صورتحال میں صبر کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔

یہ بات جان لو کہ صبر کرنا تم پر چاہے جتنا بھی شاق گذرے اور اس بارے میں تم کو

چاہے جتنی بھی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں پھر بھی عدم صبر سے صبر ہی آسان ہے، کیونکہ اللہ کی حرام کردہ چیزوں پر صبر کرنا اس بات سے کہیں زیادہ آسان اور سہل ہے کہ عذاب جہنم پر صبر کیا جائے اس لیے اللہ کی اطاعت وفرماں برداری پر صبر کرنا گلے میں جہنم کا طوق ڈالنے سے کہیں بہتر اور افضل ہے۔

لہٰذا صبر کی قدر ومنزلت بڑی ہی بلند وبالا ہے اور صبر کیا ہی بہترین خصلت اور عادت ہے اس سے بڑھ کر اچھی اور بہتر عادت اور کیا ہو سکتی ہے؟ اور صبر کرنے والے کیا ہی پیارے اور اچھے لوگ ہوا کرتے ہیں۔

اے اللہ! ہمیں ان لوگوں میں شامل فرما لے جنھوں نے صبر کا دروازہ کھول کر راستہ ہموار کر دیا اور جزع وفزع کی خندقوں کو پاٹ کر ہمیشہ کے لیے اس بے راہ روی کا راستہ بند کر دیا اور سخت ترین عقاب کی گھاٹی سر کر لی اور خواہش نفس کا پل عبور کر کے اطاعت الٰہی کے حرم سرا میں داخل ہو گئے اے اللہ! ہمیں ان لوگوں میں سے بنا دے جنھوں نے ہدایت کو اپنے لیے مشعل راہ بنایا جس کی وجہ سے ان کے لیے نجات وکامرانی کا راستہ صاف ہو گیا اور وہ اخلاص اور یقین کی راہ پر چل پڑے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ.

اپنے فہم وادراک کا امتحان لیں!

ذیل میں اس موضوع سے متعلق سوالات کو دو مرحلوں کو مدنظر رکھتے ہوئے وضع کیا گیا ہے۔

سوالوں کی ایک قسم تو وہ ہے جن کا جواب فوراً دینا ہے۔ اس قسم کے سوالات کو پہلے مرحلہ میں رکھا گیا ہے۔

سوالوں کی دوسری قسم وہ ہے جو بحث ونظر اور غور وفکر کی متقاضی ہے۔ اس قسم کے سوالات کو دوسرے مرحلہ میں رکھا گیا ہے۔

پہلے مرحلہ کے سوالات جن کا جواب فوراً دینا ہے:

۱۔ صبر کی انواع واقسام بیان کریں؟

۲۔ صبر کو احکام تکلیفیہ کے پانچوں احکامات سے سابقہ پڑتا ہے، وہ احکام تکلیفیہ کیا ہیں؟

۳۔ کیا صبر محمود کا وقت متعین ہے؟

۴۔ اطاعت وفرماں برداری کے کاموں کی انجام دہی پر صبر کا کیا مطلب ہے؟

۵۔ گناہوں پر صبر کی حقیقت کیا ہے؟

۶۔ اللہ تعالیٰ کی المناک قضا وقدر پر صبر کی کیا حقیقت ہے؟

۷۔ صبر کے ثمرات وفوائد ہیں، ان میں اہم ترین فوائد کون کون سے ہیں؟

۸۔ صبر کے متعدد میدان ہیں، ان میں اہم ترین میدان کون کون سے ہیں؟

۹۔ صبر کے لیے مددگار اسباب ووسائل کون کون سے ہیں؟

۱۰۔ صبر کے منافی آفات کون سی ہیں؟

دوسرے مرحلہ کے سوالات جو استنباطی انداز کے ہیں:

۱۔ ((وجدنا خير عيشنا في الصبر)) کس کا قول ہے؟ اور اس سے مراد کیا ہے؟

۲۔ سیّدنا یوسف علیہ السلام کا عزیز مصر کی بیوی کے ڈورے ڈالنے اور اس کے پھسلانے پر صبر کا مرتبہ اپنے بھائیوں کی چال بازیوں پر صبر کرنے سے بڑھ کیوں ہے؟

۳۔ صبر کسبی عادت ہے یا وھبی؟

۴۔ ((ان من ورائکم ایام الصبر)) اس حدیث کی تشریح کریں؟

۵۔ سفیان ثوری رحمہ اللہ کا قول ہے: ((لاتحدث بوجعك، ولا بمصيبتك)) کیا اس کا کوئی ضابطہ یا معیار ہے؟

۶۔ بندہ شہوات نفسانیہ پر کیوں کر صبر و تحمل روا رکھ سکتا ہے؟

۷۔ اس حدیث شریف کے کیا معنی ہیں ((حفت الجنة بالمكاره، وحفت النار بالشهوات؟))

۸۔ ماہ رمضان کریم کو "صبر کا مہینہ" کیوں کہا جاتا ہے؟

۹۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان: ((انما الصبر عند الصدمة الاولىٰ)) کس مناسبت سے وارد ہوا ہے؟

۱۰۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ((ان شئت صبرت ولك الجنة)) کس مناسبت سے آیا ہے؟

۱۱۔ ان کتابوں میں سے معروف و مشہور کتب کا ذکر کریں جن میں صبر کے متعلق بحث کی گئی ہے؟

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ.

619

ورع اور مشتبہات سے بچاؤ

مقدمہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ، وَالصَّلاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى اَشْرَفِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ ، نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ .

اما بعد !

پرہیز گاری اوراحتیاط یا بالفاظ دیگر ناجائز اورحرام چیزوں سے دوری یا خوف الٰہی کا احساس اعمال قلوب میں سے عظیم الشان عمل ہے،گویا کہ پرہیز گاری یا اجتناب دین کے مختلف ستونوں میں سے ایک ستون ہے۔ یہی وہ دوائے دل ہے جو دلوں کے میل کچیل کو کھرچ کر انہیں پاک اور صاف بنانے کا ذریعہ ہے اورنفس کو گناہوں کی آلائش سے صاف وشفاف بنانے کا وسیلہ ہے۔گویا کہ ورع ایمان کے درخت کا انمول پھل ہے۔

ہم نے اس کتابچہ میں جو کہ اس سلسلہ کی اہم کڑی ہے(ورع) کے معنی بیان کرنے کی کوشش کریں گے،ہم اس کتابچہ میں اس کی حقیقت تک رسائی کی تگ ودوکریں گے نیزاس کے بعض فوائد وثمرات کے متعلق بحث کریں گے؟اوراس بات کاحل تلاش کریں گے کہ (ورع اور پرہیزگاری) کاحصولِ کیوں کرممکن ہے؟ہم کس طرح ورع و پرہیزگاری کے زیور سے آراستہ وپیراستہ ہوسکتے ہیں؟

اعمال قلوب سے متعلق لکھے گئے مقالات کے ضمن میں یہ دسویں نمبر کا مقالہ ہے۔ اللہ کی توفیق سے جنہیں آپ کے سامنے فائدہ کی غرض سے پیش کرنے کی مجھے سعادت نصیب ہوئی، اس کے ترجمہ وتیاری میں الفرقان ٹرسٹ نے تعاون کیا اور آج یہی مکتبہ والے اس

کتابچہ کو چھاپ کر اس کی نشر و اشاعت میں حصہ لے رہے ہیں اور علمی مواد کی شکل میں طبع کر کے اسے پیش کرنے جا رہے ہیں۔

ہم اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے لیے خیر اور بھلائی کو میسر اور آسان فرمادے اور علم و عمل کی راہ نوردی ہمارے لیے سہل سے سہل ترین بنادے جس کو عبور کرنے میں کسی قسم کی دشواری پیش نہ آئے۔(انہ سمیع مجیب)

محمد صالح المنجد

موضوع کی اہمیت اورافادیت

امام طاؤس رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ایمان کی مثال درخت کی ہے۔ اس کی جڑ کلمہ شہادت ہے۔ اس کا تنا اوراس کے پتے فلاں فلاں شکل کے ہیں اوراس کا پھل یا ثمر ورع (پرہیز گاری) ہے۔ بلاشبہ وہ درخت بے فیض ہے جو ثمر آور نہ ہو اوراس انسان میں کوئی بھلائی نہیں جو متقی وپرہیز گار اور متورع نہ ہو۔'' ❶

قاسم ابن عثمان رحمہ اللہ کا فرمان ہے:

''ورع (مشتبہات سے بچاؤں) دین کا عمود یا ستون ہے۔'' ❷

ورع اطاعت وفرماں برداری کی اساس ہے۔ اس بارے میں حارث بن اسد المحاسبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اطاعت وبندگی کی اصل ورع اور پرہیز گاری ہے۔'' ❸

قام جوعی رحمہ اللہ کا فرمان ہے:

''دین کی اساس حرام سے اجتناب یا پرہیز گاری ہے۔'' ❹

حقیقت بھی یہی ہے کہ ورع یا پرہیز گاری بندے کی شرافت واصلاح حال کی دلیل ہے۔ چنانچہ سیّدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

''تم کسی شخص کے نماز روزے کو مت دیکھو اگر دیکھنا ہی ہے تو اس کی گفتار و کردار کو دیکھو، اس کی امانت داری وعہد کی پاسداری کو دیکھو اور اس کے ورع

---

❶ السنة لعبدالله بن احمد : ٦٣٥.
❷ تاريخ دمشق : ١٢٢/٤٩.
❸ حلية الاولياء : ٧٦/١٠.
❹ تاريخ دمشق : ١٢٣/٤٩.

وپرہیزگاری کی طرف نظر دوڑاؤ۔'' ❶

ہماری امت کے اسلاف رحمہم اللہ ورع کو بطورکورس پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ امام ضحاک رحمہ اللہ کا قول ہے:

''ہماری عادت یہ تھی کہ ہم ورع کے علاوہ اور کسی چیز کی تعلیم وتعلم کی طرف زور نہیں دیا کرتے تھے۔'' ❷

انہیں کا فرمان ہے: ''ہم نے اپنے مصاحبین اور دوستوں کو اس حال میں پایا کہ وہ ورع کی تعلیم وتعلم کے علاوہ اور کسی چیز کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے۔'' ❸

ورع یا پرہیزگاری کی تعریف

عربی زبان میں (ورع) سے مراد (تـــحـــرج) یعنی گناہ سے بچنا اور معاصی سے اجتناب کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے (ورع، یـرع، ورعـا، ورعة، وتورع عن كذا: ای تحرج) یعنی حرام اور ناجائز چیزوں سے بچا یا دور رہا۔

اصلاً (ورع) آتا ہی اسی معنی میں ہے جس کا بیان اوپر گذرا (حرام اور ناجائز چیزوں سے اجتناب) اس کے بعد اس معنی کو مباح اور حلال چیزوں میں ان چیزوں سے پرہیز کے لیے بطور استعارہ لے لیا گیا جن سے مروءۃ پر زد پڑتی ہو۔ ❹

ورع کی اصطلاحی تعریف:

علمائے کرام نے ورع کی تعریف مختلف پیرایہ بیان سے کی ہے۔ ان میں ہر ایک کا ورع تعریف میں جداگانہ انداز ہے۔

چنانچہ فضیل بن عیاض رحمہ اللہ ''ورع'' کی تعریف کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

''حرام چیزوں سے اجتناب کا نام ورع ہے۔'' ❺

---

❶ شعب الایمان: ۵۲۸۱۔ ۵۲۸۷۔
❷ الورع لابن ابی الدنیا: ۲۷۔
❸ الورع لابن ابی الدنیا: ۲۶۔
❹ لسان العرب: ۸/۳۸۸۔
❺ حلية الاولياء: ۸/۹۱۔

اور ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ کا قول ہے:

''ہر شبہ میں ڈالنے والی چیز سے دوری، اور لایعنی باتوں سے پرہیز، اور فضول گوئی سے اجتناب ورع کہلاتا ہے۔'' ❶

امام ابن قیم رحمہ اللہ نے ''ورع'' کی تعریف میں اظہار خیال کرتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا:

''آخرت میں جس چیز سے مضرت رسانی کا خطرہ لاحق ہو۔ اس کو دنیا میں آنکھ بند کر کے چھوڑ دینا ورع کہلاتا ہے۔'' ❷

شیخ ابوبکر محمد بن علی کتانی رحمہ اللہ نے ''ورع'' کی تعریف میں فرمایا:

''ادب وشائستگی پر ہمیشگی اور دوام اور نفس کی نگہبانی کا نام ورع ہے۔'' ❸

امام زرقانی رحمہ اللہ ''ورع'' کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''حرام کاری یا ایسی چیز جس کی انجام دہی مؤمن کی شان مروت کے خلاف ہو۔ اس میں مبتلا ہوجانے کے خدشہ سے اس چیز کی انجام دہی ترک کر دینا جس کے کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ورع کہلاتا ہے۔ بالفاظ دیگر مباح چیزوں کو حرام میں مبتلا ہوجانے کے خوف سے ترک کر دینا پرہیزگاروں اور متورعین کا کام ہے۔'' ❹

علامہ جرجانی رحمہ اللہ ''ورع'' کی تعریف کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

''اس خوف کے پیش نظر شبہات سے اجتناب کہ کہیں ان کا ارتکاب محرمات کے مرتکب ہونے کا باعث نہ بن جائے، ورع کہلاتا ہے۔'' ❺

بعض لوگوں نے اس کی تعریف کرتے ہوئے یہ اظہار خیال فرمایا ہے:

''شکوک وشبہات کے جال میں پھنسنے کے خدشہ سے بطور احتیاط مشکوک چیزوں

---

❶ مدارج السالکین: ۲/۲۱.
❷ الفوائد: ۱۱۸.
❸ تاریخ دمشق: ۵۴/۲۵۷.
❹ مناھل العرفان: ۲/۴۲.
❺ التعریفات: ۳۲۵.

کو ترک کر کے واضح اور روشن راہ کو اختیار کرنا ورع کہلاتا ہے۔'' ❶

کسی تعریف کرنے والے نے اس کی تعریف یہ بھی کی ہے کہ ''ہر اس چیز سے محتاط رویہ اختیار کرنا جس سے خطرہ لاحق ہو ورع کہلاتا ہے، اور ورع کی غرض وغایت اخلاص کی طہارت کے آئینہ میں شرک خفی کے شائبہ کو باریک عینک لگا کر دیکھنا اور اس بارے میں چھان بین کرنا ''ورع'' کہلاتا ہے۔'' ❷

تمام علمائے کرام کے مذکورہ اقوال کے مابین تطبیق دیتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''ورع'' کے چار مراتب ہیں:

۱۔ **انصاف پروروں کا ورع** ......محرمات کو سرے سے ترک کر دینا، انصاف پروروں کا ورع ہے۔

۲۔ **صالحین اور اللہ والوں کا ورع** ......اس سے مراد اس چیز سے مطلقاً اجتناب ہے جس میں ذرہ برابر حرمت کا احتمال پایا جاتا ہو اسے صالحین کا ورع کہتے ہیں۔

۳۔ **متقین کا ورع** ......حرام کاری یا ایسی چیز جس کی انجام دہی مؤمن کی شان کے خلاف ہو اس میں مبتلا ہو جانے کے خدشہ سے اس چیز کی انجام دہی ترک کر دینا جس کے کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں متقین کی شان ہے بالفاظ دیگر مباح چیزوں کو حرام میں مبتلا ہو جانے کے خوف سے ترک کر دینا پرہیز گاروں اور متقین کا کام ہے۔

۴۔ **صدیقین کا ورع** ......اس سے مراد یہ ہے کہ بندہ اس چیز سے کنارہ کشی اختیار کر لے جس کی انجام دہی میں کوئی حرج نہیں لیکن اس کو اس بات کا خطرہ ہو کہ ہوسکتا ہے اس کی انجام دہی میں ریا کاری کا پہلو شامل ہے یا یہ کام خالصتاً لوجہ اللہ نہیں ہے یا اس میں شرک کی آمیزش کا خدشہ ہو یا اس سے کراہت کی بو آ رہی ہو یا یہ کہ وہ کام معصیت کا پیش خیمہ ہو۔ اس لیے اس سے دوری اور اجتناب صدیقین کا بلند و بالا مرتبہ ہے۔

---

❶ فیض القدیر : ۵۲۹/۳.

❷ فیض القدیر : ۵۷۵/۳.

علمائے کرام میں سے تمام علماء نے ''ورع'' کی جو تعریفیں کی ہیں وہ مذکورہ چار مراتب میں سے کسی نہ کسی مرتبہ میں ضرور بالضرور داخل نظر آتی ہیں۔

ورع کا وجوب اور اس کے فضائل

اللہ تعالیٰ سبحانہ وتعالیٰ نے کتاب عزیز کو جن مختلف حکمتوں اور مصلحتوں کے پیش نظر نازل فرمایا ہے ان میں سے ایک لوگوں کو ورع کی صفت سے آشنا کروانا بھی ہے تاکہ لوگ دنیا وآخرت کی بھلائی سے اپنا دامن بھر کر سعادت مندی وخوش بختی سے ہم کنار ہوسکیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّ صَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿١١٣﴾﴾ (طه: ۱۱۳)

''اور اسی طرح ہم نے اسے عربی قرآن بنا کر نازل کیا اور اس میں ڈرانے کی باتیں پھیر پھیر کر بیان کیں، شاید کہ وہ ڈر جائیں یا یہ ان کے لیے کوئی نصیحت پیدا کردے۔''

مراد یہ ہے کہ کم ازکم اس کو پڑھ کر خدا کا خوف یا تقوی پیدا ہو یا ان کے دلوں میں انجام کی طرف سے کچھ سوچ تو پیدا ہو۔

سیّدنا قتادۃ رضی اللہ عنہ نے آیت میں مذکورۃ لفظ (ذکـــرا) کی تفسیر (ورع) سے کی ہے، مراد یہ ہے کہ کم ازکم اس کو پڑھ کر ان کے اندر (ورع) اور تقوی یا خوف خداوندی کا داعیہ تو پیدا ہو۔ [1]

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے پرہیزگاروں اور ورع وتقوی سے کام لینے والوں کے لیے مثال بیان فرما کر ان کی دل جوئی کا سامان مہیا فرمایا ہے تاکہ وہ اپنے مشن پر کاربند رہیں اور اس پر استقامت اور ثابت قدمی کا ثبوت پیش کریں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

[1] تفسير طبرى: ٨/٤٦٤.

﴿ اَ فَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِیْ مَسٰكِنِهِمْ ۭ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰی ۝۱۲۸ ﴾ (طه : ۱۲۸)

''پھر کیا اس بات نے ان کی رہنمائی نہیں کی کہ ہم نے ان سے پہلے کتنے زمانوں کے لوگ ہلاک کر دیے، جن کے رہنے کی جگہوں میں یہ چلتے پھرتے ہیں بے شک اس میں عقل والوں کے لیے یقیناً کئی نشانیاں ہیں۔''

امام قتادۃ رحمہ اللہ ''لاولی النھی'' کی تفسیر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ ''(اولی النھی) سے مراد یہاں صفت (ورع) سے متصف پرہیز گار اور متقین لوگ ہیں جو زندگی کی بساط پر محتاط رویہ اختیار کر کے گذر بسر کرنے والے ہیں۔''[1]

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا قرآن کریم کو نازل کرنا اور اس میں طرح طرح کی مثالیں بیان کرنا لوگوں کو صفت ''ورع'' سے آشنا کروانے کی غرض سے ہے یہ دلیل ہے اس بات کی کہ یہ عمل قلبی اپنی عظمت شان کی وجہ سے وجوب کا درجہ رکھتا ہے۔ میری اس عمل قلبی سے مراد ''ورع'' ہے۔

''ورع واجب'' ورع کے مختلف مراتب میں ادنی درجہ کے مرتبہ کا حامل فریضہ ہے اور وہ محرمات سے اجتناب اور کنارہ کشی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے جو مراتب ہیں ان کی حیثیت مستحب یا مندوب کی ہے۔

ورع کی فضیلت:

ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے ''ورع'' کی فضیلت کے بارے میں مختلف پیرایہ بیان سے احادیث بیان فرما کر اس بارے میں ہماری رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ چنانچہ سیّدنا ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''اے ابوہریرۃ! پرہیز گاری کو اپنا شعار بنا لو لوگوں میں عابد و زاہد شمار ہونے لگو گے۔''[2]

---

[1] تفسیر طبری : ۴۷۵/۸۔ [2] ابن ماجة ، كتاب الزهد، باب الورع والتقوى: ۴۲۱۷ وصححه الالبانی۔

اسی طرح سیّدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''دین اسلام میں پرہیزگاری اور تقوی کا مرتبہ افضل ترین درجہ کا حامل ہے۔'' ❶

اسی طرح سیّدنا حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ سے بھی ایک روایت وارد ہوئی ہے۔ ❷

سیّدنا عمرو بن قیس ملائی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی قدر ہے کہ ''تمہارے دین کی کنجی یا اس کی بنیاد ورع و پرہیزگاری ہے۔'' ❸

ام المؤمنین سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ارشاد فرماتی ہیں:

''دنیا کی تمام چیزوں میں سے کوئی چیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کو بھانے والی نہ تھی اور نہ ہی دنیا کی کسی چیز سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرعوب ہوکر اس کے گرویدہ بنے اگر کوئی چیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک قابل رشک تھی تو وہ متورع اور متقی و پرہیزگار شخص کا وجود تھا۔'' ❹

سلف صالحین رحمہم اللہ نے پرہیزگاری اور تقوی کی فضیلت کو بھانپ لیا تھا، اسی لیے اس بارے میں ان سے مختلف اقوال وافعال کا ثبوت موجود ہے جو کہ پرہیزگاری اور ورع کے لیے مشعل راہ ہیں۔

سیّدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ ''رات کے آخری پہر مکھی کی طرح بھنبھناہٹ کا نام دین نہیں بلکہ پرہیزگاری اور تقوی و ورع کا نام دین ہے۔'' ❺

اسی طرح اس بارے میں حسن رحمہ اللہ سے مروی ہے فرماتے ہیں:

''افضل ترین عبادت تفکر و تدبر اور تقوی و پرہیزگاری ہے۔'' ❻

---

❶ رواہ حاکم : ۳۱۴ و وافقه الذهبی

❷ رواہ الحاکم : ۳۱۷۔ الطبرانی فی المعجم الاوسط : ۳۹۶۰ وصححه الالبانی رحمه الله.

❸ مصنف ابن ابی شیبة : ۲۶۱۱۵۔ الورع لابن ابی الدنیا : ۱۴.

❹ رواہ الطبرانی فی المعجم الاوسط : ۲۳۵. ❺ الزهد للامام احمد : ۱۲۵.

❻ الورع لابن ابی الدنیا : ۳۷.

اور آپ ہی کا یہ قول بھی ہے:

''ورع (پرہیز گاری) ہی اصل حکمت ودانائی ہے۔'' ❶

سیّدنا سعید بن میسّب رحمہ اللہ کا فرمان ہے:

''اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے دور رہنا اور اللہ کے اوامر ونواہی میں تدبر وتفکر کرنے کا نام عبادت ہے۔'' ❷

سیّدنا مطرف بن عبداللہ بن شخیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''تمہارے دین میں افضل ترین چیز ورع ہے۔'' ❸

آپ رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ ''اگر تمہارا دو آدمیوں سے آمنا سامنا ہو جائے۔ ان میں سے ایک تو بکثرت نماز ادا کرنے والا اور روزے رکھنے والا اور صدقہ خیرات کرنے والا ہو اور دوسرا شخص کچھ نہ کرتا ہو مگر دونوں میں مرتبہ کے اعتبار سے زمین وآسمان کا فرق پایا جاتا ہو لوگوں نے دریافت کیا کہ آخر ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ تو آپ رحمہ اللہ نے جواب دیا: ان میں سے دوسرا اللہ کے لیے تقوی وپرہیز گاری کرنے والا اور اللہ کی حرام کردہ اور ناجائز چیزوں سے اجتناب کرنے والا ہونے کی وجہ سے افضلیت وبرتری کے مقام پر فائز ہوگا۔'' ❹

سیّدنا یحییٰ بن ابی کثیر رحمہ اللہ کا قول ہے

''افضل ترین عمل تقوی وپرہیز گاری اور ورع واحتیاط ہے۔'' ❺

تفقہ فی الدین کے ساتھ ورع کی آمیزش

فقہائے امت اور عوام الناس کے ''ورع'' میں فرق ہے۔ عوام کے ورع کا دائرہ خود ان کی ذات تک محدود ہوتا ہے۔ ان کی پرہیز گاری کے فائدے کے نفع مند اثرات خود ان کی

---

❶ تفسیر البغوی : ۱/۳۳٤۔ تفسیر قرطبی : ۳/۳۱۳.

❷ تفسیر القرطبی : ٤/۱ ۳۰.

❸ تفسیر الطبری : ۱۲/۱۷.

❹ تفسیر الطبری : ۱۲/۱۷۔ مصنف ابن ابی شیبة : ۳٥٤۹۱.

❺ شعب الایمان : ۸۱٤۹.

ذات سے تجاوز نہیں کرتے۔ ان کے علاوہ لوگوں پر اس کی اثر پذیری کا کوئی شائبہ تک نہیں پہنچتا۔ اسی لیے کسی عربی شاعر کا قول ہے:

"ایک متقی و پرہیز گار فقیہہ شیطان پر ہزار عابدوں اور زاہدوں سے بھاری ہے۔"[1]

اسی لیے علمائے کرام نے قاضی وقت کے لیے جس کے ذمہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنا کرانا ہو، تقوی و پرہیز گاری سے متصف ہونے کو شرط قرار دیا ہے، کیونکہ منصب قضا دنیا کے تمام مناصب اور عہدوں میں اعلیٰ ترین مقام کا حامل منصب ہے۔ یہ وہ منصب ہے جس میں قاضی وقت فریقین کے مابین مال ودولت، زمین و جائداد، عزت وعصمت اور ان جیسے مختلف حساس معاملات کے بارے میں قول فیصل سناتا ہے اس لیے اس بلند وبالا حساس منصب عالی پر فائز ہونے والے شخص کے لیے علمائے کرام نے (ورع یا تقوی و پرہیز گاری سے سرشاری کی شرط لگائی ہے۔[2]

ورع کی حقیقت وکیفیت

شبہات سے کنارہ کشی ورع کا تقاضا ہے:

سیّدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے ہوئے اپنے کانوں سے سنا ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"حلال واضح ہے اور حرام واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان مشکوک چیزیں موجود ہیں، جو اکثر وبیشتر لوگوں کے علم سے مخفی ہیں (جسے وہ نہیں جانتے) چنانچہ جو شخص شبہات سے دامن بچا کر نکل گیا وہ اپنی عزت وآبرو کو تہمت سے بچا لے گیا اور جو شخص شک وشبہ میں ڈال دینے والی چیزوں میں پھنس گیا اس کی مثال اس چرواہے کی ہے جو کسی کی چار دیواری کے قریب بکری چرائے تو خدشہ ہے کہ اس کی بکریاں چراگاہ کی حدود سے تجاوز کر کے اس شخص کی چراگاہ میں داخل نہ

[1] نشر طی التعریف: ۱۹۹. [2] تفسیر القرطبی: ۱۵/۱۵٤.

ہو جائیں اور کان کھول کر سن لو! ہر بادشاہ کی ایک حرم سرا ہوتی ہے اور اللہ کی اس کی سرزمین میں (حریم) اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں اور یہ بات بھی ذہن نشیں کر لو! کہ جسم میں ایک لوتھڑا ہے۔ اگر اس کی اصلاح ہو گئی تو گویا کہ پورے جسم کی اصلاح ہو گئی اور اگر اس کی درستگی نہ ہوئی تو سمجھو پورے جسم کی شامت آ گئی اور وہ خون کا لوتھڑا ''دل'' ہے۔'' [1]

سیّدنا وابصہ بن معبد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''گناہ تو وہ ہے جس کی چبھن تمہارے دل میں محسوس ہو اور جس کی ٹیس تمہارے قلب کو پہنچے، چاہے لوگ تم سے اس کے بارے میں پوچھیں یا نہ پوچھیں یا تم اس کے بارے میں مورد الزام ٹھہرائیں۔'' [2]

حسان بن ابی سنان رحمہ اللہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں:

''پرہیز گاری یہی ہے کہ جس چیز کے بارے میں تم شک وشبہ میں مبتلا ہو جاؤ اسے بے چوں چرا ترک کر دو۔'' [3]

بعض مباح چیزوں سے بطور احتیاط دوری اختیار کرنا

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں:

''جہاں تک ورع پرہیز گاری کا معاملہ ہے تو اس سلسلہ میں اس چیز سے کنارہ کشی یا دوری اختیار کی جائے گی جو مضرت رساں ہو اس ضمن میں محرمات اور شبہات کا شمار ہو گا کیونکہ یہی چیزیں مضرت رسانی کا پیش خیمہ ہیں۔ بلاشبہ جو شخص شبہات سے دامن بچا کر نکل گیا وہ اپنی عزت وآبرو کو تہمت سے بچا لے گیا اور جو شخص شک وشبہ میں ڈال دینے والی چیزوں میں پھنس گیا اس کی مثال اس

[1] صحیح بخاری، کتاب الإیمان، باب فضل من استبرأ لدینه : ۵۲۔ صحیح مسلم : ۱۵۹۹.

[2] رواه احمد : ۱۸۰۳۰ وحسنه الالبانی رحمه اللّٰه۔

[3] الورع لابن ابی الدنیا : ٤٦.

چرواہے کی ہے جو کسی کی چار دیواری کے قریب بکری چرائے تو خدشہ ہے کہ کہیں اس کی بکریاں چراگاہ کی حدود سے تجاوز کر کے اس شخص کی چراگاہ میں داخل نہ ہو جائیں۔

اور جہاں تک مباحات یا ان چیزوں سے پرہیز گاری اختیار کرنے کا معاملہ ہے جن کے اختیار کرنے میں کوئی مضرت رسانی کا شبہ نہ ہو یا ان میں مضرت کا شائبہ پایا جاتا ہو مگر نفع اندوزی کا پہلو راجح ہو یا ان کے ذریعہ کوئی بڑی مضرت رساں چیز دفع ہو جانے کی امید ہو تو اس صورتحال میں ''ورع'' کی انجام دہی جہالت اور ظلم شمار ہوگی اور یہ چیز ان تین اقسام کے ضمن میں آتی ہے جن میں ''ورع'' جائز نہیں، نفع ونقصان میں برابر کا پہلو رکھنے والی چیزیں، یا وہ چیزیں جن میں نفع اندوزی کا پہلو راجح ہو، یا وہ چیزیں جن میں خالص نفع ہی نفع پایا جاتا ہو، جیسے کہ مباحات یا مستحبات یا واجبات سے متعلق امور ہیں ان میں ''ورع'' اختیار کرنا گمراہی و بے راہ روی کا شاخسانہ ہے بلکہ عین گمراہی اور کجروی ہے۔'' [1]

یہاں پر اس پیرایہ بیان سے یہ مقصود نہیں ہے کہ ہر حلال کام کی انجام دہی میں پرہیز گاری کا عمل دخل نہیں بلکہ یہاں پر اس توضیح کا مقصد یہ ہے کہ ہر وہ مباح قسم کی چیزیں جن کی انجام دہی برائی اور منکر کا پیش خیمہ نہ ہو یا کسی گمراہی و بے راہ روی تک لے جانے کا سبب نہ بنے تو اس میں پرہیز گاری اختیار کرنا ورع نہیں کہلاتا بلکہ یہ تو اس کے برعکس کچھ اور ہی معاملہ ہے اس کو ورع شمار نہیں کیا جاسکتا۔

لہٰذا ہر مسلمان شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ کی حدود سے قریب ہونے سے ہوشیار ہو جائے کیونکہ اللہ کی حرم کی فصیل سے قریب ہونا اس بات کا پیش خیمہ ہے کہ مؤمن کہیں حرام کے چنگل میں جا کر نہ پھنس جائے:

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا﴾ (البقرۃ: ۱۷۸)

[1] مجموع الفتاوی: ۱۰/۶۱۵۔۶۱۶.

''یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں تم ان کے قریب جانے کی کوشش نہ کرنا۔''

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا﴾ (البقرة : ۲۲۹)

''یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں خبردار ان سے آگے نہ بڑھنا۔''

حدود سے مراد یہاں پر حلال کا آخری سرا اور حرام کی تکیل یا اس کے شروع کا حصہ ہے۔ اس بنیاد پر معنی یہ ہوں گے کہ تم اللہ کی مباح کردہ چیزوں میں حدود سے تجاوز نہ کرو اور اللہ کی حرام کردہ چیزوں کے قریب نہ بھٹکو، یہاں ورع کا کردار نمایاں ہوکر سامنے آ جاتا ہے کیونکہ ورع یہی تو ہے کہ تم حرام کے قریب نہ جاؤ اور اللہ نے جو چیزیں مباح قرار دیں ہیں ان کے حدود کی پامالی مت کرو اسی لیے حلال چیزوں میں حد سے تجاوز کرنا عظیم ترین کبائر کے ارتکاب کا پیش خیمہ ہے اور حد سے زیادہ حرام کردہ چیزوں میں ملوث ہونے کا ذریعہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض سلف صالحین رحمہم اللہ کے بارے میں وارد ہوا ہے کہ وہ بعض مباحات کو محرمات میں ملوث ہو جانے کے خطرے سے ترک فرمادیا کرتے تھے اور ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔

سیّدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ ''میں چاہتا ہوں کہ میں اپنے اور حرام کے مابین حلال کو بطور سترہ یعنی آڑ بنا کر کھڑا کرلوں اور مباحات کو حرام قرار نہ دوں۔''[1]

سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ کا ارشاد گرامی ہے:

''بندہ ایمان کی گہرائی تک اس وقت تک رسائی نہیں پا سکتا جب تک کہ اپنے اور حرام کے مابین حلال کی دیوار بنا کر بطور رکاوٹ اسے روک نہ بنا لے اور جب تک گناہوں اور ان کے مشابہ چیزوں کو ترک نہ کردے۔''[2]

سیّدنا میمون بن مہران رحمہ اللہ کا قول ہے:

''آدمی کے لیے اس وقت تک حلال کی دستیابی ناممکن ہے جب تک کہ وہ اپنے

---

[1] الورع للامام احمد : ۵۰.

[2] الورع للامام احمد : ۵۰.

اور حرام کے درمیان حلال کی اوٹ بنا کر کھڑی نہ کر لے۔"❶

بعض سلف صالحین رحمہم اللہ کا فرمان ہے:

"بندہ تقویٰ کی حقیقی چاشنی اس وقت تک محسوس نہیں کر سکتا حتی کہ وہ ان چیزوں کو ترک کرنے کا عادی نہ ہو جائے جن کے ترک کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں محض اس خطرے کے پیش نظر کہ کہیں وہ ان چیزوں کی چنگل میں نہ جا پھنسے جن کی انجام دہی شرعاً غیر مناسب ہے۔"❷

سلف صالحین میں سے بعض لوگوں کا قول ہے:

"ہم حلال کے ستر دروازے اس خوف کے پیش چھوڑ دیا کرتے تھے کہ کہیں حرام کا ارتکاب نہ ہو جائے۔"❸

اسی طرح بعض مباحات وہ بھی ہیں جن کو بطور پرہیز گاری ترک کرنا جائز نہیں! کیونکہ ان سے کنارہ کشی اللہ کے نبی ﷺ کی سنت سے اعراض یا اغماض کرنا ہے۔ مثال کے طور پر سرے سے شادی بیاہ کرنے کے لیے رضامندی کا اظہار نہ کرنا، آرام اور وراحت کی خاطر سونا سلانا ترک کر دینا، کھانے پینے سے پرہیز کرنا یہ اور اس طرح کے مباحات کو ترک کرنا ناجائز ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کی سنت شادی بیاہ، سونا سلانا، کھانا پینا بھی ہے۔ یہ حرکت سنت نبوی کے سراسر مخالف ہے۔

اس کے علاوہ مباحات کی بعض قسمیں وہ ہیں جو نیت صادقہ وصالحہ کی بنیاد پر عبادات کے زمرے میں شمار ہونے لگتی ہیں۔ مثال کے طور پر کوئی شخص کھائے پیئے اور اس کا مطمع نظر اس سے عبادت وریاضت کے لیے قوت وطاقت یا توانائی حاصل کرنا ہو، یا اپنی بیوی سے دل لگی اور ہنسی مذاق کرے اور اس سے اس کا مقصد ان کی رغبت کو تسکین دینا ہو اور ان کی

---

❶ حلية الأولياء: ٤/٨٤.
❷ مدارج السالكين: ٢/٢٢.
❸ مدارج السالكين: ٢/٢٢.

نفسانی حاجت روائی ہوتا کہ وہ انس اور لگاؤ محسوس کریں اس صورتحال میں یہ اعمال مباحات کی فہرست سے نکل کر اطاعات وعباداتٌ کے ضمن میں شمار ہونے لگتے ہیں اور ان کا بطور پرہیز گاری ترک کرنا خصوصاً ایسی صورت حال میں کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ ایسا کرنا فضول بیکار کام ہے۔

ورع کی جامع ومانع صورت حال

پرہیز گاری کے بارے میں عموماً لوگ چار حصوں میں تقسیم ہوجاتے ہیں۔ اسی لیے اس بارے میں ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ کا مقولہ مشہور ہے:

> ''ورع کے بارے میں چار طرح کے لوگ ہوا کرتے ہیں: ان میں کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جو ''ورع'' قلیل اور کثیر دونوں کے پابند ہوتے ہیں اور چند لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو قلیل پر محتاط رویہ اختیار کرکے ''ورع'' کا ثبوت پیش کرتے ہیں اور جب بلندی کے مقام تک رسائی پاجاتے ہیں تو ''ورع'' کو خیرآباد کہہ دیتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کثیر سے تو ''ورع'' کرنے کے پابند ہوتے ہیں مگر قلیل کے بارے عدم''ورع'' میں ملوث ہوکر کثیر کو بھی گدلا کرڈالتے ہیں اور چوتھی قسم کے وہ لوگ ہوتے ہیں جو نہ ہی قلیل کے بارے میں ورع اور احتیاط کے پابند ہوتے ہیں اور نہ ہی کثیر کے مسئلہ میں انہیں ''ورع'' کا لحاظ ہوتا ہے۔''[1]

مذکورہ پیرایہ بیان میں صنف اول سے مراد وہ لوگ ہیں جو صغائر اور کبائر دونوں قسم کے گناہوں سے پرہیز گاری اور محتاط رویہ اختیار کرتے ہیں اور ایک عاجز اور پرہیز گار کی طرح زندگی گذارنا اپنا طرۂ امتیاز بنالیتے ہیں۔

دوسری قسم سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو عام لوگوں کی طرح گردانا جاتا ہے وہ لوگوں کے

---

[1] تاریخ بغداد: ۱۹۹/٦.

تھوڑے بہت مال کے حصول کے وقت اسے ناحق کھانے سے گریز کرتے ہیں اور اس بارے میں پرہیز گاری کا پہلو اپناتے ہیں ،لیکن جب اللہ تعالیٰ انہیں کسی بلند منصب پر فائز فرما کر سیاہ وسفید کا مالک بنا دیتا ہے تو پھر وہ عوام کا مال ہڑپ کرنے میں ذرہ برابر پس وپیش سے کام نہیں لیتے۔اس وقت ان کا ورع اور تقوی وخشیت کا چولا اتر جاتا ہے اور اللہ کی سرزمین پر دندناتے پھرتے ہیں اور اس وقت کسی قسم کی پرہیز گاری ان کو ان کی اس حرکت سے باز نہیں رکھ سکتی گویا کہ اس موقع پر وہ بالکل بے لگام بن جاتے ہیں۔ (اعاذنا اللّٰه منه) .

تیسری صنف وہ ہے جس میں اکثر وبیشتر لوگ مبتلا نظر آتے ہیں، مراد یہ ہے کہ آپ بظاہر دیکھیں گے کہ اس قسم سے متصف لوگ نہ تو زنا کاری کرتے ہیں اور نہ ہی سودخوری کے عادی ہوتے ہیں اور نہ ہی کبیرہ گناہوں میں ملوث ہوتے ہیں لیکن بعض صغیرہ گناہوں کے ارتکاب سے پرہیز نہیں کرتے اور نہ ہی وہ اس بارے میں محتاط رویہ اختیار کرتے ہیں۔مثال کے طور پر غیر محرم کی طرف دیکھنا دکھانا اور گانے سننا،قوالیاں گانا بجانا اور ان حرام چیزوں کی سماعت ان کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتی بلکہ وہ اس کے عادی ہوتے ہیں اور اس بارے میں وہ پرہیز گاری یا احتیاط کا پہلو نہیں اپناتے۔

چوتھی قسم ان لوگوں کی ہے جو گناہوں سے بالعموم پرہیز نہیں کرتے چاہے وہ صغائر ہوں یا کبائر۔انہیں گناہوں سے احتیاط اور پرہیز کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی جدھر دل کرتا ہے ادھر ہی چل پڑتے ہیں۔

لیکن ورع اور پرہیز گاری درحقیقت تمام پہلوؤں پر حاوی ہونا چاہیے لہٰذا ''متورع'' شخص وہ ہے جو تمام واجبات وفرائض پر عمل پیرا ہو اور ہر قسم کے منکرات اور بداعمالیوں نیز محرمات سے کنارہ کشی اختیار کرے اور ہر طرح کے مشتبہ امور سے پرہیز کرنے والا اور دور رہنے والا ہو دراصل یہی ورع کی حقیقت وغایت ہے۔

عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اگر کوئی شخص سو فیصد تقویٰ و پرہیز گاری پر عمل پیرا ہو مگر اس میں سے کسی ایک

چیز کے بارے میں پرہیز گاری سے کام نہ لیتا ہو تو ایسا شخص سرے سے متورع
نہیں کہلائے گا۔''❶

جیسا کہ ورع اور تقویٰ کی شمولیت وکمالیت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان دل ، زبان ، اعضاء وجوارح سے ورع اور تقویٰ کا مظاہرہ کرے لہٰذا صرف دل سے بندے کا متورع ہونا کافی نہ ہوگا یا صرف اعضاء وجوارح سے بندے کا متورع ہونا ورع نہیں کہلائے گا یا انسان اگر صرف زبانی طور پر متورع ہو تو اس زبانی جمع وخرچ کو ورع شمار نہیں کیا جائے گا اس لیے ایک مسلمان کو بحیثیت مسلمان ورع کے ان تمام پہلوؤں کا خیال رکھنا چاہیے جن میں عدم احتیاط یا عدم تورع بندے کو ہلاکت وبربادی کے دہانے پر لے جا کر کھڑا کر دیتی ہے چاہے اس کا تعلق دیکھنے دکھانے سے ہو یا سننے سنانے سے یا سب وشتم سے ہو یا گفت وشنید سے یا پیٹ سے یا شرم گاہ سے ہو یا ہاتھ پیر سے وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام پہلوؤں کا خیال کرتے ہوئے پرہیز گاری وورع کی راہ پر گامزن رہنا پرہیز گاری کہلاتا ہے۔

ایک مؤمن کے لیے اس بارے میں سب سے سخت ترین مرحلہ زبان وکلام میں ورع اختیار کرنے کا ہے۔ اسی لیے سیّدنا حسن بن صالح رحمہ اللہ کا فرمان ہے:

''ورع کی نشو ونما ہوتی رہتی ہے اور وہ پروان چڑھتی رہتی ہے مگر اس کا اثر زبان وکلام یا ان دونوں پر اس کی اثر پذیری میں بہت ہی کم یا برائے نام نظر آتا ہے) ورع گفت وشنید پر سب سے کم اثر چھوڑنے والی شے شمار ہوتی ہے۔''❷

فضیل بن عیاض رحمہ اللہ ورع کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

''زبان کے بارے میں پرہیز گاری کا معاملہ بڑا ہی سخت ترین معاملہ ثابت ہوا ہے۔''❸

سیّدنا جنید رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

❶ حلیة الاولیاء : ۱۶۷/۸۔ ❷ حلیة الاولیاء : ۳۲۹/۷۔
❸ حلیة الاولیاء: ۹۱/۸۔

''گفت وشنید میں پرہیز گاری سے کام لینا اعضاء وجوارح سے پرہیز گاری برتنے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ مشکل اور بھاری ہے۔'' ❷

کسب معاش یا ہنرمندی اعضاء وجوارح کا کام ہے۔

اسحاق بن خلف رحمہ اللہ ورع کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

''گفتگو میں پرہیز گاری اور تقویٰ اختیار کرنا سونے اور چاندی سے بھی زیادہ مہنگا ہے۔''

تنہائی ہو یا محفل، دونوں حالتوں میں تورع اختیار کرنا

سیّدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنے دوستوں کے ساتھ مدینہ کے اردگرد کسی علاقہ کی طرف چہل قدمی کی غرض سے نکلے اور ایک جگہ پڑاؤ ڈالا اور کھانے کا دسترخوان لگایا گیا۔ ابھی وہاں پر پڑاؤ ڈالا ہی تھا کہ ایک چرواہے کا سامنے سے گذر ہوا۔ اس نے ان لوگوں کو دیکھ کر سلام عرض کیا تو سیّدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس چرواہے سے مخاطب ہوکر کہا: ''چلو آؤ تم بھی ہمارے دسترخوان سے تناول کرلو۔'' یہ بات سن کر اس چرواہے نے جواب دیا: میں روزے سے ہوں۔ تو سیّدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ نے بطور تعجب پوچھا: کیا تم اتنی شدید گرمی کے دنوں میں بھی روزہ رکھتے ہو؟ اور ان ایام میں جن میں بادِ سموم چل رہی ہے اس فریضہ کا اہتمام کرتے ہو جبکہ تم ان پہاڑیوں کے مابین چلچلاتی دھوپ میں بکریاں چراتے ہو؟ تو اس چرواہے نے جواب دیا: میں اپنے ایام کے خالی اوقات کو اس طرح کاٹنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تو سیّدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس کے ورع اور تقوی کا امتحان لینا چاہا اور اس سے سوال کیا: کیا تم اپنی بکریوں میں سے ایک بکری ہمیں بیچ سکتے ہو؟ ہم تمہیں اس کی قیمت تو دیں گے ہی، اس کے ساتھ تمہیں اس کا گوشت بھی دیں تاکہ تم افطار میں اسے استعمال کرسکو۔ تو اس چرواہے نے جواب دیا: میں ان میں سے کسی بکری کو بھی کیونکر فروخت کرسکتا ہوں؟ یہ تو میری بکریاں نہیں ہیں یہ تو میرے آقا

❶ حلیة الاولیاء: ۱۰/۲۶۹. ❷ تاریخ دمشق: ۸/۲۰۵.

کی بکریاں ہیں۔ تو سیّدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے جواب دیا: فرض کرو تم سے بکری گم ہو جائے اور تم جا کر کہہ دو کہ اسے تو بھیڑیا کھا گیا ہے تو تمہارا آقا کیا کرے گا؟ یہ بات سن کر وہ چرواہا پیٹھ پھیر کر چلتا بنا، اس حال میں کہ اس کی انگلی آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھی اور وہ زور زور سے کہتا جا رہا تھا: فاین اللّٰہ؟ اگر میں ایسا کروں تو اللہ کی نگاہ سے بچ کر کہاں جاؤں گا؟ (اللہ کہاں چلا جائے گا؟) کیا وہ حاضر نہیں؟ چرواہے کا یہ جملہ سیّدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کے زباں زد ہو گیا اور ان کے قلب و دماغ پر نقش ہو گیا اور آپ اس قول کو اپنی زبان سے دہرانے لگے "قال الراعی: فاین اللّٰہ؟" یعنی چرواہے نے کہا کہ اللہ کہاں گیا؟ چنانچہ ابن عمر رضی اللہ عنہما جب مدینہ واپس تشریف لائے تو اس چرواہے کے آقا کو بلا بھیجا اور اس سے اس کی بکریاں اور چرواہا دونوں کو خرید کر چرواہے کو تو آزاد کر دیا اور بکریاں اس کو بطور تحفہ عطا فرما دیں۔ [1]

ہر شخص کے احوال کے بقدر پرہیز گاری ہوتی ہے

ہر شخص ورع یا پرہیز گاری کے بارے میں دوسروں سے اپنا الگ رنگ و روپ رکھتا ہے اور شخص مذکور کے علم و معرفت اور اس کی قدر و منزلت، نیز اس کی عمر کے بقدر اس کے اندر "ورع" کی جلوہ نمائی ہوتی ہے۔

کمسن بچوں کے ورع کا تقاضا ہے کہ وہ بڑوں یا عامۃ المسلمین کے معاملات میں ٹانگ نہ اڑائیں یعنی چھوٹے منہ بڑی بات نہ کریں اور مسلمانوں کے اہم امور میں دخل اندازی نہ دیں یعنی دخل در غیر معقولات کا ارتکاب نہ کریں اور بڑوں یا تجربہ کار اور پختہ عقل سے سرشار لوگوں کا "ورع" یہ ہے کہ وہ پیش آمدہ معاملات میں اپنی رائے پیش کریں اور حاکم کو اپنی صائب الرائے باتوں سے آگاہ کریں۔

اسی طرح جاہل اور عالم کے ورع میں نمایاں فرق ہوا کرتا ہے چنانچہ اس بارے میں ھبۃ اللہ مقری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

[1] شعب الایمان: ٥٢٩١.

''کہا جاتا ہے عالم کا ورع یہ ہے کہ وہ اپنے کلام کے موتی بکھیر کر لوگوں کو اس سے مستفید ہونے کی راہ ہموار کرے اور جاہل کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ سکوت اختیار کرے۔'' ❶

سیّدنا ابن عیینہ رحمہ اللہ سے ''ورع'' کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ رحمہ اللہ نے جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''اس علم کے حصول کا نام ''ورع'' ہے جس سے ورع کی معرفت اور عرفان نصیب ہوتا ہو۔ بعض لوگوں کے نزدیک حد سے زیادہ مستقل سکوت اختیار کرنے اور قلت کلامی کو ورع کا نام دیا گیا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ میرے نزدیک بولنے والا یا وعظ ونصیحت کرنے والا خاموش جاہل سے کہیں زیادہ بہتر اور افضل ہے۔'' ❷

علم اور ورع کے درمیان تال میل

یہاں پر ایک اہم ترین علمی مسئلہ کا بیان ناگزیر ہے جس کا عمل قلبی سے گہرا ربط ہے اور وہ علم کا ورع سے تال میل کا معاملہ ہے کیونکہ یہ بات تو طے ہے کہ بغیر علم ومعرفت کے ورع اور پرہیز گاری بے سود ہے بلکہ بغیر علم کے اس کا سرے سے وجود ہی ممکن نہیں اسی لیے علامہ ابوسعود رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں سے تورع یا احتیاط اور پرہیز گاری حلال وحرام کے علم پر موقوف ہے۔ وہ بھی وہ علم جو کتاب وسنت پر مشتمل ہو۔'' ❸

شیخ الاسلام ابن تیمیۃ رحمہ اللہ فرماتے ہیں ورع کا اتمام اور اکمال یہ ہے انسان دو بھلائیوں میں سے افضل ترین بھلائی اور دو برائیوں میں سے بدترین برائی کا علم رکھتا ہو اور ان

---

❶ الناسخ والمنسوخ للمقری: ۳۸.

❷ حلیۃ الاولیاء: ۷/۲۹۹.

❸ تفسیر ابو السعود: ۲/۱۳۰.

دونوں میں ہر ایک چیز کے پرکھنے کا گر جانتا ہے اور اسے اس بات کا ادراک ہو کہ شریعت اسلامیہ کی بنیاد مصالح کی دستیابی اور اس کی تکمیل میں پنہاں ہے اور اس کے مفاسد وعلل کی بیخ کنی اس کے مضر اثرات کے زائل اور کم کرنے سے جڑی ہوئی ہے۔ چنانچہ جس شخص کے اندر مصلحت شرعیہ کی انجام دہی اور مفاسد شرعیہ کی بیخ کنی کی صلاحیت نہ ہو اور وہ ان دونوں کے اندر توازن برقرار رکھنے کا گر نہ جانتا ہو اور اپنے پھوہڑ پن کے باوجود اپنے آپ کو متورع (پرہیز گار) گردانتا ہو اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہ کوئی شخص ظالم وجابر حکمران کے ساتھ فریضہ جہاد کی ادائیگی پر آمادگی کا اظہار نہ کرے اور اس کو باعث پرہیز گاری گردانے تو یہ اس کے علم سے کورے پن کی دلیل ہے۔

مثال کے طور پر مسلم فوج پر کوئی ایسا کمانڈر مسلط کر دیا جائے جو کہ فسق وفجور میں مبتلا ہو خصوصاً اس موقع پر جبکہ اسلامی فوج میدان کارزار میں کفار ومشرکین کے ساتھ برسرپیکار ہو عین گھمسان کی لڑائی کے دوران کوئی سرپھرا کھڑا ہو جائے اور یہ شوشہ چھوڑ دے کہ میں تو اس فاسق وفاجر شخص کی قیادت میں جنگ کرنے سے بطور احتیاط یا تورعاً دست بردار ہوتا ہوں، اس موقع پر اس جھوٹے اور مکار متورع (پرہیز گار) کی اس حرکت کی پاداش کیا نتیجہ برآمد ہوگا؟ وہ ظاہر اور عیاں ہے یعنی اس کی پاداش میں دشمن شہر میں گھس آئیں گے جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو ہزیمت وشکست خوردگی سے دوچار ہونا پڑے گا۔

بغیر علم کے ورع (پرہیز گاری) کی مثالوں میں سے ایک مثال یہ بھی ہے کہ ایک شخص تھا۔ اس کے والد کا انتقال ہو گیا اس نے ترکہ میں مشتبہ مال چھوڑا اور اس کا مورث مقروض تھا لوگوں نے جب دیکھا کہ اس کو مال وجائداد ترکہ میں ملی ہے تو انہوں نے اس سے اپنے قرضوں کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا تو اس لڑکے نے جواب دیا کہ میں نے بطور تورع (پرہیز گار) اپنے باپ کا قرض ادا نہیں کیا کیونکہ میرے باپ کا مال مشتبہ ہے اور شبہ کے مال سے قرض کی ادائیگی مجھے ناگوار ہے۔

اس قسم کا ورع ''ورع فاسد'' کہلائے گا اور اس طرح کا آدمی جاہل شمار کیا جائے گا

کیونکہ وہ لوگوں کے حقوق کی ادائیگی سے اجتناب کا رویہ محض اس لیے اختیار کررہا ہے کہ اس کے باپ کا مال مشتبہ ہے۔اس میں شبہ کا پہلو پایا جاتا ہے جبکہ قرض کی ادائیگی واجب ہے اور محض شبہ کی بنیاد پر واجب کو ترک کررہا ہے یہ اس کا جہل نہیں تو اور کیا ہے؟

مراد یہ ہے کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں کہ جہل کی بنیاد واجبات کی پرواہ نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ پرہیز گاری کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اپنے مشن کو جاری وساری رکھیں چاہے جو بھی ہو۔

اس کے بعد امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے مزید فرماتے ہیں:

''بعض لوگ جمعہ یا جماعت کے ساتھ ان ائمہ کے پیچھے نماز ادا کرنا چھوڑ دیتے ہیں جن میں بدعت یا فسق وفجور کا شائبہ پایا جاتا ہے اور اسے ورع شمار کرتے ہیں اور سچے گواہ کی گواہی قبول کرنے اور عالم دین سے تعلیم وتعلم یا اکتساب فیض کرنے سے صرف اس بنیاد پر پہلوتہی کرتے ہیں کہ وہ ہلکی پھلکی بدعت کا مرتکب ہے اور حق کی اس دہائی کو قبول کرنے سے انکار کردیتے ہیں حالانکہ جس کا سننا اور قبول کرنا ورع (پرہیز گاری) کا تقاضا ہے۔'' [1]

صالحین کرام کے ورع اور پرہیز گاری کے نمونے

سلف صالحین رحمہم اللہ میں سے اکثر وبیشتر لوگ صفت ورع سے مزین ہوا کرتے تھے۔اس کے باوجود بطور تواضع وہ اپنے آپ کو اس صفت سے عاری بتلایا کرتے تھے اور اس صفت سے متصف ہونے کی اپنی ذات سے عموماً نفی کیا کرتے تھے، کیونکہ ان کو اس بات کا بخوبی ادراک تھا کہ یہ ایسی صفت ہے جو بڑی جانفشانی اور بڑی مشقت سے ہی ہاتھ آتی ہے اور بذات خود یہ بڑا ہی بھاری بھر کم عمل ہے۔ چنانچہ امام شعبی رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں:

''اے علماء کے گروہ سے تعلق رکھنے والو! اور اے فقہاء کرام کی جماعت سے

---

[1] مجموع الفتاوی: ۱۰/۵۱۲.

وابستہ لوگو! ہم نہ تو فقہاء ہیں اور نہ ہی علماء ہیں لیکن ہم نے حدیث نبوی کی سماعت کی ہے تو ہم نے جو کچھ سنا ہے اسی کو ہم تمہارے سامنے بیان کر دیا کرتے ہیں اور فقیہ تو وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی ناجائز وحرام کردہ چیزوں سے ورع (پرہیز گاری) کرنے والا ہو یعنی ان سے دور رہنے والا ہو اور عالم وہ ہے جو اللہ کے خوف وخشیت سے سرشار ہو۔'' ❶

''ورع'' کی اسی اہمیت کے پیش نظر یہاں پر صالحین کرام کے ورع کے چند نمونوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ جو مندرجہ ذیل ہے:

سابقہ اُمتوں کے تقویٰ کا بیان:

سیّدنا ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''ایک شخص نے کسی شخص سے زمین خریدی تو جس شخص نے جائداد یا زمین خریدی تھی اسے اس خریدی ہوئی زمین میں سے سونے کی ایک دیگ مل گئی، تو اس شخص نے فروخت کرنے والے شخص سے یہ بات کہی کہ تم اپنی سونے کی دیگچے لو۔ میں نے تو تم سے زمین خریدی تھی سونا تو نہیں خریدا تھا۔ اس زمین فروخت کرنے والے شخص نے جواب دیا کہ میں نے تمہیں زمین اور اس زمین میں جو کچھ ہے وہ سب کچھ فروخت کر دیا۔ اب میں کس بنیاد پر اس میں دستیاب ہونے والے سونے کو واپس لوں۔ خرید وفروخت کرنے والے دونوں فریقین نے سونا لینے سے بطور ورع پہلوتہی کا اظہار کیا۔ راوی کا کہنا ہے کہ دونوں نے فیصلہ کی غرض سے اس قضیہ کو ایک تیسرے شخص کے سامنے رکھا۔ اس شخص نے یہ قضیہ سن کر فریقین کو مخاطب کر کے یہ کہا: کیا تم دونوں کے پاس نرینہ اولاد ہے؟ تو فریقین میں سے ایک نے کہا: میرے پاس بیٹا ہے اور دوسرے نے کہا: میرے پاس بیٹی ہے۔ یہ سن کر فیصلہ کرنے والے شخص نے فیصلہ سناتے ہوئے

❶ حلیة الاولیاء: ۴/۳۱۱۔

یہ حکم صادر کیا کہ تم دونوں لڑکے کی لڑکی کے ساتھ شادی کر دو اور اس طرح تم دونوں ہی اس مال میں سے اپنے اوپر خرچ بھی کرو اور صدقہ وخیرات بھی کرو۔'' ❶

نبی کریم ﷺ کے ورع وتقویٰ کا بیان:

سیّدنا ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ سیّدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہ نے صدقہ کی کھجوروں میں سے ایک کھجور لی اور اسے اپنے منہ میں ڈال لیا، نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''تھوکو! تھوکو! پھر فرمایا: تم کو اس بات کا پتہ نہیں کہ ہم لوگ صدقہ کا مال نہیں کھاتے۔'' ❷

آپ نے دیکھا نبی کریم ﷺ نے اپنے نواسے کو اس کھجور کھانے سے جس کے کھانے کا اس کے لیے جواز نہ تھا محض ورع کے پیش نظر روک دیا جبکہ وہ کم سن بچے تھے اور غیر مکلّف بھی تھے مگر پھر بھی نبی کریم ﷺ نے ان کو منع فرمایا۔ یہ محض ورع کی اثر پذیری تھی جو کہ اس صورت میں نمایاں ہو کر سامنے آئی۔

سیّدنا ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''میں اپنی اہلیہ کے پاس آتا ہوں تو کھجور وغیرہ اپنے بستر پر پڑی پاتا ہوں اور کھانے کی غرض سے ہاتھ میں اٹھا بھی لیتا ہوں مگر خیال آتا ہے کہ کہیں صدقہ کی نہ ہو اس خوف سے اسے رکھ دیتا ہوں اور نہیں کھاتا۔'' ❸

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ورع اور پرہیزگاری کا بیان:

سیّدنا ابو قتادۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ نبی کریم ﷺ کے ساتھ ''قاحہ'' نامی وادی میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ ہم میں سے کچھ لوگ محرم تھے اور بعض لوگ بغیر احرام کے تھے۔ میں نے اپنے ساتھیوں اور ہم نشینوں کو دیکھا کہ وہ کسی چیز کے

---

❶ صحیح بخاری، کتاب احادیث الأنبیاء : ۳۴۷۲۔ صحیح مسلم : ۱۷۲۱.

❷ صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، باب الصدقة علی موالی ازواج النبیّ : ۱۴۹۱۔ صحیح مسلم : ۱۰۶۹.

❸ صحیح بخاری، کتاب فی اللقطة، باب کیف تعرف لقطة اهل مکة : ۲۴۳۳۔ صحیح مسلم : ۱۰۷۰.

دیکھنے دکھانے میں محو ہیں تو میں نے بھی غور کیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ نیل گائے وہاں موجود ہے جسے یہ لوگ دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں میرا کوڑا زمین پر گر پڑا تو میرے ساتھیوں نے کہا کہ میں اس کو تمہیں اٹھا کر دینے کے بارے میں مدد نہیں کر سکتا کیونکہ ہم لوگ محرم ہیں تو میں نے خود ہی اس کو اٹھایا اور اتر کر اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس کے بعد میں جھاڑی کے پچھلے حصہ سے نیل گائے شکار کرنے کے لیے پہنچا اور اسے شکار کر کے مار گرایا اور شکار لے کر اپنے ساتھیوں کے پاس واپس آیا تو شکار دیکھ کر بعض لوگوں نے کہا اس میں سے کھاؤ پیو! اور بعض لوگوں نے کہا: اسے ہاتھ نہ لگانا اور نہ ہی اس سے کھانا پینا۔ تو میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اس حال میں کہ آپ ہمارے سامنے تھے اور ہم نے اس شکار کے بارے میں آپ ﷺ سے دریافت فرمایا تو آپ ﷺ نے حکم دیا: ''کھاؤ پیو یہ تو حلال ہے۔''[1]

حدیث کی توضیح یہ ہے کہ کوڑا جو کہ زمین پر گر گیا تھا وہ سیّدنا ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کا تھا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے کسی نے اس کوڑے کو اٹھا کر دینا گوارا نہ کیا کیونکہ ان کو اس بات کا خدشہ تھا کہ کہیں یہ فعل شکار پر معاونت شمار نہ ہو چونکہ وہ لوگ حالت احرام میں تھے اور سیّدنا ابوقتادہ غیر محرم تھے اس کے بعد انہوں نے اس شکار کیے ہوئے جانور کے گوشت کو کھانے میں بھی ورع و پرہیز گاری سے کام لیا یہاں تک کہ از راہ احتیاط اس میں مشارکت کرنا بھی گوارا نہ کی، کیونکہ سیّدنا ابوقتادہ رضی اللہ عنہ تو شکار کے بارے میں اسی وقت متنبہ ہوئے جبکہ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو جو کہ حالت احرام میں تھے اس کے مشاہدہ میں محو دیکھا تھا۔ اس بنیاد پر انہوں نے تورع کا پہلو اختیار کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے ورع اور پرہیز گاری کا یہ عالم تھا جس کا تذکرہ مندرجہ بالا سطور میں گزرا۔

سیّدنا ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کی پرہیز گاری:

سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ورع اور پرہیز گاری کے میدان میں بڑے بلند و بالا مرتبہ پر فائز تھے بلکہ آپ ورع و پرہیز گاری کے اوج کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ آپ کو نبی کریم ﷺ

---

[1] صحیح بخاری، کتاب جزاء الصید، باب لا یعین المحرم الحلال فی قتل الصید: ۱۸۲۳۔

کے بعد ورع اور پرہیزگاری میں افضل ترین مقام حاصل ہے بلکہ آپ متورعین میں افضل ترین شخصیت کے حامل انسان ہیں۔

سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، وہ فرماتی ہیں کہ سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ایک غلام تھا وہ ان کو خراج ادا کیا کرتا تھا اور سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اس کے ادا کیے۔ خراج کی رقم کو اپنے مصرف میں لایا کرتے تھے۔ ایک دن وہ غلام کچھ لے کر آپ کی خدمت حاضر ہوا اور آپ نے بے چوں چرا اسے کھا لیا تو غلام نے عرض کیا: اے ابوبکر! آپ کو کچھ پتہ بھی ہے کہ یہ کیا ہے؟ جس کو آپ نے تناول فرمایا ہے۔ تو سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس سے دریافت فرمایا: یہ کیا ہے؟ کچھ بتلاؤ تو آخر یہ ہے کیا؟ تو اس نے جواب دیا کہ میں نے زمانہ جاہلیت میں کسی شخص کے لیے کہانت کی تھی، حالانکہ مجھے یہ فن سرے سے آتا ہی نہیں ہے۔ میں نے تو اس کو دھوکا دیا تھا۔ اب جب اس سے ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے یہ چیز دی جس کو آپ نے تناول فرمایا ہے۔ یہ سننا تھا کہ سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسی وقت اپنے منہ میں انگلی ڈالی اور جو کچھ پیٹ میں تھا سارے کا سارا قے کر دیا۔ ❶ یہ تھا سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ورع اور تقویٰ۔

سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ورع اور پرہیزگاری:

سیّدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنے والد عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔ آپ نے مہاجرین میں سے چار لوگوں کے لیے چار ہزار دینار یا درہم متعین کیے اور ابن عمر کے لیے تین ہزار پانچ سو۔ تو لوگوں میں سے کسی نے ان سے دریافت کیا کہ ابن عمر بھی تو مہاجرین میں سے ہیں آپ نے ان کے حق میں چار ہزار سے کم کیوں متعین کیا؟ تو آپ نے جواب دیا کہ ہجرت کرتے وقت ان کے والدین ان کو اپنے ہمراہ لے کر آئے تھے۔ اس کا مرتبہ اس مہاجر کے برابر کیوں کر ہوسکتا ہے جس نے بنفس نفیس ہجرت کی ہے۔'' ❷

دراصل ابن عمر رضی اللہ عنہما کو ہجرت کے وقت ان کے والدین اپنے ہمراہ لے کر آئے تھے،

---

❶ صحیح بخاری، کتاب مناقب الأنصار، باب أیام الجاهلیة: ۳۸٤۲.

❷ صحیح بخاری، کتاب مناقب الأنصار، باب هجرة النبیّ و اصحابه الی المدینة: ۳۹۱۲.

اس حال میں کہ وہ کمسن اور بچے تھے۔ اس لیے ان کو ان مہاجرین کے برابر از راہ ورع وتقویٰ شمار نہیں کیا گیا جنھوں نے بنفس نفیس ہجرت کی ہے۔

سیّدنا ثعلبہ بن ابی مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مدینہ کی عورتوں میں چادریں تقسیم فرمائیں۔ اخیر میں ایک خوبصورت عمدہ قسم کی چادر باقی بچ گئی تو سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ کے بعض حاشیہ برداروں نے عرض کیا: ''اے امیر المؤمنین! یہ چادر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی کو جو کہ آپ کے نکاح میں ہیں عنایت فرما دیں۔'' ان کے نزدیک اس سے مراد سیّدہ ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا تھیں کیونکہ انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی ہونے کا شرف حاصل تھا۔ سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''ام سلیط اس کی زیادہ حق دار ہیں اور ام سلیط انصاری قبیلہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہ ان انصاری خواتین میں تھیں جنھوں نے بذات خود نبی کریم سے بیعت کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر ان کے بارے میں ارشاد فرمایا: یہ وہ خاتون ہیں جو غزوۂ احد کے دن ہمارے لیے مشکیزوں کی سلائی کیا کرتی تھیں۔''[1]

یہ تھا سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ کا تقویٰ کہ آپ نے محض احتیاطاً وتورعاً اپنی بیوی کو وہ چادر عطا نہیں فرمائی جبکہ آپ کی بیوی نواسی رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھیں اور آپ کے نکاح میں تھیں اس کے باوجود پرہیزگاری اور ورع کا مظاہرہ کرتے ہوئے آپ نے اپنی شریک حیات کو یہ چادر دینے سے انکار کر دیا۔

سیّدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کا ورع اور پرہیزگاری:

سیّدنا زینب رضی اللہ عنہا کو اللہ تعالیٰ نے محض ان کے ورع اور پرہیزگاری کی بنیاد پر واقعہ افک میں ملوث ہونے سے بال بال بچایا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ منافقین سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی عصمت دری میں ملوث ہو چکے تھے اور لوگوں نے منافقین کی افواہوں سے فضا گرم کر رکھی تھی، مگر سیّدہ زینب رضی اللہ عنہا نے سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی سوتن ہونے اور آپس میں شدید تنافس اور باہم تفاخر کا داعیہ پائے جانے کے باوجود اس موقع پر جب کہ سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے

[1] صحیح بخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب حمل الرجل امرأته فی الغزو: ۲۸۸۱.

بارے میں یہ افواہ اڑائی گئی تو آپ نے ورع کا مظاہرہ فرماتے ہوئے سکوت اختیار فرمایا۔

سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سیّدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے میرے معاملہ کے بارے دریافت فرمایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ''اے زینب! کیا تم کو اس قضیہ کے بارے میں کوئی علم ہے یا تم نے کبھی اس طرح کی کوئی حرکت دیکھی ہے؟'' تو زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا نے جواب دیا: اے اللہ کے رسول! میں اپنی سماعت اور بصارت کو اس بہتان سے محفوظ و مامون رکھنا چاہتی ہوں۔ اللہ کی قسم! میں نے سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو خیر ہی سے متصف پایا ہے میں اس کے علاوہ ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ فرماتے ہیں جبکہ صورت حال یہ تھی کہ سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا میری سوتن تھیں مجھ سے بطور تنافس تفاخر و شدید تنافس کا معاملہ فرمایا کرتی تھیں مگر اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے انہیں محض ورع اور پرہیز گاری کی وجہ سے اس حادثہ میں ملوث ہونے سے بچالیا۔ یہ ورع کی برکت اور اس کی جلوہ نمائی کا ثمرہ تھا۔ ❶

سیّدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا ورع:

سیّدنا نافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں: سیّدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کے کانوں میں کہیں سے گٹار یا سارنگی یا موسیقی کی دھن کی آواز پڑ گئی تو آواز سنتے ہی آپ نے اپنے دونوں کانوں میں انگلی ٹھونس لی اور راستے سے کنارہ کش ہوکر دور جا کر کھڑے ہوگئے۔ راوی کہتے ہیں کہ مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا: یانافع! کیا اب تو کچھ سنائی نہیں دے رہا ہے؟ راوی کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: ''نہیں! اب کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا ہے۔ تب انہوں نے اپنے دونوں کانوں سے انگلیاں نکالیں۔'' ❷

تابعین کے ورع اور پرہیز گاری کے نمونے:

سیّدنا عبدالرحمٰن بن عثمان رحمہ اللہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ ''ہم سیّدنا طلحہ بن

❶ صحیح بخاری، کتاب الشھادات، باب اذا زکی رجل رجلا کفاہ: ٢٦٦١۔ صحیح مسلم: ٢٧٧٠۔

❷ ابوداؤد، کتاب الأدب، باب کراھیۃ الغناء والزمر: ٤٩٢٤۔ الامام احمد: ٤٥٣٥ وحسنہ الالبانی رحمہ اللہ۔

عبیداللہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ حرم میں تھے اور ہمیں حرم کے اندر کھانے کے لیے کوئی چڑیا بطور ہدیہ دی گئی تو ہم میں سے بعض لوگوں نے اس میں سے کھایا اور بعض لوگوں نے تورعاً اور احتیاطاً اس میں سے کچھ بھی نہیں کھایا۔ جب سیّدنا طلحہ رضی اللہ عنہ نیند سے بیدار ہوئے تو انہوں نے اس میں سے کھانے والوں کی تائید کی اور فرمایا: ''ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس چڑیا کو کھایا ہے۔'' ❶

سیّدنا عبداللہ بن مبارک رضی اللہ عنہ کی پرہیز گاری:

سیّدنا حسن بن عرفہ رضی اللہ عنہ نے سیّدنا دقیق رحمہ اللہ سے عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کے ورع اور پرہیزگاری کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ قصہ بیان کیا کہ عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے ملک شام میں کسی شخص سے عاریۃً چندروز کے لیے بطور مستعار قلم لیا تھا اور ذہول ونسیان کو شکار ہو کر اسے اپنے ساتھ لے کر خراسان چلے آئے۔ اب خراسان پہنچنے کے بعد جب یاد آیا تو اس قلم کو واپس کرنے کے لیے خراسان سے پیدل چل کر شام لوٹ کر آئے اور اس کے مالک کو اس کی امانت جب تک سپرد نہ کردی، چین کا سانس نہ لیا۔'' ❷

پرہیز گاروں کے قصے تو بہت زیادہ ہیں جو ختم ہونے والے نہیں (سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے) جیسا کہ مثل مشہور ہے:

عقل مند را اشارہ کافی است

ورع کے فوائد وثمرات

ورع یا پرہیز گاری فلاح اور کامیابی کا ذریعہ ہے:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝۱۴﴾ (الاعلی: ١٤)

''بلاشبہ اس نے فلاح پالی جس نے اپنے نفس کو اخلاق رذیلہ سے اور دلوں

❶ تفسیر الطبری: ٥/٦٤. ❷ تهذيب التهذيب: ٥/٣٣٧.

کوشرک ومعصیت کی آلودگیوں سے پاک وصاف کرلیا۔“

قتادۃ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”اس سے مراد یہ ہے کہ جس نے ورع اور پرہیزگاری کی چھتری تلے عمل کیا۔“ ❶

سیّدنا موسیٰ بن حماد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”میں نے سیّدنا سفیان ثوری رحمہ اللہ کوخواب میں جنت کی سیر کرتے ہوئے دیکھا، دیکھتا کیا ہوں کہ سیّدنا سفیان ثوری رحمہ اللہ کھجور کی ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی پر اڑتے اور ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ کا چکر لگاتے پھر رہے ہیں تو میں نے ان سے دریافت کیا: اے ابوعبداللہ! تم کو یہ مقام کیوں کر ہاتھ آیا؟ اور کس وجہ سے تم کو یہ مرتبہ حاصل ہوا تو انہوں نے جواب دیا: ورع اور پرہیزگاری کی بنیاد پر ہماری اس مقام تک رسائی ہوئی ہے۔“ ❷

قیامت کے دن حساب وکتاب میں تخفیف کا سبب ثابت ہوگی:

سیّدنا سفیان رحمہ اللہ کا کہنا ہے:

”اے مخاطب! زہد واستغناء کا سہارا پکڑو اگر تم نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ تم کو دنیا کے عیوب ونقائص سے آگاہی عطا فرمادے گا اور تم کو ورع اور پرہیزگاری اختیار کرنی چاہیے اگر تم نے ورع اور پرہیزگاری کو اپنا مطمع نظر بنالیا تو اللہ تعالیٰ تمہارے حساب وکتاب میں تخفیف فرما کر تم سے رحم وکرم کا معاملہ روا رکھتے ہوئے تمہارے ساتھ نرمی کا رویہ اختیار فرمائے گا۔“ ❸

اعمال میں برکت اور نیکیوں میں زیادتی کا ذریعہ ہے:

یوسف بن اسباط رحمہ اللہ کا قول ہے:

”پرہیزگاری بڑے سے بڑے کام کی انجام دہی کے لیے کافی ہے۔“ ❹

---

❶ تفسیر طبری: ١٢/٥٤٦. ❷ المنامات لابن ابی الدنیا: ٢٧٥.

❸ حلیة الاولیاء: ٧/٢٠۔ الزهد وصفة الزاهدین لابن الاعرابی: ٦٣.

❹ حلیة الاولیاء: ٨/٢٤٣۔ التواضع والخمول لابن ابی الدنیا: ٨٧.

کسی شخص نے ابوعبدالرحمٰن عمری رحمہ اللہ سے درخواست کی کہ مجھے وعظ ونصیحت کیجئے۔ تو انہوں نے زمین سے ایک سنگ ریزہ اٹھایا اور فرمایا:

''اگر اس سنگ ریزے کے بقدر ورع اور للّٰہیت تمہارے قلب میں جاگزیں ہو جائے تو یہ تمہارے لیے اس سرزمین پر بسنے والی تمام مخلوق کی نماز اور عبادت سے کہیں بڑھ کر ہے۔'' ❶

ورع اور للّٰہیت اصلاح نیت کا سبب ہے:

سیّدنا بلال بن سعد رحمہ اللہ کا کہنا ہے:

''مؤمن کے دل میں پایا جانے والا جذبہ ورع مؤمن کا اس وقت تک پیچھا نہیں چھوڑتا جب تک کہ وہ یہ دیکھ کر اطمینان حاصل نہ کرلے کہ اس نے آخر نیت کیا کی ہے، اگر نیت درست ہوگئی تو اس سے کم تر درجہ کی چیزیں بدرجہ اولیٰ خود بخود درست ہوجایا کرتی ہیں۔'' ❷

ورع شبہات سے روک لگانے کا ذریعہ ہے:

ابوعبداللہ انطاکی رحمہ اللہ کا قول ہے:

''جس شخص کے دل میں خوف اور خشیت پیدا ہوجائے سمجھو اس کو صبر کرنا آ گیا، اور جس کو صبر کرنے کا گر مل جائے سمجھ لو اس کو ورع اور پرہیزگاری سے آشنائی ہوگئی اور جس کو ورع سے آشنائی نصیب ہوجائے تو سمجھ لو اس کو شبہات سے رک جانے کا طریقہ معلوم ہوگیا۔'' ❸

ورع و پرہیزگاری دعاؤں کی قبولیت کا ذریعہ ہے:

محمد بن واسع رحمہ اللہ کا فرمان ہے:

''ورع اور للّٰہیت کے ساتھ دعا کی اتنی مقدار کافی ہے جتنی کہ کھانے میں نمک کی

---

❶ حلیة الاولیاء: ۸/۲۸۶۔ الورع لابن ابی الدنیا: ۲۳.

❷ حلیة الاولیاء: ۵/۲۳۰ تصرف۔ ❸ حلیة الاولیاء: ۹/۲۹۰.

مقدار کافی ہوتی ہے۔"❶

ورع اور پرہیزگاری حصول علم کا ذریعہ ہے:

ابن مبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"علم کا حصول چار چیزوں کے بغیر پائے کمال تک نہیں پہنچ سکتا۔ علم کے لیے مکمل فراغت مال واسباب کا مہیا ہونا، قوت حافظہ اور ورع۔ یہ چار چیزیں حصول علم کے لیے اساس اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔"❷

ورع علم میں برکت کا سبب ہے:

علامہ قنوجی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"عالم کے لیے ورع سے مزین ہونا ازحد ضروری ہے تاکہ اس کا علم سودمند اور نفع بخش ثابت ہو جس سے منافع اور فوائد کا چشمہ ابلنے لگے۔"❸

ورع اور للّٰہیت غیر سے حق قبول کرنے کا ذریعہ ہے:

سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"میں نے کسی شخص کی جب بھی اس کی خواہش نفس کے بارے میں مخالفت کی تو میں نے اس کو اپنے اوپر چراغ پا پایا۔ معلوم ہوتا ہے اہل علم ورع کے ساتھ رخصت ہو چکے ہیں۔"❹

ورع اور تقوی اپنے نفس کے عیوب ونقائص کی اصلاح کا وسیلہ ہے:

اگر انسان صحیح معنوں میں تقویٰ اور ورع سے کام لینے والا ہے تو وہ اپنے عیوب کی اصلاح میں اتنا مشغول ہو جاتا ہے کہ دنیا کے عیوب کی چھان بین کا اس کے پاس موقع نہیں رہتا اور یہ مشغولیت اس کے لیے اپنے ذاتی عیوب کی اصلاح اور درستگی کا سبب بن جاتی ہے۔ اس بارے میں عربی کے مشہور شاعر ابراہیم بن داؤد بن شداد رحمہ اللہ کے اشعار کا ترجمہ

---

❶ شعب الایمان: ١١٤٩.
❷ شعب الایمان: ١٧٣٢.
❸ ابجد العلوم: ٢٣٨/١.
❹ حلیۃ الاولیاء: ١٩/٧.

ملاحظہ فرمائیں:

''انسان اگر عقل ودانش اور ورع وتقویٰ کی دولت سے مالا مال ہوتو اس کا ورع وتقویٰ اس کو لوگوں کے عیوب سے بے بہرہ بنا دیتا ہے، جس طرح بیمار کو مرض کے درد والم کی شدت دنیا کے تمام لوگوں کے امراض کی المنا کی وشدت سے غافل کر دیتی ہے۔''❶

ورع اخلاق کو نکھارنے کا سبب ہے:

سیّدنا عبدالکریم جرجانی رحمہ اللہ کا کہنا ہے:

''اللہ کا پاس ولحاظ رکھنے والا (متورع) شخص کبھی لڑائی جھگڑے کے چکر میں نہیں پڑتا۔''❷

ورع دنیا وآخرت کی سعادت کا سبب اور ذریعہ ہے:

فضیل بن عیاض رحمہ اللہ کا قول ہے:

''پانچ چیزوں کو سعادت مندی میں شمار کیا جاتا ہے، دل میں یقین صادق، دین میں ورع کامل، دنیا سے مکمل زہد اور استغناء، شرم وحیا سے سرشاری اور علوم ومعرفت سے بہرہ وری۔ یہ پانچ چیزیں سعادت مندی کا صدر دروازہ ہیں۔''❸

ورع اور محتاط زندگی اختیار کرنے والوں میں ہمارا کیونکر شمار ہوسکتا ہے؟

ورع دراصل اللہ کی طرف سے عطا کردہ عطیہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے ورع اور پرہیزگاری کی دولت سے مالا مال کر دیتا ہے۔ یہ اللہ کی مشیت پر منحصر ہے الا یہ کہ علمائے کرام نے چند اسباب ووسائل بیان کیے ہیں جو اس عظیم الشان مقام تک رسائی کا ذریعہ اور سبب ہیں۔ ان اسباب ووسائل میں سے چند وسائل کا بیان مندرجہ ذیل ہے:

---

❶ الورع لابن ابی الدنیا: ۲۱۸. ❷ شعب الایمان: ۸۴۸۹.
❸ حلیة الاولیاء: ۱۰/۲۱۶.

محرمات ومشتبہات سے اجتناب اور دوری:......سیّدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے: ''اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو تم پر حرام کیا ہے، ان سے اجتناب اور دوری اختیار کرو تو تم لوگوں میں سب سے زیادہ ورع اور پرہیز گاری کرنے والے بن جاؤ گے۔'' ❶

دینار ودرھم میں حسن تصرف:......سیّدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک شخص کسی چیز کے بارے میں گواہی دینے کے لیے حاضر ہوا سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس شخص کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا: میں تم کو نہیں جانتا اور یہ بات تمہارے لیے باعث مضرت نہیں کہ میں تم کو سرے سے جانتا ہی نہیں ہوں لہٰذا اس شخص کو لے کر آؤ جو تمہیں جانتا ہو۔ یہ بات سن کر اس کے قبیلہ کے لوگوں میں سے ایک شخص نے عرض کیا: میں اس کو جانتا ہوں۔ سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ سے اس شخص نے دریافت فرمایا: تم کس بنیاد پر اس کو جانتے ہو؟ تو اس شخص نے جواب دیا: اس شخص کی عدالت اور اس کے فضل وکرم کی بنیاد پر۔ تو سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس شخص سے سوال کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: کیا یہ تمہارا ایسا قریب ترین پڑوسی ہے جس کے لیل ونہار اور جس کا آنا جانا تمہارے لیے کھلی ہوئی کتاب ہو؟ تو اس شخص نے جواب دیا: نہیں، اتنا قرب تو نہیں ہے۔ پھر سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس شخص سے دریافت فرمایا کہ کیا تمہارا اس سے درہم ودینار کا معاملہ ہوا ہے؟ کیونکہ درہم ودینار ورع کو پرکھنے کی کسوٹی ہیں انہیں سے بندے کے ورع وپرہیز گاری پر دلیل فراہم ہوتی ہے؟ تو اس نے جواب دیا: نہیں، ہمارا اس سے اس قسم کا کوئی معاملہ نہیں ہے۔ اس کے بعد دریافت فرمایا کہ کیا یہ تمہارا رفیق سفر رہا ہے؟ کیونکہ سفر کی رفاقت انسان کے مکارم اخلاق کو پرکھنے کی میزان ہے۔ اس سے بندے کے اخلاق اجاگر ہو کر سامنے آجاتے ہیں؟ تو اس شخص نے جواب دیا: نہیں، ہمارا اس کے ساتھ ایسا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ تو سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم اس شخص کو نہیں پہچانتے، پھر اپنے مخاطب کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: جاؤ ایسے شخص کو لے کر آؤ جو واقعی تمہیں جانتا ہو۔'' ❷

---

❶ شعب الایمان: ۲۰۱ وصححه ابن الجوزی۔

❷ سنن البیهقی الکبری: ۲۰۱۸۷ وصححه الالبانی رحمه الله۔

سفیان ثوری رحمہ اللہ سے ورع کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے یہ اشعار پڑھے:

''میں نے اس (ورع) کو درہم ودینار کے قریب بیٹھا ہوا پایا ہے۔ اس کے علاوہ کہیں اور اس کی موجودگی کا خیال دماغ سے قطعی طور پر نکال دو۔ اگر تم کو اس پر دسترس حاصل ہوگئی اس وجہ سے کہ تم نے اس کو ترک کر دیا ہے۔ تو سمجھ لو یہ بندۂ مسلم کے تقویٰ کی کرشمہ سازی ہے۔'' [1]

اور کسی عربی شاعر کا قول ہے:

''تم کو کسی شخص کی پیوند لگی قمیص دھوکا اور فریب میں مبتلا نہ کرے یا کسی شخص کا ٹخنوں سے اونچا پائجامہ غلط فہمی اور دھوکا کا شکار نہ بنائے یا کسی کی پیشانی پر نشان کی موجودگی فریب میں نہ ڈالے بلکہ درہم ودینار سے وابستگی کے وقت اس کی کج روی یا اس کا تقویٰ کھل کر سامنے آتا ہے۔ اس پر نگاہ رکھو اور اس کو دیکھو کہ وہ درہم ودینار کے معاملات میں کیسا ہے؟ تو اس کا ورع کھل کر سامنے آ جائے گا۔'' [2]

اس بات کی یاد دہانی کہ اللہ تعالیٰ ہر چھوٹے بڑے گناہ کا محاسبہ کرے گا:

ابوالعباس بن عطا رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''تورع اور پرہیز گاری کرنے والوں کا اپنی زندگی کے لیے محتاط رویہ اختیار کرنے کا احساس وشت وجبل کے ذرات اور ریزوں یا رائی اور سرسوں کے دانوں کو دیکھ کر پیدا ہوتا ہے اور انسان کے دل ودماغ میں اس بات کے شعور سے ورع کا خیال کروٹیں لینے لگتا ہے کہ ہمارا رب کریم جو کہ ہر آن و ہر لمحہ اور ہر قول وفعل نیز ہر (همزة ولمزة) کا محاسبہ کرے گا اور حساب وپرسش کے بعد اس کا پورا پورا بدلہ عطا فرمائے گا اور اس سے بھی باریک بینی کی بات یہ ہے کہ رب کریم بندے کا ریزوں اور ذرات کے برابر چیزوں نیز رائی کے دانوں کے برابر اعمال کا بھی حساب وکتاب کرے گا، جس ذات کی یہ شان اور عظمت ہو تو وہ اس لائق ہے

[1] مختصر شعب الایمان للقزوینی : ۸۶.   [2] احیاء علوم الدین : ۲/ ۸۲.

کہ اس سے ڈرا جائے اور اس کے ورع اور تقویٰ کا پاس ولحاظ رکھا جائے۔'' ❶

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات سے ڈرنا اور خوف کھانا:

ابوعبداللہ انطا کی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''خوف سے ورع اور پرہیزگاری حاصل ہوتی ہے۔'' ❷

اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے ملاقات کا یقین اور موت سے دوچار ہونے کا خیال:

یحییٰ بن معاذ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ورع تین خصلتوں سے عبارت ہوتی ہے: نفس کی شرافت اور بزرگی، (جس کو عزت نفس کہا جاتا ہے) یقین کی پختگی ودرستگی اور موت کی توقع اور امید۔'' ❸

سنت کی پابندی اور دین میں نئی چیز ایجاد کرنے سے پہلوتہی:

امام اوزاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ہم لوگ اس بات کے بارے میں اظہار خیال کیا کرتے ہیں کہ کوئی شخص جب بھی کسی بدعت کی داغ بیل ڈالتا ہے تو اس سے اس کا ورع اور تقویٰ سلب کر لیا جاتا ہے گویا کہ وہ شتر بے مہار ہو جاتا ہے۔'' ❹

ابومظفر سمعانی رحمہ اللہ اہل کلام کی مذمت کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

''کیا کسی شخص نے کبھی اس بات کا مشاہدہ کیا ہے کہ کسی متکلم کے لیے اس کے فن کلام ومنطق کے اندر کلامی ومنطقی موشگافیاں دین میں تقویٰ وپرہیزگاری کا باعث بنی ہوں یا اس کی اس بارے میں فکر ونظر نے اسے معاملات میں ورع تک پہنچایا ہو یا کلامی ومنطقی موشگافیوں نے اس کو تزکیہ وسلوک کے بارے میں سدادرائے کی قوت عطا فرمائی ہو یا دنیا سے بے رغبتی اور زہد کی دولت سے اس نے اسے سرشاری کی سعادت سے ہم کنار کیا ہو یا حرام وشبہات سے محتاط رویہ

---

❶ شعب الایمان: ۲۷۰۔
❷ حلیة الاولیاء: ۹/۲۹۰۔
❸ حلیة الاولیاء: ۱۰/۶۸۔
❹ احادیث ذم الکلام واھله: ۵/۱۲۷۔

اپنانے کا اسے عادی بنایا ہو یا عبادت وریاضت میں خشوع وخضوع اور اطاعت وبندگی سے مزید سرشاری اور گناہوں سے بچنے کی راہ پر گامزن ہونے کی سعادت سے اسے مالا مال کیا ہو (الا من رحم اللّٰہ) شاذ ونادر ہی ایسا ہوا ہو تو ہوا ہو ورنہ حقیقت میں یہ چیز نادر الوجود ہے۔'' ❶

علم کے ساتھ عمل پیرگی:

سہیل بن عبداللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اگر مومن علم کے بموجب عمل کرتا ہوا دکھائی دے تو یہ اس کے ورع کی دلیل اور پہچان ہے اور جب کسی شخص کو ورع نصیب ہو جائے تو اس کا دل اللہ کی یاد سے معمور ہو جاتا ہے اور اس کو اللہ کی معیت مل جاتی ہے۔'' ❷

دنیا سے منہ موڑ لینا اور زہد کا راستہ اختیار کرنا:

ابو جعفر صفار رحمہ اللہ سے مروی ہے فرماتے ہیں:

''بصرہ کی رہنے والی ایک عورت نے کہا: اس دل پر ورع کی اثر اندازی ہو ہی نہیں سکتی جس میں دنیا کی محبت رچی بسی ہوئی ہو بلکہ ایسے دل کے لیے ورع حرام ہو جاتا ہے۔'' ❸

ابو جعفر مخولی رحمہ اللہ سے مروی ہے فرماتے ہیں:

''اس دل میں ورع خفی کا سکونت پذیر ہونا حرام ہے جس میں دنیا سرایت کر گئی ہو گویا کہ اس میں جب حب دنیا نے ڈیرا جما لیا ہو تو اب ورع کے لیے اس میں کیوں کر جگہ باقی بچے گی۔'' ❹

اسی لیے اکثر وبیشتر تورع کرنے والے محتاج اور مساکین ہی دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ مالداروں میں سے کوئی تو سود خوری میں ملوث ہوتا ہے تو کوئی لوگوں کا ناجائز مال

---

❶ الانتصار لاصحاب الحدیث: ٦٥.
❷ حلیة الاولیاء: ١٠/٢٠٥.
❸ الورع لابن ابی الدنیا: ٢٩.
❹ تاریخ بغداد: ١٤/٤١٠.

ہڑپ کرنے کے جرم میں گرفتار ہوتا ہے تو کوئی حلال وحرام کی پرواہ نہ کرتے ہوئے شبہ سے دوچار ہوتا ہے اس لیے اب تو لوگوں میں شاذ ونادر ہی پرہیزگار اور متورع شخص ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں بلکہ متورعین تقریبا نادرالوجود ہو چکے ہیں۔

سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ہم نے جب بھی کسی پرہیزگار، ورع کرنے والے خاشع وخاضع شخص دیکھا تو ہمیں وہ محتاج وتنگ دست ہی ملا۔'' ❶

جو دنیا سے زہد واستغناء نہ برت سکے وہ متورع یا خاشع کیوں کر ہوسکتا ہے؟ بلکہ وہ ورع کی تمازت برداشت ہی نہیں کرسکتا کیونکہ دنیا داری کی وجہ سے اسے مادی جھمیلوں سے ہی فرصت نہ مل پائے گی تو وہ ورع کی کہاں سے پابندی کرے گا؟

غیظ وغضب سے کنارہ کشی:

ابوعبداللہ ساجی رحمہ اللہ سے منقول ہے، فرماتے ہیں:

''جوں ہی غیظ وغضب کا بخار عقل پر سوار ہوتا ہے ویسے ہی ورع اس شخص سے رخصت ہو جاتی ہے۔'' ❷

کم خوراکی اور شہوات نفسانیہ سے اجتناب:

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''زہد واستغناء اور عفت وپاک دامنی نیز ورع وپرہیزگاری کی کنجی (کم خوراکی شہوات نفسانیہ پر قابو یا بالفاظ دیگر کسر شہوت ہے۔'' ❸

لالچ اور حرص سے بے اعتنائی:

ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''لالچ اور حرص کی طرف سے بے اعتنائی صدق ووفاء اور ورع وپرہیزگاری سے

---

❶ تهذيب الكمال: ٢٨/٤٣٠. ❷ حلية الاولياء: ٩/٣١٧.
❸ معارج القدس: ٨١.

سرشاری کا ذریعہ ہے۔'' ❶

کم گفتاری یا کم کلامی:

عبداللہ بن ابوزکریا رحمہ اللہ سے یہ قول منقول ہے:

''جو شخص منہ پھٹ ہو یا حد سے زیادہ باتیں بنانے والا ہو اس کی لغزشیں بھی اسی مقدار میں حد سے زیادہ ہوتی چلی جاتی ہیں جتنی کہ وہ باتیں بناتا پھرتا ہے لہٰذا اس بنیاد پر جس شخص کی غلطیاں اور لغزشیں جتنی زیادہ ہوں گی اتنا ہی ورع و پرہیزگاری سے اس کا رشتہ کمزور ہوتا چلا جائے گا اور جس شخص کا رشتہ ورع سے کمزور پڑ جاتا ہے اس کا دل مردہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے دل سے نشاط و حیویت کی نعمت چھین لیتے ہیں پھر وہ مردہ دل بن جاتا ہے۔'' ❷

بحث و مباحثہ سے اجتناب:

امام اوزاعی رحمہ اللہ نے حکم بن غیلان قیسی کو یہ فرمان لکھ کر بھیجا تھا:

''بحث و تکرار میں خصوصاً ان چیزوں سے کنارہ کشی اختیار کرو جو دل کے لیے باعث شر اور فتنہ ہیں اور جن سے عداوت اور دشمنی کی شجرکاری ہوتی ہے اور جو قساوت قلب کا باعث ہیں اور منطق و عقل کے اعتبار سے ورع کو کھوکھلا کر کے رکھ دیتی ہیں۔'' ❸

اپنے عیوب کی طرف توجہ مبذول کرتے ہوئے دوسروں کے عیوب سے چشم پوشی:

ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ سے پوچھا گیا: ''ورع اور پرہیزگاری کا تتمہ اور تکملہ کیا ہے؟ آپ نے جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''مخلوق کائنات کے عیوب سے صرف نظر کرتے ہوئے اپنے گناہوں کی اصلاح کی طرف توجہ مبذول کرنا ورع کا تکملہ ہے اور مؤمن کو چاہیے کہ رب تعالیٰ کے

---

❶ حلیة الاولیاء: ۳۵/۸. ❷ حلیة الاولیاء: ۱۴۹/۵.

❸ حلیة الاولیاء: ۱۴۱/۶.

سامنے دل کی گہرائی کے ساتھ خشوع وخضوع کا اظہار کرتے ہوئے خوش کلامی کے آئینہ میں اپنے گناہوں کے بارے میں غور وفکر کرنا اور اپنے رب کے حضور توبہ وانابت کرنا دل میں ورع کو ثبات عطا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس سے تمہارا دل صفت ورع پر ثابت قدمی واستقامت کی راہ پر گامزن ہوتا چلا جائے گا۔'' ❶

ان چیزوں سے دوری اور کنارہ کشی جو بلا فائدہ ضیاع وقت کا سبب ہیں:

سہل بن عبداللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جو شخص اپنے اعضاء وجوارح کو منہیات میں مصروف رکھنے لگے وہ ورع جیسی نعمت جلیلہ سے محروم کر دیا جاتا ہے۔'' ❷

اور انہی سے یہ قول بھی وارد ہوا ہے:

''جو شخص فضول باتوں میں مصروف ہو جائے اس سے ورع کی توفیق سلب کر لی جاتی ہے۔'' ❸

شرم وحیا پر کاربند رہنا بھی ورع اور پرہیز گاری سے متصف ہونے کا نسخہ ہے:

سیّدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''جو شخص قلت حیا کی بیماری میں مبتلا ہو جائے تو اس کے ورع اور پرہیز گاری میں بھی خلل پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے اور جو شخص قلت ورع کا شکار ہو جائے اس کا دل مردہ ہو جاتا ہے۔'' ❹

ورع مشروع اور ورع غیر مشروع میں تقابلی موازنہ

شرعاً جواز کا حکم رکھنے والے ورع مشروع کا بیان:

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس سلسلہ میں اظہار خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

---

❶ حلیة الاولیاء : ۱٦/۸ بتصرف
❷ شعب الایمان : ۵۰۵٦.
❸ حلیة الاولیاء : ۱۹٦/۱۰.
❹ المعجم الاوسط للطبرانی : ۳۷۰/۲.

''ورع مشروع شرعاً اس ورع کو کہا جاتا ہے جس کے انجام کار اور نتیجہ سے اندیشہ اور خوف محسوس کیا جائے۔ یہ وہ ورع ہے جس کی حرمت معروف اور جانی پہچانی ہو اور جس کو حرام قرار دینا باعث شبہ و بدگمانی ہو، جس کے ترک کرنے میں اس کی انجام دہی سے زیادہ خرابی کا خدشہ نہ ہو۔'' [1]

اس قسم کے ورع اور پرہیزگاری کی ہم نے گذشتہ صفحات میں بہت سے مثالیں پیش کردی ہیں:

ورع غیر مشروع کا بیان

ا۔ ورع میں غلو اور حد سے تجاوز کرنا:

بعض لوگ ورع اور پرہیزگاری میں حد سے تجاوز کر کے مبالغہ کی حدوں کو چھونے لگتے ہیں اور ورع کو اس کے مقام و مرتبہ سے بہت آگے نکال کر حدود شرعیہ کو پامال کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ یہ بہت بڑی لغزش ہے، کیونکہ ہر چیز کی ایک متعین حد ہے اور انسان جب بھی حد سے تجاوز کر کے اس کی حدود شرعیہ کو پامال کرنا شروع کر دیتا ہے اور اس کے حدود اربعہ کی چاردیواری سے باہر نکل جاتا ہے تو وہ ورع غیر مشروع کی انجام دہی کا ارتکاب کرنے والا گردانا جاتا ہے۔ اس بنیاد پر کسی شخص کے لیے یہ بات جائز نہیں کہ وہ ورع میں مبالغہ آمیزی کرے یا اس میں حد سے تجاوز کرتے ہوئے زیادتی ونقصان کا شکار ہو۔

اب ہم ورع سے متعلق ان مسائل کو بیان کریں گے جن میں لوگ غلو کا شکار ہو جایا کرتے ہیں۔

ان میں سے ایک مسئلہ یہ ہے جو کہ معروف و مشہور ہے کہ بعض لوگ یہ شوشہ چھوڑتے ہیں کہ اگر حرام مال حلال مال سے مل کر باہم خلط ملط ہو جائے تو بعینہٖ حرام مال کو حلال مال سے جدا کرنا واجب ہے۔ مثال کے طور پر کوئی شخص سو روپے کا مالک ہو۔ اس میں سے آدھے

---

[1] مجموع الفتاوی: ۱۰/۵۱۱-۵۱۲ باختصار

یعنی پچاس روپے حلال ہوں اور پچاس حرام ہوں تو اس مال کا نصف حصہ یعنی پچاس روپے نکال کر اس مال کو حرام مال کی آمیزش سے پاک وصاف کر دینا چاہیے لیکن اس بارے میں بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اس طرح سے مال کو پاک وصاف کرنا کافی نہیں ہے بلکہ اس مال میں سے عین حرام مال کو جب تک اس سے جدا نہ کیا جائے تب تک وہ مال حلال نہیں ہوگا یہی وہ غلو ہے جو ورع کی حد سے خارج سمجھا گیا ہے۔

کیونکہ علمائے کرام اس مال کے بارے میں جس میں حرام مال کی آمیزش ہو، اختلاف کا شکار نظر آتے ہیں۔ بعض علماء نے تو اس قسم کے مال سے کھانے پینے کو منع کیا ہے۔ الا یہ کہ حرام کی آمیزش آٹے میں نمک کے برابر ہو تو اور بات ہے۔ اس بارے میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ”مناسب یہی ہے کہ اس مال سے اجتناب کیا جائے الا یہ کہ حرام مال کی آمیزش بہت ہی معمولی سی ہو یا یہ کہ غیر معروف ہو تو اس مال میں سے کھایا پیا جا سکتا ہے۔“ ❶

اسلاف میں سے بعض لوگوں نے اس مال میں سے کھانے پینے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے، جس کے بارے میں یہ بات تو طے ہو کہ اس میں حرام کی آمیزش ہے مگر بالتحدید یہ بات معلوم نہ ہو کہ اس میں حرام کی آمیزش کی نوعیت کیا ہے؟ تو اس بارے میں امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ”ایسے مال میں سے کھانے پینے میں کوئی حرج کی بات نہیں جس میں بعینہ حرام کی تعیین نہ ہو۔“ ❷

بعض لوگوں نے بطور ورع اس سلسلہ میں یہ پہلو اختیار کیا ہے: ورع (پرہیز گاری) کی بنیاد پر اس مال کے بارے میں توقف اختیار کیا جائے گا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ”میرے نزدیک یہ بات ناپسندیدہ کہ اس مال سے مطلقاً تورع اختیار کیا جائے

---

❶ جامع العلوم والحکم: ۷۰.   ❷ ایضًا

بلکہ میرے نزدیک اس بارے میں مرغوب ترین بات یہ ہے کہ اس مال سے سرے سے سروکار ہی نہ رکھا جائے۔'' [1]

لیکن اگر اس مال میں سے حرام مال کی مقدار نکال کر الگ کر دی جائے تو پھر اس میں تصرف کا جواز ہے۔ چنانچہ اس بارے امام احمد رحمہ اللہ فیصلہ کن بات کہتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

''اگر مال کی مقدار زیادہ ہو تو اس میں سے حرام مال کی مقدار نکال کر الگ کر دی جائے اور باقی میں تصرف کیا جائے تو کوئی مضائقہ کی بات نہیں ہے۔'' [2]

لہٰذا اس قسم کی صورت حال پیدا ہو جانے کی وجہ سے انسان مال حلال میں سے حرام مال کو نکال دینے کے بعد بھی حلال مال میں تصرف سے بطور ورع احتیاط برتے تو اس کا یہ تصرف جائز نہیں بلکہ عین غلو ہے۔

بعض لوگوں کو ان معاملات میں شک ہونے لگتا ہے جس کے بارے میں کسی صورت میں بھی انہیں سوال کرنے کا جواز نہیں پہنچتا، کیا کسی انسان کے لیے اس بات کا جواز ہے کہ وہ کسی مسلمان مستور الحال شخص جس کے بارے میں کسی کو شک وشبہ تک نہ ہو بلکہ اس کی شخصیت صاف وشفاف ہو، کے یہاں بطور مہمان جائے اور اس کے یہاں اس شخص کی مہمانی اور ضیافت کی خاطر کھانے کا دستر خوان چنا جائے۔ اس موقع پر وہ میزبان سے یہ سوال کرے کہ تم نے جس مال سے یہ کھانا خریدا ہے وہ کس قسم کا ہے؟ اور تم کو یہ مال کہاں سے حاصل ہوا ہے؟ اور کس جگہ سے یہ کھانا لائے ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔

کیا اس موقع پر اس قسم کے استفسار کو ورع تصور کیا جائے گا؟ کیا حقیقت میں یہی ورع ہے؟ نہیں! یہ ورع نہیں، بلکہ اس قسم کی حرکت کرنے میں مسلمان بھائی کی دل شکنی اور اس کو ایذا رسانی کا کھلم کھلا ارتکاب ہے، کیونکہ اس قسم کا سوال کرنا گویا کہ اپنے مسلمان بھائی پر اتہام بازی ہے اور مسلمان پر تہمت طرازی کرنا یا بغیر کسی قرینہ کے اس کو مورد شک ٹھہرانا جس پر نہ کوئی دلیل پائی جاتی ہو اور نہ ہی کوئی گواہی کا وجود ہو کسی طرح سے جائز نہیں بلکہ یہ تو

---

[1] جامع العلوم والحکم: ۷۰. [2] ایضًا

بدگمانی اور سوئے ظن ہے اور ایک مسلمان کا اپنے مسلمان بھائی کو ایذا دینا حرام ہے۔ اس کا کسی صورت میں جواز نہیں۔

ب:......وسوسہ کی بیماری سے دوچار لوگوں کے ورع کا بیان:

ورع کے بارے میں چند معاملات ایسے بھی ہیں جن کی طرف توجہ دینا فضول ہے بالفاظ دیگر ان کی طرف نظر التفات کرنا بے سود ہے کیونکہ اسے وسوسہ کرنے والوں کے ورع میں گردانا جاتا ہے۔

اس کی مثال وہی ہے جس کو علامہ امام ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں ذکر کیا ہے فرماتے ہیں:

"موسوسین کے ورع میں سے یہ ہے کہ کوئی شخص شکار کا گوشت کھانے سے محض اس شک کی بنیاد پر انکار کردے کہ کہیں یہ شکار کسی شخص کی ملکیت نہ ہو اور اس کی قید تصرف سے نکل بھاگا ہو یا یہ کہ کوئی کسی مجہول شخص سے اپنی ضروریات کی چیزیں خریدنے میں محض اس خدشہ کی بنیاد پر لیت ولعل سے کام لے کہ پتہ نہیں یہ حرام ہیں یا حلال جبکہ وہاں کوئی بھی ایسا قرینہ موجود نہ ہو جو اس کی حرمت پر دلالت کرتا ہو تو یہ موسوسین کا ورع ہے۔" [1]

وسوسہ کرنے والوں کے ورع کی ایک دوسری مثال جس کو امام زرکشی رحمہ اللہ نے ذکر کرتے ہوئے یوں فرمایا ہے:

"مثال کے طور کوئی شخص قسم کھالے کہ اپنی بیوی کے ہاتھ کی بنی ہوئی یا پروئی ہوئی چیز وہ زیب تن نہیں کرے گا۔ اب اس کی بیوی نے اپنے ہاتھ سے کوئی چیز سی کر یا پرو کر یا کڑھائی کر کے بیچ دی اور اس کی قیمت اپنے شوہر کو ہدیہ کر دی تو اس کے کھانے میں کسی قسم کی کراہت نہیں بلکہ اس کا نہ کھانا ورع کے خلاف ہے۔ اس کے نہ کھانے کو ورع نہیں کہا جاسکتا بلکہ یہ تو شیطانی وسوسہ ہے۔" [2]

---

[1] فتح الباری: ٤/٢٩٥.
[2] المنثور في القواعد: ٢/٢٣٠.

بہت ہی باریک اور نازک نوعیت کا ورع

ورع کے بارے چند مسائل ایسے بھی ہیں جو بہت ہی باریک بینی کے متقاضی ہیں۔ ہر شخص اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ ان کا معاملہ بڑا ہی نازک اور دقیق ہوتا ہے۔ امام ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''چند مسائل ایسے بھی ہیں جن کا سمجھنا اور ان کی طرف توجہ مبذول کرنا ضروری ہے لہٰذا ایک مؤمن کو اس کے فہم وادراک کی کوشش کرنی چاہیے۔ وہ شبہات سے تعلق رکھنے والے مسائل میں باریک بینی سے کام لینے اور ان کے بارے میں توقف اختیار کرنے کا معاملہ ہے۔ یہ تدقیق اور باریک بینی انہیں کے بس میں ہوتی ہے جن کی حالت ایمانی استقامت اور ثابت قدمی کا آئینہ دار ہو۔ جن کے احوال وکوائف درست ہوں اور جن کے اعمال تقویٰ و ورع کا جیتا جاگتا نمونہ ہوں۔ جہاں تک ان لوگوں کا معاملہ ہے جو ظاہری طور پر حرمات کی پامالی کرتے ہیں اور اس کی کوئی پرواہ تک نہیں کرتے۔ اس کے بعد دقیق سے دقیق شبہات سے تعلق رکھنے والی چیزوں سے تورع (پرہیز گاری) اختیار کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں یا اس کا عزم وارادہ رکھتے ہیں۔ یہ چیز ان کے بس سے باہر ہے۔ حقیقت میں یہ اس کے تحمل کی طاقت نہیں رکھتے بلکہ اس کی تگ ودو ان کے لیے لاحاصل ہے اور حقیقت میں یہ ورع کی پیشانی پر بدنما داغ لگانا ہے۔

جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس شخص کو جواب دیتے ہوئے جب کہ ان سے اہل عراق سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں کسی شخص نے سوال کرتے ہوئے مچھر کے ناحق خون کردینے کے بارے میں پوچھا تھا، ارشاد فرمایا تھا: یہ لوگ مجھ سے مچھر کے خون کے بارے میں سوال کررہے ہیں جبکہ انہوں نے سیّدنا حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کیا ہے؟ میں نے اپنے کانوں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے

سنا ہے کہ دنیا میں یہ دونوں میرے لیے چمکتے دمکتے خوشبودار پھول ہیں۔''[1]

اسی طرح امام احمد رحمہ اللہ سے جب اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جس نے سبزی خریدی ہو اور وہ بائع سے سبزی یا ساگ پتوں کو باندھنے کی ڈوری کا سودا کرے، تو امام رحمہ اللہ نے سائل سے پوچھا یہ کیا کھیل بنا رکھا ہے؟ یہ کس قسم کے مسائل تم پوچھ رہے ہو؟ تو لوگوں نے جواب دیا کہ سیّدنا ابراہیم بن ابی نعیم رحمہ اللہ اس قسم کے مسائل بیان فرماتے ہیں تو سیّدنا امام احمد رحمہ اللہ نے سائل کو جواب دیا کہ اگر ابراہیم نعیم رحمہ اللہ ایسا کرتے ہیں تو بجا ہے۔ یہ ان ہی کے شایان شان بات ہے، مجھے ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا۔''[2]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ورع کے مسائل میں سے چند دقت طلب باریک مسائل بھی ہوا کرتے ہیں جن کی گتھیاں سلجھانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی بلکہ ہر کس و ناکس اس میں تورع کا پہلو اختیار نہیں کر سکتا اگر گناہ گار اور فاسق و فاجر لوگوں نے اس میں ورع نمائی کی کوشش کی تو یہ چیز ان کے لیے وبال جان ثابت ہوتی ہے۔ اس قسم کے مسائل میں بڑی باریک بینی اور دقت نظری کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو ان فاسق و فاجر لوگوں کے بس سے باہر ہے اور اس بارے میں ورع کی انجام دہی ان کے لیے بعید از قیاس معاملہ ہوا کرتا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری: ٥٦٤٨.   [2] جامع العلوم والحکم: ١١١.

خاتمہ

ورع (پرہیز گاری) کو سرے سے چھوڑ دینا یا ترک کر دینا انسان کے لیے دینی و دنیاوی دونوں اعتبار سے حد سے زیادہ خرابیوں اور برائیوں نیز بہت بڑے فساد کا پیش خیمہ ہے۔

سہیل بن عبداللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جب کوئی بندہ ورع اور پرہیز گاری کرنا چھوڑ دیتا ہے اور اپنے اعمال کی انجام دہی میں تورع سے کام نہیں لیتا تو اس کے اعضاء و جوارح گناہوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکنا شروع کر دیتے ہیں اور اس کا دل شیطان کے چنگل میں جا کر پھنس جاتا ہے اور وہ اسی کے قبضۂ تصرف میں کام کرنا شروع کر دیتا ہے۔'' [1]

کبھی کبھار تو بندے کا عدم تورع اس کے اعمال صالحہ کو رائیگاں کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ اس بارے میں ایاس بن معاویہ رحمہ اللہ اظہار خیال کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

''ہر وہ دین و مذہب جس کی بنیاد عدم ورع پر ہو خس و خاشاک کی طرح ہے گویا کہ اس کی دو کوڑی کی حیثیت نہیں بلکہ بیکار اور بے سود ہے۔'' [2]

ہم تو کہتے ہیں کہ ورع کو ترک کر دینا امت اسلامیہ کے فساد اور بگاڑ کا پیش خیمہ ہے اور اعمال صالحہ کی برکت چھن جانے کا سبب ہے اس سلسلہ میں سیّدنا سہل بن عبداللہ رحمہ اللہ کا فرمان ہے:

''لوگوں میں عجیب و غریب چیزوں کا صدور رونما ہوتا ہوا نظر آتا ہے ان کے فریضہ ورع سے پہلوتہی کی وجہ سے خشوع و خضوع کی دولت سے نفع اندوزی کی صلاحیت سلب کر لی جاتی ہے۔'' [3]

---

[1] حلية الاولياء : ١٠/٢٠٥.
[2] تهذيب الكمال : ٣/٤٣١.
[3] حلية الاولياء : ١٠/٢٠٦.

خالی دعوی کرنے اور شیخی بگھارنے کا نام ورع نہیں ہے کہ انسان محض تورع کا دعوی کرلے اور ورع کرنے والوں میں شمار ہونے لگے۔ نہیں ایسا نہیں! بلکہ دعوی کے ساتھ اس راہ میں جد و جہد اور کوشش و عمل کرتے رہنے کی ضرورت درپیش ہوتی ہے تا کہ ورع کی دولت سے سرشاری نصیب ہوجائے اور بندے کے دل میں ورع جاگزیں ہوجائے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں سے دور رہے بغیر اس کی محبت کا دعوی کرنا برائے دعوی ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ تو سراسر جھوٹ اور دروغ گوئی ہے اور دل کو بہلانے کے لیے ایسا گمان کرنا ہے۔ سیّدنا حاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''جو شخص اللہ کے محارم سے اجتناب کے بغیر متورع ہونے کا دعوی کرے وہ جھوٹا اور کذاب ہے۔''❶

لہٰذا ایک مؤمن کو چاہیے کہ اس کے نزدیک دین کے اعتبار سے اہم ترین چیز اس کا ورع وتقوی ہو اور ہر اس چیز میں اللہ کے تقویٰ کا استعمال اور اس کے مراقبہ کا استحضار پیش نظر رہے۔ جس کے کرنے کا اس نے حکم دیا ہے اور جس کے کرنے سے شارع حکیم نے منع کیا ہے دراصل مؤمن کا یہ طرۂ امتیاز ہونا چاہیے۔

کسی عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

> ''تقوی کی پابندی کرو اور تورع اختیار کرنے والے بنو اور آزمائش پر جم کے صبر کرنا اپنی عادت بنالو اور دین کے بارے میں بیدار مغزی سے کام لینے والے بن جاؤ۔''❷

تو وہ شخص لائق صد ستائش ہے جس کے دل کا شعار ورع اور تقوی ہو اور جس کے دل میں ورع وتقوی کی قندیلیں فروزاں ہوں۔

اے اللہ! ہمارے معاملہ کو ہدایت کی راہ پر گامزن فرمادے اور تقوی کو ہمارے لیے زادِ راہ بنادے اور جنت کو ہمارا مرجع اور ہماری آماجگاہ مقرر فرمادے اور ہمیں ایسے شکر کی توفیق

---

❶ حلیة الاولیاء : ۸/۷۵۔ ❷ نشر طی التعریف : ۸۵۔

عطا فرما جو تجھے مجھ سے راضی اور خوش کر دے اور ہمیں ایسا ورع وتقوی عطا فرما جو ہم کو تیری معصیت سے روکنے اور دور رکھنے کا ذریعہ ثابت ہو، اور ایسی خوش اخلاقی کی دولت سے سرشاری نصیب فرما جس کے ساتھ لوگوں کے درمیان ہر دل عزیز بن کر زندگی گذاروں اور ہمیں ایسی عقل سلیم کی دولت سے مالا مال فرما دے جو کہ میرے لیے سودمند ونفع بخش ثابت ہو۔ اے اللہ! ہمیں ہدایت یافتہ اور ہدایت کی راہ پر گامزن لوگوں میں شمار فرما لے، گمراہ لوگوں یا گمراہی کے راستہ پر گامزن لوگوں میں ہمیں نہ بنا اور ہمارے تمام کے تمام گناہوں کو بخش دے۔ (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ بِنِعْمَتِهٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ)

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ أَجْمَعِيْنَ.

اپنے فہم وادراک کا امتحان لیں!

ذیل میں اس موضوع سے متعلق سوالات کو دو مرحلوں کو مدنظر رکھتے ہوئے وضع کیا گیا ہے۔

سوالوں کی ایک قسم تو وہ ہے جن کا جواب فوراً دینا ہے۔ اس قسم کے سوالات کو پہلے مرحلہ میں رکھا گیا ہے۔

سوالوں کی دوسری قسم وہ ہے جو بحث ونظر اور غور وفکر کی متقاضی ہے اس قسم کے سوالات کو دوسرے مرحلہ میں رکھا گیا ہے۔

پہلے مرحلہ کے سوالات جن کا جواب فورا دینا ہے:

۱۔ ورع واجب کی تعریف کیا ہے؟

۲۔ ورع کے چار مراتب ہیں ان کا مفصل ذکر کریں اور تمام مراتب میں سے ہر مرتبہ کی تعریف کریں۔

۳۔ ان احادیث میں سے تین احادیث کا ذکر کریں جو ورع کی فضیلت میں وارد ہوئی ہیں۔

۴۔ قضاء اور عدلیہ کے بارے میں ورع شرط کیوں ہے؟

۵۔ صالحین اور اللہ والوں کے ورع کے قصوں میں سے بطور نمونہ تین قصوں کا ذکر فرمائیں۔

۶۔ ورع کے پانچ فوائد کا تذکرہ کیجیے۔

۷۔ ورع میں غلو کا کیا مطلب ہے؟ اس کی چند مثالیں ذکر کریں۔

۸۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے ورع کی کیا تعریف کی ہے؟

۹۔ ورع کے بارے میں لوگوں کی اقسام کا ذکر کریں۔

۱۰۔ موسوسین (وسوسہ کی بیماری میں مبتلا) لوگوں کی مثالوں میں سے دو مثالوں کا تذکرہ کریں۔

دوسرے مرحلہ کے سوالات جو استنباطی انداز کے ہیں:

۱۔ ورع کی حقیقت اور اصلیت کیا ہے؟

۲۔ بحث ومباحثہ سے دوری اور علیحدگی کو ورع کے حصول کے اسباب میں کیوں کر شمار کیا جا سکتا ہے؟

۳۔ ورع شبہات سے علیحدگی کا کیوں کر ذریعہ بن سکتا ہے۔ اس کی وضاحت کریں۔

۴۔ بعض ان اسباب اور وسائل کا ذکر کیجئے جو ورع کے حصول میں مددگار کی حیثیت رکھتے ہیں مگر زیر نظر کتابچہ میں مذکور اسباب ووسائل کے علاوہ ہوں۔

۵۔ بعض ان کتابوں کا ذکر کریں جو کہ ''موضوع ورع'' کے بارے میں مرجع کی حیثیت رکھتی ہیں۔

۶۔ اس قصہ کا تذکرہ کریں جو اس بات کا بین ثبوت ہو کہ ورع جس طرح خفیہ طور پر ہوتا ہے اسی طرح اعلانیہ طور پر اس کا وجود ممکن ہے؟

۷۔ بعض مباح چیزوں سے کیسے ورع برتا جا سکتا ہے؟

۸۔ کیا مسلم کے لیے یہ بات کافی ہے کہ وہ دل سے ورع کا کام انجام دے اور بس! اس کی وضاحت کریں۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ .

673

مقدمہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى اَشْرَفِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ ، نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ .

اما بعد!

بلاشبہ غور و فکر، تدبر سوچ بچار بصارت کا مبدا اور باطن اشیاء کی حقیقت کی کنجی ہے۔ یہ علوم وفنون کی بنیاد ہے، ان اعمال کا تعلق عظیم قلوب و اذہان سے ہے بلکہ یہ افضل ترین عبادات میں سے ہے۔ اکثر لوگ اس کی فضیلت سے آگاہ ہیں لیکن اس کی حقیقت اور نتیجے سے نا آشنا ہیں، بہت کم لوگ ہیں جو غور و فکر اور تدبر کرتے ہیں۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ كَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَ هُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ○ وَ مَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ ○﴾

(يوسف: ١٠٥، ١٠٦)

''اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے گزرتے ہیں اور وہ ان سے بے دھیان ہوتے ہیں۔ اور ان میں سے اکثر اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، مگر اس حال میں کہ وہ شریک بنانے والے ہوتے ہیں۔''

یقیناً اللہ تعالیٰ نے اسماء و صفات میں غور و فکر و تامل، جنت و جہنم اور ان کی نعمتوں اور عذاب پر تدبر، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کی کتاب مبین میں وارد آیات و نشانیاں جو ساری کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں کی مجالس سب سے معزز و مشرف اور اعلیٰ ہیں۔ ان مجالس سے پُر لطف اور طیب کوئی اور مجالس نہیں، میں تفکر اور اس کا دائرہ کار کیا ہے؟ اس کے ثمرات اور

فوائد کیا ہیں؟ اس عظیم المرتبت عبادت پر ہمارے سلف کس طرح کاربند تھے۔

اس کا تذکرہ ہم اعمال القلوب کے گیارہ نمبر کتابچے میں کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس علمی دور میں اسے ترتیب دینا میرے لیے نہایت آسان کر دیا اور جو لوگ کسی بھی طرح اس کو ترتیب دینے اور جمع کرنے میں میرے شامل حال رہے، جن کی کوششوں کی بدولت یہ کتابچہ آپ کے ہاتھوں میں ہے بالخصوص اس کے ترجمہ وتیاری میں الفرقان ٹرسٹ نے تعاون کیا اور آج یہی اس کتابچہ کو چھاپ کر اس کی نشر و اشاعت میں حصہ لے رہے ہیں اور علمی مواد کی شکل میں طبع کر کے اسے پیش کرنے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی کاوشوں کو شرفِ قبولیت بخشے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ ہمیں اور آپ کو ان سلف صالحین میں شامل کر لے جو اس عظیم عبادت کو سرانجام دیتے رہے۔

محمد صالح المنجد

موضوع کی لغوی واصطلاحی تعریف

لغوی تعریف:

تفکر کا معنی ہے غوروفکر اور یہ فِکْرٌ سے باب تَفَعُّلٌ ہے۔اس کا مادہ ف ، ك ، ر ہے جو دل کے کسی چیز پر متردد ہونے پر دلالت کرتا ہے۔کہا جاتا ہے: تفكر اذا ردد قلبه معتبراً.

فَكَّرَ کا مصدر التفكير ہے۔التفكر اسم مصدر ہے۔ ❶

اصطلاحی تعریف:

دل کا بصیرت اور نہایت باریک بینی سے دلائل کا مشاہدہ کرنا تفکر کہلاتا ہے۔ایک قول یہ بھی ہے: ''اشیاء کے معانی پر دل کا غوروفکر کرنا تفکر کہلاتا ہے۔'' ابن عاشور کہتے ہیں: ''تفکر عقل کا وہ دائرہ کار ہے جو صحیح علم تک پہنچنے کا راستہ اور طریق ہے۔'' ❷

تفکر واجب ہے:

بہت سے دلائل اس بات پر دال ہیں کہ مومنوں پر غوروفکر کرنا واجب اور فرض ہے۔خواہ یہ تدبر وتفکر اللہ تعالیٰ کی آیات ،مخلوقات ، انسانوں کے اپنے نفوس پر یا اللہ تعالیٰ کے عذاب اور سزا یا اس کی رحمت اور جنت کے متعلق ہو۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ بِالْبَيِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ

❶ مقاييس اللغة: ٣٥٧/٤، لسان العرب: ٦٥/٥۔ مختار الصحاح: ٥١٧۔ التعريفات: ٧٦.
❷ التحرير والتنوير: ٢٤٤/٣.

الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴾

(النحل : ٤٣، ٤٤)

''اور ہم نے تجھ سے پہلے نہیں بھیجے مگر مرد، جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے۔ سو ذکر والوں سے پوچھ لو، اگر تم شروع سے نہیں جانتے۔ واضح دلائل اور کتابیں دے کر اور ہم نے تیری طرف یہ نصیحت اتاری، تاکہ تو لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دے جو کچھ ان کی طرف اتارا گیا ہے اور تاکہ وہ غور و فکر کریں۔''

اللہ تعالیٰ نے کتاب عزیز میں اپنے غور و فکر کرنے والے بندوں کی تعریف بیان کی ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۝ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ رَبَّنَآ إِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهٗ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ أَنْصَارٍ ۝ ﴾ (آل عمران : ۱۹۰ تا ۱۹۲)

''بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے بدلنے میں عقلوں والوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں۔ وہ لوگ جو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور و فکر کرتے ہیں، اے ہمارے رب! تو نے یہ بے مقصد پیدا نہیں کیا، تو پاک ہے، سو ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔ اے ہمارے رب! بلاشبہ تو جسے آگ میں ڈالے سو یقیناً تو نے اسے رسوا کر دیا اور ظالموں کے لیے کوئی مدد کرنے والے نہیں۔''

امام عطاء بیان کرتے ہیں کہ میں اور عبید بن عمیر ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے۔ ابن عمیر نے کہا کہ ام المومنین ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق عجیب چیز بتلائیں جس

کا آپ نے مشاہدہ کیا ہو؟ ابن عمیر کہتے ہیں کہ آپ رضی اللہ عنہا خاموش رہیں، پھر کہنے لگیں کہ کسی ایک رات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((ذَرِينِي أَتَعَبَّدُ اللَّيْلَةَ بِرَبِّي)) ''مجھے اپنے رب کی عبادت کے لیے تنہا چھوڑ دو۔'' سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: اللہ کی قسم! مجھے آپ کی قربت اور جو چیز آپ کے لیے خوشی کا باعث ہو، پسند ہے۔ پھر کہا کہ آپ کھڑے ہوئے، وضو کیا اور پھر نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔ سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ آپ زاروقطار روتے رہے یہاں تک کہ آپ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ پھر فرماتی ہیں کہ دوبارہ رونے لگے، مسلسل روتے رہے یہاں تک کہ داڑھی تر ہوگئی۔ پھر بیان کرتی ہیں کہ پھر رونے لگے، مسلسل روتے رہے یہاں تک کہ زمین تر ہوگئی، پھر سیّدنا بلال رضی اللہ عنہ نماز کے لیے اذان کہنے آئے تو آپ کو روتے دیکھ کر پوچھا: اے اللہ کے رسول! آپ کیوں رو رہے ہیں؟ اور بے شک اللہ تعالیٰ نے آپ کے پہلے اور پچھلے گناہ معاف کردیے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((أَفَلَا أَكُونَ عَبْدًا شَكُورًا ، لَقَدْ نَزَلَتْ عَلَيَّ اللَّيْلَةَ آيَةٌ وَيْلٌ لِمَنْ قَرَأَهَا وَلَمْ يَتَفَكَّرْ فِيهَا ﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ ......)) [1]

''کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں، بے شک آج رات مجھ پر ایک آیت نازل ہوئی ہے، اس کے لیے ویل ہے جس نے اس آیت کو پڑھا لیکن اس میں غوروفکر نہ کیا۔''

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جو شخص ان آیات میں غوروفکر نہ کرے اس کے لیے ہلاکت اور عذاب کی وعید ہے۔ اللہ تعالیٰ صرف اس شخص کو عذاب کی وعید سناتا ہے جو اس کے حکم کی مخالفت کرے۔ اس سے ثابت ہوا کہ غوروفکر واجب ہے۔ (یہ وجوبی حکم ہے)

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں تفکر کا ذکر مثالوں کے ساتھ کیا ہے اور اپنے بندوں کو ان امثلہ میں غوروفکر کا حکم دیا ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

---

[1] ابن حبان في صحيحة : ٦٢٠ و صححه الالباني.

﴿اَیَوَدُّ اَحَدُکُمْ اَنْ تَکُوْنَ لَہٗ جَنَّۃٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّ اَعْنَابٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَہٗ فِیْهَا مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ وَ اَصَابَهُ الْکِبَرُ وَ لَہٗ ذُرِّیَّۃٌ ضُعَفَآءُ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِیْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَکُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ﴾ (البقرہ: ۲٦٦)

''کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اس کا کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو، جس کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں، اس کے لیے اس میں ہر قسم کے کچھ نہ کچھ پھل ہوں اور اسے بڑھاپا آ پہنچے اور اس کے کمزور بچے ہوں، پھر اسے ایک بگولا آ پہنچے، جس میں ایک آگ ہو تو وہ بالکل جل جائے۔ اسی طرح اللہ تمھارے لیے کھول کر آیات بیان کرتا ہے، تاکہ تم سوچو۔''

اس آدمی کا دل باغ کے ساتھ کئی لحاظ سے جڑا ہوا تھا:

- وہ باغ کوئی چھوٹی کھیتی نہیں ہے۔
- اس میں کھجوروں اور انگوروں کے اور طرح طرح کے درخت ہیں۔
- اس باغ کو رہٹوں یا ٹیوب ویلوں سے پانی نکال کر سیراب نہیں کیا جاتا بلکہ اس میں قدرتی نہریں جاری ہیں۔
- یہ آدمی بڑھاپے کو پہنچ گیا اور انسان جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو اسے اس چیز کی ضرورت ہوتی ہے کہ مال بغیر مشقت کے مل جائے۔
- اس کی اولاد کمزور یعنی ابھی چھوٹی ہے۔ چھوٹی ہے یا بیمار ہے اور ان کے لیے اس باغ کے سوا رزق اور روزی کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔

اس باغ کا غور و فکر کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے۔ آپ غور کریں کہ جب اس باغ کو آگ کا بگولہ جلا کر راکھ کر دے تو اس کی اُمیدیں کس طرح رائیگاں اور بے کار ہو جائیں گی۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَکُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ﴾ (البقرہ: ۲۱۹)

''اس طرح اللہ تمھارے لیے کھول کر آیات بیان کرتا ہے، تاکہ تم غوروفکر کرو۔''

یعنی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا اس مثال کو بیان کرنے کا مقصد صرف یہی ہے کہ اس کے بندے اس میں غوروفکر کریں۔

آیت میں غوروفکر کے وقت جس طرح کہ اللہ تعالیٰ ہم سے چاہتے ہیں تو ہمارے لیے اس باغ کے مالک کی اس مثال سے تشبیہ واضح ہو جاتی ہے جو اپنے صدقات میں ریا کاری اور احسان جتلانے والا ہے۔ جب قیامت کا دن ہوگا تو وہ ایک ایک نیکی کا محتاج ہوگا لیکن اس کی نیکیاں بکھرے ہوئے غبار کی طرح ہوں گی، جس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

''اس کی حالت جب اس باغ کو آگ کے بگولے نے جلا کر راکھ کر دیا'' سے مراد وہ آدمی ہے جو اپنے صدقے کو ریا کاری اور احسان جتلا کر اپنے ہاتھ سے آگ لگا کر برباد کر رہا ہے۔

جو انسان اس مثال پر غوروفکر کرتا ہے تو اس کے اندر عمل کے لیے اخلاص پیدا ہوتا ہے۔

امثال القرآن میں سے اللہ تعالیٰ نے ایک اور مثال بیان کی ہے:

﴿اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَ الْاَنْعَامُ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَ ازَّيَّنَتْ وَ ظَنَّ اَهْلُهَاۤ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَاۤ اَتٰىهَاۤ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۝﴾ (یونس : ٢٤)

''دنیا کی زندگی کی مثال تو بس اس پانی کی سی ہے جسے ہم نے آسمان سے اتارا تو اس کے ساتھ زمین سے اگنے والی چیزیں خوب مل جل گئیں، جس سے انسان اور چوپائے کھاتے ہیں، یہاں تک کہ جب زمین نے اپنی آرائش حاصل کر لی اور خوب مزین ہوگئی اور اس کے رہنے والوں نے یقین کر لیا کہ بے شک وہ اس پر قادر ہیں تو رات یا دن کو اس پر ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے اسے کٹی ہوئی کر دیا، جیسے

وہ کل تھی ہی نہیں۔ اسی طرح ہم ان لوگوں کے لیے آیات کھول کر بیان کرتے ہیں جو خوب سوچتے ہیں۔"

اس مثال میں اللہ تعالیٰ نے اس زندگی کی حقیقت بیان کی ہے، گویا کہ وہ اس زمین کی طرح ہے جو اچھے اچھے پھل اور انگوریاں اُگاتی ہے پھر اسے اچانک کوئی آفت آ پہنچے اور اسے تباہ و برباد کر دے گویا کہ وہ پھلوں اور سرسبزے سے مزین نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا يَسْتَوِي أَصْحَٰبُ النَّارِ وَأَصْحَٰبُ الْجَنَّةِ أَصْحَٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَائِزُونَ ۝ لَوْ أَنزَلْنَا هَٰذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ۝﴾

(الحشر: ٢٠، ٢١)

"آگ والے اور جنت والے برابر نہیں ہیں، جو جنت والے ہیں، وہی اصل کامیاب ہیں۔ اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے تو یقیناً تو اسے اللہ کے ڈر سے پست ہونے والا، ٹکڑے ٹکڑے ہونے والا دیکھتا اور یہ مثالیں ہیں، ہم انھیں لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں، تاکہ وہ غور و فکر کریں۔"

انسان قرآن پاک کی قوت و تاثیر پر غور کرے کہ اگر وہ پہاڑوں پر نازل ہوتا تو وہ ریزہ ریزہ ہو جاتے تو اس کے نفس پر اس کا زیادہ اثر ہونا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان میں موجود مخلوقات کی انواع و اقسام کی تعداد اپنے بندوں کے لیے بیان کی ہے اور اسی طرح اپنی صفات اور اپنے بندوں پر اپنی نعمتوں کا بطورِ انعام ذکر کیا ہے تاکہ وہ اس میں غور و فکر کریں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اللَّهُ الَّذِي رَفَعَ السَّمَٰوَٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى يُدَبِّرُ الْأَمْرَ يُفَصِّلُ الْآيَٰتِ لَعَلَّكُم بِلِقَاءِ رَبِّكُمْ تُوقِنُونَ ۝ وَهُوَ الَّذِي مَدَّ الْأَرْضَ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَٰسِيَ وَأَنْهَٰرًا وَمِن كُلِّ الثَّمَرَٰتِ جَعَلَ فِيهَا

زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ٥﴾ (الرعد: ۲، ۳)

’’اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں کو بلند کیا بغیر ستونوں کے، جنھیں تم دیکھتے ہو، پھر وہ عرش پر بلند ہوا اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کیا۔ ہر ایک ایک مقرر وقت کے لیے چل رہا ہے، وہ ہر کام کی تدبیر کرتا ہے، کھول کھول کر آیات بیان کرتا ہے، تاکہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرلو۔ اور وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ اور ندیاں بنائیں اور اس میں تمام پھلوں میں سے ایک ایک جوڑا دو، دو قسم کا بنایا، وہ رات کو دن پر اوڑھا دیتا ہے، بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو غور وفکر کرتے ہیں۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّ مِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ٥ يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَ الزَّيْتُوْنَ وَ النَّخِيْلَ وَ الْاَعْنَابَ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ٥ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَ النُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ٥ وَ مَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ٥ وَ هُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا وَ تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ٥﴾

(النمل: ۱۰ تا ۱٤)

’’وہی ہے جس نے آسمان سے کچھ پانی اتارا، تمھارے لیے اسی سے پینا ہے اور اسی سے پودے ہیں جن میں تم چراتے ہو۔ وہ تمھارے لیے اس کے ساتھ کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل اگاتا ہے۔ بے شک اس میں ان

لوگوں کے لیے یقیناً بڑی نشانی ہے جو غور و فکر کرتے ہیں۔اور اس نے تمھاری خاطر رات اور دن اور سورج اور چاند کو مسخر کر دیا اور ستارے اس کے حکم کے ساتھ مسخر ہیں۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو سمجھتے ہیں۔اور جو کچھ اس نے تمھارے لیے زمین میں پھیلا دیا ہے، جس کے رنگ مختلف ہیں، بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بڑی نشانی ہے جو نصیحت حاصل کرتے ہیں۔اور وہی ہے جس نے سمندر کو مسخر کر دیا، تا کہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس سے زینت کی چیزیں نکالو، جنھیں تم پہنتے ہو۔اور تو کشتیوں کو دیکھتا ہے، اس میں پانی کو چیرتی چلی جانے والی ہیں اور تا کہ تم اس کا کچھ فضل تلاش کرو اور تا کہ تم شکر کرو۔''

اسی طرح لوگوں کو اس بات کا بھی حکم ہے کہ ان سے پہلے جو اُمتیں گزر چکی ہیں ان کے انجام اور اسباب ہلاکت پر غور کریں اور سوچیں کہ وہ کمزور نہ تھے کہ اس عذاب کو برداشت نہ کر سکتے بلکہ بڑی بڑی قوتوں کے مالک تھے لیکن اس کے باوجود اللہ کے لشکروں کے سامنے نہ ٹھہر سکے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ○ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّ اَثَارُوا الْاَرْضَ وَ عَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ○﴾ (الروم: ۸، ۹)

''اور کیا انھوں نے اپنے دلوں میں غور نہیں کیا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور ان کے درمیان جو کچھ ہے اسے پیدا نہیں کیا مگر حق اور ایک مقرر وقت کے ساتھ اور بے شک بہت سے لوگ یقیناً اپنے رب سے ملنے ہی کے منکر ہیں۔

اور کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے۔ وہ ان سے قوت میں زیادہ سخت تھے اور انھوں نے زمین کو پھاڑا اور اسے آباد کیا اس سے زیادہ جو انھوں نے اسے آباد کیا ہے اور ان کے پاس ان کے رسول واضح دلیلیں لے کر آئے تو اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرے اور لیکن وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے۔"

سلف صالحین تفکر و تدبر کو واجب قرار دیتے تھے اور اپنے اصحاب کو اس بات کا حکم دیتے تھے۔ ابو سلیمان درانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اپنی آنکھوں کو رونے کا اور دل کو غور و فکر کرنے کا عادی بناؤ۔" [1]

تفکر کی اقسام اور اس کا دائرہ کار

بلاشبہ تفکر کی حدود و قیود ہیں جنہیں اپنانا مسلمانوں پر فرض ہے۔ اور وہ کبھی بھی غور و فکر میں بہت زیادہ دُور نہ نکل جائے یعنی غلو نہ کرے۔ مسلمان کے لیے یہ بات بھی ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کی کیفیت میں غور و فکر نہ کرے۔

سیّدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((تَفَكَّرُوْا فِيْ آلاءِ اللّٰهِ وَلَا تَفَكَّرُوْا فِي اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ .)) [2]

"اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر غور و فکر کرو اور اللہ تعالیٰ کی ذات میں غور و فکر نہ کرو۔"

سیّدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

"ہر چیز میں غور و فکر کرو لیکن اللہ کی ذات میں غور و فکر نہ کرو۔" [3]

اگر انسان کے دل و دماغ میں ایسے افکار اور سوچیں جگہ پکڑ لیں تو وہ فوراً ان سے رُک جائے۔ اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرے اور اپنی سوچ دوسرے کاموں میں مرکوز کر دے۔

---

[1] حلية الاولياء: ٩/ ٢٧٤.
[2] المعجم الكبير: ١١/ ٣١٣، ح: ٦٨٣.
[3] الابانة لابن بطة: ١٠٨

رہا اللہ تعالیٰ کے ناموں اور اسماء پر کیفیت کے بغیر غوروفکر تو اس کام کا حکم دیا گیا ہے۔
مثال کے طور پر جو آدمی یہ سوچ لے کہ اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے، اللہ تعالیٰ ہر معاملے پر نگران اور اس سے واقف ہے تو یہ چیز اس کے لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے خوف کا باعث اور نافرمانی سے کوسوں دُور ہو جانے کا باعث ہوگی۔

بعض اوقات انسان ایسی اشیاء کے متعلق غوروفکر کرتا اور سوچتا ہے جس کا نہ کوئی دنیوی فائدہ ہے اور نہ اخروی، مثلاً وہ کسی کھلاڑی کے متعلق سوچتا ہے کہ اس کا کھیل کے میدان میں کیا تجربہ ہے۔ فلاں گلوکار کے گانے کا کیا سٹائل ہے۔ فلاں اداکار کی فلمیں کس طرح ہٹ ہو رہی ہیں اور مسلسل ریکارڈ بزنس کر رہی ہیں۔ اس طرح جب وہ کسی نا آشنا عورت کو دیکھتا ہے تو اس کے حسن و جمال پر غوروفکر شروع کر دیتا ہے، اس کی عقل محو ہو جاتی ہے اور دل ہر وقت اسی کے متعلق سوچتا ہے۔

اس طرح کی سوچ اور فکر افعال مذمومہ ہیں کیونکہ ان کا کوئی دنیوی فائدہ ہے اور نہ اُخروی۔ سب سے بہتر سوچ اور فکر وہ ہے جو آدمی کے لیے حقیقی ثمرات اور فوائد کا باعث ہو۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''معروف قاعدہ ہے: نیکی اور شر کی اصل بنیاد غوروفکر ہے کیونکہ زہد و ورع، ترک منہیات، محبت اور بغض کے ارادے اور طلب میں مبدا تفکر و تدبر ہی ہے۔''

سب سے بہترین اور نفع مند سوچ اور فکر:

- ❀ اخروی مفادات پر غوروفکر
- ❀ اخروی مفادات کے حصول کے طریقے
- ❀ اخروی مفاسد پر غوروفکر
- ❀ اخروی مفاسد سے بچنے کے طریقے

یہ چاروں افکار سب سے اعلیٰ اور عظیم المرتبت افکار ہیں اور ان کے ساتھ مزید درج ذیل چار بھی شامل ہیں:

❀ دنیوی مفادات پر غور و فکر

❀ دنیوی مفادات و منافع کے حصول کے طریقے

❀ دنیوی مفاسد پر غور

❀ دنیوی مفاسد سے احتراز اور بچنے کے طریقے

ان آٹھ اقسام پر عقلاء کے افکار کا دار و مدار ہے۔

پہلی قسم: ......اللہ تعالیٰ کے احسانات اور نعمتوں، اس کے حکم اور نہی اور انہیں جاننے کے طریقے، اللہ کے اسماء و صفات جو کتاب و سنت وغیرہ سے ثابت ہیں پر غور اور فکر پر مشتمل ہے۔ [1]

اس کا دائرہ کار اور مجالات کیا ہے جن پر غور و فکر انسان کے لیے ممکن ہو تا کہ وہ اصل فوائد اور ثمرات تک پہنچ سکے۔

اور وہ کون سی اشیاء ہیں کہ جن میں مسلمان اپنی عقل اور دل کو بروئے کار لا کر کسی نتیجے اور فائدے تک پہنچ سکے۔

نفس پر تفکر و تدبر:

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے نفس پر غور و فکر کا حکم اور ترغیب دی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی مذمت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ﴾ (الروم: ۸)

''اور کیا انھوں نے اپنے دلوں میں غور نہیں کیا۔''

اپنے نفس (پورے جسم) پر غور و فکر کرنا دوسری مخلوقات پر غور و فکر سے زیادہ مناسب ہے چونکہ انسان اپنے نفس کے سب سے زیادہ قریب ہے اور اس کے احوال سے دوسروں کے احوال کی نسبت زیادہ واقف ہے۔ جس شخص نے اپنی ذات پر غور کیا اور اس کی صفات کے متعلق سوچا تو اس کے لیے عجیب و غریب فاطر اور نشانیاں ظاہر ہوں گی بلکہ جس نے اپنے

[1] الفوائد: ۱۹۸۔

نفس کو پہچان لیا گویا اس نے اپنے رب کی عظمت کو پہچان لیا۔

نفس پر غور و فکر درج ذیل اُمور پر مشتمل ہے:

۱۔ اس کیفیت پر غور و فکر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے، یہ جسم کس طرح پیدا کیا؟ اور اس کو کس طرح ترتیب دیا؟ کس طرح اس میں قوت سماعت اور قوت بصارت کو رکھ دیا؟

۲۔ اس نفس میں جو خرابیاں ہیں ان پر تفکر بہت اہم کام ہے، کیونکہ انسان اپنے نفس کو درست اور اس کے عیوب کو تب ہی ٹھیک کر سکتا ہے جب وہ ان پر غور و فکر کرے گا، جب انسان کی فکر درست ہو گی تو وہ نفس کے عیب پہچان لے گا اور غلطیاں خود بخود نمایاں ہو جائیں گی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ضروری ہے کہ ایسی بات سے گریز کرے جس کی وجہ سے خطا میں پڑنے کا اندیشہ ہو۔

۳۔ بیوی بچے اور خاندان پر غور و فکر۔

اللہ تعالیٰ نے ہمارے نفسوں کے جوڑے بنائے ہیں، ہماری پشتوں سے ہمارے بیٹوں کو پیدا کیا ہے، اسی طرح ہم بھی اپنے والدین کا جزو ہیں۔ ان تمام احوال پر غور و فکر کہ یہ نفس کا کس طرح جزو ہیں؟ انسان ان تمام احوال و اعمال پر غور و فکر کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ ان کی اصلاح کے لیے کون سا مناسب طریقہ ہے؟

زمین و آسمان کی تخلیق اور ان میں رونما ہونے والی تبدیلیوں پر غور و فکر:

بے شک اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں عجیب و غریب نشانیاں ہیں جو اللہ کی حکمت، قدرت اور جلالت پر دلالت کرتی ہیں جو دیکھنے والوں اور غور و فکر کرنے والوں کو حیران کر دیتی ہیں۔

لوگ زمین و آسمان کی تخلیق اور اس کے عجائب پر کیوں تفکر کریں؟ ابن سعدی رحمہ اللہ اس سوال کا جواب یوں دیتے ہیں:

> ''ان کی تخلیق کا جو مقصد ہے انہیں اس کا پتہ چل جائے، اور اس بات پر بھی دلالت ہے کہ تفکر اولیاء اللہ کی صفات میں سے ہے۔ جب وہ ان چیزوں پر غور و

فکر کرتے ہیں تو اس بات سے آگاہ ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بے کار پیدا نہیں کیا۔ اور زبان حال سے یوں پکار اُٹھتے ہیں:

﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ﴾ (آل عمران: ١٩١)

''اے ہمارے رب! تو نے یہ بے مقصد پیدا نہیں کیا، تو پاک ہے۔''❶

انسان کے لیے ضروری ہے کہ سائنسی و ٹیکنالوجی کے علوم سے غور و فکر کے میدان میں مستفید ہو۔ کتنی ہی مخلوقات ہیں جن سے ہمارے اسلاف واقف اور آگاہ نہیں ہوئے، ان کا وجود آج ظاہر ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۝﴾ (النمل: ٨)

''اور وہ پیدا کرے گا جو تم نہیں جانتے۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ ایسی ایسی مخلوقات پیدا کرتا ہے جو سمندر کی تہ میں، پہاڑوں کی غاروں میں اور آسمانوں کے کناروں میں ہیں لیکن وہ ہمارے علم کی دسترس سے باہر ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ۝﴾ (يٰس: ٣٦)

''پاک ہے وہ جس نے سب کے سب جوڑے پیدا کیے ان چیزوں سے جنھیں زمین اگاتی ہے اور خود ان سے اور ان چیزوں سے جنھیں وہ نہیں جانتے۔''

اللہ کی نعمتوں پر غور و فکر:

یہ غور و فکر کے دائرہ کار میں سے بہت اہم ہے۔ جب مسلمان اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر غور و فکر کرتا ہے تو لا محالہ جو رزق اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کیا ہے اس پر تفکر و تدبر کرتا ہے، اور اس کی بیوی جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کا جیون ساتھی بنایا حالانکہ اس سے پہلے وہ اسے نہیں جانتا تھا تو وہ لوگوں میں سے اس کے سب سے زیادہ قریب ہوگئی۔ اس طرح اس امن و امان پر غور

❶ تيسير الكريم الرحمن: ١٦١.

جو اللہ تعالیٰ نے بالخصوص اسے عطا کیا ہے حالانکہ وہ اپنے ماحول میں خودکش دھماکوں، بم بلاسٹ اور قتل و غارت کے حوادث کے متعلق سنتا رہتا ہے۔

دُنیا و آخرت پر غور و فکر:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ﴾ (البقره: ۲۱۹، ۲۲۰)

''تاکہ تم غور و فکر کرو۔ دنیا اور آخرت کے بارے میں۔''

ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''دُنیا کے زوال و فنا اور آخرت کے دوام و بقا پر غور و فکر۔''[1]

امام قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''تاکہ تم دنیا اور آخرت پر غور و فکر کرو تو دنیا پر آخرت کو جو فضیلت اور برتری حاصل ہے اسے پہچان لو گے۔''[2]

تفکر میں نہایت احتیاط و احتراز کی ضرورت ہے:

اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿عَلٰۤى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَ نُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (الواقعه: ٦١)

''اس بات سے کہ تمھاری جگہ تمھارے جیسے اور لوگ لے آئیں اور نئے سرے سے تمھیں ایسی صورت میں پیدا کر دیں جو تم نہیں جانتے۔''

یہ آیت کریمہ دلالت کرتی ہے کہ انسان کی تخلیق میں کچھ ایسی چیزیں بھی ہیں جو آدمی پر مخفی ہیں اور ان کی معرفت ممکن نہیں ہے۔ ہمارے لیے ان اُمور میں اپنا قیمتی وقت برباد کرنا جائز نہیں ہے۔ مخلوقات میں غور و فکر کے اعتبار سے اسلامی نظر اور مغربی نظر میں یہی فرق ہے۔ واقعات نظر تجربہ اور ہر چیز کی معرفت سے ممکن ہے۔

اسلامی نظر کا یوں اقرار کیا جاتا ہے کہ کچھ اشیاء ہیں جن کی معرفت ممکن نہیں اور کچھ

[1] تفسیر الطبری: ۳٦۹/۲.   [2] تفسیر الطبری: ۳٦۹/۲.

حدود و قیود ہیں جن سے تجاوز کرنا جائز نہیں، مثلاً روح کے متعلق ابحاث۔ یہ وہ بحثیں ہیں جن میں غیر مسلم اپنا بہت وقت ضائع کرتے ہیں۔ اگر انہیں پتا چل جائے کہ اللہ تعالیٰ نے روح کے اسرار و غموض صرف اپنے پاس رکھے ہیں تو وہ ان ابحاث کو چھوڑ دیں جنھوں نے ان کے اموال اور بے شمار وسائل کو ضائع اور برباد کر دیا ہے بلکہ ان کے اعتقاد میں بہت سے شکوک وشبہات داخل ہو چکے ہیں، یہ انہیں بھی ترک کر دیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ط قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝﴾ (بنی اسرائیل : ۸۵)

’’اور وہ تجھ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دے روح میرے رب کے حکم سے ہے اور تمھیں علم میں سے بہت تھوڑے کے سوا نہیں دیا گیا۔‘‘

بہت سے پوشیدہ جہاں ایسے بھی ہیں جن کی حقیقت مادی (دنیوی) علم کے ذریعے نہیں کھل سکتی، جیسے فرشتوں کا جہاں، جنات کا جہاں وغیرہ۔ یہ وہ اُمور ہیں جن کی بنا پر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اپنی فکر کو شریعت میں موجود حدود و قیود کے تابع کر دے اور ان سے تجاوز نہ کرے۔ ان کا تعلق غیب سے ہے۔ غور و فکر اور تجربات سے ان کی حقیقت منکشف نہیں ہو سکتی۔

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’یہ انسان جس کی تخلیق نطفہ سے ہے، میں بہت سی نشانیاں ہیں اور تیرے ہاں سب سے زیادہ قریب تیرا نفس ہے، اس نفس میں بہت سے عجائب و غرائب ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عظمت پر دلالت کرتے ہیں۔ اس پر غور و فکر کرنے سے عمر کا دسواں حصہ بھی ختم نہیں ہو گا جب کہ تو اس سے غافل ہے۔ اے شخص! جو اپنے نفس سے غافل اور نا آشنا ہے تو کس طرح دوسری چیز کی معرفت کی طمع کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں تجھے تیرے نفس پر غور و فکر کرنے کا حکم دیا ہے، فرمایا:

﴿وَفِيْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝﴾ (الذاریات : ۲۱)

''اور تمھارے نفسوں میں بھی، تو کیا تم نہیں دیکھتے؟''

تو غور کر بے شک تو ایک حقیر نطفے سے پیدا کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ۝ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ۝ مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ۝ ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ۝﴾ (عبس: ۱۷ تا ۲۰)

''مارا جائے انسان! وہ کس قدر ناشکرا ہے۔ اس نے اسے کس چیز سے پیدا کیا۔ ایک قطرے سے، اس نے اسے پیدا کیا، پس اس کا اندازہ مقرر کیا۔ پھر اس کے لیے راستہ آسان کر دیا۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ۝﴾ (الروم: ۲۰)

''اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمھیں حقیر مٹی سے پیدا کیا، پھر اچانک تم بشر ہو، جو پھیل رہے ہو۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۝﴾ (القیامة: ۳۷، ۳۸)

''کیا وہ منی کا ایک قطرہ نہیں تھا جو گرایا جاتا ہے۔ پھر وہ جما ہوا خون بنا، پھر اس نے پیدا کیا، پس درست بنا دیا۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝ فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۝﴾ (المرسلات: ۲۰ تا ۲۲)

''کیا ہم نے تمھیں ایک حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا؟ پھر ہم نے اسے ایک مضبوط ٹھکانے میں رکھا۔ ایک معلوم اندازے تک۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَوَلَمْ يَرَ الْاِنسَانُ اَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ﴾ (یٰس : ۷۷)

''اور کیا انسان نے نہیں دیکھا کہ بے شک ہم نے اسے ایک قطرے سے پیدا کیا تو اچانک وہ کھلا جھگڑنے والا ہے۔''

اسی طرح فرمایا:

﴿إِنَّا خَلَقْنَا الْاِنسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا﴾ (الدھر : ۲)

''بلاشبہ ہم نے انسان کو ایک ملے جلے قطرے سے پیدا کیا، ہم اسے آزماتے ہیں، سو ہم نے اسے خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا بنا دیا۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے اس کیفیت کو ذکر کیا کہ اس نے کس طرح نطفہ کو علقہ، علقہ کو مضغہ اور مضغہ کو ہڈیاں بنا دیا:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَأْنٰهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ ۝﴾ (المؤمنون : ۱۲ تا ۱۴)

''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے انسان کو حقیر مٹی کے ایک خلاصے سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے اسے ایک قطرہ بنا کر ایک محفوظ ٹھکانے میں رکھا۔ پھر ہم نے اس قطرے کو ایک جما ہوا خون بنایا، پھر ہم نے اس جمے ہوئے خون کو ایک بوٹی بنایا، پھر ہم نے اس بوٹی کو ہڈیاں بنایا، پھر ہم نے ان ہڈیوں کو کچھ گوشت پہنایا، پھر ہم نے اسے ایک اور صورت میں پیدا کر دیا، سو بہت برکت والا ہے اللہ جو پیدا کرنے والوں میں سب سے اچھا ہے۔''

قرآن پاک میں ﴿النطفة﴾ کا بار بار ذکر اس لیے نہیں کہ اس لفظ کو سن لیا جائے اور اس کے معنی میں تفکر و تدبر کو چھوڑ دیا جائے۔

اب آپ نطفہ کو دیکھیں کہ یہ نجس پانی کا ایک قطرہ ہے اگر اسے ایک لمحہ کے لیے کھلی فضا میں چھوڑ دیا جائے تو اس کی ہیئت بدل جاتی ہے اور گل سڑ جاتا ہے، لیکن رب الارباب نے کس طرح پیٹھ اور پسلیوں کے درمیان سے نکالا، کس طرح مذکر و مؤنث کو جمع کر کے ان کے دلوں میں محبت و اُلفت ڈال دی۔

کس طرح محبت اور شہوت کے اجتماع میں ان کی رہنمائی کی۔

کس طرح آدمی سے حرکت کی روئداد کی بدولت نطفہ نکالا۔

کس طرح باریک رگوں سے حیض کا خون کھینچا اور اس کو رحم میں جمع کر دیا۔

پھر کس طرح نطفہ سے بچہ پیدا کیا اور اس کو حیض سے پانی اور غذا کس طرح پہنچائی کہ اس نے نمو پائی اور بڑا ہو گیا۔

اور سفید نطفہ کو کس طرح سرخ جما ہوا خون بنا دیا۔

پھر جمع ہوئے خون کو لوتھڑا بنا دیا، پھر لوتھڑے کو مختلف اجزاء جو برابر اور ایک دوسرے کے مشابہ ہیں جیسے ہڈیاں، اعصاب، رگیں، انتڑیاں اور گوشت وغیرہ۔

پھر گوشت، اعصاب اور رگوں سے اعضاء کو جوڑ دیا، پھر سر کو گول بنایا، آنکھ، کان، ناک، منہ اور دوسرے اعضاء کو بنا دیا۔ پھر ہاتھ اور پاؤں کو لمبائی کی شکل میں ترتیب دیا اور ان کے کناروں پر انگلیوں کو جوڑ دیا اور انگلیوں کو پوروں کی شکل میں تقسیم کر دیا۔ پھر باطنی اعضاء جیسے دل، معدہ، جگر، تلی، پھیپھڑے، رحم، مثانہ، انتڑیاں گویا ہر چیز کی مخصوص شکل، مقدار اور مخصوص عمل ہے اور کمال طریقے سے انہیں اللہ نے ترتیب دیا ہے۔

پھر ہر عضو کی کئی ایک اقسام ہیں، آنکھ کی ترکیبات سات درجات میں ہے اور ہر طبقے کی مخصوص کیفیت اور مخصوص کام ہے۔ اگر ان میں سے ایک درجہ بھی کم کر دیا جائے یا زائل ہو جائے تو آنکھ کی بصارت ختم ہو جاتی ہے۔

پھر آپ ہڈیوں پر غور وفکر کریں یہ ٹھوس اور مضبوط اجسام میں سے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں نہایت باریک اور کمزور نطفے سے پیدا کیا۔ پھر انہیں بدن کی مضبوطی کا ذریعہ بنا دیا۔ پھر انہیں مختلف اشکال اور مختلف اندازے سے بنایا۔ان میں سے بعض چھوٹے، بڑے، لمبے، گول، پیٹ والے، ٹھوس، چوڑے اور باریک ہیں۔ جب انسان کو تمام بدن کے ساتھ اور بعض اجزاء کے ساتھ ہلنے جلنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو اس وقت ایک ہڈی نہیں بلکہ بہت ساری ہڈیاں جن میں جوڑ ہیں، کے ساتھ حرکت کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ ہر ایک کی شکل وصورت مطلوبہ حرکت کے موافق ہے، پھر جوڑوں کو تندیوں کے ذریعے ہڈیوں کے ساتھ جوڑا ہوا ہے۔بعض ہڈیوں کے کنارے باہر نکلے ہوئے ہیں، بعض میں گڑھے بنے ہوئے ہیں جو باہر نکلی ہوئی ہیں۔ یہ گڑھے ان کے موافق ہیں تاکہ یہ ایک دوسرے میں داخل ہوسکیں تو اب آدمی اس پوزیشن میں ہے کہ اگر جسم کے کسی ایک جزو کو حرکت دینا چاہے تو اس کے لیے ممکن ہے۔ اگر یہ جوڑ نہ ہوتے تو وہ یہ کام نہ کر پاتا۔

پھر آپ سر کی ہڈیوں پر غور وفکر کریں کہ اللہ تعالیٰ نے کیسے ان کی تخلیق کی اور کس طرح ان کو جمع اور ترتیب دی اور اس نے پچاس مختلف شکل وصورت والی ہڈیوں کو جوڑا، پھر ان کو ایک دوسرے سے اس طرح جوڑا کہ سر فٹ بال کی طرح برابر ہو گیا جس کا آپ روزانہ مشاہدہ کرتے ہیں۔ ہڈیوں کی تعداد بیان کرنے کا مقصد صرف ان کی گنتی نہیں ہے، یہ علم تو آپ کو اطباء سے بھی مل جائے گا بلکہ مقصد یہ ہے کہ انسان ان کی تدبیر اور تخلیق پر غور کرے کہ یہ کتنی شاندار ہے اور ہڈیوں کی شکلیں، مقدار مختلف ہے اور تعداد متعین ہے۔ اگر ایک ہڈی بھی زائد ہو جائے تو انسان کے لیے وبال جان بن جائے اور وہ اس کے اکھاڑنے کا محتاج ہو جاتا ہے۔ اگر ایک بھی ٹوٹ جائے تو اس وجہ سے اس کو جوڑنے کا محتاج ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اور طبیب صرف اس لحاظ سے غور وفکر کرتا ہے کہ اس کو جوڑنا کس طرح ہے جب کہ اہل بصیرت اس لحاظ سے دیکھتے ہیں کہ وہ اس کے خالق اور خوبصورت شکل دینے والے کی جلالت و عظمت پر غور وفکر کریں۔ اہل بصیرت اور ڈاکٹر وطبیب کے دیکھنے میں یہی فرق ہے۔

اسی طرح اعصاب، ہڈیوں اور شریانوں کی تعداد اور ان کی بڑھوتری پر غور و فکر کرنا چاہیے۔اب انسان کی ظاہری وضع قطع اور صفات پر غور و فکر کریں تو آپ کو ان تمام میں اللہ کی قدرت کے عجائب اور کاریگری نظر آئے گی اور یہ سارا کام اللہ تعالیٰ نے پانی کے ایک قطرے سے کیا ہے،تو آپ غور کریں جس ذات نے ایک قطرے سے یہ کاریگری انجام دی تو زمین و آسمان میں اس کی کیا کیا قدرتیں اور کاریگری ہو گی۔

اب دُنیا میں انسانوں کی مختلف طبائع، شکلیں، تعداد، قبائل کی شکل میں، علیحدہ علیحدہ، مشرق و مغرب میں بسی ہیں۔ اس حکمت پر بھی غور کرنا چاہیے۔ آپ یہ مت خیال کیجیے کہ آسمان و زمین میں اس کی ملکیت میں ایک ذرہ بھی اس کی حکمت سے خالی ہو گا بلکہ یہ پُر حکمت تخلیق اور کاریگری ہے اور انسانی بدن بے شمار عجائب کا مجموعہ ہے بلکہ زمین میں جو کچھ ہے اس کی اور آسمانوں کے عجائب۔ کے درمیان کوئی نسبت نہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ءَ اَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنَاهَا﴾ (النازعات : ۲۷)

’’کیا پیدا کرنے میں تم زیادہ مشکل ہو یا آسمان؟ اس نے اسے بنایا۔‘‘

﴿لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (المؤمن : ۵۷)

’’یقیناً آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا لوگوں کے پیدا کرنے سے زیادہ بڑا (کام) ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔‘‘

اب آپ دوبارہ نطفہ پر غور کریں اور اس کی جو پہلی حالت تھی اس کا تصور کریں اور دوسری حالت میں کس طرح تبدیل ہو گیا اس پر تدبر کریں، آپ غور کیجیے کہ اگر جن و انس نطفہ میں سماعت، بصارت، عقل، قدرت، علم، روح یا ہڈی، جوڑ، گوشت یا بال پیدا کرنا چاہیں تو کیا وہ اس کی قدرت رکھتے ہیں؟ ہرگز نہیں، بلکہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے کے بعد وہ اس کی حقیقت اور تخلیق کی کیفیت کی تہ تک پہنچنا چاہیں تو اس سے عاجز آ جائیں۔

اگر آپ دیوار پر لگی انسان کی تصویر پر غور کریں تو آپ محسوس کریں گے کہ تصویر میں

نین نقش انسانی صورت کے قریب قریب ہیں۔ اس تصویر کو دیکھنے والا بے اختیار پکار اُٹھے گا کہ یہ انسان ہے۔ آپ اس تصویر بنانے والے کی مصوری پر تعجب کریں گے کہ کس طرح کانوں کی لو، ہاتھوں کی انگلیاں اور تمام اعضاء میں کیسی کاریگری ہے اور آپ کے دل میں اس کی عظمت بڑھ جائے گی باوجود اس کے کہ آپ جانتے ہیں کہ یہ تصویر رنگ (کلر)، قلم اور ہاتھ کے ساتھ مکمل ہوئی ہے اور یہ چیز مصور کا کام یا اس کی تخلیق نہیں ہے بلکہ کسی اور کی تخلیق ہے اور رنگوں دیوار کے مجموعے سے ایک مخصوص ترتیب ہے۔ تو آپ کا تعجب مزید بڑھ جائے گا جب آپ حقیر نطفے پر غور و فکر کریں گے جس کا وجود ناپید تھا تو اس کے خالق نے اسے پیٹھ اور پسلیوں کے درمیان سے پیدا کر دیا۔ پھر اس سے نہایت خوبصورت شکل نکالی اور نہایت احسن انداز میں اس کو ترتیب دیا۔ پھر اسے شان دار تصویر میں ڈھال دیا۔ اس کے ملتے جلتے اجزاء کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا۔ حمل ہی میں ہڈیوں کو بنایا، اعضاء کو خوبصورت شکل دی، اس کے ظاہر و باطن کو زینت بخشی، وریدوں اور اعصاب کو ترتیب دیا اور اس کی بقا کے لیے غذا کا نظام جاری کیا۔

پھر اس نفس کو سننے دیکھنے، جاننے اور بولنے کی قوت بخشی اور ریڑھ کی ہڈی بنائی۔ جو بدن کی اساس اور بنیاد ہے۔ پیٹ غذائی آلات پر مشتمل ہے اور سر حواس کا مجموعہ ہے۔

پھر آپ تین اندھیروں میں موجود جنین پر غور و فکر کریں۔ اگر اللہ تعالیٰ ان پردوں کو ختم کر دے تو آنکھ مادۂ رحم میں موجود تصویر و تخلیط کی ہر ہر چیز کو سوائے اس تصویر کے خالق اور آلات کے دیکھ لیتی۔ کیا آپ نے ایسا کوئی مصور اور فاعل دیکھا جو آلات کی مدد کے بغیر کوئی شاہکار میدان میں لائے۔ لیکن یہ صرف اور صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات ہے جو بہت بلند و بالا ہے اور اس کے برہان و دلائل بہت واضح اور بلیغ ہیں۔

پھر اس کی اتمام رحمت کی کمال قدرت دیکھیے کہ بچہ جب بڑا ہوا تو اس پر رحم مادر تنگ ہو گیا تو اسے کس طرح راستے کی رہنمائی کی، یہاں تک کہ وہ بچہ اُلٹ پلٹ ہوا اور خروج کے لیے حرکت کی اور اس تنگ جگہ (رحم) سے نکل آیا۔ اس عاقل و بصیر کی طرح جو راستے سے

واقف ہو۔

جب رحم مادر سے باہر آ گیا تو اسے غذا کی ضرورت محسوس ہوئی ، اس خالق نے کس طرح چھاتی کی طرف رہنمائی کی۔

جب اس کا بدن نہایت کمزور اور دبلا پتلا تھا اور کثیف غذاؤں کا متحمل نہ تھا تو اس کے لیے کس طرح دودھ نکالا جو گوبر اور خون کے درمیان سے بالکل خالص اور حلق سے بآسانی اُتر جانے والا ہے۔ کس طرح پستان کو بنایا اور اس میں دودھ جمع کر دیا اور پستانوں پر دو سر پستان بنا دیے جن کی بناوٹ بچے کے منہ کے لحاظ سے ہے۔ یعنی پستان کی نوک کی مقدار بچے کے منہ کے کھلنے کے برابر ہے۔ پھر پستان کی نوک میں نہایت باریک اور تنگ سوراخ بنایا جس سے دودھ مسلسل چوسنے کے بعد نکلتا ہے۔ بچہ اس کی بہت کم طاقت رکھتا ہے، پھر کس طرح اس کو چوسنا سکھایا کہ سخت بھوک میں وہ اس کو چوستا ہے اور اس تنگ سوراخ سے کس طرح دودھ نکلتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت، نرمی اور شفقت ملاحظہ کیجیے کہ دو سال پورے ہونے تک دانتوں کی تخلیق کو مؤخر رکھا کیونکہ ان دو سالوں میں اس کی غذا دودھ ہوتی ہے اور اسے دانتوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جب وہ بڑا ہو جاتا ہے تو دودھ جیسی کمزور غذا اس کے غیر موافق ہو جاتی ہے اور اسے بھاری غذا کی ضرورت ہوتی ہے اور کھانے کو چبانے اور پیسنے کی ضرورت ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے ضرورت کے وقت دانت اُگا دیے۔ نہ انہیں ضرورت سے پہلے اُگایا اور نہ بعد میں بلکہ عین وقت پر پیدا کیا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کس طرح ان نوک دار ہڈیوں کو موتیوں کی شکل میں نہایت ترتیب سے پیدا کیا۔ پھر والدین کے دلوں کو اس کے قیام (یعنی تمام مسائل کی تدبیر) کے لیے محبت سے بھر دیا اور یہ اس وقت میں جب وہ بذاتِ خود کوئی کام سرانجام دینے سے عاجز ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو رحمت سے نہ بھرتا تو بچہ بذاتِ خود اپنی پرورش کرنے سے عاجز ہوتا۔ پھر دیکھیے اس کو کس طرح رزق دیا، قدرت، تمیز، عقل اور ہدایت درجہ بدرجہ عطا کی ، یہاں تک کہ وہ مختلف ادوار سے گزر کر بالغ ہو گیا۔ پھر جوانی کی پہلی سٹیج کو پہنچا پھر مکمل نوجوان ہو گیا۔ پھر اس کی عمر ڈھلنے لگی، پھر وہ

بوڑھا ہو گیا۔ یا تو وہ ناشکرا ہوتا ہے یا قدر دان، فرماں بردار یا نافرمان مومن یا کافر۔ اس بات کی تصدیق اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے بھی ہوتی ہے:

﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ○ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ○ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ○﴾ (الدھر: ۱ تا ۳)

''کیا انسان پر زمانے میں سے کوئی ایسا وقت گزرا ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز نہیں تھا جس کا (کہیں) ذکر ہوا ہو؟ بلاشبہ ہم نے انسان کو ایک ملے جلے قطرے سے پیدا کیا، ہم اسے آزماتے ہیں، سو ہم نے اسے خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا بنا دیا۔ بلاشبہ ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، خواہ وہ شکر کرنے والا بنے اور خواہ ناشکرا۔''

جب آپ نے اپنے نفس کے متعلق غور و فکر کا راستہ جان لیا تو اب زمین پر غور کریں جو آپ کا ٹھکانا ہے، پھر اس میں جاری نہروں، پہاڑوں اور معدنیات پر غور کیجیے۔

زمین کی بنجر حالت پر غور کیجیے کہ جب اللہ تعالیٰ اس پر بارش نازل کرتا ہے تو وہ لہلاتی ہے، اُبھرتی ہے، سرسبز ہو جاتی ہے اور مختلف اقسام کی انگوریاں اُگاتی ہے جس سے طرح طرح کے حیوانات سیراب ہوتے ہیں۔ پھر آپ زمین کی مختلف جوانب میں مضبوط، سخت اور ٹھوس پہاڑوں پر نگاہ دوڑائیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے نیچے پانی کو کس طرح پیدا کر دیا ہے جن سے چشمے پھوٹتے ہیں۔ جن کی بدولت نہریں جاری ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خشک پتھر اور میلی مٹی سے صاف، میٹھا اور پیاس بجھانے والا پانی نکالا ہے اور اس کے ذریعے سے ہر چیز کو زندہ کیا۔ مختلف قسم کے درخت اور نباتات پانی کے ذریعے سے اُگائیں، جن سے دانے، انگور، کیلے، زیتون، کھجور، انار اور بے شمار قسم کے پھل نکالے جنھیں شمار نہیں کیا جا سکتا، جن کی شکلیں، رنگ، ذائقے اور صفات الگ الگ ہیں۔ ذائقے کے اعتبار سے ہر ایک دوسرے سے بڑھ کر ہے حالانکہ انھیں ایک ہی پانی سے سیراب کیا گیا ہے اور ایک ہی زمین

سے پیدا ہوئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی عظیم المرتبت نشانیاں جو پہاڑوں کے نیچے مدفون ہیں اور بعض وہ معدنیات جوزیرزمین موجود ہیں، تمام جمادات، حیوانات اور نباتات میں کوئی نہ کوئی حکمت موجود ہے۔ کوئی بھی چیز بے کار اور لہو ولعب کے لیے نہیں بنائی گئی، بلکہ ہر چیز اللہ تعالیٰ نے اس طرح پیدا کی جو اس کے شایانِ شان ہے اور جو اس کی جلالت، کرم اور لطف کی دلیل ہے۔

پھر اس کی نشانیوں میں سے حیوانات کی مختلف اقسام ہیں، بعض وہ ہیں جو اُڑتے ہیں، بعض وہ ہیں جو چلتے ہیں دو ٹانگوں پر، بعض چار ٹانگوں پر بعض دس ٹانگوں اور بعض ایک سو سے زیادہ ٹانگوں پر چلتے ہیں جیسے کہ حشرات الارض میں اس کا مشاہدہ کیا گیا ہے۔

آپ مکڑی کے عجائب پر غور کیجیے کہ وہ اپنا گھر کس طرح بناتی ہے، اس میں غذا کس طرح جمع کرتی ہے اور پھر کس طرح ذخیرہ کرتی ہے، اور اپنے گھر کی تعمیر کس قدر ذہانت اور کاریگری کے ساتھ کرتی ہے۔

آپ مکڑی کے اس گھر پر غور کریں جو نہر کے کنارے تعمیر کرتی ہے۔ سب سے پہلے دو متقارب جگہوں کا انتخاب کرتی ہے جن کے درمیان ایک ذراع یا اس سے زیادہ فاصلہ ہوتا ہے پھر وہ دونوں جانب کو ایک دھاگے سے ملاتی ہے، پھر وہ ایک جانب لعاب ڈالنا شروع ہوتی ہے تاکہ دونوں جوانب آپس میں مل جائیں، پھر وہ دوسری جانب ایک دھاگا ملاتی ہے، پھر مسلسل دوسرا، تیسرا، پھر پے در پے ایک مناسب مقدار اور نہایت کاریگری سے بنتی ہے، یہاں تک کہ وہ دھاگوں کو رسیوں کی طرح مضبوطی سے باندھتی ہے اور نہایت مہارت سے جوڑتی ہے۔ آپ اس کام میں یکسانیت اور عجیب کاریگری ملاحظہ کریں گے۔ مکڑی ایسا جال بنتی ہے جس میں کھٹمل اور مکھی وغیرہ پھنس جاتے ہیں اور خود ایک کونے میں گھات لگا کر شکار کے پھنسنے کا انتظار کرتی ہے۔ جب شکار پھنس جاتا ہے تو اسے پکڑنے اور کھانے میں جلدی کرتی ہے۔ جب جالے میں شکار نہ پھنسے تو وہ اپنے گھر کی دیوار کی ایک جانب اسی طرح بیٹھتی ہے کہ وہاں ایک نئی تار نکال کر مناسب طریقے سے دونوں جانب ملا دیتی ہے۔ پھر

ایک تار کے ساتھ اپنے آپ کو فضا میں اُلٹا لٹکا دیتی ہے اور اڑتی ہوئی مکھی کا انتظار کرتی ہے، جب مکھی اُڑتے ہوئے اس کی جانب آتی ہے تو مکڑی اپنے آپ کو اس کی جانب پھینکتی ہے اور اسے پکڑ اس کی ٹانگوں پر اپنا جالا لپیٹ کر اسے مضبوطی سے باندھ کر کھا جاتی ہے۔

ہر چھوٹے بڑے حیوان میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عجیب وغریب نشانیاں ہیں جنہیں گنا اور شمار نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کے خیال میں مکڑی میں جو کاریگری ہے وہ بذاتِ خود جانتی ہے، یا اس کے وجود کی وجہ سے ہے یا کسی نے اسے سکھایا ہے؟ کیا اس کی راہ نمائی اور اسے سکھانے والا کوئی نہیں؟ کیوں نہیں، یہ صنعت سکھانے والی بابرکت ذات اللہ تعالیٰ ہے۔

انسان بھی یہ کام کرنے سے ضعیف اور عاجز ہے۔ بلکہ آپ ہاتھی کے وجود کا مشاہدہ کریں تو وہ بھی یہ کام انجام دینے سے عاجز ہے۔ پھر یہ کمزور حیوان کس طرح کرتا ہے کیا انسان اس جانور کی شکل وصورت، حرکت، صحیح راہ نمائی اور عجائب وغرائب میں اس کے بنانے والے اللہ حکیم وعلیم کی کاریگری پر غور نہیں کرتا۔ قادر علیم کی تخلیق پر نگاہ نہیں دوڑاتا ، صاحب بصیرت اس چھوٹے سے حیوان میں اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی عظمت، تدبیر، کمالِ قدرت اور حکمت کو دیکھتا ہے جس میں بڑے بڑے دانش وروں اور عقل مندوں کی عقل باقی تمام حیوانات کے علاوہ حیران ہو جاتی ہے۔

یہ ایسا باب ہے جس کا احاطہ ناممکن ہے۔ حیوانات کی شکلیں، صفات اور طبائع کا شمار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جی ہاں، آپ جب بھی کوئی نیا حیوان دیکھیں گے اگرچہ وہ کیڑا مکوڑا ہو تو اس کا تعجب بڑھ جائے گا اور بے اختیار پکار اُٹھے گا۔ سبحان اللہ! کیا عجیب وغریب مخلوق ہے۔ انسان سب حیوانات سے عجیب مخلوق ہے لیکن وہ اپنے نفس کے عجائب وغرائب پر غور وفکر نہیں کرتا بلکہ جب وہ ان جانوروں کو دیکھتا ہے جو اس سے مانوس ہیں تو تعجب کرتے ہوئے کہتا ہے: ”سبحان اللہ! کیا ہی خوب مخلوق ہے۔“ [1]

---

[1] احیاء علوم الدین: ٤/ ٤٣٥، ٤٤٢.

غور و فکر کے ذرائع

تفکر کا تعلق دلی اعمال سے ہے اور درج ذیل اعمال پر عمل کرنے سے انسان غور و فکر میں منہمک ہو سکتا ہے۔

شیطان سے استعاذہ:

شیطان نے اپنے آپ سے یہ عہد کیا تھا کہ وہ جن وانس کو گمراہ کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو لشکر اور پیروکار مہیا کر دیے ہیں جو اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔ وہ انسان کو نیکی کے کاموں سے روکنے میں بہت حریص ہیں بالخصوص ایسے اعمال سے روکنے میں جن کا تعلق دل کے ساتھ ہے اور دلی اعمال میں سے ہی ایک عمل تفکر ہے۔

امام کرمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''انسان پر شیطان کے غلبہ کی علامت یہ ہے کہ انسان کا دل اللہ تعالیٰ کی نعمتوں، اس کے احسانات اور اس کا شکر ادا کرنے سے غافل ہو جائے اور انسان کی عقل غور و فکر، مراقبے اور کائنات کی تدبیر میں غور و فکر سے غافل رہتی ہے۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے ہماری رہنمائی کی ہے کہ قرآن کریم کی قراءت سے پہلے شیطان سے پناہ طلب کی جائے، کیونکہ قرآن کریم کی آیات میں غور و فکر تفکر کی اہم ترین قسم ہے اور قرآن کریم کی ابتدا سے پہلے شیطان سے پناہ مانگنا شیطان سے جو انسان کے دل میں وسوسے ڈالنے والا ہے، حقارت کی وجہ سے ہے۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''قراءت کی ابتدا میں پناہ مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ تاکہ قاری پر اس کی قراءت خلط ملط نہ ہو، اسے اشتباہ نہ پڑے اور اسے غور و فکر میں رکاوٹ نہ ہو۔''[2]

---

[1] تفسير النسفي: ٤/ ٢٢٧.

[2] تفسير ابن كثير: ٢/ ٧٧٣.

گناہوں سے دُوری:

اللہ تعالیٰ نے ہر اس انسان کو جو زمین میں تکبر کرتا ہے، اس کی آیات پر ایمان نہیں لاتا اور اس کے احکامات پر عمل نہیں کرتا اس عظیم نعمت تفکر سے محروم رکھا ہے۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ اِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ٥﴾ (الاعراف : ١٤٦)

''عنقریب میں اپنی آیات سے ان لوگوں کو پھیر دوں گا جو زمین میں حق کے بغیر بڑے بنتے ہیں اور اگر ہر نشانی دیکھ لیں تو بھی اس پر ایمان نہیں لاتے اور اگر بھلائی کا راستہ دیکھ لیں تو اسے راستہ نہیں بناتے اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھیں تو اسے راستہ بنا لیتے ہیں، یہ اس لیے کہ بے شک انھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور وہ ان سے غافل تھے۔''

امام حسن رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ ''میں ان کو اپنے امر میں غور و فکر سے منع کر دوں گا۔'' [1]

اور سب سے بڑا گناہ جو اللہ تعالیٰ کی عظمت پر غور و فکر سے مانع ہے وہ گانے بجانے کا سننا ہے۔ ابن الجوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جان لیجیے! گانا بجانا سننا دل کو اللہ تعالیٰ کی عظمت پر غور و فکر سے غافل کر دیتا ہے۔'' [2]

اے مسلمان بھائی! حرص کیجیے کہ آپ کی خواہشات قابل اعتراض نہ ہوں تاکہ آپ اس عظیم بھلائی سے محروم نہ ہوں۔

---

[1] احياء علوم الدين : ٤/ ٤٢٤.

[2] تلبيس ابليس : ٢٧٤.

قبروں کی زیارت:

قبروں کی زیارت ان اہم اعمال میں سے ہے جو دل کے غور و فکر پر معاونت کرتی ہیں۔ چنانچہ جب انسان قبر کی زیارت کرتا ہے تو آنکھ کی بصیرت سے غور و فکر کرتا ہے اور جان لیتا ہے کہ اس کا انجام آخر کار یہ گڑھا ہے پھر وہ کثرت کے ساتھ نیک اعمال کرتا ہے۔

مغیث الاسود رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"قبروں کی زیارت کرو وہ تمہیں یاد کرتی ہیں۔" ❶

غور و فکر کے فوائد

اس اُمت کے سلف صالحین نے تفکر کے بہت سے فوائد اور ثمرات کی نشان دہی کی ہے۔ وہ اپنے آپ کو اور اپنے بھائیوں کو غور و فکر پر اُبھارا کرتے تھے اور اسے اہم ترین اور افضل ترین عمل شمار کیا کرتے تھے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

"ایک گھڑی کا غور و فکر کرنا ایک رات کے قیام سے بہتر ہے۔" ❷

اسی طرح کا قول ابو الدرداء رضی اللہ عنہ ❸ اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔ ❹

ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فرمان ہے کہ "غور و فکر سے پڑھی گئی دو رکعتیں پوری رات کے قیام سے بہتر ہیں جب دل غافل ہو۔" ❺

محمد بن کعب القرظی رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ اگر میں رات سے لے کر صبح تک ﴿إِذَا زُلْزِلَتِ﴾ اور ﴿الْقَارِعَةُ﴾ پڑھتا رہوں، میں ان سے زیادہ اور کچھ نہ پڑھوں، ان کو بار بار دہراؤں اور ان پر غور و فکر کروں تو میرے نزدیک یہ زیادہ پسندیدہ ہے اس بات سے کہ میں قرآن کو تیزی سے پڑھوں۔" ❻

---

❶ احوال القبور: ۲۳۸.
❷ العظمة لأبي الشيخ: ۱/ ۳۰۲.
❸ شعب الایمان: ۱۱۸.
❹ الزهد لإمام احمد: ۲۷۲.
❺ الزهد لابن المبارك: ۲۸۸، ۱۱۴۷.
❻ الزهد لابن المبارك: ۲۸۷.

اب ذیل میں تفکر کے فوائد وثمرات نقل کیے جاتے ہیں:

عمل میں کوشش:

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یہ فکر انسان کو محبت اور معرفت عطا کرتی ہے، جب انسان آخرت، اس کے شرف اور اس کی ہمیشگی کے بارے میں سوچتا ہے اور دنیا، اس کی عارضی حیثیت اور اس کے فنا ہونے کے بارے میں سوچتا ہے تو یہ سوچ اسے آخرت کا شوق اور دنیا سے بے نیازی عطا کرتی ہے۔ انسان جب بھی وقت کی عارضی حیثیت پر غور کرتا ہے اور اُمیدیں کم رکھتا ہے تو وہ محنت اور کوشش کرتا ہے اور وقت کو غنیمت سمجھتے ہوئے اپنی تمام قوت کو خرچ کرتا ہے۔'' ❶

جناب ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فرمان ہے:

'' بھلائی کے کاموں میں غور و فکر اس بھلائی پر عمل کی دعوت دیتا ہے اور برائی پر ندامت اِسے چھوڑنے کی دعوت دیتی ہے۔'' ❷

امام قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جس نے اپنے نفس کی تخلیق پر غور کر لیا وہ پہچان لے گا کہ اس کی پیدائش کا مقصد اور جوڑوں کی نرمی کا مقصد اللہ کی عبادت ہے۔'' ❸

امام وہب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''انسان جب بھی لمبا غور و فکر کرتا ہے سمجھ کو پا لیتا ہے جب سمجھ جاتا ہے تو اس کا علم بھی حاصل کر لیتا ہے اور جب اسے علم ہو جاتا ہے تو پھر وہ عمل بھی کرتا ہے۔'' ❹

اللہ تعالیٰ کا خوف اور اس کی عظمت کا اعتراف:

بشر بن حارث رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اگر لوگ اللہ تعالیٰ کی عظمت میں غور و فکر کریں تو وہ

❶ الفوائد: ١٩٨. ❷ احياء علوم الدين: ٤/ ٤٢٥.
❸ تفسير ابن كثير: ٤/ ٢٩٧. ❹ العظمة لأبي الشيخ: ٥٦.

اللہ کی نافرمانی کا ارتکاب نہ کریں۔"

حاتم الاصم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ذکر سے محبت بڑھتی ہے اور غور و فکر سے خوف بڑھتا ہے۔"❷

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سوچ غفلت کو ختم کر دیتی ہے اور دل میں خشیت پیدا کر دیتی ہے۔❸

انسان کی اللہ سے محبت:

بندے کی اللہ تعالیٰ سے محبت اللہ کی نعمتوں میں غور و فکر سے حاصل ہوتی ہے، کیونکہ نفس کی سرشت میں شامل ہے کہ وہ اپنے سے خوبصورت سے محبت کرتا ہے۔ چنانچہ جب انسان اللہ کی نعمتوں پر غور کرے جو اللہ نے اس پر کی ہیں تو یہ سوچ اسے اللہ کی محبت تک لے جائے گی۔

ایمان میں اضافہ:

اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں غور و فکر، کائنات کی تخلیق اور آفاق و انفس میں غور و فکر ایمان میں اضافے کا سبب بنتا ہے کیونکہ یہ غور و فکر انسان کے دل میں اللہ کی قدرت کا تصور، اس کی قوت، عظمت، تدبیر، اس کی قیومیت اس کی حیات اور اس کی رحمت کے تصورات کو پختہ کرتا ہے۔

خلیفہ عبدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اگر اللہ تعالیٰ کو دیکھے بغیر اس کی عبادت نہ کی جائے تو ایک بھی بندہ اللہ کی عبادت نہ کرے۔ لیکن مومن اس کائنات پر غور و فکر کرتے ہیں وہ رات کے آ جانے میں غور و فکر کرتے ہیں کہ جب رات چھا جائے تو وہ ہر چیز کو ڈھانپ لیتی ہے اسی طرح وہ دن کے طلوع ہونے میں تدبر کرتے ہیں کہ جب وہ طلوع ہوتا ہے تو رات کی بادشاہی ختم کر دیتا ہے، اسی طرح مومن بندے بادلوں پر غور و فکر کرتے ہیں جنہیں آسمان و زمین کے درمیان مسخر کیا گیا ہے۔ ستاروں پر غور و فکر کرتے ہیں۔ گرمی اور سردی پر غور و فکر کرتے ہیں۔ اللہ کی قسم! مومن ہمیشہ

---

❶ حلیة الاولیاء: ٨/ ٣٣٧.
❷ احیاء علوم الدین: ٤/ ٤٢٥.
❸ تفسیر النسفی: ١/ ١٩٨.

اللہ کی تخلیق میں غوروفکر کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے دل کا یقین اللہ تعالیٰ پر پختہ ہوتا جاتا ہے۔“ ❶

عربی شاعر کہتا ہے:

”زمین کی نباتات پر غور کیجیے اور دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کس طریقے سے پیدا کیا ہے۔ چاندی کے چشمے جو سامنے ہے، لیکن دیکھنے میں پگھلا ہوا سونا ہے۔ زبرجد کی شاخیں (جو ایسے مشاہدات ہیں) کہ بے شک اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں۔“ ❷

نفس کے حال کی معرفت اور اس کی اصلاح کی کوشش:

انسان جب اپنے نفس پر غوروفکر کرتا ہے تو اسے اپنے عیوب اور محاسن کا پتہ چلتا ہے۔

فضیل بن عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”غوروفکر ایسا آئینہ ہے جو آپ کو آپ کی خوبیاں اور خامیاں دونوں دکھاتا ہے۔“ ❸

اور جب انسان اپنے نفس کا حال جان جاتا ہے تو وہ اپنے عیوب کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے اور اپنے محاسن میں اضافے کی کوشش کرتا ہے۔

سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”غوروفکر نور ہے جو دل میں داخل ہو جاتا ہے۔“

امام موصوف ہمیشہ مثال دیا کرتے تھے:

”جب انسان غوروفکر کرنے لگ جائے تو پھر اس کے لیے ہر چیز میں عبرت ہے۔“

اور آپ نے فرمایا:

”غوروفکر رحمت کی چابی ہے۔ کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ جس نے غوروفکر کیا وہ توبہ کر لیتا ہے۔“ ❹

غوروفکر کا بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے علم حاصل ہوتا ہے اور جب علم آ جائے تو دل کی حالت بدل جاتی ہے، انسان کے دل میں خشیت پیدا ہو جاتی ہے، حقوق اللہ میں کوتاہی کا

---

❶ الدر المنثور: ٣٤٣/٤.
❷ البداية والنهاية: ١٠/ ٢٣٥.
❸ العظيمة لأبي الشيخ: ١٣.
❹ حلية الاولياء: ٢٠٦/٧.

احساس پیدا ہو جاتا ہے اور انسان محنت اور کوشش کا شائق بن جاتا ہے۔ چنانچہ جب دل کی حالت بدل جائے تو اعمال بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ انسان کی اصلاح ہو جاتی ہے، قدر و منزلت بڑھ جاتی ہے اور اخلاق عمدہ ہو جاتے ہیں۔

مغیث بن سمی رحمہ اللہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں:

''پہلے زمانے میں ایک گناہ گار شخص تھا۔ ایک دن اس نے اپنے گزرے ہوئے ایام پر غور و فکر کرنا شروع کر دیا اور باری تعالیٰ سے دعا کی کہ ''اے اللہ! مجھے بخش دے۔'' اسی حالت میں اسے موت آ گئی اور اس کی بخشش ہو گئی۔'' [1]

اُمت مسلمہ کی ترقی:

اگر ہم مسلمانوں کے احوال کی اصلاح چاہتے ہیں تو پھر ہم پر لازم ہے کہ ہم اُمت مسلمہ کی تنزلی کے اسباب پر غور و فکر کریں۔ اپنی غلطیوں کی اصلاح کی کوشش کریں اور اپنی حالت کا سلف صالحین کی حالت کے ساتھ موازنہ کریں تاکہ ہم ان اسباب کی معرفت حاصل کریں جن کے سبب ہمارے اسلاف نے دنیا کے کونے کونے میں اسلام کا پھریرا لہرا دیا، جب کہ ہم اپنے اوپر دراز ہاتھوں سے بچنے کی کوشش میں ہیں۔

اُمت میں جو بہت بڑے مصلح اور مجددین گزرے ہیں انہوں نے بھی پہلا کام یہ کیا تھا کہ سب سے پہلے انہوں نے مسلمانوں کے حالات پر غور و فکر کیا کہ مسلمانوں سے کہاں کمی ہوئی ہے؟ خلل کہاں ہے؟ اور ترقی کی راہ میں حائل رکاوٹیں کیا ہیں؟ پھر انہوں نے مسلمانوں کے حالات کو تبدیل کرنے اور ترقی دینے کے لیے سخت جدو جہد کی اور جہالت، شرک اور گناہوں جیسی رکاوٹوں کو دُور کیا۔

کثرت علم اور معرفت کا حصول:

غور و فکر ایک ایسا سبب ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ صاحب غور و فکر کو علم و حکمت عطا کر دیتا ہے اور انسان مکمل طور پر شریعت کے فہم سے شناسا ہو جاتا ہے۔

[1] الزهد لعضاء بن السري: ۲/ ٤٦٨.

ابو درداء رضی اللہ عنہ لقمان حکیم کی صفت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان کو مال و دولت، اہل و عیال، حسب نسب اور اچھی خصلتیں وغیرہ جو بھی عطا کیا گیا اس وجہ سے دیا گیا کہ وہ خاموش طبع انسان تھے۔ بہت زیادہ غور و فکر کرنے والے اور گہری نظر رکھنے والے تھے۔ انہیں جو کچھ بھی ملا اسی وجہ سے ملا۔ ❶

امام حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''عقل مند لوگ ہمیشہ ذکر کے ساتھ غور و فکر کرتے اور غور و فکر کے ساتھ ذکر کرتے ہیں، یہاں تک کہ ان کا دل اللہ سے لگ جاتا ہے اور حکمت پر مبنی کلام کرتے ہیں۔'' ❷

ابو سلیمان دارمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''دنیا کے بارے میں غور و فکر آخرت سے پردے کا باعث بنتا ہے اور نیک لوگوں کے لیے سزا کا باعث بنتا ہے اور آخرت کے بارے میں غور و فکر کی وجہ سے انسان میں حکمت پیدا ہوتی ہے اور دل زندہ رہتے ہیں۔'' ❸

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''کلام پر خاموشی سے مدد لو۔ یعنی موقع محل کے مطابق گفتگو کرو اور استنباط کرتے وقت غور و فکر سے مدد لو۔'' ❹

اسی طرح آپ ہی کا فرمان ہے: ''چار چیزیں فضیلت والی ہیں، ان میں سے ایک حکمت ہے اور اس کی نگران فکر ہے۔ دوسری عفت و حیا ہے اور اس کی نگران شہوت پر قابو پانا ہے۔ تیسری چیز طاقت ہے اور اس کی نگران غصے پر قابو پالینا ہے اور چوتھی چیز عدل ہے اور اس کی نگران نفس کے اعضاء میں اعتدال ہے۔'' ❺

علماء نے اتنے قیمتی موتی کیسے دریافت کیے؟ انہوں نے یہ بے شمار کتب کس طرح لکھیں؟ انہوں نے تفسیر اور فقہ میں ان اقوال کا استنباط کیسے کیا؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان چیزوں کا بہت بڑا حصہ اللہ تعالیٰ کی آیات میں غور و فکر کا نتیجہ ہے اور واقعات و حوادث پر

---

❶ تفسیر ابن کثیر: ۳/ ۵۸۵.
❷ حلیة الاولیاء: ۱۰/ ۱۹.
❸ احیاء علوم الدین: ۴/ ۴۲۵.
❹ مفتاح دار السعادة: ۱/ ۱۸۰.
❺ احیاء علوم الدین: ۴/ ۴۲۵.

غور وفکر اور انہیں وحی سے مربوط کرنے کا نتیجہ ہے۔

چنانچہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ ایسے دو بھائیوں کے بارے میں بتایئے جنہوں نے دو بہنوں سے شادی کی۔ ایک بھائی سے غلطی سے دوسرے بھائی کی بیوی سے ہمبستری کر لی اور دوسرے بھائی نے غلطی سے پہلے بھائی کی بیوی سے صحبت کر لی اور انہیں صبح اس بات کا علم ہوا۔

امام صاحب نے اس مسئلے پر غور وفکر کیا اور نتیجے پر پہنچتے ہوئے فرمایا: ''اے فلاں! کیا تجھے وہ عورت پسند ہے جس سے تو نے رات گزاری؟ اس نے جواب دیا کہ ہاں۔ پھر آپ نے دوسرے سے بھی یہی دریافت فرمایا تو اس نے بھی ہاں میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا: آپ اس عورت کو طلاق دے دو جس سے آپ کا نکاح ہوا تھا، یہی بات دوسرے شخص کو بھی فرمائی اور پھر ان کا ان عورتوں کے ساتھ نکاح کر دیا۔

اسی غور وفکر کے ساتھ علماء اس قابل ہوئے کہ ان نصوص کے درمیان جمع وتطبیق دیں جن میں ظاہری طور پر تعارض نظر آتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی﴾ (الاسراء: ١٥)

''اور کوئی بوجھ اٹھانے والی (جان) کسی دوسری (جان) کا بوجھ نہیں اٹھاتی۔''

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

((اِنَّ الْمَيِّتَ يُعَذَّبُ بِبُكَاءِ اَهْلِهِ عَلَيْهِ .))

''میت کو اس کے گھر والوں کے رونے کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا۔''[1]

چنانچہ آیت قرآنی تو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انسان کو دوسروں کی غلطیوں کی سزا نہیں ملے گی جب کہ حدیث پاک کی دلالت یہ ہے کہ میت کو اس کے گھر والوں کے رونے اور نوحہ کرنے کی وجہ سے عذاب ملے گا۔

علمائے کرام نے اس مسئلے پر غور وفکر کیا اور اس قابل ہوئے کہ اس کا حل نکالیں۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب البکاء عند المریض: ١٣٠٤۔ مسلم: ٩٢٧.

فرماتے ہیں کہ جب میت نے اپنے بعد اپنے گھر والوں کو خود رونے کا حکم دیا ہو تو اس حکم کی وجہ سے اسے عذاب دیا جائے گا۔

عبادت اور غور و فکر لازم و ملزوم ہیں

سیّدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ اور اپنی خالہ سیّدہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر رات گزاری...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سوئے رہے اور جب آدھی رات ہوگئی یا اس سے کچھ پہلے یا اس کے کچھ بعد آپ بیدار ہوئے اور اپنے ہاتھوں سے اپنی نیند کو دُور کرنے کے لیے آنکھیں ملنے لگے۔ پھر آپ نے سورۂ آل عمران کی آخری دس آیات پڑھیں...... پھر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے۔ ❶

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنی نیند سے بیدار ہوتے تو ابتدا غور و فکر سے کرتے یعنی ان آیات کی تلاوت کرتے جن میں غور و فکر اور تدبر کا حکم دیا گیا ہے اور وہ سورۂ آل عمران کی آخری دس آیات ہیں۔ اور یہ وہ راستہ ہے جس پر ہر مسلمان کے لیے چلنا اور اسے اختیار کرنا فرض ہے کہ وہ غور و فکر اور عبادت کو لازم و ملزوم سمجھے، عبادت کو چھوڑ کر صرف اکیلے تفکر میں اپنا وقت ضائع نہ کرے۔

ابن العربی رحمہ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل و عمل کے متعلق کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ تم پر اپنی رحمت برسائے۔ دیکھو کہ آپ نے غور و فکر کو کس طرح اکٹھا کیا۔ پہلے مخلوقات پر غور و فکر کیا، پھر نماز کی طرف متوجہ ہوئے، یہی طریقہ مسنونہ ہے جس پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ رہا صوفیا کا طریقہ کہ ان کے بزرگ ایک دن، ایک رات یا ایک مہینا صرف غور و فکر کرتے ہیں۔ تو یہ طریقہ درست نہیں ہے اور نہ کسی بشر کے لائق ہے اور نہ ہی مسنون طریقہ ہے۔ ❷

مسلمان کے لیے ان دونوں طریقوں (غور و فکر اور عبادت) کو جمع کرنا فرض ہے۔

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الوضوء، باب القراءة القرآن بعد الحدث: ۱۸۳۔ مسلم: ۹۲۷.

❷ تفسیر القرطبی: ۴/ ۳۱۰.

صرف ایک ہی پر اکتفا نہ کرے، ایسا کرنے سے وہ سیدھے راستے سے بھٹک کر بے ڈھنگ راستے پر چلا جائے گا۔

تفکر کے معاملے میں اسلاف کا عمل

ایک مسلمان پر واجب ہے کہ وہ سلف صالحین یعنی صحابہ کرام، تابعین عظام اور قیامت تک آنے والے ان کے متبعین کی اقتداء کرے۔

ہمارے اسلاف نے غور و فکر کی اہمیت کے بارے میں ہمیں متوجہ کیا، اس پر عمل کرنے میں دوام اختیار کیا اور اسے اپنی روزمرہ زندگی کا بنیادی جزو قرار دیا۔

حضرت محمد بن واسع رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد اہل بصرہ میں سے ایک آدمی نے حضرت اُم ذرؓ کی طرف رخت سفر باندھا تا کہ ان سے حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی عبادت کے بارے سوال کرے۔ وہ آدمی حضرت اُمّ ذر کے پاس آیا اور کہا: میں آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ آپ مجھے حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی عبادت کے بارے بتائیں۔ تو انہوں نے فرمایا: وہ سارا دن عبادت اور حالت تنہائی میں غور و فکر میں مشغول رہتے۔'' [1]

عون رحمہ اللہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا ہم نے حضرت اُم درداء رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا: حضرت ابو درداء کی سب سے افضل عبادت کیا تھی؟ انہوں نے فرمایا: غور و فکر کرنا اور عبرت حاصل کرنا۔ [2]

ادھر عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کا واقعہ ملاحظہ کریں۔

وہ ایک دن سہل بن عدی کو حالت خاموشی میں متفکر دیکھ کر فرمانے لگے کہ آپ کہاں پہنچ گئے تھے؟ انہوں نے فرمایا: ''پل صراط پر۔'' [3]

ایک دن حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اپنے ساتھیوں میں بیٹھے ہوئے رونے لگے۔

---

[1] حلیة الاولیاء: ١٦٤/١.
[2] حلیة الاولیاء: ٣٠٠/٧.
[3] احیاء علوم الدین: ٤٢٥/٤.

ان سے اس بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا: میں نے دنیا، اس کی لذات اور اس کی شہوات کے بارے میں غور وفکر کیا تو میں نے یہ عبرت حاصل کی کہ یہ شہوات ختم نہیں ہوتیں، اس میں اس شخص کے لیے کوئی عبرت نہیں جو اس کو ایک مفروضہ سمجھتا ہے اس کے لیے عبرت ہے جو نصیحت حاصل کرتا ہے۔ ❶

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ ایک مجلس میں (بیٹھے ہوئے تھے) تشریف فرما تھے تو اچانک چراغ گل ہو گیا اور کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ جب ساتھیوں نے چراغ روشن کیا تو دیکھا کہ سفیان ثوری رحمہ اللہ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ آپ کو کیا ہوا؟ فرمایا: مجھے قبر کی یاد آ گئی تھی۔

شیخ ابراہیم سے پوچھا گیا: آپ بہت طویل غور وفکر کرتے ہیں۔ فرمانے لگے: غور وفکر کرنا عقل کا مغز ہے۔ ❷

ایک مرتبہ ابوشریح چلتے چلتے بیٹھ گئے اور اپنے گرد چادر لپیٹ کر رونے لگے۔ ان سے استفسار کیا گیا آپ کو کس چیز نے رُلا دیا؟ فرمایا: مجھے عمر کے گزرنے، قلت اعمال اور موت کی قربت کا خیال آ گیا تھا۔ ❸

حضرت داؤد طائی ایک چاندنی رات بیٹھے ہوئے غور وفکر کرنے لگے، پھر اسی حالت میں اٹھے اور آنکھیں اوپر کی طرف اُٹھائے ہوئے چھت پر چلنے لگے حتی کہ اپنے پڑوسی کے گھر جا گرے۔ مالک مکان بستر سے اچھلا اور اسے چور خیال کرتے ہوئے تلوار نکال لی لیکن جب دیکھا کہ یہ داؤد طائی ہیں تو پلٹ کر تلوار رکھ دی اور ان کو ہاتھ سے پکڑ کر ان کے گھر پہنچا دیا۔ پھر جب داؤد سے اس بارے دریافت کیا گیا تو فرمایا: میں ہوش وحواس میں نہیں تھا۔ ❹

امام حاتم نے فرمایا: جو کوئی قبرستان سے اس حال میں گزرا کہ غور وفکر نہ کیا اور نہ مُردوں

---

❶ تفسیر ابن کثیر: ١/ ٤٣٩.
❷ مفتاح دار السعادۃ: ١/ ١٨٠.
❸ العمر والشیب لابن أبي الدنیا: ٢٢.
❹ حلیۃ الاولیاء: ٨/ ٢٨٠.

کے لیے دعا کی تو اس نے اپنے نفس اور مردوں سے خیانت کی۔ ❶

ایک حکایت بیان کی گئی ہے کہ ایک بندے نے صلوٰۃ اللیل کے وضو کے لیے پیالہ پکڑا اور اس کے حلقے (ڈنڈی) میں اپنی انگلی داخل کر دی۔ پھر اسی حالت میں بیٹھ کر فکر و تدبر کرنے لگا یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ اس شخص سے اس بارے میں دریافت کیا گیا تو کہنے لگا: میں نے اپنی انگلی پیالے کے حلقے میں داخل کی تھی کہ مجھے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان یاد آ گیا:

﴿اِذِ الْاَغْلٰلُ فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ یُسْحَبُوْنَ۝﴾ (مومن: ۷۱)

''جب طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور زنجیریں، گھسیٹے جا رہے ہوں گے۔''

اور میں نے سوچا کہ میں کیسے اس طوق (بیڑی) کا سامنا کروں گا؟ پھر اسی سوچ اور فکر میں ساری رات بیت گئی۔ ❷

سلف میں سے کوئی بزرگ نانبائی کے تنور کے قریب سے گزرے۔ ٹھہر کر تنور میں موجود آگ کا مشاہدہ کرنے لگے، پھر ان کے آنسو بہنے لگے اور وہ بہت زیادہ روئے۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ کو کیا ہوا؟ تو فرمایا: مجھے (جہنم کی) آگ یاد آ گئی تھی۔

روایت کیا گیا ہے کہ ایک اعرابی (بدو) اپنے اونٹ پر جا رہا تھا کہ اس کا اونٹ اچانک گر کر مر گیا۔ وہ اونٹ سے اُترا اور اس کے گرد چکر لگانے لگا۔ پھر اس کے بارے میں غور و فکر کرتے ہوئے کہنے لگا: تجھے کیا ہو گیا ہے؟ تو اُٹھتا کیوں نہیں، حالانکہ تیرے اعضاء صحیح سالم ہیں؟ تیرا کیا معاملہ ہے؟ تجھے کون سی چیز اُٹھائے گی؟ تجھے کس نے پچھاڑا ہے؟ اور کس نے حرکت کرنے سے منع کیا ہے؟ پھر اس نے اسے چھوڑا اور اس کے معاملے میں غور و فکر اور تعجب کرتا ہوا چلا گیا۔ ❸

یہ اس اُمت کے سلف صالحین کا حال ہے تو کیا وہ ہمارے لیے اسوہ اور نمونہ نہیں؟

❶ العاقبة فی ذکر الموت: ١٩٥.　❷ تفسیر القرطبی: ٢٤٥/٨.
❸ تفسیر القرطبی: ٣٢١/٦.

خاتمہ

جو دل اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور اس کی نشانیوں میں غوروفکر نہیں کرتا وہ حقیقی دل ہی نہیں ہے۔ نفع مند تفکر ایسے صاحب بصیرت انسان کا تفکر ہوتا ہے جو فائدے کے حصول کا طلب گار ہو۔ جو انسان فقط حصولِ علم کے لیے ان نشانیوں میں غوروفکر کرتا ہے اور اسے علم کے بعد عمل کی کوشش نہیں کرتا تو وہ اپنے آپ پر ظلم کرنے والا ہے۔

ابو العتاہیہ نے فرمایا:

☆ ''میں نے دنیا کے نتائج و انجام کو دیکھا تو میں نے محبوب چیزوں کو خوفناک چیزوں کی خاطر ترک کر دیا۔

☆ میں نے دنیا اور اس کی جدت میں غوروفکر کیا، تو اس کی تمام جدت بوسیدہ ہوتی نظر آئی۔

☆ میں نے اکثر اہل دنیا کو پرکھا، تو تمام لوگ دنیا کے معاملے میں ہی دوڑ دھوپ کرتے نظر آئے۔

☆ عزت کے اعتبار سے دنیا کا ارفع و اعلیٰ مقام وہ ہے جو ہلاکت کے زیادہ قریب ہے۔

☆ دنیا ہمیشہ بے کیف اور اجیرن رہتی ہے اور صاحب دنیا ہمیشہ مصائب میں گرفتار رہتا ہے۔

☆ دنیاوی محاسن کے بعد اس کی برائیاں بھی آتی ہیں، اور موت کی خبر اور خوشخبری کے درمیان کوئی چیز نہیں۔

☆ میں کئی قبروں کے قریب سے گزرا، لیکن غلام اور آقا میں کوئی تمیز نہ کر پایا۔

☆ کیا تیرے خیال میں تو ان لوگوں کا شمار کر سکتا ہے جنہیں پہلے تو نے زندہ دیکھا، پھر مردہ پایا۔''

انسان پر واجب ہے کہ وہ تفکر پر دوام اختیار کرے اور طویل تفکر کرے کیونکہ یہ عمل اللہ کی رضا، انشراحِ صدر اور قلبی سکون تک پہنچانے والا ہے۔ اللہ سے خوف اور خشیت کا وارث

بنا دیتا ہے۔علم وحکمت اور بصیرت کا وارث بناتا ہےاور دلوں کوزندگی بخشتا ہے۔

پس اے انسان سوچ تو کس طرف جا رہا ہے؟ اور گزری ہوئی عمر کے بارے غوروفکر کر کیا تجھے یقین اور اُمید ہے کہ اس زندگی کے ذریعے اللہ کے عذاب سے نجات پا جائے گا، یا پھر اس زندگی کے عیوب ونقائص کے ذریعے ہلاکت و بربادی حاصل کرے گا؟

ایسے لوگوں کی طرح بے خوف اور لا پراہ ہونے سے بچ جاؤ جنہوں نے اپنے آپ کو خواہشات کا غلام بنا دیا۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دُعا گو اور سراپا التجا ہیں کہ ہمیں ان لوگوں میں شامل کر دے جو غوروفکر کرتے ہیں، عقل وشعور رکھتے ہیں اور تدبر سے کام لیتے ہیں۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ .

اپنے فہم وادراک کا امتحان لیں

ذیل میں اس موضوع سے متعلق سوالات کو دو مرحلوں کو مدنظر رکھتے ہوئے وضع کیا گیا ہے۔

سوالوں کی ایک قسم تو وہ ہے جن کا جواب فوراً دینا ہے۔اس قسم کے سوالات کو پہلے مرحلہ میں رکھا گیا ہے۔

سوالوں کی دوسری قسم وہ ہے جو بحث ونظر اور غور وفکر کی متقاضی ہے اس قسم کے سوالات کو دوسرے مرحلہ میں رکھا کیا گیا ہے۔

پہلے مرحلہ کے سوالات جن کا جواب فورا دینا ہے:

۱۔ طاہر بن عاشور نے تفکر کی جو تعریف کی ہے اس کو بیان کریں۔

۲۔ تفکر کا حکم کیا ہے؟ دلیل کے ساتھ وضاحت کریں۔

۳۔ تفکر کے جو چار دائرۂ کار ہیں ان کو ذکر کریں۔

۴۔ تفکر کے دو معین اُمور ذکر کیجیے۔

۵۔ تفکر کے کئی فوائد ونتائج ہیں اور وہ کون کون سے ہیں؟

۶۔ سلف صالحین کی غور وفکر پر جو مختلف صورتیں اور نمونے ہیں وہ ذکر کریں۔

۷۔ اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان میں مخلوقات کی مختلف قسمیں کس لیے پیدا کی ہیں؟

دوسرے مرحلہ کے سوالات جن کا جواب غور وفکر کے بعد دینا ہے:

۱۔ اچھی فکر کے اُصول وضوابط بیان کریں۔

۲۔ آنے والی عبارت کی وضاحت کریں ((من عرف حقيقة نفسه فقد عرف عظمة ربه))

۳۔ غور وفکر کس طرح ایمان میں زیادتی کا باعث ہے؟

۴۔ کیا تفکر اور عبادت لازم وملزوم ہیں؟

۵۔ دو ایسی کتابوں کا ذکر کریں جو تفکر کے موضوع پر مرتب کی گئی ہوں۔

۶۔ غور وفکر پر وہ کون سے معاون اُمور ہیں جو کتاب میں ذکر نہیں کیے گئے؟

719
أعمال القلوب
نفس کا محاسبہ
خوف
محاسبہ
شکر
غور وفکر
رضا
ورع
تقویٰ

مقدمہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ، وَالصَّلاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى اَشْرَفِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ ، نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ .

اما بعد !

محاسبۂ نفس مومنوں کا طریقہ کار، موحدین کی پہچان اور اللہ کا خوف رکھنے والوں کا امتیاز ہے۔ چنانچہ مومن کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے رب سے ڈرنے والا، اپنے نفس کا محاسبہ کرنے والا اور اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرنے والا ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کا نفس کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ نفس کی خرابی بہت نقصان دہ، اس کا مکر بہت بڑا اور اس کا شر بہت پھیلا ہوا ہے۔ یہ نفس ہی ہے جو برائی کا حکم دینے والا، خواہش کی طرف مائل کرنے والا، جہالت کی طرف بلانے والا، ہلاکت کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے مگر جس پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ نفس کی خواہشات کو شتر بے مہار نہیں چھوڑا جا سکتا کیونکہ وہ سرکشی اور بُری عادات کی طرف ہی لے کر جائیں گی۔ وہ بُرے اخلاق میں مبتلا ہو جائے گا۔

اسی لیے انسان کو چاہیے کہ وہ اپنا وزن ماپ لے قبل اس کے کہ اس کا وزن کیا جائے اور وہ اپنا محاسبہ خود کرے اس سے پہلے کہ اس کا محاسبہ کیا جائے اور انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرنے کے لیے تیاری کرے۔

ہم اس کتابچہ میں انسان کی خود احتسابی کے بارے میں کہی گئی چند باتیں نقل کریں گے۔ یہ سلسلہ ''اعمال القلوب'' کا بارھواں اور آخری کتابچہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ایک علمی مجلس میں پیش کیا گیا۔ اس کے اُردو ترجمہ و تیاری میں الفرقان ٹرسٹ نے تعاون کیا

اور کتابچہ کو چھاپ کر اس کی نشر و اشاعت میں حصہ لے رہے ہیں اور علمی مواد کی شکل میں طبع کر کے اسے پیش کرنے جا رہے ہیں۔

ہم اللہ تعالیٰ سے نیکی اور تقویٰ کا سوال کرتے ہیں اور ان اعمال کی توفیق مانگتے ہیں جو اسے پسند ہیں اور جن پر وہ راضی ہے۔

محمد صالح المنجد

محاسبہ کی لغوی و اصطلاحی تعریف

لغوی تعریف:

محاسبہ "حَاسَبَ ، یُحَاسِبُ" سے مصدر ہے۔ یہ باب حساب سے مفاعلہ کا صیغہ ہے۔ جس کا معنی ہے گنتی پوری کرنا۔ ❶

اس سے جو فعل مجرد آتا ہے وہ حسب یحسب حسبانًا و حساباً و حسابة و حسبًا ہے یعنی شمار کرنا۔ ❷

اصطلاحی تعریف:

جب ہم لغوی اور اصطلاحی معنی کو ایک دوسرے کے ساتھ ملائیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ "محاسبہ برائیوں کو شمار کرنا اور عیوب کی گنتی کا نام ہے۔"

امام ماوردی رحمہ اللہ نے محاسبہ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"انسان رات کو جائزہ لے کہ اس نے دن میں کیا افعال سرانجام دیے ہیں، اگر وہ اعمال اچھے ہوں تو انہیں جاری رکھے اور اسی طرح کے اعمال سرانجام دیتا رہے اور اگر وہ افعال بُرے ہوں تو پھر ہر ممکن طریقے سے ان کا تدارک کرے اور مستقبل میں اس طرح کے اعمال سے باز آ جائے، یہ محاسبہ کہلاتا ہے۔" ❸

بعض لوگوں نے محاسبہ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"عقل کو اس بات پر لگانا کہ وہ نفس کو خیانت سے بچائے اور نفس کی کمی یا زیادتی کا جائزہ لے اور ہر فعل پر اس سے سوال کرے کہ یہ فعل کیوں انجام دیا اور کس کے لیے انجام دیا، اگر تو وہ فعل اللہ تعالیٰ کے لیے سرانجام دیا گیا تو اسے جاری

---

❶ التوقيف على مهمات التعاريف: ٦٤٠۔ ❷ القاموس المحيط: ١/ ٩٤.

❸ أدب الدنيا والدين للماوردي: ٤٥٣۔ ٤٥٤۔

رہنے دے اور اگر غیر اللہ کے لیے سر انجام دیا گیا تو اس سے باز آ جائے اور گناہ اور کوتاہی پر اپنے نفس کو ملامت کرے، اگر ممکن ہو تو اسے سزا دے یا پھر نفس کو ایسی نیکیوں کی طرف موڑ دے جو گناہوں کو مٹا دینے والی ہیں۔''

چنانچہ محاسبہ کا معنی یہ ہوا کہ ''اپنے نفس کے اعمال کا جائزہ لینا، غلطیوں کو دُور کرنا اور نیکیوں کو جاری رکھنا۔''

محاسبہ کی اہمیت وافادیت

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اپنے نفس کا محاسبہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَّاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ○ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ أُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ○﴾ (الحشر : ۱۸، ۱۹)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا آگے بھیجا ہے اور اللہ سے ڈرو، یقیناً اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے جو تم کر رہے ہو۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے تو اس نے انھیں ان کی جانیں بھلوا دیں، یہی لوگ نافرمان ہیں۔''

ابن سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ایسے کاموں کا حکم دیتا ہے جو ایمان کے واجبات میں سے ہیں اور ان سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ مخفی اور اعلانیہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا ڈر اور تقویٰ لازم پکڑیں اور اللہ تعالیٰ کے عائد کردہ احکامات، اس کی شریعت اور اس کی حدود کا لحاظ کریں۔ وہ دیکھیں گے کہ کون سی چیز ان کے لیے نفع مند ہے اور کون سی نقصان دہ اور یہ کہ قیامت کے دن ان اعمال کا نتیجہ نفع یا نقصان کی صورت میں کیا ہوگا۔ چنانچہ جب آخرت ان کا نصب العین اور دلوں کا مرکز بن جائے گی اور اس کی اہمیت اُجاگر ہو جائے گی تو وہ کثرت سے ایسے اعمال سر انجام دیں گے جو آخرت میں نفع دینے والے ہیں اور وہ ایسی بندشوں اور رکاوٹوں کو ختم کر دیں گے جو اس راستے پر چلنے میں رکاوٹ ہیں۔ اسی طرح جب

ان کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ ان کے تمام اعمال کی خبر رکھنے والا ہے، ان کے اعمال اللہ تعالیٰ سے مخفی نہیں ہیں، اس کے پاس نہ تو ان کے اعمال ضائع ہوں گے اور نہ ان کے بارے میں کسی قسم کی کوتاہی برتی جائے گی تو اللہ کے بندوں پر اور زیادہ محنت اور کوشش واجب ہو جاتی ہے۔''

یہ آیت کریمہ انسان کی خود احتسابی کی بنیاد ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے نفس کا جائزہ لے، اگر کوئی خامی نظر آئے تو اسے ترک کر دے اور اللہ سے توبہ کرے اور ایسے افعال سے بھی گریز کرے جو کوتاہیوں کا سبب بنتے ہیں اگر انسان دیکھے کہ اس کا نفس اللہ کے احکامات سے غفلت برت رہا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنی پوری کوشش اور تگ و دو کے ساتھ اللہ رب العزت سے احکامات کو بجا لانے کے لیے مدد مانگے اور اللہ کے احکامات کو پورا کرنے کے لیے اور اس پر ثابت قدم رہنے کے لیے اس توفیق کا طلب گار ہو اور اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کے احسانات اور اپنی غلطیوں کا موازنہ کرے۔ یقیناً اس سے انسان میں احساس بیدار ہو گا۔

بدنصیبی ہی بدنصیبی ہے کہ انسان اللہ کے احکامات سے غفلت کا مظاہرہ کرے اور اس قوم کی مانند ہو جائے جنھوں نے اللہ تعالیٰ کو بھلا دیا، اس کے ذکر اور اقامت حق سے غافل ہو گئے اور اپنے نفس کی خواہشات کی پیروی میں لگ گئے۔ وہ کبھی کامیاب نہیں ہوں گے اور انہیں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو گا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مصالح کو فراموش کر دیا ہے اور ان کی منفعتوں اور ان کے فوائد کو بھلا دیا ہے یقیناً ان کا معاملہ بہت بگڑا ہوا ہے دونوں جہانوں میں ناکامی ان کا مقدر ہے۔ وہ اس قدر خسارے میں ہیں جس کا نہ تدارک ممکن ہے اور نہ اس کی درستگی کیونکہ وہ فاسق لوگ ہیں۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ﴾ (الاعراف: ۲۰۱)

''یقیناً جو لوگ ڈر گئے، جب انھیں شیطان کی طرف سے کوئی (برا) خیال چھوتا

ہے وہ ہشیار ہو جاتے ہیں، پھر اچانک وہ بصیرت والے ہوتے ہیں۔''

چنانچہ متقین کا وصف یہ ہے کہ جب وہ شیطانی وسوسے میں آ کر کوئی برائی کر بیٹھتے ہیں تو وہ اللہ کا ذکر کرتے ہیں، اس کی طرف رجوع کرتے ہیں، اس کی طرف مائل ہوتے ہیں اور اس سے توبہ طلب کرتے ہیں اور یہ توبہ اور رجوع الی اللہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک بندہ اپنے تمام اعمال پر محاسبہ نہ کرے۔

محاسبہ نفس کی مشروعیت از روئے سنت:

سیّدنا شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ ، وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ .)) ❶

''عقل مند وہ ہے جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اور موت سے پہلے اچھے اعمال کر لیے۔''

محاسبہ نفس ان اعمال میں سے ہے جن پر علماء کا اجماع ہے:

امام عز بن عبدالسلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''تمام علماء کا اجماع ہے کہ ان سب اعمال پر محاسبہ نفس کرنا واجب ہے جو انسان ماضی میں سرانجام دے چکا ہے یا مستقبل میں سرانجام دے گا۔'' ❷

نفس اور اس کے امراض

انسان اگر نفس کو کتاب اللہ اور سنت رسول کے مطابق نہ چلائے تو یہ انسان کو ہلاکت اور تباہی کی طرف لے جاتا ہے اور اسے سیدھے راستے پر چلانے کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ انسان اپنی خواہشات اور خیالات پر اس کا محاسبہ کرتا رہے۔ کہا جاتا ہے کہ ''نفس

---

❶ رواه الترمذي، كتاب صفة القيامة، باب حديث الكيس : ٢٤٥٩ و حسنه .

❷ تفسير الثعالبي : ٣٩٩/٤.

انتہائی بڑے خائن حصہ دار کی طرح ہے اگر تم اس کا محاسبہ نہیں کرو گے تو یہ تمہارا مال لے جائے گا۔"❶

فاسد نفس ہی دلوں کے امراض کا سبب ہے۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"دل کے تمام امراض نفس کی طرف سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ تمام فاسد اعمال یہیں سے شروع ہو کر پورے اعضاء کو منتقل ہوتے ہیں اور ان اعمال کی طرف سب سے پہلے دل لپکتا ہے۔"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خطبہ میں فرماتے تھے:

((وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَسَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا .))❷

"ہم اپنے نفسوں کے شر سے اور اپنے بُرے اعمال سے اللہ کی پناہ میں آتے ہیں۔"

نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بالعموم نفس کے شر سے بھی پناہ مانگی ہے اور اس کی وجہ سے جو اعمال سرزد ہوتے ہیں ان کے شر سے بھی پناہ مانگی ہے اور پھر اس وجہ سے جو ناپسندیدگی اور سزا مقدر ٹھہرتی ہے اس کے شر سے بھی پناہ مانگی ہے۔

اولیاء اللہ طریقوں کے مختلف اور راستوں کے جدا ہونے کا باوجود اس بات پر متفق ہیں کہ "نفس" دل کے اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے راستے میں رکاوٹ ہے، بے شک نفس کو مطیع کیے بغیر اور اسے برائی سے روکے بغیر اللہ تعالیٰ تک رسائی اور اس تک پہنچنا ممکن نہیں۔ چنانچہ لوگوں کی دو اقسام ہیں:

ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن کو نفس اپنے کنٹرول میں کر لیتا ہے، انہیں غلام بنا لیتا ہے اور انہیں ہلاک کر دیتا ہے اور ایسے لوگ خوشی سے نفس کے احکامات کے ماتحت بن جاتے ہیں۔

دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو اپنے نفس پر قابو پا لیتے ہیں اور اسے مغلوب کر لیتے ہیں، چنانچہ نفس ایسے لوگوں کے احکامات کے تابع ہو جاتا ہے۔

---

❶ اغاثة اللفهان: ١/ ٧٩.

❷ رواه الترمذی، کتاب النکاح، باب ما جاء فی خطبة النکاح: ١١٠٥ و حسنه.

بعض صلحاء کا قول ہے:

''جس نے اپنے نفس پر غلبہ پالیا وہ فلاح پا گیا اور کامیاب ہو گیا اور جس پر اس کے نفس نے قابو پالیا وہ نقصان میں رہا اور ہلاک ہو گیا۔''

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاَمَّا مَنۡ طَغٰی ۝ وَ اٰثَرَ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا ۝ فَاِنَّ الۡجَحِیۡمَ ہِیَ الۡمَاۡوٰی ۝ وَ اَمَّا مَنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَ نَہَی النَّفۡسَ عَنِ الۡہَوٰی ۝ فَاِنَّ الۡجَنَّۃَ ہِیَ الۡمَاۡوٰی ۝﴾ (النازعات : ۳۷ تا ٤١)

''پس لیکن جو حد سے بڑھ گیا۔ اور اس نے دنیا کی زندگی کو ترجیح دی۔ تو بے شک جہنم ہی (اس کا) ٹھکانا ہے۔ اور رہا وہ جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا اور اس نے نفس کو خواہش سے روک لیا۔ تو بے شک جنت ہی (اس کا) ٹھکانا ہے۔'' [1]

چنانچہ نفس سرکشی اور دنیوی زندگی کی ترجیح کی طرف بلاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے خوف اور نفس کو خواہشات سے روکنے کی طرف بلاتا ہے اور دل ان دونوں بلانے والوں کے درمیان میں ہے، کبھی اس بلانے والے کی طرف مائل ہوتا ہے اور کبھی اس کی طرف۔ یہی مقام آزمائش اور امتحان ہے۔

قرآن کریم میں نفس کی اقسام

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں نفس کی تین اقسام بیان فرمائی ہیں:

۱۔ نفس مطمئنہ ۲۔ نفس لوامہ ۳۔ نفس امارہ

۱۔ نفس مطمئنہ:

نفس جب اللہ تعالیٰ کے تصور سے سکون محسوس کرے، اس کے ذکر سے اطمینان پائے،

---

[1] إغاثة اللهفان : ٧٥، ٧٤.

اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے، اس کی ملاقات کا شوق رکھے، اس کی قربت سے اُنس محسوس کرے تو یہ نفس مطمئنہ کے اوصاف ہیں اور ایسا دل رکھنے والے سے اس کی وفات کے وقت کہا جائے گا:

﴿یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ۝ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ۝ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ۝﴾ (الفجر: ۲۷ تا ۳۰)

"اے اطمینان والی جان! اپنے رب کی طرف لوٹ آ، اس حال میں کہ تو راضی ہے، پسند کی ہوئی ہے۔ پس میرے (خاص) بندوں میں داخل ہو جا۔ اور میری جنت میں داخل ہو جا۔"

طمانیت کی حقیقت سکون اور استقرار ہے۔ اپنے رب کی طرف سکون محسوس کرنا اللہ کی اطاعت، اس کے ذکر اور اس کے احکام کی اتباع کے نتیجے میں ہی ممکن ہے۔ اس کے سوا سکون کا حصول ممکن نہیں، چنانچہ نفس مطمئنہ اللہ تعالیٰ کی محبت، اس کی بندگی اور اس کی ملاقات پر ایمان کے بارے میں اطمینان رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی حقیقت کی تصدیق اور اللہ کو رب ماننے پر راضی ہونے، اسلام کو دین ماننے اور محمد ﷺ کو رسول ماننے پر اطمینان رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قضا وقدر اور اللہ تعالیٰ کی قوت پر ایمان رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو شر، مکر کرنے والوں کے مکر، حاسدین اور دشمنوں سے بچاتا ہے اور اس کو کافی ہو جاتا ہے۔ نفس مطمئنہ اسے کہتے ہیں جو یہ یقین اور اطمینان رکھے کہ اللہ اکیلا اس کا رب، اس کا معبود، اس کا الٰہ، اس کا اور ہر شے کا مالک ہے۔ یہ یقین رکھے کہ اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے اور پلک جھپکنے کے برابر بھی اس سے بے نیاز رہنا ممکن نہیں، ایسا نفس، نفس مطمئنہ ہے۔

۲۔ نفس امارہ:

یہ نفس مطمئنہ کی ضد اور اس کا مخالف ہے۔ نفس امارہ سے مراد وہ نفس ہے جو باطل اور گمراہی پر مبنی خواہشات کی اتباع کا حکم دے۔ یہ نفس ہر برائی کی جڑ ہوتا ہے۔ یہی نفس امارہ

ہی انسان کو قبیح اور بُرے اعمال کی طرف لے کر جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ﴾

(یوسف : ٥٣)

''بے شک نفس تو برائی کا بہت حکم دینے والا ہے مگر جس پر میرا رب رحم کرے۔''

اللہ تعالیٰ نے ''امارہ'' مبالغہ کا صیغہ استعمال فرمایا ہے۔''آمرۃ'' نہیں ذکر فرمایا کیونکہ ''امارۃ'' زیادہ بلیغ ہے اس سے مراد ہے بہت زیادہ برائی کا حکم دینے والا۔ نفس کو اصلاً ظالم اور جاہل پیدا کیا گیا ہے مگر جس پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔

﴿وَ اللّٰهُ اَخۡرَجَکُمۡ مِّنۡۢ بُطُوۡنِ اُمَّهٰتِکُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ شَیۡـًٔا﴾

(النحل : ٧٨)

''اور اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے۔''

﴿اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَظَلُوۡمٌ کَفَّارٌ﴾ (ابراهيم : ٣٤)

''بے شک انسان یقیناً بڑا ظالم، بہت ناشکرا ہے۔''

ہاں نفس کے پاس حق کو قبول کرنے کی فطری استعداد ضرور موجود ہوتی ہے جب اسے فاسد خارجی اثرات کے بغیر پیش کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِیۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیۡهَا﴾ (الروم : ٣٠)

''اللہ کی اس فطرت کے مطابق، جس پر اس نے سب لوگوں کو پیدا کیا۔''

لیکن جب نفس کو تعلیم نہیں دی جائے گی تو وہ جاہل ہی رہے گا اور اگر اسے بغیر تربیت کے ناپختہ چھوڑ دیا جائے گا تو ایسا نفس سرکشی کی طرف بلائے گا اور شر کی طرف مائل کرے گا۔ چنانچہ ظلم اور علم دونوں خارجی چیزیں ہیں جو اصلاً نفس میں موجود نہیں ہیں۔ اگر مومنوں پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ایک بھی انسان متقی نہ ہوتا۔ جب اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ

بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو دین میں سمجھ بوجھ اور شریعت پر عمل کرنے میں اس کی مدد کرتا ہے۔
نفس امارہ میں ظلم کا سبب جہالت ہے یا ضرورت۔ اسی لیے یہ انسان کو لازمی طور پر برائی کی طرف ہی مائل کرتا ہے مگر وہ انسان جسے اللہ کی رحمت مل جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ انسان یہ بھی جانتا ہے کہ وہ ہمیشہ اللہ کے سامنے مجبور و بے بس ہے، ہمیشہ اللہ کا محتاج ہے، یہاں تک کہ وہ انسان کے نفس کو شر سے بچالے اور اس کی مدد کرے۔ بندے کا اپنے رب کی طرف ضرورت مند ہونا، ہر ضرورت سے بڑھ کر ہے، حتی کہ کھانے پینے اور نفس کی ضروریات سے بھی بڑھ کر ہے۔

۳۔ نفس لوامہ:

یہ لفظ ''اللوم'' سے مشتق ہے۔ نفس لوامہ انسان کی خیر اور شر دونوں پر ملامت کرتا ہے۔ اس میں خیر اور شر دونوں پائے جاتے ہیں۔ شر پر ملامت کرتا ہے، جیسا کہ امام حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''اللہ کی قسم! آپ مومن کو ہر حال میں اپنے نفس کو ملامت کرتا ہی پائیں گے۔ وہ اپنے ہر فعل میں نادم ہوتا ہے اور اپنے نفس کو ملامت کرتا ہے اور فاسق و فاجر انسان برابر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور اپنے نفس کو سزا نہیں دیتا۔'' [1]

یہاں تک کہ قیامت کے دن اپنے نفس کو ملامت کرے گا۔ اگر نیک تھا تو نیکیاں زیادہ کیوں نہ کیں، یہ اس کے سامنے جنت کے مراتب ہیں، اگر بُرا تھا تو یہ ملامت کرے گا کہ بُرے اعمال کیوں کرتا رہا۔ یہ اس کے سامنے آگ ہے۔ یہ نفس دُنیا میں بھی ملامت کرتا ہے اور آخرت میں بھی ملامت کرے گا۔ بُرا آدمی ملامت کرے گا کہ برائی سے توبہ کیوں نہ کی اور نیک آدمی ملامت کرے گا کہ نیکیاں زیادہ کیوں نہ کیں۔

چنانچہ نفس کبھی ''امارہ'' ہوتا ہے، کبھی لوامہ اور کبھی مطمئنہ۔

نفس مطمئنہ ہونا ایسا وصف ہے جس کی مدح کی جانی چاہیے اور نفس امارہ ہونا ایسا وصف

[1] إغاثة اللفهان : ۱/ ۷۷.

ہے جس کی مذمت کی جانی چاہیے اور نفس لوامہ مدح اور ذم دو قسموں میں منقسم ہے جس طرح کی ملامت ہو، یہی حال نفس کا ہے۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ لوگوں میں سے فلاں بندے کے پاس ہمیشہ نفس مطمئنہ ہی رہے گا یا ہمیشہ نفس امارہ ہی رہے گا، بعض اوقات کسی کے پاس نفس مطمئنہ ہوتا ہے پھر بعض دوسرے ایام میں نفس امارہ ہوتا ہے اور کبھی نفس لوامہ ہوتا ہے۔

بلکہ ایک ہی دن میں اور ایک ہی گھڑی میں ایسا ردّ و بدل ہوتا رہتا ہے لیکن حکم لگاتے وقت غالب نفس کو پیش نظر رکھا جائے گا۔

چنانچہ اپنی خلوت و تنہائی میں اپنے نفس کا محاسبہ کیجیے اور وقت ختم ہونے سے پہلے غور وفکر کیجیے۔ فراغت کے زمانے میں سخت وقت کے لیے اعمال کر لیجیے، کام کرنے سے پہلے غور وفکر کیجیے کہ یہ آپ کے صحیفے میں لکھا جائے گا اور دیکھیے کیا آپ کی کوششوں میں آپ کا نفس آپ کے ساتھ ہے یا آپ کے خلاف۔ بلاشبہ! خوش بخت ہے وہ انسان جس نے اپنا محاسبہ کر لیا اور وہ انسان کامیاب ہے جس نے اپنے نفس سے لڑائی مول لے لی۔ اس سے اپنے حقوق اور مطالبات پورے کرواتا رہا اور جب کبھی نفس خواہشات اور اُمیدوں میں منہمک ہوا اور اس پر غلبہ پا لیتا رہا۔

محاسبہ کی کیفیت

محاسبہ نفس میں شدت:

انسان کا شمار اس وقت تک متقین اور پرہیز گاروں میں نہیں ہوتا جب تک وہ اپنے نفس کا اتنا سخت محاسبہ نہ کرے جتنا ایک کنجوس شراکت دار اپنے دوسرے حصہ دار کا محاسبہ کرتا ہے۔

میمون بن مہران رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”انسان اس وقت تک متقی نہیں بنتا جب تک وہ ایک آدمی کے اپنے حصہ دار کے محاسبہ کرنے سے زیادہ سخت اپنے نفس کا محاسبہ نہ کرے۔ یہاں تک کہ وہ

اس بات کا بھی لحاظ رکھے کہ اس کا کھانا پینا اور اس کی کمائی کہاں سے ہے یعنی کیسے کمایا ہے؟" ❶

اسی طرح فرماتے ہیں:

"متقی وہ ہے جو اپنے نفس کا، بخیل حصہ دار سے بھی زیادہ سخت محاسبہ کرے۔" ❷

چنانچہ محاسبہ نفس میں شدت اور سختی ہی وہ چیز ہے جو اس محاسبہ سے مطلوبہ نتائج دیتی ہے اور محاسبہ نفس میں تساہل، جیسا کہ بعض لوگ کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ عمل تو صغیرہ گناہوں میں سے ہے اور اس عمل کے حرام ہونے میں علماء کا اختلاف ہے اور اس عمل میں راجح قول کے مطابق یہ مکروہ ہے تو یہ محاسبہ نہیں ہے، بلکہ یہ تو نفس کو اس بات کی اجازت دینا ہے کہ وہ گمراہی میں جا گرے اور پھر اس میں بڑھتا ہی چلا جائے۔

ہر عمل پر محاسبہ:

سعید بن جبیر رحمہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"﴿وَلَآ أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ﴾ (القیامۃ: ۲)

"نہیں میں قیامت کے دن کی قسم کھاتا ہوں۔"

خیر اور شر دونوں پر ملامت کرتا ہے۔" ❸

امام حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"مومن کو آپ اپنے نفس کو ملامت کرتا ہی دیکھیں گے۔ وہ کہتا ہے: میری ان کلمات سے کیا مراد ہے؟ میرے کھانے کا مقصد کیا ہے، میرے دل کا کیا ارادہ ہے تو آپ سے اپنے آپ کو سزا دیتا ہی دیکھیں گے اور فاجر آگے ہی بڑھتا چلا جاتا ہے وہ اپنے نفس کو سزا نہیں دیتا۔"

چنانچہ محاسبہ صرف گناہوں اور برے اعمال تک ہی محدود نہیں بلکہ انسان کے لیے

---

❶ حلیة الأولیاء: ٤/ ٨٩.
❷ محاسبة النفس: ٩.
❸ تفسیر الطبري: ١٢/ ٣٢٧.
❹ الزهد للامام احمد: ٢٨١۔

ضروری ہے کہ وہ اپنے نیک اور مباح اعمال پر نفس کے محاسبے کا اہتمام کرے۔

محاسبہ کے بعد نفس کو نیک اعمال پر گامزن کرنا:

کوئی بھی عمل جب نتیجہ خیز نہ ہو تو وہ عمل ناقص ہے۔ صاحب عمل کو چاہیے کہ وہ اس پر دوبارہ غور و فکر کرے جب محاسبہ کے نتائج برآمد نہ ہوں تو محاسبہ کرنے والے کو چاہیے کہ وہ دوبارہ اپنے نفس کا محاسبہ کرے بلکہ اسے چاہیے کہ وہ اس محاسبے کا محاسبہ کرے۔

امام مالک بن دینار رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحم فرمائے جو اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہتا ہے کیا تو نے یہ گناہ نہیں کیا؟ کیا یہ غلطی تجھ سے سرزد نہیں ہوئی؟ پھر وہ آگے بڑھتا ہے پھر اسے نکیل ڈال لیتا ہے، پھر وہ کتاب اللہ کو تھام لیتا ہے اور وہ اس کی رہنما بن جاتی ہے۔''[1]

ابراہیم تیمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''میں نے تصور اور خیال میں اپنے آپ کو جنت میں دیکھا کہ اس کے پھل کھا رہا ہوں، اس کی نہروں سے پی رہا ہوں اور حوروں سے معانقہ کر رہا ہوں۔ پھر میں نے اپنے آپ کو جہنم میں دیکھا، میں تھوہر کا درخت کھا رہا ہوں۔ کھولتا ہوا گرم پانی پی رہا ہوں، اس کی زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑا ہوا ہوں۔ پھر اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہا: تجھے کون سی جگہ پسند ہے؟ اس نے جواب دیا: میں چاہتا ہوں کہ مجھے دوبارہ دُنیا میں لوٹا دیا جائے تاکہ نیک اعمال بجا لاؤں۔ امام صاحب کہتے ہیں کہ میں نے کہا تو امیدوں اور خواہشات کے درمیان ہے، اب اپنی مرضی سے جو چاہے عمل کر۔''

---

[1] تاریخ دمشق: ٥٦/ ٤٢٠.

[2] محاسبة النفس: ١٠۔

محاسبہ کے فوائد وثمرات

نفس کے اعمال، اقوال اور تصورات وخیالات پر محاسبہ کرنا ہر کامیابی اور فلاح کی کلید ہے اور کسی بھی مسلمان کے لیے دُنیا وآخرت کی سعادت کا سبب ہے۔ حضرت حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''بندہ ہمیشہ بھلائی پر رہتا ہے جب تک وہ اپنے نفس پر نصیحت اور محاسبہ کرتا رہے۔''❶

ایک مسلمان کے لیے محاسبہ نفس کے درج ذیل ثمرات ہوتے ہیں:

قیامت کے دن حساب میں تخفیف:

مسلمان کا دنیا میں اپنے نفس کا محاسبہ کرنا قیامت کے دن اس سے حساب میں تخفیف کا باعث ہوگا کیونکہ محاسبہ کی وجہ سے اس کے بُرے اعمال میں کمی آجاتی ہے اور نیکیاں بڑھ جاتی ہیں۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''اپنے نفس کا محاسبہ کرو قبل اس کے کہ تمہارا حساب لیا جائے۔ اپنے نفس کا وزن کرو قبل اس کے کہ تمہارا وزن کیا جائے کیونکہ یہ تمہارے لیے زیادہ آسان ہے اور اپنے آپ کو بڑی پیشی کے لیے تیار کرو:

﴿يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُونَ لَا تَخْفَىٰ مِنكُمْ خَافِيَةٌ۝﴾ (الحاقة : ١٨)

''اس دن تم پیش کیے جاؤ گے، تمہاری کوئی چھپی ہوئی بات چھپی نہیں رہے گی۔''❷

جعفر بن برقان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے بعض گورنروں کو خط لکھا تھا جس کا آخری حصہ یہ تھا:

''سخت حساب سے پہلے آسانی میں ہی اپنے نفس کا محاسبہ کرلو کیونکہ جس نے سخت حساب سے پہلے آسانی میں اپنے نفس کا محاسبہ کرلیا اس کا ٹھکانہ من پسند اور قابل رشک ہوگا اور جس نے اپنی زندگی کو اپنا معبود بنا لیا اور اپنی خواہش کو اپنا مشغلہ بنالایا تو اس کا ٹھکانا ندامت اور حسرت والا ہوگا جو تجھے وعظ کیا جاتا ہے

❶ محاسبة النفس : ٦.
❷ الزهد لابن مبارك : ٣٠٧.

اس سے نصیحت پکڑ تاکہ تو باز آجائے۔'' ❶

حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''مومن اپنے نفس پر نگہبان ہے وہ اللہ کی رضا کے لیے اس کا محاسبہ کرتا ہے، قیامت کے دن ان لوگوں سے حساب میں تخفیف کی جائے گی جنھوں نے دُنیا میں اپنے نفس کا محاسبہ کیا تھا اور قیامت کے دن ان لوگوں کے حساب میں سختی کی جائے گی جنھوں نے اپنے اعمال کا محاسبہ نہیں کیا ہوگا۔
مومن اچانک کسی چیز کو دیکھتا ہے تو اسے اچھی لگتی ہے، وہ کہتا ہے: اللہ کی قسم! مجھے تیری رغبت ہے، تو ہی میری ضرورت ہے لیکن اللہ کی قسم! تجھ تک پہنچنے کا ذریعہ نہیں، تیرے اور میرے درمیان دُوری حائل ہے پھر وہ چیز اس کے ہاتھ نکل جاتی ہے تو وہ اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہتا ہے، میں نے اس کا ارادہ کیوں اور کس لیے کیا۔ اللہ کی قسم! اب کبھی بھی اس کا ارادہ نہیں کروں گا۔'' ❷

حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''مومن اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے اور جانتا ہے کہ اس نے اللہ کے سامنے کھڑے ہونا ہے اور منافق اپنے نفس سے غفلت برتتا ہے، اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحم فرمائے جو ملک الموت کے نزول سے قبل اپنے نفس پر غور وفکر کر لیتا ہے۔'' ❸

حصولِ ہدایت اور اس پر ثابت قدمی:

امام بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ہدایت کا حصول اور اس پر ثابت قدمی کثرت غور وفکر سے کائناتی نشانیوں پر ہمیشہ غور وفکر اور اپنے نفس کے اعمال کے ہمیشہ محاسبہ سے حاصل ہوتی ہے۔'' ❹

---

❶ محاسبة النفس: ١٦. ❷ الزهد لابن المبارك: ٣٠٨.
❸ تاريخ بغداد: ١٨٤/٤.
❹ تفسير البيضاوي: ١٢٩.

دل کے مرض کا علاج:

کیونکہ دل کی بیماری کا علاج اور ازالہ محاسبہ نفس اور نفس کی مخالفت سے ہی ممکن ہے اور محاسبہ نفس میں سستی نفس کی موافقت اور نفس کی خواہشات کی پیروی میں دل کی ہلاکت ہے چنانچہ وہ انسان عاجز ہے جو نفس کی خواہشات کی پیروی کرتا ہے۔

وہ اسی طرف مائل ہوتا ہے جس طرف اس کا نفس مائل ہوتا ہے اور وہ اسی طرف جاتا ہے جس طرف اس کا نفس لے جائے تو اس سے اس کا دل فاسد ہو جاتا ہے اور نفس کی مخالفت ہی میں دل کی اصلاح کا طریقہ کار اور دل کی بیماریوں کا علاج پوشیدہ ہے۔

نفس کی برائیاں اور عیوب کا ظاہر ہونا اور اعمال پر عدم غفلت:

انسان جب اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے تو اسے اپنے عیوب کا پتا چلتا ہے۔ جب اسے اپنے عیبوں کا پتہ چلتا ہے تو پھر وہ اپنے نیک اعمال سے غفلت نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے رب سے اُمید کرتا ہے کہ وہ اس کے اعمال کو نقص کے باوجود قبول فرمائے۔

عبدالعزیز بن رواد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”جب بھی میں نے کوئی نیک عمل کیا تو اس سے فراغت کے بعد جب میں نے اپنے نفس کا محاسبہ کیا تو اس عمل میں شیطان کا حصہ اللہ تعالیٰ کے حصے سے زیادہ تھا۔“ ❶

محاسبہ نفس کی وجہ سے انسان غرور اور تکبر سے بچ جاتا ہے:

سیّدنا ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ آدمی اس وقت تک صاحب بصیرت نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق (اس کے ہاں) مبغوض اور قابل نفرت ہو جائیں پھر وہ اپنے نفس کی طرف پلٹے تو وہ اس کے لیے لوگوں سے بھی زیادہ قابل نفرت ہو۔ ❷

اس سے مراد یہ ہے کہ جب انسان اپنے نفس کا محاسبہ کرے گا تو اس سے بغض اور نفرت کرے گا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ نفس کی برائیاں جنت میں داخل ہونے سے راستے کا

❶ الكامل لابن عدي: ٥/ ٢٩١.
❷ محاسبة النفس: ٢٣.

پتھر (رکاوٹ) ہیں جس شخص کی یہ کیفیت ہو تو اس میں غرور اور تکبر کس طرح سرایت کر سکتا ہے!! جب سلف صالحین نے اپنے نفوس کا محاسبہ کیا تو ان کی حقیقت کو پہچان لیا تو انہیں اللہ تعالیٰ کی ذات اور اپنے حق میں نہایت حقیر تصور کیا۔

بعض سلف صالحین عرفہ میں لوگوں کی موجودگی میں یہ دعا کیا کرتے تھے:

((اَللّٰھُمَّ لَا تَرُدَّھُمْ لِأَجْلِيْ .))

''اے اللہ! انہیں میری وجہ سے اپنے در سے نا اُمید نہ لوٹانا۔'' ❶

اللّٰهم لا تردهم لاجلي .))

محمد بن واسع رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے: ''اگر گناہوں کی بدبو ہوتی تو کسی انسان میں یہ طاقت نہ ہوتی کہ وہ میرے قریب بیٹھ سکتا۔'' ❷ حالانکہ وہ اس اُمت کے بڑے عبادت گزاروں میں سے تھے۔

یونس بن عبید رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''مجھے نیکی کی خصلتوں میں سے ایک سو خصلتوں کا علم ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ میرے اندر ان میں سے ایک بھی پائی جاتی ہو۔''

یہ حماد بن سلمہ رحمہ اللہ ہیں۔ ایک دفعہ سفیان ثوری رحمہ اللہ کے پاس گئے تو کہنے لگے: اے ابوعبداللہ! کیا آپ جس چیز سے ڈرتے تھے اس سے محفوظ نہیں ہو گئے اور آپ کو وہ چیز مل نہیں گئی جس کی آپ کو اللہ سے اُمید تھی۔ وہ سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے تو سفیان ثوری رحمہ اللہ نے جواب دیا کہ اے ابوسلمہ! کیا تم میرے جیسے لوگوں کے بارے میں طمع کرتے ہو کہ اللہ آگ سے نجات دے دے گا؟ تو انہوں نے کہا: اللہ کی قسم! میں آپ کے بارے میں یہ اُمید رکھتا ہوں ''اگر حدیث، فقہ اور زہد کے ائمہ کو آگ سے نجات نہیں ملے گی تو ہم کہاں؟ ❸

جعفر بن زید رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

❶ الزهد للامام احمد: ۱/ ۲٤٤. ❷ محاسبة النفس: ۳۷.

❸ اغاثة اللفهان: ۱/ ۸۵.

''ہم کابل کی طرف غزوہ کرنے کے لیے نکلے۔ لشکر میں ''صلۃ بن اشیم'' بھی تھے۔ لوگوں نے رات کو پڑاؤ کیا، نماز پڑھی اور لیٹ گئے۔ میں نے کہا کہ میں ان کا عمل ضرور دیکھوں گا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ لوگ غافل ہو گئے ہیں تو آہستہ سے نکل کر اور قریب ہی درختوں کے جھنڈ میں داخل ہو گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے داخل ہو گیا۔ پھر وہ کھڑا ہوا اور نماز پڑھنے لگا۔ اچانک شیر آیا اور ہمارے بہت قریب پہنچ گیا۔ میں ایک درخت پر چڑھ گیا۔ جب انہوں نے سجدہ کیا تو میں کہنے لگا کہ ابھی شیر انہیں اُچک لے گا، وہ بیٹھے پھر سلام پھیرا، پھر کہنے لگے: اے درندے! کہیں اور سے جا کر اپنا رزق تلاش کر۔ وہ شیر چلا گیا۔ وہ اسی حالت میں نماز پڑھتے رہے یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ وہ بیٹھے، اللہ کی حمد بیان کی اور کہا: اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ مجھے جہنم کی آگ سے بچا لے اور مجھ سا گناہ گار جنت مانگنے سے شرم محسوس کرتا ہے۔ پھر وہ واپس پلٹے اور صبح اس حالت میں کی کہ گویا رات وہیں پر بسر کی اور میں نے اللہ علیم وخبیر کی قدرت سے جو رات کو خوفناک منظر دیکھا تھا اسی حالت میں صبح کی۔'' [1]

فارغ اوقات سے استفادہ:

محاسبہ نفس انسان کو اس مقام تک لے کر جاتا ہے کہ وہ اپنے اوقات کو بہتر طور پر استعمال کرے۔ ابن عساکر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابو الفتح نصر بن ابراہیم مقدسی رحمۃ اللہ علیہ محاسبہ نفس کا اس قدر اہتمام کرتے کہ ان کا کوئی وقت بغیر فائدے کے نہیں گزرتا تھا یا تو وہ اپنے مخطوط کو صاف کرتے رہتے یا تدریس کرتے یا مطالعہ کرتے رہتے۔

چنانچہ اس انسان کے لیے جو محاسبہ نفس کے ان ثمرات سے واقف ہے، یہ ضروری ہے کہ وہ محاسبۂ نفس سے غافل نہ ہو اور اپنی حرکات وسکنات اور اپنے چال چلن پر نظر رکھے کیونکہ ہر انسان انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ نفس انسان کا ضیاع یا اسے ایسے راستے پر لگا دینا

[1] شعب الایمان: ۳۲۱۱.

جو ہلاکت کی طرف لے جائے یہ بہت بڑا خسارہ ہے جس کی اجازت انتہائی جاہل، احمق اور کم عقل انسان ہی دے سکتا ہے اور اس خسارے کی حقیقت بھی ہار جیت کے دن ہی واضح ہوگی۔

نفس کا محاسبہ کون کرے؟

محاسبہ نفس کسی ایک جماعت کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ اس میں تمام مومن چھوٹے بڑے، مرد عورت، نیک بد، عالم اور جاہل سب کے سب شامل ہیں۔

جاہل انسان اپنے نفس کا محاسبہ کرے کیونکہ اگر وہ جاہل رہے گا تو اللہ کی عبادت کس طرح کر سکے گا؟ اس کی جہالت کب ختم ہوگی؟ کیسے ختم ہوگی؟ وہ علم کیسے حاصل کر سکے گا؟ اور وہ علم سیکھنے کی ابتدا کہاں سے کرے؟

اسی طرح صاحب علم اپنے نفس کا محاسبہ کرے۔ کہا جاتا ہے کہ انتہا (آخر) میں محاسبہ کرنا ابتدا میں محاسبہ کرنے سے زیادہ لازمی ہے۔

یعنی وہ لوگ جنہوں نے اپنے نفسوں کو نفیس ترین اور عالی مرتبت بنا لیا اور نیک اعمال کیے، علم حاصل کیا، نیکی کا حکم دیا اور برائی سے منع کیا اور دیگر اعمال انجام دیے۔ اس حالت کے باوجود ان پر لازم ہے کہ وہ اپنے نفس کا محاسبہ کریں اور ان کا یہ محاسبہ اس محاسبہ سے زیادہ سخت ہے جو وہ اپنی جہالت اور گمراہی کے دنوں میں کر لیتے۔

ہم نے کتنے ہی طالب علموں کو دیکھا ہے جو اپنے نفس کو نہیں بچاتے اور اس کا محاسبہ نہیں کرتے۔ وہ کتنی ہی جگہوں اور مواقع پر پھسل گئے اور سیدھے راستے سے بھٹک گئے اور وہ اپنے آپ کو بُری عادات سے نہیں بچاتے اور نہ مکروہات سے بچاتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو محرمات کا ارتکاب بھی کرتے ہیں۔

ایسے لوگ اپنے نفس کا محاسبہ نہیں کرتے۔

وہ اس علم پر فخر کرتے ہیں، دوسروں پر تکبر کرتے ہیں اور حسد، بغض، چغلی اور غیبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان سے قبیح اعمال سرزد ہو جاتے ہیں۔ وہ خود کو دوسروں سے ماورا

خصوصیات کا حامل سمجھتے ہیں، یہ لوگ اگر اس منصب کے حامل ہوں بھی تو اللہ تعالیٰ تو تمام لوگوں کا محاسبہ کرے گا بلکہ اس کا حساب زیادہ سخت ہوگا۔

ایسے لوگوں کو ان کا علم کوئی فائدہ نہیں دے گا کیونکہ علم کا عمل کے ساتھ وہی رشتہ ہے جو مجاہد کا اسلحہ کے ساتھ ہے۔ اگر وہ اسے استعمال ہی نہ کرے تو اس کا فائدہ؟ یا جو بھوکے اور ذخیرہ کی ہوئی خوراک کا رشتہ ہے، جب بھوکا اس خوراک سے کچھ کھا ہی نہیں سکتا تو اسے اس خوراک کا فائدہ؟

يُحَاوِلُ نَيْلَ الْمَجْدِ وَالسَّيْفُ مُغْمَدُ
وَيَأْمُلُ إِدْرَاكَ الْعُلَا وَهُوَ نَائِمُ

''وہ بلندی حاصل کرنے کی کوشش میں ہے جب کہ اس کی تلوار میان میں ہے۔
وہ بلندی اور عالمی مرتبہ پانے کی اُمید رکھتا ہے جب کہ اس کی کیفیت نیند کی سی ہے (یعنی سویا ہوا ہے)۔'' [1]

ایسے طالب علم سے تو بعض جاہلوں کا حال بہتر ہے کیونکہ بعض عام لوگ بھی بُرے اعمال اپنے نفس کا محاسبہ کر لیتے ہیں اور اپنے نفس کی خواہشات میں مبتلا ہونے سے بچا لیتے ہیں۔ وہ غلطیاں جن کا عام طالب علم ارتکاب کرتے ہیں اور جن پر محاسبہ نفس کرنا ضروری ہے وہ غلطیاں علم کی تبلیغ اور تدریس نہ کرنا ہیں۔

علماء تو عام لوگوں سے زیادہ حق دار ہیں کہ محاسبہ نفس کا اہتمام کریں اور ہم جو آج کل گمراہ کن اور گمراہی پر مبنی فتاویٰ جات دیکھتے ہیں جو کہ مختلف سوفٹ ویئر کے ذریعے اور انٹرنیٹ کی ویب سائٹس پر شائع ہوتے ہیں ان کا سبب بھی علماء کا اپنے نفس کا محاسبہ نہ کرنا ہے۔ اگر وہ سچے دل سے اپنے نفس کے محاسبے کا اہتمام کرتے تو ان فتاویٰ جات میں تساہل نہ برتتے اور سوال پوچھنے والوں کی خواہشات کے مطابق احکام صادر نہ فرماتے۔

اسی لیے علماء اور طلباء علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ زیادہ سختی کے ساتھ اپنے نفس کے

[1] المدهش: ٤٧٠.

محاسبے کا اہتمام کریں کیونکہ اگر وہ اپنے نفس کا محاسبہ کریں گے تو خود انہیں بھی فائدہ ہوگا اور لوگ بھی اس سے فائدہ اُٹھائیں گے اور اگر یہ لوگ محاسبہ نفس کو ترک کر دیں گے تو خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔

نیک اعمال پر محاسبہ نفس کی اقسام

محاسبہ نفس صرف گناہوں پر نہیں ہوتا بلکہ یہ اطاعت کے کاموں میں بھی ہوتا ہے اور نیک اعمال پر محاسبہ نفس کی دو اقسام ہیں عمل سے پہلے اور عمل کے بعد۔

ا۔ عمل سے پہلے محاسبہ نفس:

انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے ارادوں، خیالات، افکار وعزائم کو دیکھے اور اپنے عمل کے ارادے پر غور کرے کہ کیا وہ خالصتاً اللہ کی رضا کے لیے ہے۔ اگر اللہ کی رضا کے لیے ہو تو ٹھیک ورنہ اس عمل کو ترک کر دے۔

امام حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحم فرمائے جو اپنے ارادے پر غور کرتا ہے اگر وہ کام اللہ کے لیے ہو تو جاری رکھتا ہے اور اگر غیر اللہ کے لیے ہو تو اس کام سے رُک جاتا ہے۔'' [1]

انسان کو ریا سے ڈرتے ہوئے تمام اعمال چھوڑ نہیں دینے چاہییں یہ تو وہ اعمال مراد ہیں جن کے بارے میں ابتدائی طور پر یہ رائے ہو، لیکن وہ اعمال صالحہ جو کہ واجبات میں سے ہیں یا وہ مندوب اعمال جن کی انسان نے تیاری کی ہوتی ہے انہیں چھوڑنا نہیں چاہیے بلکہ اپنی نیت کو درست کرنا چاہیے اور اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے۔

اخلاص کے ساتھ اعمال کی انجام دہی کے لیے محاسبہ نفس کی یہ قسم بہت اہمیت رکھتی ہے۔ محاسبہ کے بغیر یہ اعمال ریا پر مبنی ہوں گے اور انسان کو ہلاک کر دیں گے۔ انسان اللہ کے اس قول کی زد میں آ جائے گا:

---

[1] شعب الایمان: ۷۲۷۹۔

﴿عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ○ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ○﴾ (الغاشیہ: ۳، ۴)

''محنت کرنے والے، تھک جانے والے۔ گرم آگ میں داخل ہوں گے۔''

ظاہری طور پر اصلاح کی کوشش کے باوجود پھر ان اعمال سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس کے بعد انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی نیت کو صاف کرے وہ دیکھے کہ کیا یہ عمل اس کے بس میں ہے یا بس میں نہیں ہے؟

اگر اس کے بس میں نہ ہو تو اس کام کو چھوڑ دے تاکہ ایسی چیز میں وقت ضائع نہ ہو جو بس میں ہی نہیں ہے۔

اگر وہ کام انسان کے بس میں ہو تو اس پر دوبارہ غور کرے اور دیکھے کہ کیا اس کا کرنا اس کے چھوڑنے سے بہتر ہے یا اس کا چھوڑنا اس کے کرنے سے بہتر ہے؟ اگر اس کا کرنا چھوڑنے سے بہتر ہو تو اس کو کر گزرے اور اگر چھوڑنا کرنے سے بہتر ہو تو اسے چھوڑ دے۔

محاسبہ نفس کی یہ قسم نفس کو شرک اکبر اور شرک اصغر یا شرک خفی (ریا) سے بچانے کے لیے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

۲۔ عمل کے بعد محاسبہ نفس:

اس کی تین اقسام ہیں:

اوّل:...... اللہ تعالیٰ کے حق میں کمی و کتاہی پر محاسبہ نفس:

یہ اطاعت پر مبنی عمل کے بعد محاسبہ ہے کہ کیسے عبادت کی؟ کیا یہ عبادت اسی طریقے پر کی گئی جس پر ہونی چاہیے تھی؟ کیا سنت کے موافق تھی؟ یا اس میں کوئی نقص رہ گیا؟ جیسے نماز میں خشوع و خضوع کا فوت ہونا یا بعض گناہوں کی وجہ سے روزے کی بے حرمتی یا حج میں فسق یا لڑائی جھگڑا ہونا۔

اطاعت کے کاموں میں اللہ کا حق چھ اُمور پر مبنی ہے:

۱۔ عمل میں اخلاص

۲۔ عمل میں اللہ کے لیے خیر خواہی

۳۔ نبی اکرم ﷺ کا اتباع

۴۔ اس عمل کو اچھے طریقے سے انجام دینا

۵۔ اللہ کے احسان اور اس کی توفیق اور مدد کی گواہی دی جائے جس کی وجہ سے یہ نیک عمل آسان ہوا۔

۶۔ نیک عمل کے بعد اس میں کمی وکوتاہی کا اعتراف

دوم:...... ایسے عمل پر محاسبہ جس کا چھوڑنا اس کے کرنے سے بہتر تھا:

مسلمان کے شایانِ شان نہیں کہ وہ غیر افضل کام میں مصروف ہو اور افضل کام رہ جائے جیسے کوئی شخص قیام اللیل میں مشغول ہو اور صبح کی نماز فوت ہو جائے یا ایسے اذکار میں مصروف ہو کہ ان سے افضل دیگر اذکارِ مسنونہ موجود ہوں۔

ام المؤمنین جویریہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ صبح صبح ان کے پاس سے نکلے، جب آپ نے صبح کی نماز پڑھی وہ اپنی نماز کی جگہ میں تھیں، پھر آپ چاشت کے وقت لوٹے تو دیکھا کہ وہ وہیں بیٹھی ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب سے میں نے تمہیں چھوڑا تم اسی حال میں رہیں؟'' انہوں نے جواب دیا: ہاں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''میں نے تمہارے چار کلمات تین مرتبہ کہے ہیں اگر وہ ان کلموں کے ساتھ وزن کیے جائیں جو تم نے اب تک کہے ہیں تو وہ وزنی ہو جائیں گے:

((سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ عَدَدَ خَلْقِهِ ، وَرِضَا نَفْسِهِ ، وَزِنَةَ عَرْشِهِ ، وَمِدَادَ كَلِمَاتِهِ .)) [1]

''میں اللہ کی تسبیح بیان کرتا ہوں، اس کی حمد کے ساتھ اس کی مخلوق کے شمار کے برابر اور اس کی رضا مندی کے برابر اس کے عرش کے تول کے برابر اور اس کے کلمات کی سیاہی کے برابر۔''

سوم:...... عادی اور مباح اُمور میں نیت کے فوت ہونے پر محاسبہ نفس:

---

[1] صحیح مسلم: ۲۷۲۶.

انسان عادت اور مباح اُمور کو نیک اعمال میں بدل سکتا ہے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب نیت نیک ہو اور اس عمل پر اللہ تعالیٰ سے اجر کی اُمید ہو۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّكَ لَنْ تُنْفِقَ نَفَقَةً تَبْتَغِي بِهَا وَجْهَ اللّٰهِ إِلَّا أُجِرْتَ عَلَيْهَا، حَتّٰى مَا تَجْعَلُ فِي فِيِّ امْرَأَتِكَ .)) [1]

''بے شک تو جو خرچ کرے اور اس سے تیری نیت اللہ کی رضا کے حصول کی ہو تو تجھ کو اس کا ثواب ملے گا یہاں تک کہ اس پر بھی جو تو اپنی بیوی کے منہ میں ڈالے۔''

چنانچہ مسلمان کو چاہیے کہ وہ مباح اُمور اور عادات پر بھی اپنے نفس کا محاسبہ کرے کہ کیا اس کی نیت نیک تھی کہ اس پر اجر ملے یا اگر اس نے نیک نیت نہ کی ہو تو اس پر اجر نہیں ملے گا۔

محاسبہ پر معاون چیزیں

اللہ تعالیٰ کی معرفت:

محاسبہ پر معاون چیزوں میں اس بات کا شعور ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے پر حاکم ہے اور وہ اس کی ہر مخفی چیز سے واقف ہے اور کوئی مخفی چیز اس سے چھپ نہیں سکتی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝﴾ (ق : ١٦)

''اور بلا شبہ یقیناً ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم ان چیزوں کو جانتے ہیں جن کا وسوسہ اس کا نفس ڈالتا ہے اور ہم اس کی رگ جاں سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔''

اور فرمایا:

﴿وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ﴾ (البقرہ: ٢٣٥)

''اور جان لو کہ بے شک اللہ جانتا ہے جو تمھارے دلوں میں ہے۔ پس اس سے ڈرو۔''

---

[1] صحيح بخاري، كتاب الايمان، باب أن الأعمال بالنية والحسبة : ٥٦.

امام ثعالبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’بندے کا اپنے نفس کے عیوب کو جاننے اور اللہ تعالیٰ کے جلال، اس کی کبریائی اور بے نیازی کو جاننے سے اور اس بات کی معرفت سے کہ اللہ تعالیٰ جو بھی کرے اس سے کوئی پوچھنے والا نہیں تو اس کے خوف میں تقویت پیدا ہوگی، وہ تمام لوگوں سے بڑھ کر اللہ سے ڈرنے لگے گا، اپنے نفس کی اور اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرے گا، پھر جب اس کو مکمل معرفت حاصل ہو جائے گی تو اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا ہو جائے گا اور دل جلنے لگے گا۔ پھر اس جلنے کا اثر دل سے بدن پر منتقل ہو جائے گا۔ خواہشات ختم ہو جائیں گی اور خوف کی آگ سے جل جائیں گی۔ دل میں مسکینی، عاجزی، مسکنت اور نرمی پیدا ہو جائے گی اس کا ارادہ اور پلان مکمل طور پر خوف پر محیط ہوگا اور اپنے انجام پر غور کرنے لگ جائے گا، پھر وہ اپنے نفس کا محاسبہ کرے گا اور ہر وقت کوشش میں لگا رہے گا اور اپنے ارادوں، اپنے اعمال اور اپنے اقوال میں نفس کا مواخذہ کرے گا۔‘‘ [1]

اس بات کی معرفت کی محاسبۂ نفس کل اسے راحت پہنچائے گا:

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’محاسبہ نفس میں یہ چیز بھی معاون ہے کہ بندے کو اس بات کا علم ہو کہ آج کی کوشش کل حساب کے دن اسے فائدہ دے گی اور اگر آج وہ سستی کا شکار ہوتا ہے تو کل اس کا حساب سخت ہوگا۔‘‘ [2]

ان سوالوں پر غور وفکر جو روزِ قیامت پوچھے جائیں گے:

ان سوالوں پر غور وفکر جو قیامت کے دن پوچھے جائیں گے اس بات کے ضامن ہیں کہ انسان اپنے نفس کا محاسبہ کرے، اللہ کی طرف متوجہ ہو، سستی اور خواہشات کو چھوڑ دے۔ حق

[1] تفسير الثعالبي: ٤/ ٤١٢. [2] إغاثة اللهفان: ١/ ٨٠.

کی پیروی کرے، اپنے آپ پر فرائض کو لازم کرے، محرمات کا ترک کر دے، مستحبات کو کثرت سے انجام دے اور مکروہات اور مشتبہ چیزوں سے دُور رہے۔ بندے سے عنقریب ان تمام اعمال کے بارے میں سوال کیا جائے گا جو اس کے اعضاء و جوارح نے سرانجام دیے۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا﴾

(الاسراء: ٣٦)

''بے شک کان اور آنکھ اور دل، ان میں سے ہر ایک، اس کے متعلق سوال ہوگا۔''

عنقریب بندے سے اللہ کی نعمتوں کے بارے میں بھی سوال کیا جائے گا کہ کیا اس نے ان کا شکر ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ﴾ (التکاثر: ٨)

''پھر یقیناً تم اس دن نعمتوں کے بارے میں ضرور پوچھے جاؤ گے۔''

سوال کافروں اور فاسقوں کو متوجہ کر کے نہیں کیا گیا بلکہ صالحین اور اسی طرح رسولوں کو مخاطب کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لِّيَسْئَلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ﴾ (الاحزاب: ٨)

''تاکہ وہ سچوں سے ان کے سچ کے بارے میں سوال کرے۔''

امام مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''صادقین سے مراد رسولوں کی طرف سے پیغام پہنچا دینے والے ہیں۔''[1]

امام سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''عنقریب اللہ تعالیٰ انبیاء اور ان کے پیروکاروں سے اس پختہ عہد کے بارے میں سوال کرے گا کہ انہوں نے وہ وعدہ پورا کیا اور سچ کر دکھایا تو انہیں جنت کی نعمتیں عطا کی جائیں یا انہوں نے اس وعدے کو جھٹلا دیا تو انہیں دردناک

[1] تفسیر ابن کثیر: ٣/٥٦٨.

عذاب دیا جائے۔‘‘ ❶

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَ لَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَo﴾

(الاعراف : ٦)

’’تو یقیناً ہم ان لوگوں سے ضرور پوچھیں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور یقیناً ہم رسولوں سے (بھی) ضرور پوچھیں گے۔‘‘

جب رسولوں اور صادقین سے قیامت کے دن سوال کیا جائے گا تو ان کے علاوہ باقی لوگوں کا کیا حال ہوگا؟

انعام کی معرفت:

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’اسی طرح محاسبہ نفس میں یہ چیز بھی معاون ہے کہ انسان کو اس بات کا علم ہو کہ اس تجارت کا نفع جنت الفردوس کی رہائش اور اللہ تعالیٰ کے چہرے کا دیدار ہے اور اس تجارت کا خسارہ جہنم میں داخلہ اور اللہ تعالیٰ سے دُوری ہے۔ جب اس بات کا یقین ہو جائے گا تو محاسبہ کرنا آسان ہو جائے گا۔‘‘ ❷

قیامت کے دن کی یاد:

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے عدی بن ارطاۃ کو خط لکھا:

’’اے عدی! اللہ سے ڈرو اور یوم قیامت سے پہلے اپنے نفس کا محاسبہ کرو اور اس رات کو یاد کرو جس کی صبح قیامت برپا ہو جائے گی۔ قیامت کے دن سورج لپیٹ دیا جائے گا، ستارے بکھر جائیں گے، مخلوقات گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گی، ایک گروہ جنت میں جائے گا اور دوسرا گروہ دوزخ میں جائے گا۔‘‘ ❸

---

❶ تيسير الكريم الرحمن: ٦٥٩. ❷ إغاثة اللهفان: ١/ ٨٠.

❸ تاريخ دمشق: ٦٢/٤٠.

موت کی یاد:

معروف کرخی رحمہ اللہ کے پاس ایک آدمی آیا۔ آپ نے اس سے فرمایا کہ ظہر ہمارے ساتھ پڑھو، اس نے کہا کہ اگر میں نے ظہر کی نماز آپ کے ساتھ پڑھ لی تو عصر آپ کے ساتھ نہیں پڑھوں گا۔ معروف رحمہ اللہ فرماتے ہیں گویا تو یہ اُمید رکھتا ہے کہ تو عصر تک زندہ رہے گا۔ ہم اتنی لمبی اُمید سے اللہ کی پناہ میں آتے ہیں۔''❶

کسی آدمی نے معروف کرخی رحمہ اللہ کی غیبت میں کوئی بات کہی تو آپ نے اس سے فرمایا: ''اس روئی کو یاد کرو جب وہ آپ کی آنکھوں پر رکھی جائے گی (یعنی موت اور قبر کی یاد)۔''❷

جب انسان کو موت یاد ہو تو وہ اپنے اعمال کا محاسبہ کرتا ہے اور وہ اپنے نفس کو قابو میں رکھتا ہے۔

محاسبۂ نفس میں ابتدا کہاں سے کی جائے؟

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''انسان کو چاہیے کہ اولاً فرائض پر محاسبہ کرے اگر اس میں کوئی کمی ہو تو اس کا ازالہ کرے۔ اس کی قضا دے یا اصلاح کرے۔

پھر منہیات پر محاسبہ کرے، جب پتہ چلے کہ کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہے تو توبہ اور استغفار کے ساتھ ازالہ کرے اور گناہوں کو مٹا دینے والی نیکیاں سرانجام دے۔

پھر غفلت پر محاسبہ کرے اگر اس سے کسی غفلت کا ارتکاب ہو گیا ہو تو ذکر اور اللہ کی طرف رجوع سے اس کا ازالہ کرے۔

پھر اپنی گفتگو پر محاسبہ کرے اور جس کام کی طرف قدم چل کر گئے ہیں اس کا محاسبہ یا جس کام کی طرف ہاتھ بڑھایا یا جو کانوں نے سنا اس پر محاسبہ کرے کہ

---

❶ حلیة الاولیاء: ۱۶۳/۸.
❷ حلیة الاولیاء: ۱۶٤/۸.

میں کیا چاہتا تھا؟ میں نے یہ کام کیوں کیا؟ کس وجہ سے کیا؟ اور اس بات کا علم رکھے کہ ہر قول اور فعل دو رجسٹروں میں لکھا جاتا ہے۔ ایک رجسٹر میں یہ لکھا جاتا ہے کہ یہ کام میں نے کس کی خوشنودی کے لیے کیا؟ دوسرے میں یہ لکھا جاتا ہے کہ کیسے کیا؟ پہلے سوال کا تعلق اخلاص کے ساتھ ہے اور دوسرے کا تعلق اتباع کے ساتھ ہے۔''[1]

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے محاسبہ نفس کا عملی طریقہ بھی ذکر کیا ہے۔ انہوں نے محاسبہ کا ابتدائی طریقہ کار اور مابعد چیزیں ذکر کی ہیں۔

۱۔ فرائض پر محاسبہ:

شریعت میں واجبات پر عمل کرنا محرمات کو ترک کرنے سے اولیٰ ہے کیونکہ واجبات ہی مقصود اصلی ہیں، چنانچہ بندے کو چاہیے کہ سب سے پہلے فرائض پر محاسبہ نفس کرے اگر اس میں کوئی کمی دیکھے تو اسے پورا کرے یا تو اسی واجب کا اعادہ کرے یا نوافل کثرت سے ادا کرے، جب انسان دیکھے کہ کوئی فرض اصلاً باطل ہو گیا ہے تو اس کا اعادہ کرے اگر اس میں کوئی کمی رہ گئی ہو تو نوافل کے ساتھ اس کمی کا ازالہ کرے۔

۲۔ حرام کردہ اور منع کردہ چیزوں پر محاسبہ:

محرمات پر انسان اس طرح محاسبہ کرے کہ کیا اس نے کسی حرام کا ارتکاب تو نہیں کیا؟ پھر اس کے بعد اس کی اصلاح کی کوشش کرے، اگر تو انسان نے سود سے کوئی حرام مال کمایا ہے تو اس سے خلاصی حاصل کرے یا کسی کا حق غصب کیا ہے تو اسے واپس کرے۔ اگر کسی کی غیبت کی ہے یا کسی کی تحقیر کی ہے یا کمتر جانا ہے تو اس سے معافی طلب کرے، اس کے لیے دُعا کرے اور اس کی طرف سے صدقہ کرے۔ اگر کوئی ایسا گناہ ہوا ہے جس کا ازالہ ممکن نہ ہو جیسے کسی نے شراب پی ہو یا کسی عورت کی طرف دیکھا ہو یا اس طرح کا کوئی گناہ ہو تو اس پر ندامت کا اظہار کرے اور توبہ کرے اور دوبارہ گناہ نہ کرنے کا پختہ عزم کرے۔ اس کے ساتھ

[1] إغاثة اللهفان: ۱/ ۸۳.

ساتھ کثرت سے گناہوں کو دھو ڈالنے والے اعمال کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ﴾ (هود: ١١٤)

''اور ان کے دونوں کناروں میں نماز قائم کر اور رات کی کچھ گھڑیوں میں بھی۔ بے شک نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔''

۳۔ اپنے مقاصد سے غفلت پر محاسبہ:

انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے نفس پر غور کرے کہ کیا وہ کھیل کود (جائز) میں تو نہیں ڈوبا ہوا، پھر ذکر، عبادت اور نیک اعمال سے جو اتنا عرصہ دُور رہا ہے اس کا ازالہ کرے اور غفلت کے بدلے نیک اعمال سرانجام دے۔

۴۔ اعضاء کا محاسبہ:

میرے پاؤں نے کیا کیا ہے؟ ہاتھ نے کیا کیا ہے؟ کانوں نے کیا سنا ہے؟ آنکھوں نے کیا دیکھا ہے؟ زبان نے کیا بولا ہے؟

پھر اپنے اعضاء کو اللہ کی اطاعت میں مشغول کرے اس حالت کا ازالہ کرے۔

۵۔ نیتوں پر محاسبہ:

اس عمل میں میرا ارادہ کیا ہے؟ اور اس میں میری نیت کیا ہے؟

خاص طور پر دل کا محاسبہ بھی ضروری ہے، کیونکہ نیت کا محاسبہ بہت مشکل ہے اس لیے کہ دل بہت پھسلنے والی چیز ہے اور اسے ''قلب'' کہا بھی اسی لیے جاتا ہے کہ یہ بہت پھسلتا ہے۔

نفس کو سزا

مسلمان جب اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ اس کا نفس کسی معصیت میں مبتلا ہے یا فضائل میں کسی سستی یا کاہلی کا شکار ہے تو مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنے نفس کو اس کی سزا دے اور اسے ادب سکھائے۔

انسان اسی صورت میں صراطِ مستقیم پر رہتا ہے کہ وہ کوشش کرے، محاسبۂ نفس کرے اور نفس کو سزا دے۔

کس قدر تعجب کی بات ہے کہ اپنے خاندان اور نوکروں کو تو بُرے اخلاق اور کوتاہیوں پر سزا دیتا ہے لیکن وہ اپنے نفس سے صادر ہونے والے بُرے اعمال پر اسے سزا نہیں دیتا حالانکہ اپنے نفس کو سزا دینا زیادہ لائق اور اولیٰ ہے۔

''عقوبات'' (سزا) کے لفظ میں مقصود یہ ہے کہ انسان اپنے نفس پر اطاعت کے کام اور ایسے اعمال لازم کرے جو وہ اس سے پہلے نہیں کرتا۔ یہی سلف کا طریقہ کار ہے۔ ہم یہاں نفس کو سزا دینے کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں:

☆ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی ایک دفعہ عصر کی نماز جماعت سے رہ گئی تو آپ نے اپنے نفس کو یہ سزا دی کہ آپ نے ایک قطعہ زمین صدقہ کی جس کی مالیت دو لاکھ درہم تھی۔ [1]

☆ اسی طرح جب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی نماز جب جماعت سے رہ جاتی تو وہ تمام رات جاگ کر گزارتے۔ [2]

☆ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی مغرب کی نماز دو ستارے طلوع ہونے تک لیٹ ہوگئی تو آپ نے دو غلام آزاد کیے حالانکہ ابھی نماز کا وقت نہیں نکلا تھا یعنی ختم نہیں ہوا تھا۔ [3]

☆ ابن ابی ربیعہ رحمہ اللہ کی فجر کی دو سنتیں فوت ہوگئیں تو انہوں نے ایک غلام آزاد کیا۔ [4]

☆ ابن عون رحمہ اللہ کو آپ کی والدہ نے آواز دی۔ انہوں نے جواب دیا تو ان کی آواز والدہ کی آواز سے بلند ہوگئی تو انہوں نے دو غلام آزاد کیے۔ [5]

چنانچہ ثابت ہوا کہ سلف کے نزدیک ''سزا'' کا مطلب اپنے نفس پر اعمال صالحہ کو لازم

---

[1] عمدة القاري: ١٧٣/١٢.
[2] إحياء علوم الدين: ٤٠٨/٤.
[3] شرح العمدة لابن تيمية: ٢١٠/٤.
[4] إحياء علوم الدين: ٤٠٨/٤.
[5] حلية الاولياء: ٣٩/٣.

کرنا اوراذکار واوراد کو دُگنا کرنا ہے۔

محاسبۂ نفس پر معاون چیزوں میں ایسی باتوں پر غوروفکر کرنا بھی ہے جو قلت عمل کے باوجود بہت زیادہ اجر کا باعث ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ قَامَ بِعَشْرِ آيَاتٍ لَمْ يُكْتَبْ مِنَ الْغَافِلِينَ ، وَمَنْ قَامَ بِمِائَةِ آيَةٍ كُتِبَ مِنَ الْقَانِتِيْنَ ، وَمَنْ قَامَ بِأَلْفِ آيَةٍ كُتِبَ مِنَ الْمُقَنْطِرِيْنَ .)) [1]

''جس شخص نے دس آیتوں سے قیام کیا وہ غافلوں میں شمار نہیں ہوتا اور جو سو (۱۰۰) آیتوں سے قیام کرے وہ قانتین (عابدین) میں لکھا جاتا ہے اور جو ہزار آیتوں سے قیام کرے وہ مقنطرین (بے انتہا ثواب جمع کرنے والوں) میں لکھا جاتا ہے۔''

چنانچہ جب مسلمان اس حدیث اور اس جیسی دوسری مثالوں پر غور کرے گا تو لازمی بات ہے کہ وہ اپنے اوقات کے ضیاع پر نادم ہوگا کہ اس نے جسم کی راحت کے لیے کتنا زیادہ ثواب ضائع کیا۔ پھر لازماً وہ اپنے نفس پر نیک اعمال کو لازم کرے گا۔

محاسبہ نفس میں معاون چیزوں میں مجتہدین کے حالات پر غوروفکر اور سلف کے احوال پر تدبر بھی شامل ہے کہ وہ کس قدر عبادات سرانجام دیتے تھے حالانکہ اس طرح کی مثالیں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ وہ اپنے نفس کو اس طرح سزا دیتے تھے کہ وہ مزید عبادت اور مستحبات سرانجام دیتے تھے۔

قاسم بن محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں صبح صبح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس حاضر ہوا۔ انہیں سلام کیا، جب میں حاضر ہوا تو وہ چاشت کی نماز ادا کر رہی تھیں اور یہ آیت

[1] رواه أبو داود، كتاب شهر رمضان ، باب تحزيب القرآن : ١٣٩٨ و صححه الألباني.

تلاوت کر رہی تھیں:

﴿فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقَانَا عَذَابَ السَّمُومِ﴾ (الطور: ۲۷)

''پھر اللہ نے ہم پر احسان کیا اور ہمیں زہریلی لُو کے عذاب سے بچالیا۔''

اور رو رہی تھیں، دعا کر رہی تھیں اور بار بار آیت کو دہرا رہی تھیں۔ میں کھڑا ہوا یہاں تک کہ کھڑا کھڑا تھک گیا اور آپ اسی حالت میں رہیں۔ جب میں نے یہ دیکھا تو بازار چلا گیا اور سوچا کہ اپنی ضرورت پوری کر کے واپس آتا ہوں۔ چنانچہ میں نے اپنی ضرورت پوری کی، واپس آیا تو سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ابھی تک اسی حالت میں تھیں۔ آپ بار بار آیت کو دہراتی تھیں، روتی تھیں اور دُعا کرتی تھیں۔ ❶

ابو الدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''اگر تین چیزیں نہ ہوتیں تو مجھے ایک دن بھی زندہ رہنا پسند نہ تھا، سخت گرمی کی دوپہر میں اللہ کے لیے پیاسا رہنا، نصف رات کو سجدے کرنا اور ان لوگوں کی مجلس جو بہترین کلام کا انتخاب کر کے بولتے ہیں جس طرح بہترین پھل کا انتخاب کیا جاتا ہے۔'' ❷

حضرت مسروق رحمہ اللہ کی زوجہ فرماتی ہیں: ''مسروق کو جب بھی دیکھا جائے نماز لمبی کرنے کی وجہ سے اس کی ٹانگیں سوجی رہتی ہیں۔ اللہ کی قسم! اگر میں اس کے پیچھے بیٹھوں تو اس پر ترس کھا کر روتی رہوں۔'' ❸

حضرت ام الربیع رحمہ اللہ اپنے بیٹے کے بہت زیادہ رونے اور رات کو جاگنے کی وجہ سے اس پر بہت شفقت کرتی تھیں۔ والدہ نے پوچھا: اے بیٹے! شاید تو کسی کو قتل کر بیٹھا ہے؟ ربیع نے جواب دیا کہ ہاں، اے امی جان۔ والدہ نے پوچھا کہ وہ مقتول کون ہے؟ تاکہ ہم اس کے اہل خانہ کے پاس جائیں اور وہ آپ کو معاف کر دیں۔ اللہ کی قسم! اگر انہیں آپ کے

---

❶ صفة الصفوة: ۲/ ۳۱.

❷ الزهد لابن المبارك: ۲۷۷، و تاريخ دمشق: ۴۷/ ۱۵۹.

❸ الزهد لابن المبارك: ۹۵، و تاريخ دمشق: ۵۷/ ۴۲۶.

رونے اور راتوں کو جاگنے کا علم ہو جائے تو وہ ضرور آپ پر رحم کھائیں گے، تو حضرت ربیع نے جواب دیا کہ اے امی جان! مقتول تو میرا نفس ہے۔ [1]

اب اس پاکیزہ اور طیب نفس لوامہ اور انکار کرنے والے ظالم اور کافر نفس کے درمیان فرق دیکھیں۔ جس نے اپنے عبادت میں کوشش کرنے والے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ زیادہ عبادت مت کرو۔ اس کے بیٹے نے پوچھا کہ کیوں؟ تو اس نے جواب دیا کہ کیونکہ ممکن ہے کہ روزِ قیامت کوئی چیز نہ ہو۔

نفس کو سزا دینے کی حد کیا ہے؟

مسلمان انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے نفس کو ایسے راستے پر چلائے جو اسے نجات کی طرف لے جائے تو نفس پر بھرپور محنت کرے اور اس سے علیحدگی اختیار کر کے دشمنی پر اُتر آئے، یہاں تک کہ جب وہ تھک جائے، اور اس کا اصل کام اس کے سپرد ہو جائے اور وہ آسودہ اور خوشحال ہو جائے۔ نفس کا کنٹرول مسلسل اور لگاتار محنت سے ہی ممکن ہے۔

جب اسے دیکھے کہ وہ مطمئن ہے تو اسے نصیحت کرے اور اللہ کا خوف دلائے اور جب دیکھے کہ وہ مایوس ہو رہا ہے تو اسے اُمید کی نصیحت کرے اور اللہ کی اُمید دلائے۔

نفس اس بات کا بھی محتاج ہوتا ہے کہ انسان اسے پُر اُمید رکھے اور اسے ثواب کی یاددہانی کرواتا رہے تا کہ اس کے لیے نیک اعمال کی انجام دہی آسان رہے۔

امام ابن جوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''میں دو آدمیوں کے پاس سے گزرا جو بوجھ اُٹھائے جا رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے شعروں کا جواب دے رہے تھے۔ ایک دوسرے کی بات کو غور سے سنتا پھر اسے دہراتا یا اسی طرح کا کوئی جواب دیتا۔ پھر دوسرا بھی اسی طرح کرتا۔ جب میں نے دیکھا کہ اگر وہ اس طرح نہ کرتے تو ان کی مشقت زیادہ ہو جاتی اور وزن بوجھل ہو جاتا اور ایسا کرنے سے ان کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ جب

---

[1] الزهد لابن حنبل: ٣٤٠ و حلية الاولياء: ٢/ ١١٤.

میں نے اس کے سبب پر غور کیا تو پتہ چلا کہ سب اپنی توجہ کو دوسرے انسان کی باتوں میں مشغول رکھنا اور پھر اپنی فکر کو اس کا جواب دینے میں مشغول کرنا تھا۔ چنانچہ رستہ کٹ گیا اور وہ بوجھ کو بھول گئے۔

مجھے اس سے ایک نکتے کی سمجھ آئی اور میں نے دیکھا کہ انسان مشکل معاملات کی انجام دہی سے تکلیف محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح نفس کو بدلنا بھی مشکل کام ہے اور پسندیدہ چیز سے نفس کو روکنا اور ناپسندیدہ فعل سرانجام دینا بھی تکلیف دہ امر ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ صبر کا راستہ تسلی سے کٹتا ہے اور نفس کے لیے نرمی کے رویے سے کٹتا ہے۔'' ❶

صالحین کے محاسبہ نفس کی صورتیں

سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ:

سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ میرے والد قسم اُٹھایا کرتے تھے کہ ''مجھے لوگوں میں سے عمر رضی اللہ عنہ سے زیادہ محبوب کوئی شخص نہیں۔'' سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میرے والد دوبارہ مخاطب ہوئے اور فرمایا: اے بیٹی! میں نے کیسے کہا تھا؟ انہوں نے کہا: مجھے لوگوں میں سے عمر رضی اللہ عنہ سے زیادہ محبوب کوئی شخص نہیں۔ فرمایا: زیادہ عزت والا۔ ❷

دیکھیے! کیسے انہوں نے ایک کلمہ بولنے کے بعد اپنے نفس کا محاسبہ کیا، پھر انہوں نے غور کیا اور اسے دوسرے کلمہ سے بدل دیا کیونکہ ان کی رائے میں وہ کلمہ زیادہ دقیق اور زیادہ سچائی پر مبنی تھا۔

سیّدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ:

سیّدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں سیّدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ساتھ نکلا، یہاں تک کہ ایک گڑھے میں داخل ہوئے۔ میں نے ان کو یہ کہتے ہوئے سنا، میرے اور ان

---

❶ صيد الخاطر : ٧١.
❷ تاريخ دمشق : ٢٤٧/٤٤.

کے درمیان دیوار تھی اور وہ گڑھے کے درمیان میں تھے: ''عمر بن خطاب! امیر المؤمنین واہ واہ! اللہ کی قسم! تجھے اللہ سے ڈرنا چاہیے یا وہ تجھے عذاب دے گا۔'' ❶

انہوں نے اپنے نفس کو اس لیے امیر المؤمنین کے نام سے مخاطب کیا تاکہ ان کے نفس کو یہ یاد دہانی ہو جائے کہ امیر المؤمنین کا لقب انہیں اللہ تعالیٰ سے بے نیاز نہیں کرے گا۔

سیّدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ:

ابن شماسہ مہری سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ہم عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور وہ فوت ہونے کے قریب تھے۔ آپ بہت دیر تک روئے اور اپنے منہ دیوار کی طرف پھیر لیا۔ ان کے بیٹے کہنے لگے: اے ابا جان! آپ کیوں روتے ہیں؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو یہ خوش خبری نہیں دی؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو یہ خوش خبری نہیں دی؟ تب انہوں نے اپنا چہرہ سامنے کیا اور فرمانے لگے کہ ہمارے نزدیک سب کاموں سے افضل اس بات کی گواہی ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبودِ برحق نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور میرے اوپر تین ادوار گزرے ہیں۔ ایک حال یہ تھا کہ میرے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ بُرا کوئی نہ تھا اور میری خواہش یہ تھی کہ میرا بس چلے تو میں آپ کو قتل کر دوں (نعوذ باللہ) اگر میں اس حال میں مر جاتا تو جہنمی ہوتا۔ دوسرا حال یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اسلام کی محبت ڈال دی، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ اپنا داہنا ہاتھ بڑھایئے تاکہ میں آپ کی بیعت کروں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے عمرو! تجھے کیا ہوا؟'' کہتے ہیں کہ میں نے کہا میں شرط لگانا چاہتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا شرط؟ میں نے کہا یہ شرط کہ میرے گناہ معاف کیے جائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((أَمَا عَلِمْتَ أَنَّ الْإِسْلَامَ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ ، وَأَنَّ الْهِجْرَةَ تَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهَا ، وَأَنَّ الْحَجَّ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ .)) ❷

❶ موطا مالك: ١٨٠٠. ❷ صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب كون الاسلام يهدم ما قبله: ١٢١.

"اے عمرو! کیا تو نہیں جانتا کہ اسلام گزشتہ گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ اسی طرح ہجرت گزشتہ گناہوں کو مٹا دیتی ہے، اسی طرح حج بھی ماضی کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔"

پھر رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر کوئی محبوب نہ تھا۔ اور نہ میری نگاہ میں آپ سے زیادہ کسی کی شان تھی اور میں آپ کے جلال کی وجہ سے آپ کو آنکھ بھر کر دیکھ نہ سکتا تھا۔ اگر کوئی مجھ سے آپ کی صورت کے متعلق سوال کرے تو میں بیان نہیں کر سکتا کیونکہ میں آنکھ بھر کے آپ کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اگر میں اس حال میں مر جاتا تو مجھے اُمید تھی کہ میں جنتی ہوتا۔ اس کے بعد ہم چند چیزوں میں پھنس گئے۔ میں نہیں جانتا کہ ان کی وجہ سے میرا کیا حال ہو گا۔ چنانچہ جب میں مر جاؤں تو میرے جنازے کے ساتھ کوئی رونے اور چیخنے چلانے والی نہ ہو، نہ آگ ہو اور جب مجھے دفن کرنا تو مجھ پر اچھی طرح مٹی ڈال دینا پھر میری قبر کے گرد اتنی دیر تک کھڑے رہنا جتنی دیر میں اونٹ نحر کیا جاتا ہے اور اس کا گوشت تقسیم کیا جاتا ہے تاکہ تمہارے ساتھ میرا دل بہل جائے اور میں دیکھ لوں کہ میں اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کو کیا جواب دیتا ہوں۔

سیّدنا حنظلہ اسیدی رضی اللہ عنہ:

وہ رسول اکرم ﷺ کے کاتبین میں سے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھے ابوبکر رضی اللہ عنہ ملے اور پوچھا کہ اے حنظلہ! تم کیسے ہو؟ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ حنظلہ تو منافق ہو گیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: سبحان اللہ! تم کیا کہتے ہو؟ میں نے کہا: ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس ہوتے ہیں تو آپ ہمیں جنت اور دوزخ کی یاد دلاتے ہیں گویا دونوں ہماری آنکھ کے سامنے ہیں، پھر جب ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس سے چلے جاتے ہیں اور بیویوں، اولاد اور کاروبار میں مشغول ہو جاتے ہیں تو سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! ہمارا بھی یہی حال ہے، پھر میں اور ابوبکر رضی اللہ عنہ چلے اور رسول اکرم ﷺ کے پاس پہنچے تو میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! حنظلہ منافق ہو گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تیرا کیا مطلب ہے؟ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم آپ کے پاس ہوتے ہیں تو آپ

ہمیں جنت اور دوزخ کی یاددہانی کرواتے ہیں گویا وہ دونوں ہماری آنکھ کے سامنے ہیں، پھر جب ہم آپ کے پاس سے چلے جاتے ہیں تو بیوی، بچوں اور کاموں میں مشغول ہو جاتے ہیں اور بہت سی باتیں بھول جاتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((والَّـذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ ، اِنْ لَوْ تَدُوْمُوْنَ عَلَى مَا تَكُوْنُوْنَ عِنْدِيْ وَفِي الذِّكْرِ لَصَافَحَتْكُمُ الْمَلَائِكَةُ عَلَى فُرُشِكُمْ ، وَفِيْ طُرُقِكُمْ ، وَلٰكِنْ يَا حَنْظَلَةُ سَاعَةً وَسَاعَةً .)) [1]

''اسی کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم ہمیشہ اسی حال میں رہو جس حال میں میرے پاس رہتے ہو اور ذکر میں مشغول رہو تو فرشتے تمہارے بستروں پر اور تمہارے راستوں میں تم سے مصافحہ کریں لیکن اے حنظلہ! ایک ساعت دنیا کا کاروبار اور ایک ساعت اللہ تعالیٰ کی یاد۔ آپ نے تین بار یہ فرمایا۔''

علی بن حسین رحمہ اللہ:

امام زہری فرماتے ہیں کہ میں نے علی بن حسین زین العابدین کو سنا وہ اپنے نفس کا محاسبہ کر رہے تھے اور اپنے رب سے سرگوشی کر رہے تھے اور اپنے نفس سے کہہ رہے تھے: اے نفس! تو کہاں دنیا کے دھوکے اور اس کی آبادیوں اور رنگینیوں کو قابل اعتماد سمجھ کر اس پر مطمئن ہو گیا ہے۔ کیا تو نے اپنے آباؤ واجداد کے فوت ہو جانے کو بطورِ عبرت نہیں جانا اور زمین نے کیسے کیسے آسمان چھپا لیے اور تیرے بھائیوں کے دل دکھائے اور تیرے دوستوں کو بوسیدہ کر دینے والی مٹی میں بھیج دیا۔ کتنے ہی طاقتور اور عہدوں کے مالک مختلف زمانوں میں آئے لیکن وہ نیست و نابود ہو گئے۔ کتنے ہی لوگوں کو مٹی نے بوسیدہ کر دیا اور ان کے نام و نشان تک مٹ گئے۔ یہ وہ تھے جو مختلف لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہتے تھے اور اب ان کی جماعتیں اور گروہ قبرستان میں دفن ہیں۔

تو کیا سمجھتا ہے کہ دنیا تجھے مکمل حاصل ہو گئی اور پھر اس کی خواہشات میں مشغول ہو گیا

---

[1] صحيح مسلم، كتاب التوبة، باب فضل دوام الذكر والفكر: ٢٧٥٠.

بہت جلد تجھ پر بڑھاپا طوری ہو جائے گا اور تیرے پاس ڈرانے والا آیا اور تو جان بوجھ کر اس کو صرف نظر کیے ہوئے ہے اور اپنی نیند کی لذتوں میں مشغول ہے۔

گزشتہ اُمتوں اور فنا ہو جانے والے ممالک پر نظر ڈال کہ زمانے اور دنوں کی گردش نے کس طرح انہیں فنا کر دیا اور جہنم میں پہنچا دیا۔ دُنیا سے ان کے آثار اور نشانات تک مٹ گئے اور صرف ان کے واقعات باقی ہیں۔

کتنے ہی مال دار بادشاہ اور بڑی بڑی فوجیں اور لشکر اس دنیا میں آئے اور اپنی خواہشات کی تکمیل کی۔ بڑے بڑے محلات اور عمارتیں تعمیر کیں، مال اور ہیرے جواہرات کے ذخائر جمع کیے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ پیغام آ گیا جو ردّ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی تقدیر نازل ہو گئی جسے روکا نہیں جا سکتا (یعنی موت آ گئی)۔ اللہ تعالیٰ جو بہت بلند ہے، بادشاہ ہے، جبار، متکبر اور قہار ہے۔ جابروں کو ہلاک اور متکبروں کو مٹانے والا ہے۔

تو جلدی جلدی اپنے آپ کو دنیا اور اس کے مکروفریب سے بچا لے، اور ان گھات کی جگہوں سے جو تیرے لیے لگائے بیٹھی ہے اور اپنی خوبصورتی کو تیرے لیے بطورِ زیور لے کر بیٹھی ہے اور اسے خوش نما بنا کر ظاہر کر رہی ہے۔ کا ی کوئی عقل منداس کی حرص کرے گا یا صاحب بصیرت اس فانی دنیا سے دِل لگا کر خوش ہو گا جب کہ وہ جانتا ہے کہ اس کا فنا ہونا یقینی ہے اور اس کو دوام نہیں ہے۔

جو شخص رات کے وقت اس کے حملے سے ڈرتا ہے اس کی آنکھیں کیسے سوئیں گی اور اس کا نفس کیسے سکون میں رہے گا جب کہ وہ موت کا منتظر ہو!!

ممکن ہے کوئی دنیا دار اس کی لذتوں اور رنگینیوں سے فائدہ اُٹھا لے اور طرح طرح کی اصناف جمع کرلے اور دنیا کے مزید حصول کے لیے سخت محنت کرے کیا وہ اس کی بیماریوں، آزمائشوں اور تکلیفوں میں اس کی سختی اور مشقت برداشت کرے گا؟

کتنے ہی لوگ جنہیں دنیا نے اپنی ہمیشگی اور دوام کا دھوکا دیا اور وہ اوندھے منہ زمین پر پچھاڑ دیے گئے۔ اس دنیا نے انہیں اپنے دھوکے سے اور اپنی گھات سے نہ نکلنے دیا اور اپنی

تکلیف سے شفا اور اپنی بیماری سے بری نہ ہونے دیا۔

تیری دُنیا تجھے آخرت کے مقابلے میں کس طرح بے وقوف بنائے ہوئے ہے جب کہ تو اپنی خواہشات پر سوار ہے۔ دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے والے! میرے خیال سے آخرت کے متعلق تیرا یقین نہایت کمزور ہے، کیا اس بات کا تجھے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے یا اس کے متعلق قرآن میں کوئی حکم نازل ہوا ہے؟؟ [1]

حارث محاسبی رحمہ اللہ:

حارث محاسبی انتہائی زاہد اور عبادت گزار بزرگ تھے۔ ان کا یہ نام کثرت سے محاسبہ نفس کرنے کی وجہ سے پڑا۔ امام سمعانی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''المحاسبی اس لیے نام پڑا کہ وہ بہت زیادہ محاسبہ نفس کیا کرتے تھے۔'' [1]

امام ابن جوزی رحمہ اللہ:

اپنے نفس کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں: ''میں نے ایک دن اپنے نفس پر ایک محقق کی طرح تفکر کیا۔ میں نے اس کا محاسبہ کیا، قبل اس کے کہ اس کا محاسبہ کیا جائے، میں نے اس کا وزن کیا قبل اس کے کہ اس کا وزن کیا جائے۔ میں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے بہت مہربانی کی ہے، بچپن سے لے کر اب تک اللہ کا کرم ہی کرم ہے۔ اللہ نے پھر قبیح کام پر پردہ ڈالا، پھر قابل سزا فعل کو معاف کیا اور میں نے زبان سے اس کا شکر ادا کیا۔

میں نے اپنی غلطیوں پر غور وفکر کیا، اگر مجھے ان کی سزا ملتی تو میں بہت جلد ہلاک ہو جاتا، اگر وہ لوگوں کے سامنے واضح ہو جاتی تو مجھے بہت شرمندگی ہوتی۔ کوئی بھی معتقد یہ بات سن کر اعتقاد نہیں رکھے گا کہ اس کا تعلق کبیرہ گناہوں کے ساتھ ہے یہاں تک کہ میرے بارے میں وہی گمان رکھے گا جو وہ فاسقوں کے بارے میں رکھتا ہے تو میرے لیے یہ بہت قبیح اور بُری بات ہے اور میں طرح طرح کی تاویلات فاسدہ کا شکار ہو جاؤں گا۔ میری یہ کیفیت

---

1. تاریخ دمشق: ٤١/ ٤٠٤، ٤٠٨.
2. التبیان فی آداب حملة القرآن للنووي: ١١٧.

ہو جانے کے بعد میں تو یہی دُعا کروں گا: اے اللہ! تیری حمد کے ساتھ تو پاک ہے اور جو تو نے میرے عیوب پر پردہ ڈال دیا ہے مجھے بخش دے۔ پھر میں نے اپنے نفس کو اس بات پر شاکر بنانے کی کوشش کی لیکن اس نے کما حقہ اس کو نہ پایا تو میں نے اپنی کمی وکوتاہی پر گریہ و آہ زاری کی اور اُمید کرتے ہوئے کبار کے رتبے پر پہنچ گیا۔ عمر بیت گئی لیکن مقصود حاصل نہ ہوا۔'' ❶

❶ صيد الخاطر: ٤٧١.

خاتمہ

انسان کو چاہیے کہ ایک ایسی گھڑی ہو جس میں وہ اپنے نفس سے مطالبہ کرے اور تمام حرکات وسکنات پر اس کا محاسبہ کرے۔ جس طرح دنیا کے تاجر اپنے حصہ داروں کے ساتھ کرتے ہیں۔ حرص کی وجہ سے کہ ان کے حصے کی کوئی چیز رہ نہ جائے۔

نفس کے گناہ بہت زیادہ ہیں، انسان کے لیے بہتر ہے کہ ہر روز اپنے نفس کا محاسبہ کرے، قبل اس کے کہ ایسا دن آئے جب اس کی تمام عمر کا حساب ایک ہی دن میں کیا جائے۔

ایک آدمی محاسبہ نفس کیا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے اپنی عمر کا حساب کیا اس کی عمر کے ساٹھ سال تھے، پھر اس نے دن شمار کیے تو کل اکیس ہزار پانچ سو (۲۱۵۰۰) دن تھے۔

اس نے ایک چیخ ماری اور غش کھا کر گر گیا۔ جب اسے افاقہ ہوا تو کہنے لگا: ہائے افسوس! میں اپنے رب کے پاس اکیس ہزار پانچ سو (۲۱۵۰۰) گناہوں کے ساتھ پیش ہوں گا۔

وہ کہنے لگا کہ اگر ایک دن میں ایک گناہ بھی ہو تو گناہ کس قدر زیادہ ہو جائیں گے کہ شمار ممکن نہیں رہے گا۔

پھر وہ کہنے لگا: مجھ پر افسوس! میں نے عمر گزار دی، اپنی آخرت خراب کر لی، اپنے مالک کی نافرمانی کی۔ پھر جب میں آباد گھر کو چھوڑ کر کھنڈر اور ویران گھر میں منتقل نہیں ہونا چاہتا تو حساب وکتاب، جزا وسزا والے گھر کی طرف بغیر عمل اور ثواب کے کیسے منتقل ہونا چاہوں گا۔

پھر ان پر موت کی نزع شدت طاری ہوئی تو لوگوں نے انہیں ہلایا لیکن وہ موت کی وادی میں جا چکے تھے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دُعا گو ہیں کہ وہ ہمیں اور تمہیں اپنے نفسوں کی اصلاح کی توفیق دے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ.

اپنے فہم وادراک کا امتحان لیں

ذیل میں اس موضوع سے متعلق سوالات کو دو مرحلوں کو مدنظر رکھتے ہوئے وضع کیا گیا ہے۔

سوالوں کی ایک قسم تو وہ ہے جن کا جواب فوراً دینا ہے۔ اس قسم کے سوالات کو پہلے مرحلہ میں رکھا گیا ہے۔

سوالوں کی دوسری قسم وہ ہے جو بحث ونظر اور غور وفکر کی متقاضی ہے اس قسم کے سوالات کو دوسرے مرحلہ میں رکھا گیا ہے۔

پہلے مرحلہ کے سوالات جن کا جواب فورا دینا ہے:

۱۔ محاسبہ کا اصل مقصد کیا ہے؟

۲۔ محاسبہ نفس کی اقسام بیان کیجیے؟

۳۔ کیا کتاب وسنت میں محاسبہ کی کوئی اصل اور دلیل ہے؟

۴۔ قرآن مجید میں جو اوصافِ نفس بیان ہوئے ہیں ان کا تذکرہ کیجیے۔

۵۔ محاسبہ کے کئی ایک فوائد اور ثمرات ہیں، ان میں سے پانچ کا تذکرہ کیجیے۔

۶۔ سلف صالحین کے اپنے نفوس کے محاسبہ پر چند واقعات تحریر کیجیے۔

وہ سوالات جن کا جواب غور وفکر کے بعد دینا ہوگا:

۱۔ جاہل اپنے نفس کا کس طرح محاسبہ کرتا ہے؟

۲۔ عالم اپنے نفس کا کس طرح محاسبہ کرتا ہے؟

۳۔ کیا محاسبہ نفس صرف گناہ گاروں کے ساتھ خاص ہے؟

۴۔ مسلمان نیک اعمال پر اپنے نفس کا محاسبہ کس طرح کرتا ہے؟

۵۔ محاسبہ نفس پر کون سے معاون اُمور ہیں؟
۶۔ مسلمان اپنے نفس کے محاسبے کی ابتدا کیسے کرتا ہے؟
۷۔ وہ کون سی حالتیں ہیں جن میں نسان اپنے نفس کا محاسبہ ضروری نہیں سمجھتا اور کیوں؟
۸۔ محاسبہ کے موضوع پر ایک مقالہ تحریر کیجیے۔
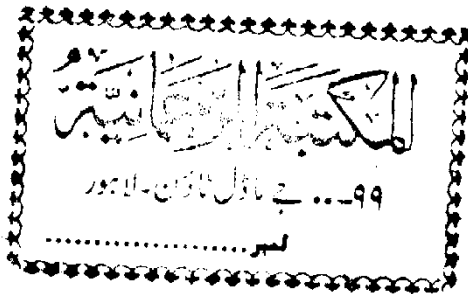
الفرقان ٹرسٹ (مکتبۃ الکتاب)

کی مطبوعات

کتاب	قیمت
۱۔تنویر الافہام فی حل عربیۃ بلوغ المرام۔(ترکیب)	160/-
۲۔سلفی خطبات (مولانا ابراہیم سلفی شہیدؒ)	400/-
۳۔سیلنگ اینڈ سیلز مینجمنٹ (اُردو ترجمہ) تجارت کے زرّین اُصولوں پر لاجواب کتاب	400/-
۴۔حسن معاشرت سے شوہر کی اصلاح	240/-
۵۔غم کا علاج	100/-
۶۔روشنی اور اندھیرا	310/-
۷۔عقیدہ ایمان اور منہج اسلام	350/-
۸۔اسلام میں اختلاف کے اُصول وآداب	220/-
۹۔تحفہ وقت (وقت کی قدر و قیمت قرآن وحدیث کی روشنی میں)	400/-
۱۰۔نجات یافتہ کون؟	340/-
۱۱۔توبہ وتقویٰ	200/-
۱۲۔الصادق الامین ﷺ......ڈاکٹر محمد لقمان السّلفی حفظہ اللہ	940/-
۱۳۔صحیح سیرت نبوی ﷺ......(از ڈاکٹر علی محمد محمد الصلابی)	زیر طبع
۱۴۔سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ شخصیت اور کارنامے......(از ڈاکٹر علی محمد محمد الصلابی)	720/-
۱۵۔سیّدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ شخصیت اور کارنامے (از ڈاکٹر علی محمد محمد الصلابی)	1000/-
۱۶۔سیّدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ شخصیت اور کارنامے (از ڈاکٹر علی محمد محمد الصلابی)	770/-
۱۷۔سیّدنا علی بن ابوطالب رضی اللہ عنہ شخصیت اور کارنامے (از ڈاکٹر علی محمد محمد الصلابی)	1200/-
۱۸۔سیّدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما شخصیت اور کارنامے......(از ڈاکٹر علی محمد محمد الصلابی)	زیر طبع

۱۹۔سیّدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ شخصیت اور کارنامے......(از ڈاکٹر علی محمد محمد الصلابی)	زیر طبع
۲۰۔علامہ ابن باز یادوں کے سفر میں......از رضوان اللہ ریاضی	370/-
۲۱۔دُنیا کا خاتمہ (اُردو ترجمہ نہایۃ العالم......از ڈاکٹر محمد بن عبدالرحمٰن العریفی) 4 کلر	1500/-
۲۲۔شیطانی وسوسے	220/-
۲۳۔صحیح دُعائیں اور اذکار......از تعلیقات علامہ محمد ناصر الدین البانی	زیر طبع
۲۴۔سفارش کرو اجر وثواب پاؤ	100/-
۲۵۔ خیر القرون	600/-
۲۶۔ منہاج السنہ	700/-
۲۷۔ سیرت سیّدنا ابراہیم (بابل سے بطحا تک)	200/-
۲۸۔ شرح عقیدہ واسطیہ (الشیخ صالح العثیمین رحمہ اللہ)	700/-
۲۹۔ شرعی دَم کے ذریعے علاج	100/-
۳۰۔ ایمان کا راستہ	500/-
۳۱۔ اولیاء حق و باطل	400/-
۳۲۔ روشنی	260/-
۳۳۔ پیغام حق	400/-
۳۴۔ بدعات کا انسائیکلو پیڈیا......علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ	940/-
۳۵۔ سلفیت تعارف وحقیقت......	350/-